حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ
کی
سیاسی ڈائری
اخبار وافکار کی روشنی میں
(جلد ہفتم)
(سلسلہ مقالات)
مقالاتِ سیاسیہ
حصہ دوم
تالیف و تدوین
ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

بسم الله الرحمن الرحیم

سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی

سیاسی ڈائری

شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا

سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی

سیاسی ڈائری

اخبار وافکار کی روشنی میں

جلد ہفتم

(سلسلہ مقالات)

مقالاتِ سیاسیہ

(حصہ دوم)

بہ قلم

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ

تالیف وتدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

باہتمام: محمد ناصر خان

فرید بکڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

New Delhi - 110002

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی سیاسی ڈائری (جلد ہشتم)

مقالاتِ سیاسیہ (حصہ دوم)

مصنف .... مورخِ ملت حضرت مولانا سید محمد میاںؒ

تالیف وتدوین .... ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

باہتمام .... محمد ناصر خان

صفحات 610

اشاعت 2018ء

Maulana Sayyad Hussain Ahmad Madani (R.A.) Ki

Siyasi Diary

Akhbâr wa Afkâr Ki Roshni Mein

(Vol. 7)

Maqâlât-e-Siyasiyyah (Part-2)

By : Maulana Sayyad Muhammad Miya

Compiled by : Dr. Abu Salman Shahjahanpuri

Edition : 2018

Pages : 610

ناشر

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FBD FARID BOOK DEPOT(Pvt.)Ltd.

2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2

Ph.: 011-23289786, 23289159 Fax: 011-23279998

E-mail: faridexport@gmail.com | Website: faridexport.com

Printed at : Farid Enterprises, Delhi-2

عرض ناشر

بحمداللہ، ادارہ فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمیٹڈ) قرآن حکیم، احادیثِ مقدسہ، اسلامی تاریخ، فقہ، تبلیغی، اصلاحی، ادبی اور دیگر علوم وفنون پر اہم کتابوں کی طباعت واشاعت کے لیے پورے عالم اسلام میں مشہور ومقبول ہے۔ ادارہ کی اس نمایاں کامیابی میں اللہ رب العزت کی بے پایاں رحمت ونصرت اور بانی ادارہ خادم قرآن الحاج محمد فرید خاں مرحوم کا دینی وملی خلوص اور دعائیں شامل ہیں جنھوں نے قرآن مجید اور دینی لٹریچر کی اشاعت کو غیر منفعتی تبلیغی مشن کے طور پر جاری کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بانی ادارہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہم مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخِ آزادی علمائے دیوبند کے بے مثال جذبۂ حریت اور جہدِ مسلسل سے روشن ہے۔ حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہم اللہ کے جانشین عظیم مجاہد آزادی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی ذاتِ گرامی اسلامی ہند کی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ زیرِنظر کتاب **''حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری: اخبار وافکار کی روشنی میں''** شیخ الاسلامؒ کی حیات، علمی، دینی وملی خدمات اور وطن کی آزادی میں عدیم المثال قیادت کی مستند ومعتبر دستاویز ہے جسے نامور اسلامی دانشور حضرت مولانا ابوسلمان شاہجہانپوریؒ نے تالیف ومدون کیا ہے۔ **'سلسلۂ مقالاتِ سیاسیہ'** اسی سلسلے کے نہایت اہم مرقعے ہیں جو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے تحریر کردہ نادر سیاسی مقالات کے مجموعے ہیں۔

ادارہ فرید بک ڈپو کو بجا طور پر فخر ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات کے سلسلے میں اکابرین جمعیۃ علماء ہند جانشینِ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہٗ (استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند) اور حضرت مولانا سید محمود اسعد مدنی مدظلہٗ (ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند) کے ارشاد وفرمائش پر ان شاہکار کتابوں کو شائع کرنے کی سعادت ہمیں حاصل ہوئی ہے۔

اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ 'چراغِ مدنی' اسی آب وتاب سے روشن رہے اور دارالعلوم دیوبند و جمعیۃ علماء ہند ملتِ اسلامیہ کی خدمت، حفاظت اور قیادت کی شاہراہ پر پیش رفت کرتے رہیں۔ آمین۔

خادم قرآن

(الحاج) **محمد ناصر خان**

اللهم صل على محمد النبي
الأمي وعلى آله وسلم تسليما

انتساب

حضرت مولانا سیّد محمد ارشد مدنی اب میرے مخدوم زادۂ محترم ہی نہیں، حضرت فدائے ملت نور اللہ مرقدہٗ کے بعد میرے مخدوم اور ملجاو ماوٰی بھی وہی ہیں۔ مجھے ہندوستان پاکستان کی سیاسیات سے کوئی دل چسپی نہیں، لیکن میں اس خانوادۂ مکرم کی اس خصوصیت کو کبھی نہیں بھلا سکتا جس کا ایک ایک فرد صرف اسلام کے لیے جیتا اور مرتا ہے اور جس کی سیاست کی بنیاد الخلق کلہم عیال اللہ کے اُصول پر ہے۔

جمعیت علمائے ہند کی صدارت کے لیے حضرت ممدوح کا انتخاب ایک جماعت کے ضابطے کی کارروائی ہے، جو بھی منتخب کیا جاتا میرے لیے صد لایق احترام ہوتا، لیکن حضرت موصوف کے انتخاب میں میں ہندوستان پاکستان کے علمی، تہذیبی، انسانی اخوت کے خوش گوار تعلقات کے فروغ کے نئے دور کے ظہور کے آثار دیکھ رہا ہوں!

اللہ تعالیٰ وہ وقت جلد لائے۔ آمین

خاک سار

ابوسلمان شاہ جہان پوری

مورخِ ملّت رح

حضرت مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ کو ہمارے بعض دوستوں نے "سید الملت" لکھنا شروع کیا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنی سیرت وخدمات اور ملت کی رہنمائی میں اپنے مساعی جلیلہ کی بنا پر ملت کی سیادت کے منصب پر فائز تھے، لیکن اس سے کسی علم وفن اور عمل کے کسی خاص میدان میں ان کے عمومی امتیاز اور تخصص کا اظہار نہیں ہوتا۔ جیسا کہ شیخ الہندؒ، شیخ الاسلامؒ، مجاہدِ ملتؒ یا فدائے ملتؒ کے خطابات سے برِ اعظم ہند پاکستان کی قومی تاریخ کی ایک عظیم رہنما شخصیت، ملتِ اسلامیہ کی ایک بزرگ اور دینی وعلمی فضیلتوں کی حامل شخصیت، ملتِ اسلامیہ کی ایک صاحب عزیمت اور خدمت گذار و جاں نثار شخصیت اور آخر الذکر سے ذوقِ خدمتِ ملت کے پیکر خاکی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ فدائے ملت کے خطاب پر اس کے صاحب کی سیرت وسوانح اور ذوق خدمتِ ملت پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامہ آں مرحوم کی قامتِ زیبا ہی کے لیے قطع کیا گیا تھا۔

ہمارے ممدوح مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی ملت کی خدمت اور علم وعمل کے میدانوں میں مسلمانوں کی رہنمائی اور ان کی تعلیم وتربیت کے سروسامان کی فکر وسعی میں گزری تھی۔ وہ جیسے بڑے صاحب علم تھے ویسے ہی رجل کار بھی تھے۔ ان کا شمار علمائے دین میں ہونے کے ساتھ اہلِ ہمت میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ علم وعمل کی تقسیم میں وہ عالم زیادہ بڑے تھے اور علوم وفنون کی تقسیم میں مدرس، محدث، مفسر، فقیہ، واعظ، خطیب کے مقابلے میں وہ مصنف زیادہ بڑے تھے۔ ان کی تالیفات وتصنیفات کا دائرہ تذکرہ، سوانح، سیرت، تاریخ ہند، تاریخ اسلام، تاریخ عزیمت دعوت کے موضوعات کو محیط ہے اور علوم وفنون کی تقسیم کے اقسام اول کے دائرے بھی حضرت مرحوم کی تصنیف وتالیف کے مضامین میں شامل ہیں۔ نیز تذکار وسوانح اور سیرت میں بھی تاریخی عنصر جزو غالب ہے گویا کہ ان کے تمام تصنیفی کاموں میں ان کی مورخانہ خصوصیات نمایاں ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اعزاز وخطاب میں ان کی مورخانہ خصوصیت اور خدمت کا اظہار اور اعتراف لازماً ہونا چاہیے تھا۔

اس تجزیے کے نتیجے میں حضرت مرحوم کی جن خصوصیات اور خدمات کا سب سے وسیع دائرہ نمایاں ہوتا ہے اور جسے ان کی ہر قسم کی تحریرات وتصنیفات نے ثابت کیا ہے وہ ان کی تصنیفات کا تاریخی عنصر ہے۔ ان کا یہ تخصص اس امر کا متقاضی ہے کہ اس کا اعتراف کیا جائے اور انھیں کسی ایسے لقب سے ملقب اور ایسے خطاب سے مخاطب کیا جائے جس میں ان کے اس تخصص کا اظہار بھی ہو۔ "مورخِ ملت" کی ترکیب ان کی اس خصوصیات وخدمت کے اعتراف اور احترام کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

الحمد للہ! میں نے حضرت مخدومی کی خصوصیات علمی وعملی کو سمجھنے میں غلطی نہیں کی اور نہ اس کے اعتراف کے اظہار میں میرے قلم نے کوتاہی کی۔ حضرت مرحوم کے لیے "مورخِ ملت" کے اعزازی وتکریمی جملے کا اختیار اور اس کا التزام میری اسی فکر اور عقیدت کا غماز ہے۔

ابو سلمان شاہ جہان پوری

سلسلۂ "مقالاتِ سیاسیہ" نمبر (۴)

متعلق حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری

فہرست مقالات		صفحہ

مقدمہ:

مؤرخِ ملّت مولانا سیّد محمد میاںؒ
اوران کی سیاسی خدمات پر ایک نظر

ہمارے ممدوح مؤرخِ ملّت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ، جن کے ''مقالات سیاسیہ'' کا یہ مجموعہ شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈایری کی ساتویں جلد کے طور پر پیش کیا جارہا ہے، ساداتِ رضویہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو قدیم زمانے سے دیوبند میں آباد ہے۔ حضرت ممدوح کے والد ماجد سیّد منظور محمد کا شجرۂ نسب چالیس واسطوں سے حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے ملتا ہے۔ مولانا سیّد محمد میاںؒ کی پیدایش ۴/ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو محلہ سرائے پیرزادگان دیوبند میں ہوئی۔ ان کا تاریخی نام مظفر میاں ہے۔

مولانا کے والد گرامی محکمۂ انہار میں ملازم تھے اور اہلِ خانہ ساتھ تھے، مختلف مقامات پر تبادلہ ہوتا رہتا تھا، اس لیے مولانا کی ابتدائی تعلیم کسی ایک جگہ اور کسی ایک استاد سے نہ ہوسکی، لیکن اب جب کہ وہ ابتدائی تعلیم سے گزر چکے تھے ضرورت تھی کہ کسی ایک جگہ کسی مدرسے میں ادب وفن کے خاص اساتذہ سے حاصل کی جائے۔ اس فیصلے کے بعد انھوں نے اہل وعیال کو دیوبند بھیج دیا اور نورِ نظر محمد میاںؒ کو دارالعلوم دیوبند میں داخل کرادیا گیا۔ یہ ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے۔ اس واقعے کا دوسرا سرا یہ ہے کہ ۱۹۲۵ء میں ہمارے ممدوح نے تحصیلِ علمی سے فراغت حاصل کرلی۔ ممدوح محترم کے اساتذہ میں مولانا انورشاہ کشمیری، شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب اور مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمہم اللہ اور اس دور کے دیگر نامور ماہرینِ علوم وفنون کے نام شامل ہیں۔

وہ تعلیم سے ابھی فارغ ہوئے ہی تھے کہ بہار کے مشہور مدرسۂ حنفیہ آرہ ضلع

شاہ آباد میں مدرس کی اسامی پر ان کا تقرر ہو گیا۔ تقریباً ساڑھے تین برس مدرسۂ حنفیہ آرہ میں پڑھانے کے بعد مدرسۂ شاہی مراد آباد میں انھیں بہ حیثیت مدرس و مفتی خدمات انجام دینے کا موقع مل گیا۔ مدرسۂ شاہی میں تقرر سے وہ دیوبند سے بھی قریب ہو گئے۔ یہاں کا ماحول ان کے ذوق کے مطابق اور طبیعت فضا سے آشنا تھی۔

مدرسے میں درس و افتا کے ساتھ مورخ ملّتؒ نے عملی سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ پہلے وہ جمعیت علماے مراد آباد کے نائب ناظم بنائے گئے، پھر انھیں ناظم کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ تحریک سول نافرمانی میں وہ جمعیت علماے ہند کے نویں ڈکٹیٹر تھے، گرفتار کیے گئے۔ اسی ذوق و منصب اور گرفتاری نے کانگریس کے حلقے میں ان کا تعارف اور رسوخ پیدا کر دیا۔ ان کے لیے یہ دونوں حلقے خدمت کا ایک ہی میدان تھا۔ انھوں نے اپنی سیاسی جدوجہد اور بے لوث خدمتِ خلق کی بہ دولت حریت پسند اور قوم پرور حلقے میں بھی مقبولیت کا ایک مقام پیدا کر لیا۔

مراد آباد کے زمانۂ قیام میں ان کی خدمات کے نہایت واضح تین دایرے تھے۔ تعلیم و تدریس اور افتا کے میدان میں وہ نہایت مستعد مدرس اور اچھے مفتی تھے۔ قومی اور ملّی خدمت کے میدان میں وہ ایک اچھے کارکن تھے۔ انھوں نے نائب ناظم اور ناظم کی حیثیت سے اپنی صلاحیت کو ثابت کر دیا تھا اور اب اونچے مناصب کے لیے فتح مندی کا دروازہ کھل چکا تھا۔ ان کی خدمات کا تیسرا میدان تصنیف و تالیف کا تھا۔ ان کی علمی قابلیت کے واقعی اندازہ شناس تو بہت کم لوگ تھے، لیکن ان کے شوقِ علمی کی دھوم پورے شہر میں مچی تھی۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے انھیں ازراہِ تفنن حیوانِ کاتب کہا تھا اور پورے حلقے میں ان کے اس لقب کی شہرت ہو گئی تھی۔ مولانا سید حامد میاںؒ لکھتے ہیں:

''مصروفیات کے باوجود ہر وقت لکھتے رہنے کی وجہ سے حضرت اقدس مدنیؒ نے انھیں ایک دفعہ ''حیوان کاتب'' فرمایا۔ منطق میں انسان کی تعریف میں کہ وہ کیا ہے؟ حیوان ناطق کہا جاتا ہے۔ آپ (حضرت مدنیؒ) نے اسے ازراہِ تلطف والد صاحبؒ کے لیے بدل کر ''حیوان کاتب'' فرمایا۔''

مؤرخِ ملّت مولانا سیّد محمد میاں علیہ الرحمہ نے حصہ تو سیاست میں بھی لیا اور پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ لیا، وہ مسند آرائے درس و تدریسِ علوم وفنون بھی رہے، وہ ایک مستند عالم دین تھے۔ مفسر، محدث اور مفتی تھے اور خطیب ومقرر بھی تھے، لیکن ان کا اصلی میدان تصنیف وتالیف تھا۔ ان کی شخصیت کے اصل جوہر قلم وقرطاس کی صحبتوں میں کھلے ہیں۔ وہ اپنی تمام حیثیتوں میں مصنف سب سے بڑے تھے۔ ان کی تصنیفات مختلف علوم وفنون میں ہیں۔ کسی علم وفن میں ان کی کوئی تصنیف اٹھا کر دیکھیے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذوق کو سب سے زیادہ مناسبت اسی فن سے ہے۔ تاریخ اسلام، تذکارِ بزرگانِ دین، تعلیم، سیرت وسوانح، فقہ وافتا، تاریخ آزادی و تحریکات سیاسی، تفسیر میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے افادات کی تالیف وتشریح سے لے کر افسانہ نویسی تک انھوں نے بے شمار موضوعات پر اور مختلف فنون میں کم و بیش ان کی ضخیم تالیفات ومختصر رسالہ جات تقریباً پچاس اور سیکڑوں چھوٹے بڑے مقالات اور دیگر تحریرات یادگار ہیں اور ہر دایرۂ فن کی تحریرات میں انھوں نے مقاصد کی بلندی، خیالات کی اہمیت، مطالب کی افادیت، مباحث کی جامعیت، فکر کی معنویت، مطالعے کی وسعت، تحریر کی سلاست اور بیان کی شگفتگی کا نقش بٹھا دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی سیاسی تالیفات وتحریرات اپنی کمیت اور کیفیت، ہر دو لحاظ سے تاریخ سیاسیاتِ ہند پاکستان کے لٹریچر میں اپنی مثال نہیں رکھتیں۔

مورخ ملّت مولانا سیّد محمد میاںؒ نے مراد آباد کے قیام کے زمانے میں تصنیف وتالیف کا ایک منصوبہ بنایا تھا اور اس پر کام بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ منصوبہ دو حصوں میں منقسم تھا۔

منصوبے کا پہلا حصہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کی دعوتِ احیاے اسلام واصلاحِ ملّت سے شروع ہو کر ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی اور اس کی ناکامی کے بعد ہندوستان کی تباہی اور ہنگامۂ دار وگیر کے تذکرے پر ختم ہوتا ہے۔ یہ حصہ گویا کہ علماے متاخرین اور متوسلین کی تاریخِ عزیمتِ دعوت ہے۔

منصوبے کا دوسرا حصہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کی تاریخ سے شروع ہو کر

تحریکِ آزادیٔ وطن کی کامیابی (۱۹۴۷ء) پر ختم ہوتا ہے۔ یہ حصہ علماے حال کی اصلاح ملّت میں فداکاریوں اور حریت وطن کے لیے ان کی قربانیوں اور جاں بازیوں کی تاریخ ہے۔

حضرت مورخِ ملّتؒ نے منصوبے کا پہلا حصہ ''علماے ہند کا شان دار ماضی'' کے عنوان سے چار جلدوں میں مرتب کیا تھا، جب کہ منصوبے کا دوسرا حصہ ''علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

علماے ہند کا شان دار ماضی:

شان دار ماضی کی پہلی جلد جو ''حضرت مجدد الف ثانیؒ'' اور ان کے خلفا اور ان کے اصلاحی کارناموں کے تذکرے میں ہے، ۱۹۳۹ء میں چھپ بھی گئی تھی اور اگرچہ اس کا تعلق وقت کی کسی انقلابی اور اصلاحی تحریک سے ہرگز نہ تھا لیکن ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت اسے خطرناک سمجھا گیا، اسے ضبط کرلیا گیا، ساتھ ہی اس کے مصنف کو بھی چند دن کے لیے حوالات جانا پڑا۔ مصنف کی تو ضمانت پر رہائی ہوگئی لیکن جمعیت علما کے احتجاج اور ضبطی کے خلاف مقدمہ کے باوجود کتاب کی ضبطی کا حکم واپس نہیں لیا گیا۔

دوسری جلد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حالات و افکار کے تذکرے سے شروع ہوکر، ان کے ابناے عظیم کی خدمات کے تذکرے کے بعد سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریکِ عزیمتِ دعوت کے حادثۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) پر ختم ہوجاتی ہے۔

تیسری جلد علماے صادق پور کے ایثار و عزیمت کی داستان کی تفصیل اور اس کے اطراف کے تذکرے میں ہے۔

چوتھی جلد ۱۸۵۷ء کے حادثہ کبریٰ کے تذکرے کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء کے وقوعہ کے پس منظر، براعظم ہند پاکستان کے دور دراز گوشوں تک حادثے کی تفصیلات، مجاہدین آزادی کی شکست، ہنگامۂ دار و گیر اور انتقام کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

شان دار ماضی کی چاروں جلدیں ۲۵ر اپریل ۱۹۳۹ء تک مکمل ہو گئیں تھیں۔ اگر چہ ان میں ترمیم و اصلاح کا عمل بعد تک ہوتا رہا، اس کے بعد ملک کے سیاسی حالات روز بہ روز ایسے سنگین اور پے چیدہ ہوتے گئے کہ اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ ۱۹۵۳ء میں تحریک آزادی ہند کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور ڈاکٹر سید محمود مرحوم کمیٹی کے چیرمین مقرر ہوئے تو حضرت مورخ ملتؒ نے اس کے مسودات کو تلاش کیا اور اشاعت کا سروسامان کیا گیا۔ جولائی ۱۹۵۷ء میں اشاعت عمل میں آئی، لیکن اس کی اشاعت کا تعلق حکومت کی مقررہ کمیٹی یا اس کے کسی تعاون سے کچھ نہ تھا۔ فروری ۱۹۵۹ء تک اس کی چاروں جلدیں شایع ہو گئیں۔

علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے:

منصوبے کا دوسرا حصہ جو علماے حق کے مجاہدانہ کارنامے کے عنوان سے دو جلدوں مرتب کیا گیا تھا۔ اس کی پہلی جلد ۲۲ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو مکمل ہوئی تھی اس میں جنگ عظیم دوم کے آغاز سے پہلے کے حالات، تحریکات اور رجالِ کار کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے اور جلد دوم جنگ عظیم ثانی کے آغاز اور اس کی تباہ کاریوں کے تذکرے سے لے کر گاندھی جی کے قتل (۱۹۴۸ء) اور حالات مابعد پر تبصرے کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ اس کی پہلی جلد کی اشاعت اوّل کتب خانۂ فخریہ - مراد آباد سے اور دوسری اشاعت الجمعیۃ بک ڈپو - نئی دہلی سے عمل میں آئی تھی۔ دوسری جلد کی اشاعت ۱۹۵۷ء کے بعد ہوئی تھی۔

مورخ ملتؒ کے یہ دونوں تصنیفی کارنامے مراد آباد کے قیام کی یادگار ہیں۔

جمعیت علما کیا ہے؟

اسی زمانے کا ایک اہم اور مفید کام جو حضرت مورخ ملتؒ نے انجام دیا، دو حصوں میں چند ضمیموں کے ساتھ ''جمعیت علماے کیا ہے؟'' کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ سلسلہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ایما پر مورخ ملتؒ نے تالیف کیا تھا۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۴۵ء میں مرکزی ایجس لیٹو اسمبلی کے انتخاب کے

موقع پر شایع ہوئی تھی یہ جلد جمعیت علما کی اسلامی اور سیاسی خدمات کے تعارف میں ہے۔ اس کا دوسرا حصہ جنوری ۱۹۴۶ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات سے قبل شایع کیا گیا تھا۔ اس کے چند ضمیمے بھی تھے، جن میں ان سے قبل و بعد کے اجلاسوں کی اہم تجاویز مرتب کردی گئی ہیں۔

جمعیت علما کیا ہے؟ حصہ دوم کے ساتھ جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاس مورخہ ۱۳ر تا ۱۵ر مارچ ۱۹۴۷ء: مرکز یہ جمعیت علماے ہند کے خصوصی اجلاس منعقدہ لکھنؤ مورخہ ۹ر تا ۱۱ر مئی ۱۹۴۷ء اور مجلس عاملہ جمعیت علماے ہند کے اجلاس مورخہ ۲۴، ۲۵ر جون ۱۹۴۷ء کی تجاویز مرتبہ مولانا سید محمد میاںؒ بہت قیمتی اضافہ ہیں۔

خدمات جمعیت علماے ہند:

چار حصوں میں جمعیت علماے ہند کی خدمات کا تعارف:

حصہ اول: جمعیت علماے ہند کی بنیادی خدمات، نومبر ۱۹۵۲ء، شعبۂ نشر و اشاعت جمعیت علماے ہند۔ نئی دہلی، صفحات ۳۰

حصۂ دوم: جمعیت علماے ہند کی امدادی خدمات، اکتوبر ۱۹۶۲ء، شعبۂ نشر و اشاعت جمعیت علماے ہند۔ نئی دہلی، صفحات ۸۰۔

حصۂ سوم: جمعیت علماے ہند کی تعمیری خدمات، اکتوبر ۱۹۶۲ء، شعبۂ نشر و اشاعت جمعیت علماے ہند۔ نئی دہلی، صفحات ۱۸

حصۂ چہارم: مجاہد ملتؒ کی تاریخی تقریریں: الجمعیۃ بک ڈپو۔ نئی دہلی، صفحات ۱۹۲

تحریک شیخ الہندؒ:

دہلی کے زمانۂ قیام کی چند اور کتب بھی یادگار ہیں۔ ان میں ایک کتاب تحریکِ شیخ الہندؒ ہے، یہ تحریکِ ریشمی رومال کا دوسرا نام ہے۔

۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے ایک منصوبے کے تحت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو کابل بھیجا تھا اور خود حجاز تشریف لے گئے تھے۔ یہ دونوں سفر ایک ہی مقصد کے تحت تھے۔ پیش نظر یہ تھا کہ برطانیہ عالمی جنگ میں پھنسا ہوا ہے اور ہندوستان میں اس کی

کوئی خاص فوجی قوت موجود نہیں ہے، اس موقع پر ترکی اور افغانستان کی مدد سے اگر ہندوستان پر حملہ کیا جائے اور اندرونِ ملک بغاوت کردی جائے تو ہندوستان سے برطانوی اقتدار کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔ مولانا سندھیؒ کے کابل پہنچنے سے دس روز قبل ہندوستان کے انقلابی راجہ مہندر پرتاب اور برکت اللہ بھوپالی جرمنی اور ترکی کے نمایندوں پر مشتمل ایک مشن لے کر کابل پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی اسی مقصد سے کابل پہنچے تھے کہ وقت کے سیاسی حالات اور عالمی تناظر میں ہندوستان کی آزادی کے لیے کوئی راہ نکالی جائے۔ انھوں نے ۱۹۱۶ء کے آغاز میں ہندوستان کی عارضی حکومت بھی قایم کرلی۔ مولانا سندھیؒ عارضی حکومت کے قیام کے مشورے میں شریک نہیں تھے لیکن ہندوستان کے ترکی جرمن مشن کے ارکان اور حکومت کے بانیان نے ان کی اہمیت اور کابل کے اونچے حلقے میں ان کے رسوخ کو دیکھ کر عارضی حکومت میں شامل ہونے کی انھیں پیش کش کی اور انھوں نے اس پیش کش کو قبول کرلیا۔ وہ حکومت میں وزیر داخلہ بنالیے گئے۔ اسی زمانے میں مولانا سندھیؒ نے مسلم سالویشن آرمی یا جنودِ ربانیہ کا منصوبہ بنایا تھا۔ مولانا سندھیؒ نے ہندوستان کی عارضی حکومت کے قیام اور مسلم سالویشن آرمی کے منصوبے اور دیگر حالات سے اپنے استاد اور سیاسی مربی مولانا محمود حسنؒ کو مطلع کرنا چاہا اور ریشمی کپڑے کے دو ٹکڑوں پر خوش خط لکھ کر عبدالحق نامی ایک شخص کے ہاتھ سندھ کے ایک نو مسلم سیاسی رہنما شیخ عبدالرحیم (حیدرآباد۔ سندھ) کو بھیجے اور ہدایت کی کہ وہ ان خطوط (ریشمی کپڑے پر لکھے ہوئے) کو کسی ذریعے سے مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کو (جو بعد میں شیخ الہندؒ کے لقب سے ملقب و مشہور ہوئے) حجاز پہنچادیں لیکن یہ خطوط شیخ صاحب تک پہنچنے سے پہلے ہی حکومت کے ہاتھ لگ گئے۔ ہندوستان میں ان خطوط سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں سلسلۂ دارو گیر شروع ہوگیا۔

اسی طرح حضرت شیخ الہندؒ حجاز پہنچے تو انھوں نے وہاں اپنی کوششیں شروع کردیں۔ گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کی، ان کا اعتماد حاصل کیا اور ان سے اپنی تحریک کے بارے میں ایک تحریر حاصل کی، جو غالب نامہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

ترکی زعما کے نام ان کے اعتماد اور ملاقات کے لیے خطوط حاصل کیے اور اس تعارف کے ذریعے مدینۂ منورہ میں انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں، آزادی ہند کے منصوبے پر ان سے مشورے کیے اور ان سے کئی دستاویز حاصل کیے۔ لیکن یہ تمام باتیں راز نہ رہ سکیں۔ حجاز میں حسین شریفِ مکہ کی ترکی خلافت سے بغاوت نے حالات کو اور پیچیدہ بنا دیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا کو گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ ہندوستان میں بھی تحریک کے کارکنوں اور دیگر افراد کے لیے پریشان کن حالات پیدا ہو گئے۔ اور بساطِ سیاست کا پانسہ یک سر پلٹ گیا۔

حکومت ہند کو کابل اور حجاز میں تحریکِ آزادیِ ہند کی کوششوں کے بارے میں اطلاعات ملی تھیں پھر خطوط، تحریرات اور وثائق بھی ہاتھ لگ گئے۔ ان کی بنیاد پر ایک مقدمہ تیار کیا گیا، اس میں استغاثے کے بڑے ملزم مولانا عبیداللہ سندھیؒ تھے اور ان کے انسٹھ شریک ملزمان تھے۔ اس کے ثبوت میں مولانا سندھیؒ کے خطوط، غالب نامہ اور دیگر تحریرات شامل تھیں۔ استغاثے کے ساتھ تقریباً دو سو بیس افراد کے بارے میں بعض ضروری معلومات اور تعارف میں ایک ڈائریکٹری بھی تھی جو انٹیلی جنس نے اپنی ضرورت اور سہولت کی خاطر تیار کر کے شامل کر دی تھی۔ اگر چہ ریشمی رومال سازش کیس باقاعدہ چلانے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن کیس تیار کر لیا گیا تھا۔

یہ تمام کاغذات انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ تھے، جو کسی ذریعے سے مورخ ملت مولانا سیّد محمد میاںؒ کو حاصل ہو گئے۔ انھوں نے اس تمام مواد کو مرتب کر کے چھپوا دیا تھا۔ اس کے ساتھ چند بیرونی تحریریں بھی شامل ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:

① پیش لفظ: از قلم حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی (وفات ٦ر فروری ٢٠٠٦ء)
صفحہ ١٥ تا ٢٤

② تعارف: از قلم حضرت مولانا سیّد محمد میاںؒ (وفات ٢٤ر اکتوبر ١٩٧٥ء)
صفحہ ٢٥ تا ١٦٤۔ مورخِ ملتؒ نے اس تحریک کے پس منظر، اس کے نشو ونما اور فروغ کی تفصیلات، حضرت شیخ الہند کے منصوبے کی تفصیلات، استغاثے کے ساتھ شامل مواد • انٹیلی جنس کی حقیقت تک نارسائی، استغاثے کے ساتھ شامل مواد کی حیثیت اور

استغاثے کی تالیف میں اہم غلطیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔

(۳) کتاب کے شروع میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ (وفات ۲۱ راگست ۱۹۴۴ء) کا ایک اہم مضمون "شاہ ولی اللہؒ اور ان کی تحریک" بہ طور پیش لفظ شامل کیا ہے۔ یہ مضمون ولی اللٰہی تحریک کو دارالعلوم دیوبند کی تحریک سے اس مقام پر جوڑ دیتا ہے جہاں سے مولانا سیّد اسعد مدنیؒ نے اپنے پیش لفظ کا آغاز کیا تھا۔ اس طرح ریشمی رومال تحریک کو تاریخ کا دو سو سالہ پس منظر مل جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ تحریک شیخ الہندؒ کا ظہور دو سو سالہ تاریخ کے واقعات اور تحریکِ ولی اللٰہی کا لازمی تسلسل ہے۔ تاریخ کے اس سفر میں نشیب و فراز، مشکلات اور آزمائشیں ضرور پیش آئیں، لیکن کوئی پیچ و خم نہیں، جس میں مقصد کبھی دھندلا گیا ہو یا منزل کبھی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہو۔

"تحریکِ شیخ الہندؒ" کی ہندوستان اور پاکستان میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ دہلی میں ایوانِ صدر میں اس کا افتتاح ہوا۔ پانچ ہزار اہل علم و دانش اور حکومت کے وزرا، ارکانِ اسمبلی کو دعوت دی گئی۔ ہندوستان کے وزیر اعظم اور فخر الدین علی احمد نے، جو اس وقت جمہوریۂ ہند کے صدر تھے، اس کے افتتاح میں بہ ذات خود دلچسپی لی اور ایک سابق صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے مقالۂ افتتاحیہ پیش کیا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء میں تین مرتبہ جمہوریۂ ہند کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

یہ جلسہ ۵ر جولائی ۱۹۷۵ء کو منعقد ہوا تھا۔ مولانا سیّد محمد میاںؒ کو اس تالیف کی تدوین و اشاعت پر خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ پاکستان کے تین اداروں نے اب تک اس کے پانچ ایڈیشن شایع کیے ہیں۔ تاریخ و سیاست کے مطالعے کا ذوق رکھنے والوں میں یہ کتاب بہت مقبول اور جمعیت علمائے ہند کے بزرگوں کی نیک نامی اور شہرت میں اضافے کا موجب ہوئی۔

اسیران مالٹا:

اسی تحریک کا شاخسانہ تھا کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے چوبیس سال تک جلاوطنی

کی زندگی گزاری اور مارچ ۱۹۳۹ء سے پہلے انھیں اپنے وطن کے ساحل پر قدم رکھنے کی اجازت نہ ملی اور حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا کو دسمبر ۱۹۱۶ء میں گرفتاری کے بعد وسط جون ۱۹۲۰ء تک ساڑھے تین سال وطن سے دوری، اعزہ واحباب کی صحبت و ملاقات سے محرومی، قید کی تکالیف کے بعد وطن لوٹے تھے۔ اگرچہ وطن سے دوری و مہجوری، قید اور واپسی کے سفر کا تذکرہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ''سفرنامۂ اسیر مالٹا'' میں کیا تھا، لیکن جس زمانے میں مذکورہ سفرنامہ شایع ہوا تھا قید بند کے واقعات کی بعض تفصیلات اور تاثرات حالات کی سنگینی اور مصالح وقت کی بنا پر زبانِ قلم پر نہ آسکے تھے یا تشنۂ تفصیل رہ گئے تھے۔ ضرورت تھی کہ سازگار حالات میں ان کی تفصیل بیان کی جائے۔ اسیرانِ مالٹا درحقیقت اسی ضرورت کی تکمیل ہے۔ یہ کتاب مورخ ملت نے اپنی زندگی کے آخری دور میں تالیف فرمائی تھی، لیکن ابھی اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ کتاب کی اشاعت مرحوم کی وفات کے تقریباً آٹھ ماہ بعد ۱۹۷۶ء میں عمل میں آئی۔ اس کا تعارف قاضی سجاد حسین صاحبؒ صدر مدرس مدرسۂ عالیہ فتح پوری - دہلی کے قلم سے یادگار ہے۔ اس کے مضامین کی تفصیل یہ ہے:

مجاہد جلیل:

یہ مختصر رسالہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے حالات زندگی میں ہے۔ ۱۹۴۷ء میں شایع ہوا۔ صفحات ۱۶، ناشر سید احمد میاں مالک کتب خانہ اسلامیہ۔ دیوبند

حیات شیخ الاسلامؒ:

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے سوانح اور سیرت و خدمات میں یہ کتاب حضرتؒ کی حیات میں مرتب کی گئی تھی۔ اسی لیے اس میں حضرت کے آخری دور کے حالات، حضرت کی وفات اور اس حادثۂ فاجعہ کی تفصیلات اور اس پر تاثرات کا ذکر نہیں ہے۔

آنے والے انقلاب کی تصویر:

یہ حضرت مورخ ملتؒ کا ایک تاریخی رسالہ ہے۔ تحریک پاکستان کے شور و ہنگامے میں کسی موقع پر لکھا گیا۔ دو باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں:

① برٹش حکومت کے استحصال کی تاریخ اور استحصال کے ظالمانہ طریقوں اور وقت کی سیاسیات پر تبصرہ۔

② مسلم لیگ کے طرزِ فکر اور اس کے فرقہ پرستانہ اندازِ سیاست پر تنبیہ! جس نے صدیوں کی مشترک سماجی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کو تباہ کر کے سوسائی کو نفرت اور اشتعال کے جذبات سے بھر دیا ہے۔

متفرق سیاسی مقالات:

۱۹۴۵ء میں ان کے دہلی منتقل ہو جانے کے بعد انھوں نے جمعیت علماے ہند کے مقاصد کے تعارف میں اس کی تجاویز اور فیصلوں کی اہمیت کے پیش نظر لیگی پروپیگنڈے کے جواب اور اس کے لیڈروں کی غلط بیانیوں کی تردید میں، حضرت شیخ الاسلامؒ کے دفاع میں، الزامات کے جواب میں، کارکنانِ جمعیت کی رہنمائی کے لیے ہدایات، وقت کے اہم سیاسی مسایل و مباحث میں جمعیت کے نقطۂ نظر اور موقف کی وضاحت کے لیے خاص طور پر مرکزی اسمبلی کے انتخابات کی سرگرمیوں کے آغاز سے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے خاتمے اور اس کے کچھ بعد تک انھوں نے اخبارات میں مضامین، مراسلات اور چودرقوں اور کتابچوں کی شکل میں اتنا لکھا ہے کہ اس کا شمار ممکن نہیں۔ ان میں بہت سے بیانات و مضامین اور کتابچوں کو مقالات سیاسیہ کی زیر نظر جلد میں مستقل رسالے کی حیثیت سے یا ضمیموں کی شکل شامل کر لیا

ہے۔ اس طرح ان سے حال و مستقبل میں استفادے کی راہ ہم وار ہوگئی ہے تا کہ جمعیت علماے ہند کی خصوصیات اور خدمات کا چھوٹے سے چھوٹا نقش بھی محفوظ ہو جائے۔

مودودی صاحب کے ردّ میں:

مورخ ملتؒ کی دو کتابیں سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کے افکار و تحقیقات کے رد میں ہیں:

① ایک کتاب ''شواہد تقدس اور تردید الزامات''، مودودی صاحب کی حضرات عثمان و معاویہ رضی اللہ عنہما پر (کتاب کے) ردّ میں ہے۔

② دوسری کتاب ''دو ضروری مسئلے'' کے عنوان سے مودودی صاحب کے ایک فتوے کے ردّ میں ہے، جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ جو خواتین ہندوستان میں رہ گئی ہیں اور ان کے شوہر پاکستان آگئے ہیں یا خواتین پاکستان آگئی ہیں اور ان کے شوہر ہندوستان میں رہ گئے ہیں اور ان میں سے کوئی اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، ان میں طلاق واقع ہوگئی۔ دوسرا مسئلہ وراثت کے بارے میں ہے۔ مودودی صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ ہندوستان پاکستان کی قومیت رکھنے والوں میں اسلامی وراثت کے اصول پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا سید محمد میاںؒ نے ان دونوں فتوؤں کا رد کیا ہے۔

مولانا محمد اعزاز علیؒ شیخ الادب و الفقہ دار العلوم دیوبند نے ''علماے حق اور مودودیت'' کے عنوان سے اس رسالے ''دو ضروری مسئلے'' پر تقریظ تحریر فرمائی ہے۔

دیگر تصانیف:

میں نے اپنے خاص ذوق کی بنا پر حضرت مورخ ملتؒ کی سیاسی تصنیفات و تالیفات کو اہمیت دی اور انھیں کی ترتیب و تدوین اور تصانیف میں ہمت صرف کی، لیکن خدا نہ خواستہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرتؒ کی دیگر خدمات ناقابل التفات ہیں۔ اسلامی تاریخ اور علوم و فنون کے مختلف موضوعات اور مباحث میں انھوں نے

نہایت عظیم الشان تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ میں یہاں ان کی ایک فہرست مرتب کر دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔

① **مقاماتِ حریری:** ایک درسی کتاب ہے۔ مولانا محمد میاںؒ نے اس کی تعلیقات تحریر فرمائی ہیں جو بہ قول مولانا سید حامد میاں مرحوم کے ثعالبی کی فقہ اللغۃ سے لی گئی ہیں۔ مولانا کی تعلیقات سے اساتذہ و طلبا دونوں کے لیے تدریس و تفہیم میں سہولت پیدا ہو گئی ہے۔

② **نور الایضاح:** فقہ کی ایک درسی کتاب ہے۔ مولانا نے اپنے استاد گرامی مولانا محمد اعزاز علیؒ کی فرمایش پر اس کا ترجمہ و شرح تحریر فرمائی تھی اور مکتبۂ اعزازیہ دیو بند سے شایع ہوئی تھی۔ اس کا پورا نام ''نور الاصباح فی نور الایضاح (اردو)'' ہے۔

③ **صحابۂ کرام کا عہدِ زرّیں:** ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' کے نام سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ایک نہایت اہم اور مشہور تالیف ہے۔ مولانا محمد میاںؒ نے اس کے ترجمہ و تشریح کے لیے قلم اُٹھایا تھا، لیکن مولانا کے حسن ذوق اور شوق تحریر نے اسے بڑے سایز کے ساڑھے سات سو صفحوں کی ایک مستقل اور بلند پایہ تالیف بنا دیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تالیف کا دایرۂ بحث خلفاے راشدین تک محیط تھا، لیکن ہمارے ممدوح مورخ ملّتؒ نے اس دایرے کو صحابۂ کرامؓ کی پوری جماعت پر محیط کر دیا ہے۔ یہ کتاب دہلی اور لاہور سے شایع ہوئی ہے۔

④ **مشکوٰۃ الآثار و مصباح الآثار:** یہ کتاب اخلاقیات میں احادیث مبارکہ کا ایک خوب صورت انتخاب ہے، جو حضرت مولانا محمد میاںؒ کے حسن ترجمہ و تالیف نکات کی بہ دولت ایک ایسی کتاب بن گئی ہے جو ہر گھر کی ضرورت ہے۔ ایک مدت تک بعض مدارس عربیہ کے نصاب درس میں شامل رہی ہے۔

⑤ **دینیات کا نصاب:** آزادی کے بعد شمال مغربی ہندوستان میں مسلمان بچوں کی دینیات کی تعلیم و تربیت کی جو ضرورتیں پیش آئیں، ان میں پہلی جماعت تا آٹھویں جماعت کے طلبا و طالبات کے لیے گیارہ رسایل پر مشتمل ایک سیٹ تیار کیا تھا، جو ایک مدت تک جمعیت علماے ہند کے قایم کردہ سیکڑوں مدارس میں اور دیگر

مدارس میں پڑھایا جاتا رہا اور اب جب کہ مختلف اہل علم واصحاب قلم نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق نصاب تیار کر لیے ہیں، مولانا محمد میاںؒ کے نصاب کی اہمیت برقرار ہے اور پچاسوں مدارس و مکاتب کے نصاب تعلیم میں اب تک شامل ہے۔

⑥ **تاریخ الاسلام:** مسلمان بچوں اور بچیوں کی اسلامی، تاریخی اور اخلاقی و مذہبی تعلیم کے لیے سوال و جواب کی صورت میں مورخ ملتؒ نے تین نمبروں میں تاریخ کا ایک نصاب مرتب کیا تھا۔ یہ نصاب ابتدائی درجات کے طلبا و طالبات کے لیے نہایت مفید تھا۔ اس کی تحریک مولانا کے گرامی مرتبت استاد مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ نے فرمائی تھی اور انھی بزرگ نے اپنے مکتبۂ اعزازیہ۔ دیوبند سے شایع کیا تھا۔

تاریخ الاسلام نمبر۔۱ (مکی زندگی کے حالات) نومبر ۱۹۳۲ء، صفحات ۱۳۲

تاریخ الاسلام نمبر۔۲ (مدنی زندگی کے حالات) دسمبر ۱۹۳۲ء، صفحات ۲۲۳

تاریخ الاسلام نمبر۔۳ (فضایل و عبادات، حلیۂ مبارک، آداب اور روز و شب کے معمولات وغیرہ۔)

نمبر۔۱ کے آخر میں اس سلسلۂ تالیف کی افادیت اور زبان کی صحت اور حسن بیان کے تذکرہ و تعارف میں ان کے استاذ شیخ الادب والفقہؒ کی گرامی قدر رائے بھی شامل ہے۔ صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۳

⑦ حضرت مولانا محمد میاںؒ نے سیرت مبارکہ اور ہمارے پیغمبر کے عنوان سے دو کتابیں سیرت نبوی میں مسلمان بچوں کے لیے تالیف فرمائیں۔ غیر مسلموں کے لیے خاص دعوت کے نقطۂ نظر سے ''محمد رسول اللہ'' تالیف فرمائی۔

⑧ **اسلام اور اسلامی فکر کیا ہے؟:** مولانا سید محمد میاںؒ نے اس کتاب میں صرف اپنے خیالات ہی تالیف نہیں فرمائے بلکہ اس میں مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا محمد عثمان فارقلیطؒ کے نتایج فکر اور رشحات قلم بھی مرتب کر دیے ہیں۔

⑨ **مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم:** مولانا سید محمد میاں مرحوم نے مسلمان بچوں کی تعلیم اور ان کی اخلاقی تربیت کے لیے دینیات، تاریخ اسلام، اخلاقیات کے نصاب ہی مرتب نہیں کر دیے، بلکہ اساتذہ کی رہنمائی کے لیے طریقۂ تعلیم اور مسئلہ تعلیم

کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

(۱۰) مولانا نے ایک نہایت اہم کام یہ انجام دیا ہے کہ زبانی اور درسی تعلیم کے ساتھ بچوں کی تربیت اور اخلاق و تاریخ کے مطالب کو ذہن نشیں کرانے کے لیے رسالت اور خلافت راشدہ کے دور کے بارے میں معلومات کو چارٹوں کی صورت میں مرتب کردیا ہے۔ یہ چارٹ مکتب و مدرسہ میں اور گھروں میں بھی مناسب جگہوں پر آویزاں کیے جاسکتے ہیں۔ ان کی افادیت اس سے بہت زیادہ ہے جس کا ہم تصور کرسکتے ہیں۔

ان کتب و رسایل کے علاوہ مختلف سیاسی دینی، اخلاقی موضوعات میں مورخ ملت مولانا سیّد محمد میاںؒ کی تالیفات و تصنیفات یادگار ہیں۔ جن کے صرف نام درج کیے جاتے ہیں:

اسلام اور انسان کی حفاظت و عزت	ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں
سیاسی و اقتصادی مسایل اور اسلامی تعلیمات	مصالح جمہوریت اور اس کی تعمیر
جمہوریت اپنے آئینے میں	حیاتِ مسلم
چاند، تارے اور آسمان	دین کامل
رحمۃ للعالمین اور سیاسی انقلاب	پانی پت اور بزرگان پانی پت
دورِ جدید کی ہندوستانی سیاست اور مسلم علما کا کردار	اسلامی تقریبات چہل حدیث وغیرہما

حضرت مورخ ملتؒ کی فتویٰ نویسی:

دینی مسایل کی تحقیق اور زندگی میں ان کی رہنمائی سے حضرت مرحوم کو خاص دل چسپی تھی، اسی ذوق کا نتیجہ تھا کہ مدرسۂ شاہی مرادآباد میں جوں ہی انھوں نے فضا کو سازگار پایا شعبۂ افتا کا آغاز کردیا۔ ۱۹۲۸ء تک مدرسۂ شاہی میں اس شعبے کا وجود نہ تھا۔ اگر کبھی کوئی استفتا آتا تو اس کا جواب ضرور دے دیا جاتا، لیکن فتوؤں کا ریکارڈ رکھنے کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ مولانا سیّد محمد میاںؒ نے اس کا خاص اہتمام کیا۔ مولانا کے ذوق و توجہ عالی سے شعبۂ افتا کی تاسیس کا عمل انجام پایا اور بعض بہت اہم فتوؤں کا اجرا ہوا۔

حضرت مولاناؒ کا ایک فتویٰ جس کی اہمیت کا تعلق صرف اس کے مضمون اور موضوع ہی سے نہیں بلکہ اس کی تحقیق کے معیار، دلایل کی پختگی اور اس کے حسنِ اطلاق سے بھی ہے۔ یہ فتویٰ زیرِ نظر مجموعۂ مقالات میں شامل ہے۔ اس کے بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ قارئین کرام بہ یک نظر اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

۱۹۴۵ء کے بعد مرکزیہ جمعیت علماے ہند سے تعلق کے زمانے میں بھی ان کا یہ شوق قایم رہا۔ اس زمانے میں مولانا نے بہت سے فتوے لکھے جو مستفتیین کو بھیج دیے جاتے اور بعض الجمعیۃ میں شایع کر دیے جاتے تھے۔ لیکن ستر کی دھائی میں جب وہ مدرسۂ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث اور مفتی مقرر کیے گئے تو انھوں نے شعبۂ افتا کی تجدید اور فتویٰ نویسی کے عمل کے احیا پر خاص توجہ فرمائی اور حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ کے انتقال کے بعد شعبۂ افتا کی خدمات میں جو خلل پیدا ہو گیا تھا اسے دور کر دیا۔ مولانا سید محمد میاںؒ کی یہ بہت بڑی علمی دینی خدمت ہے، اس کا ایک پہلو سیاسی بھی ہے اور اس سے جمعیت علماے ہند کی ایک اہم خصوصیت پر روشنی بھی پڑتی ہے۔

مولانا سید حامد میاں صاحبؒ نے مولاناؒ کے فتووں کی جمع و ترتیب کی اہمیت اور ضرورت پر توجہ دلائی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''افتا کا کام جو مراد آباد میں اور مدرسۂ امینیہ میں انجام دیا ہے، نیز نظامتِ جمعیت کے دوران بھی جو فتاویٰ تحریر کیے ہیں، وہ اگر کبھی جمع کیے گئے تو یہ بھی ان کے علمی کام کا ذخیرہ ہوگا۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ عمل خیر انجام پا جائے تو حضرت مولاناؒ کی خدمات کا ایک اہم پہلو سامنے آئے گا اور ایک علمی دینی اور سیاسی خدمت انجام پائے گی۔

جمعیت علماے ہند سے وابستگی:

اگرچہ خاک سار کا موضوع حضرت مورخ ملتؒ کی سیاسی تصنیفات اور عملی خدمات ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار تو نہیں کیا سکتا کہ انھوں نے ۱۹۲۵ء سے

۱۹۴۵ء تک اپنی عمر عزیز کے کامل بیس برس تعلیم و تدریس کی دنیا میں گزارے تھے۔ اسی میں ان کا ذوق پختہ اور علوم و فنون اسلامی میں رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ کسی ایسے شخص کا اچانک اس کے مقام سے الگ اور بے تعلق کر دیا جانا ایک حادثہ ہی ہو سکتا ہے، لیکن زندگی میں ایسے حوادث بھی پیش آتے ہیں کہ زندگی کی عزیز متاع اور شوق کو بھی قربان کر دینا پڑتا ہے۔ یہ بات مولانا کی عزیمت اور ذوق ایثار کا ثبوت ہے۔ جب ملّی مفاد کا تقاضا ہوا اور خدمت کے ایک نئے میدان میں ان کی قابلیت کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے پورے انشراحِ قلب کے ساتھ کمالِ ایثار کا ثبوت دیا اور ایک مدت تک اس چھوڑی ہوئی دنیا کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

جمعیت علماے ہند کے مرکزی ناظم کا عہدہ قبول کر کے مولانا سید محمد میاںؒ نے اپنے آپ کو آزمایشوں کے حوالے کر دیا تھا۔ ایک آل انڈیا جماعت جو نہایت ذمہ دار، حساس اور سرگرم ہو، جس کی سیکڑوں شاخیں ملک کے دور دراز علاقوں پر پھیلی ہوئی ہوں، جس کے ہزاروں کارکن اور رہنما ملت اور قوم و وطن کی خدمت کے کاموں میں مصروف ہوں، بیسیوں قومی و ملّی جماعتوں میں جسے مرکزیت حاصل ہو اور ان کے رہنماؤں سے رابطے کی ضرورتیں ہوں اور ہر سطح پر ذاتی ذوق، دلچسپی اور تعلقات کا تقاضا ہو، ایک ناظم کی ذمہ داریوں اور اس کی مشکلات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا سید محمد میاںؒ نے اپنے ذوقِ خدمت کو اور اپنی صلاحیتوں اور فکر و عمل کی قابلیتوں کو کسوٹی کے حوالے کر دیا تھا۔ جس کے کھرے کھوٹے نکلنے پر ایک عالم کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن ان کی ذمہ داریوں کی حد اور آزمایش کا سلسلہ اسی مقام پر ختم کہاں ہو جاتا تھا؟ یہ تو آغاز تھا، اس سے آگے بھی سخت مرحلے اور جانِ نحیف و نزار کے لیے قدم قدم پر آزمایش تھیں۔

جمعیت مرکزیہ اور شاخوں کے درمیان مراسلت کے ذریعے رابطہ، فیصلوں کی اطلاع، ہدایات کا اجرا، مجالس شوریٰ و عاملہ کے اجلاسوں کی تیاری اور ایجنڈے کی ترتیب سے لے کر جلسوں کی رودادوں اور اعلامیوں کی تالیف و اجرا اور شاخوں تک ان کے فیصلوں کی اطلاعات کی ذمہ داریاں، جلسوں میں شرکت، واقعات و حوادث کی

تحقیقات کے لیے کمیٹیوں کی تشکیل، رپورٹوں کی تیاری، ریلیف کے انتظامات، ضرورت مندوں سے ملاقاتیں، پورے ملک سے آئے ہوئے خطوط کے ذریعے حالات و مسایل پر نظر، سوالات کے جوابات اور مراسلت کے ذریعے رہنمائی، ایک بڑی ذمہ داری اخبارات کے مطالعے کے ذریعے حالات اور رفتار سیاست پر نظر رکھنے کی تھی اور پھر حالات اور خبروں کے مطابق وضاحت، صفائی، دفاع، انکار، تردید، تبصرہ، تنقید جو بھی وقت کا تقاضا ہو اس کا بروقت اور برمحل اقدام و انتظام کی صدر اور ناظم اعلیٰ سے زیادہ فکر بھی۔ اپنے فرایض کے ساتھ دوسرون کے کاموں کی نگرانی اور جواب دہی کا خیال اور اچانک پیش آجانے والے حوادث و واقعات اور ان کے تقاضے۔ صبح سے شام تک کاموں کا ایک لامتناہی سلسلہ اور کبھی نہ ختم ہونے والی مصروفیات تھیں اور حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کی تنہا جان ناتواں! لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں کاموں کی انجام دہی کا ایسا سلیقہ اور ہمت عطا فرمائی تھی کہ ہر کام بروقت اور حسن وخوبی کے ساتھ انجام پا رہا تھا۔

میں نے مولانا کے تیس سالہ شوقِ تصنیف و تالیف کا ذکر نہیں کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تیز رفتاری سے نہ سہی آہستہ آہستہ وہ بھی پورا ہو رہا تھا۔ اور اگر اس میں جمعیت کی ضرورتوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر رفتار کی آہستگی کا عذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس چیز کو بھی نظر انداز نہ کر دینا چاہیے کہ مولانا ۱۹۴۵ء کے میں سہارن پور کے اجلاس کے کاموں سے فارغ ہو کر دہلی تشریف لے گئے تھے اور ۱۹۴۷ء کے آخر تک جو وقت آیا تھا اس میں ہر صبح و شام کو ان کی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں میں اضافہ ہوتا رہا تھا اور آخر میں تو یہ اہتمام اتنا بڑھ گیا تھا کہ جب وہ جمعیت کے دفتر سے نکلتے تو جان کو پہلے اپنی ہتھیلی پر رکھ لیتے تھے۔ اس دور میں جان سے بے نیازی اور خدا پر بھروسے کی کیفیت کے بیان کے لیے کوئی مثال پیش کی جاسکتی ہے تو سیرتِ نبوی کے اس واقعے میں کہ ایک سیر کے موقع پر کہ فضا خطرات سے بوجھل تھی، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اپنی تلوار کو درخت کی ایک شاخ میں لٹکا کے خنک سایے میں لیٹ کر سو گئے تھے اور ایک دشمن نے موقع پا کر پہلے تلوار پر قبضہ

کیا پھر آپ کو متوجہ کیا کہ بتاؤ! اب تمھیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ صاحب مقامِ نبوت علیہ السلام کا جواب قارئین کو معلوم ہے۔ ہمارے ممدوح مولانا سید محمد میاںؒ کا اطمینان اور بے خوفی اسی پیغمبرانہ سیرت سے مستفاد تھی۔ میں اس موقع پر اتنا اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس خوبی میں جمعیت علمائے ہند کے تمام اکابر واصاغر سیرت نبوی کے اسی عشق سے سرشار تھے۔ قاضی سجاد حسین صاحبؒ لکھتے ہیں.

''۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں جب کہ ہندوستان ایک جہنم کدہ بنا ہوا تھا اور مظلوموں کی چیخ پکار سے اہلِ ہند کے دل دہل رہے تھے، مولانا نے انتہائی استقامت کے ساتھ مظلوموں کی مدد کی۔ جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم و ستم ہوا، مولانا بے دھڑک وہاں ریلیف اور امداد کے لیے پہنچے۔ پنجاب کے خوں چکاں واقعات کے بعد جب کہ مسلمانوں کے کچھ افراد پنجاب اور ہماچل کی دور دراز آبادیوں میں اکا دکا رہ گئے تھے، مولانا نے پنجاب کے دیہات کے دورے کیے۔ ہماچل کے پہاڑوں میں پھیلے ہوئے دیہات میں دشوار گزار راستے طے کر کے پہنچے اور وہاں ان کے زخموں پر مرہم رکھا اور ان کے دین و ایمان کے تحفظ کے لیے مکاتب اور مدارس قایم کیے۔'' (تعارف ''اسیرانِ مالٹا''؛ دہلی، ۱۹۷٦ء، صفحہ د)

۱۹۴۷ء میں مصیبت زدگان اور کشتہ گانِ ستم کی امداد اور دادرسی کے بارے میں مولانا سید حامد میاں صاحبؒ اپنے والد گرامی پر مضمون میں لکھتے ہیں:

''۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے بعد فرقہ واریت کے وہ ہنگامے شروع ہو گئے جو آج تک ختم نہیں ہوئے، ان کی داستان طویل بھی ہے اور دردناک بھی۔ ان ہنگاموں نے خدمات کا ایک نیا باب قایم کیا، جس کا عنوان ریلیف ہے۔ یعنی کشتہ گانِ ستم کو دفنانا، مجروحین کے جسم پر دوا کی پٹیاں باندھنا اور زخمی دلوں پر تسکین اور دل داری کا مرہم لگانا، اجڑے ہوؤں کو بسانا، مشرقی پنجاب اور ہماچل میں مسلمان ہندوانہ وضع یا سکھوں کی وضع اختیار کر کے زندگی گزار رہے تھے۔ جہاں تباہ شدہ مسلمانوں کی تعداد ایک فی ہزار . .

گئی تھی۔ جمعیت علماے ہند کے حضرات نے وہاں دورے کیے، حوصلے دلائے، شبینہ مکاتب شروع کیے۔ مسلمان جو چھپے ہوئے تھے برآمد ہونے لگے۔"

وہ ادارے جن سے مولانا کا تعلق رہا:

زندگی میں ہمارے ممدوح مورخ ملت مولانا سید محمد میاںؒ کا مختلف قسم کے متعدد اداروں سے تعلق رہا۔ پہلا ادارہ جس سے ان کا تعلق پیدا ہوا دارالعلوم دیوبند کا تھا۔ اس کی تعلیمی فضاؤں میں انھوں نے تعلیم کے مراحل طے کیے تھے۔ اس کے نام ور اور نیک سیرت اور فاضل اساتذہ نے ان کی تعلیم و تربیت میں حصہ لیا تھا اور ان کی تشکیل سیرت اور تہذیبِ اخلاق سے ان کی شخصیت کو آراستہ و پیراستہ کیا تھا۔ مولانا کی شخصیت اور سیرت پر ان بلند پایہ اساتذہ کا بہت گہرا اثر تھا، وہ زندگی کے ہر دور میں ان کے شکر گذار رہے۔ آخر میں انھوں نے دارالعلوم کی خدمات میں بھی حصہ لیا، جب کہ وہ اس کی شوریٰ کے رکن منتخب کیے گئے۔ مولانا نے اپنے اوپر اس کا قرض چکانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

دوسرا ادارہ آرہ (بہار) کا مدرسۂ حنفیہ تھا، جس میں مولانا نے اپنی جوان عمری کے ساڑھے تین برس گزارے تھے۔ مولانا کو وہ مدرسہ، اس کے منتظمین اور جن اساتذہ کے ساتھ انھوں نے درس و تدریس کی خدمات انجام دی تھیں، ہمیشہ یاد رہے اور ان سے لطف و محبت کا رشتہ قایم رہا۔

تیسرا ادارہ مرادآباد کا مدرسۂ شاہی تھا۔ اس میں مولانا نے اپنی زندگی کے سولہ قیمتی سال گزارے تھے اور اگر حالات کے نئے تقاضے پیدا نہ ہوتے تو وہ اپنی قناعت پسند طبیعت کے مطابق اپنی پوری زندگی مدرسۂ شاہی میں گزار دیتے۔ مولانا کو مدرسے کی علمی، سیاسی، تعلیمی فضا بہت پسند تھی اور مرادآباد کی معاشرتی زندگی اور سیاسی ماحول سے مانوس ہو گئے تھے اور اس میں انھوں نے اپنے لیے عزت کا مقام پیدا کر لیا تھا۔

۱۹۵۵ء میں مدرسۂ شاہی کے مہتمم مولانا عبدالحق مدنیؒ کے انتقال کے بعد

مدرسے کو ایک مخلص، انتظام کے ماہر اور عالم دین مہتمم کی ضرورت پیش آئی تو ارباب بست و کشاد کی نظر مولانا سید محمد میاںؒ پر پڑی، مولانا کا مدرسے سے، اُس کی تاریخ و مقاصدِ قیام سے، اُس کی روایات سے علم و اخلاص کا بہت قریبی تعلق تھا، وہ سولہ برس تک مدرسے کے سرگرم رکن رہ چکے تھے۔ ان کا وجود گرامی، ان کی تعلیمی و سیاسی سرگرمیاں اس کی عزت کا موجب بنی تھیں۔ اب اس کے وجود کو ان کی امداد و حمایت کی ضرورت تھی اور اس نے اپنی بقا کے لیے ان کے اخلاص اور قابلیت کو آواز دی تھی۔ مولانا کے لیے اس آواز سے اعراض اور سنی ان سنی کر دینا ممکن نہ تھا۔ مولانا کا خاندان دیوبند میں اور ان کے بیوی بچے دہلی میں تھے اور ان کی ضرورت دس سال قبل چھوڑے ہوئے ان کے محبوب ادارے کو تھی۔ مولانا نے اس کی آواز پر لبیک کہا اور اگرچہ پتھر بھاری تھا لیکن انھوں نے آگے بڑھ کر اسے اُٹھا ہی لیا اور جب تک حالات کا تقاضا ہوا ذمہ داریوں سے منہ نہیں پھیرا۔

مراد آباد کے اسی قیام کے زمانے میں مولانا نے ''ادارۂ حفظ الرحمٰن'' کے نام سے شہر سے باہر رام گنگا کے کنارے ایک نئے ادارے کی بنیاد ڈالی، مولانا اس کے بانی تھے، وہی اس کے ناظم تھے اور وہی اس کے کارکن بھی تھے۔ مولانا جب تک مراد آباد میں رہے اور مدرسۂ شاہی سے اہتمام کا تعلق رہا اس ادارے کو بھی چلاتے رہے اور جب مراد آباد سے روانہ ہوئے تو اسے بھی قابل اعتماد، صاحبِ اخلاص اور باصلاحیت ہاتھوں میں دے کر روانہ ہوئے۔

جمعیت علماے ہند، اس کی سیاست، اس کے رہنماؤں، اس کے مقاصد اور اس کے اُصول سے لے کر فرع تک سے مورخ ملتؒ کا تعلق جسم و جان کا سا تھا۔ جمعیت علماے ہند کے ایک دور کی کہانی مولانا محمد میاںؒ کی کہانی تھی۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی حیات (اگست ۱۹۶۲ء) تک جمعیت کے روح رواں رہے۔ ان کے انتقال کے بعد ایک سال تک وہ جمعیت کے ناظم اعلیٰ کے منصب پر فائز رہے تھے۔ اس کے بعد بھی منصب کی ذمہ داری کے بغیر جمعیت سے ان کا تعلق، اسی طرح ذوق و خدمت کا تعلق رہا۔

جمعیت کی خدمت کے لیے انھوں نے اپنے منصب کے وقار کی بھی کبھی پروا نہیں کی تھی۔ مولانا قاضی سجاد حسینؒ کے بہ قول:

''جمعیت علماے ہند کی نظامت کے جلیل القدر عہدے پر عرصۂ دراز تک فایز رہے، لیکن عہدے کی وجہ کبھی مولانا کے لیے ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت میں مانع نہ ہوئی۔ مولانا کا مقصد کام اور خدمت ہوتی تھی، خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہو۔''

وہ جمعیت ٹرسٹ سوسایٹی کے صدر بھی رہے تھے۔ جمعیت علماے ہند کی نظامت علیا سے فراغت کے بعد اگرچہ جمعیت سے ان کا اخلاص و تعاون کا تعلق زندگی کے آخری لمحوں تک رہا، لیکن اب انھوں نے مدرسۂ امینیہ سے تعلق میں اپنے قلب کا اطمینان و سکون تلاش کرلیا تھا۔ انھوں نے مدرسۂ امینیہ میں شیخ الحدیث اور صدر مفتی کی ذمہ داریاں قبول کرلی تھیں۔ گویا کہ ۱۹۴۵ء میں مدرسۂ شاہی کی جس مسند تدریس و افتا سے اُٹھ کر قوم کی سیاسی رہنمائی کے لیے میدانِ عمل میں نکل گئے تھے ۱۹۶۳ء کے بعد جمعیت کی خدمت اور سیاسی میدان سے نکل کر پھر اسی درس و تدریس اور خدمت افتا کی مسندوں کو زینت بخشی تھی۔ یہ خدمت ہمیشہ ان کے ذوق و مزاج کے مطابق رہی تھی۔ ان کے اصل مقام کو ہمیں درس و افتا کے ہنگاموں اور تصنیف و تالیف کے کاموں ہی میں تلاش کرنا چاہیے۔

خدمات کا اعتراف:

مولانا سید محمد میاںؒ نے جس جماعت کے پلیٹ فارم سے سیاست میں حصہ لیا تھا اس کا جو اندازِ سیاست اور موقف تھا اور جن مواقع پر اور جن تحریکات میں قوم کی رہنمائی کی تھی، ان میں نہ انھیں شاباشی مل سکتی تھی نہ ان پر پھول برسائے جاسکتے تھے۔ اس سیاسی راہ میں تو ان کے لیے صرف دار و رسن کی آزمایش ہی پیش آسکتی تھی اور وہی پیش آئی۔ انھیں اپنی سیاسی زندگی میں قید و بند کی آزمایش سے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۴ء تک چار مرتبہ مراد آباد کے زمانۂ قیام میں اور ایک مرتبہ دہلی میں اس منزل سے گزرنا پڑا۔

قومی وملی خدمات کے ذریعے انھوں نے عوام اور خواص میں عزت اور احترام کا مقام پیدا کرلیا تھا۔ ان کے ہندو اور مسلمان دوستوں نے کئی بار راجیہ سبھا کے الیکشن میں حصہ لینے کے لیے اصرار کیا بلکہ انھیں بلا مقابلہ منتخب کرانے کا وعدہ کیا، لیکن انھوں نے تصنیف وتالیف کے شوق میں یہ پیش کش قبول نہیں کی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ عملی خدمت کے مقابلے میں مسلمانوں کی سیاسی خدمات کو تاریخ میں اجاگر کرنے، مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور ان کی تعلیم وتربیت کے پائیدار انتظام کی زیادہ اہمیت ہے اور اسی کے لیے وہ اپنے آپ کو زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔

وہ اگر کسی جائز ذریعے سے بھی اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانا چاہتے تو اس کے مواقع موجود تھے، لیکن انھوں نے تو اپنے دوستوں اور حکومت کی پیش کش کو بھی قبول نہ کیا تھا۔ حکومت سے کوئی درخواست کرنے پر کس طرح رضامند ہو سکتے تھے۔ ان کی خود داری اور بے غرضی کا تو یہ عالم تھا کہ اصحابِ رسوخ کی کسی پیش کش کو رد کر دینے پر ان کے صاحب زادے مولانا سید حامد میاں صاحبؒ نے کہا کہ آپ کو قبول کر لینی چاہیے تھی؟ تو ان پر ناراض ہوئے اور فرمایا یہ بات تم مجھ سے کہہ رہے ہو!؟ سیاسی خدمات کے انعام میں حکومت کی طرف سے وظیفۂ مکان لینے سے انھوں نے انکار کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ سیاسی خدمات کے اعتراف میں سند "تانبر پتر" قبول کرلی تھی۔ سندِ اعتراف پر سیاسی یا علمی ادبی یا کسی فن میں خدمات اور کارناموں کی تفصیل اور وزیر اعظم کے دستخط ہوتے ہیں۔ مولانا سید حامد میاں صاحبؒ نے لکھا ہے۔

> "تانبر پتر انھوں نے رکھ لیا اور یہ فرما کر رکھا کہ یہ میں اس لیے لے رہا ہوں کہ جہاد آزادی میں مسلمانوں کی خدمات کے شمار میں اس سے ایک شخص کا اضافہ ہوگا۔ باقی چیزیں انھوں نے قبول نہیں کیں۔"

وفات:

مرادآباد میں اپنی تعلیم کے زمانے میں حضرت مورخ ملتؒ کو دور و نزدیک سے دیکھنے کا بہت اتفاق ہوا۔ ان کا مستقل قیام دہلی میں تھا۔ مولانا سید حامد میاںؒ

دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے آخری سالوں میں تھے۔ ان کی بیوی مریم بنت مولانا عبدالحق مدنیؒ (والدہ ماجدہ مولانا رشید میاں) اپنے والدین کے ساتھ مرادآباد میں تھیں۔ مولانا حامد میاں“ مہینے میں ایک دو بار ضرور آتے تھے۔ اسی طرح مولانا سید محمد میاںؒ کا گاہے گاہے مرادآباد آنا ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں مجھے انھیں دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ دبلے پتلے، متوسط قد اور کم زور کاٹھی کے شخص تھے۔ علی گڑھ وضع کی کھدر کی شیروانی، اسی کپڑے کی حامد کیپ، تنگ موری کا ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنتے اور ہلکے فریم کا چشمہ لگاتے تھے۔ چہرے پر چھری ڈاڑھی نہ زیادہ بڑی نہ چھوٹی، چہرے کی مناسبت سے نہایت موزوں، پاؤں میں نوکیشن ٹائپ کا ہلکا جوتا، پوشش میں سادگی، انداز میں خاکساری، ٹپ ٹاپ سے بے نیازی، چہرے پر بھولا پن برستا تھا۔ ان کے تصنیفی کاموں، جمعیت علما میں ان کے منصب کی بلندی اور ان کی خدمات کی اہمیت سے تو ناواقف تھا اور اس لحاظ سے ان کی شخصیت سے متاثر ہونا نہ ہونا بے معنی تھا، البتہ انھیں دیکھنے سے پہلے مدرسۂ شاہی کے ماحول میں ان کا ذکر اکثر سنا تھا اور ان کے نام سے واقف ہو چکا تھا مولوی محمد اسماعیل (ابن مولانا عبدالحق مدنی“) کی رات دن کی معیت میں ان کا تذکرہ اتنا سنا تھا کہ ان کے لیے دل میں گہری عقیدت پیدا ہو گئی تھی اور جب انھیں دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ ان کی شخصیت میں ایک کشش اور ان کی سادگی میں ایک حسن تھا جو دل کو بہت بھایا تھا اور نگاہیں عقیدت سے ان کے حضور جھک گئی تھیں۔

انھیں دیکھ کر کوئی اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ وہ کس بلند مرتبے کے عالم دین، وقت کے کتنے بڑے مصنف اور کس پایے کے مورخ ہیں اور ۱۹۴۷ء کے عہد پرآشوب میں ستم زدگانِ دہلی کا وہ کتنا بڑا سہارا تھے یا قریب کے زمانے میں انھوں نے ہماچل پردیش اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی کتنی عظیم الشان خدمات انجام دی تھیں۔

۱۹۶۲ء میں جب میں پہلی بار ہندوستان گیا تھا اور دہلی بھی جانا ہوا، گلی قاسم جان میں دفتر جمعیت علما کے دفتر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر پہچان لیا، بہت شفقت سے پیش آئے۔ جمعیت علما کیا ہے؟ اپنی تالیف مجھے

عنایت فرمائی۔ حال ہی میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کا انتقال ہو چکا تھا۔ طبیعت پر اس کا اثر تھا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کم زور بھی ہیں۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا کہ مولانا سید حامد میاںؒ پاکستان تشریف لے آئے ہیں اور لاہور میں جامعۂ مدنیہ قایم کی ہے۔ ان کا پتا میں دہلی سے لے کر آیا تھا۔

دہلی میں حضرت مورخ ملت مولانا سید محمد میاںؒ سے ملاقات ہوئی تو وہ تقریباً ساٹھ برس زندگی کے گزار چکے تھے۔ کم زور تھے لیکن بڑھاپے کے آثار نمایاں نہ ہوئے تھے، لیکن زندگی کا آخری دور تو شروع ہو ہی چکا تھا۔ وہ زندگی میں کبھی کسی طویل اور تکلیف دہ بیماری میں مبتلا نہ ہوئے تھے اور نہ کبھی ہسپتال میں داخل ہونے کی نوبت آئی تھی۔ صبح و شام اور موسم کے اثرات سے نزلہ، زکام، کھانسی کی شکایات ضرور پیدا ہوتی رہیں۔ بواسیر کی شکایت انھیں اس کے بعد ہی کے زمانے میں پیدا ہوئی اور چوں کہ خونی بواسیر تھی اس لیے نئے خون کی رفتار تولید اور اخراج میں توازن نہ رہا تھا۔ اس صورتِ حال نے ان کے اعصاب پر بُرا اثر ڈالا تھا اور صحت تباہ ہوگئی تھی۔ اُن میں صبر اور برداشت کی قوت انتہا درجے کی اور تحریر و مطالعہ ہمیشہ اور ہر وقت جاری رہتا تھا۔ اس لیے ان کی خرابی صحت کا نہ کوئی اندازہ کر سکتا تھا اور نہ وہ خود اپنی تکلیف کو بیان فرماتے تھے، اس لیے کوئی دوسرا نہ ان کے دکھ درد سے واقف ہوتا تھا نہ تشویش میں مبتلا ہوتا ہے۔

مولانا محمد میاںؒ کی صحت روز بہ روز گرتی رہی، کم زوری میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا رہا اور وقت موعود آہستہ آہستہ قریب آتا رہا۔ وہ آیا اور ایسے دبے پاؤں آیا کہ اگرچہ خود انھوں نے اس کی آہٹ کو سن لیا تھا لیکن کوئی اور اسے محسوس نہ کر سکا تھا۔ ۱۵ رمضان ۱۳۹۵ھ کے آتے آتے بواسیر کی کہنہ شکایت نے شدت اختیار کر لی۔ خون کے نکل جانے سے کم زوری بہت بڑھ گئی۔ ان کی ہمت اور قوت برداشت کی داد دیجیے کہ مراد آباد کا ایک ضروری سفر پیش آگیا اور اسی حالت میں وہ مراد آباد تشریف لے گئے، لوٹے تو علالت نے طول کھینچا اور نقاہت انتہا کو پہنچ گئی۔ اب ان میں اُٹھنے بیٹھنے کی سکت بھی نہ رہی۔ نقاہت کی وجہ سے آواز نہ سنی جاتی تھی۔ ۱۶ شوال ۱۳۹۵ھ مطابق

۲۴/اکتوبر ۱۹۷۵ء کو چھ بجے شام کو وقت موعود آ پہنچا اور وہ اپنے نفس مطمئنہ کے ساتھ اپنے رب کے قرب و ملاقات کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

دہلی میں مسجد عبدالنبی (جہاں اب جمعیت علماے ہند کا دفتر ہے) کے قریب دہلی دروازے کے باہر قدیم قبرستان میں تدفین عمل میں آئی اور جوارِ الٰہی میں اعلیٰ علیین ان کا مقام ٹھیرا۔ ان کی وفات کے ساتھ ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کی دیوبندی شاخ کا ترجمان، نام ور مورخ اور سب سے بڑا مصنف ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

پچھلے صفحات میں حضرت مورخِ ملت" کی علمی و تاریخی اور سیاسی خدمات کے تذکرے اور اس کے ساتھ ان کے سوانح حیات پر ایک نظر ڈالی جا چکی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نظر سرسری سے بھی بہت کم ہے اور ہمیں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ حق کا ایک شمہ بھی ادا ہوا ہے۔ خصوصاً مولانا مرحوم کی سیاسی خدمات کا تذکرہ بالکل تشنہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس گوشے کو میں تحریر میں پیش کرنے کے بجائے قارئین کرام کے سامنے سر کی آنکھوں سے دیکھے جانے والے مواد (Material) کی شکل میں پیش کر دینا چاہتا تھا۔ زیرِ نظر تالیف ''مقالاتِ سیاسیہ'' کی پیش کش اسی عزم کی صورت گری ہے۔ یہ حضرت مؤلف کے قلم سے یادگار سیاسی لٹریچر کی تحقیق کا ایک نمونہ ہے۔ اگرچہ یہ پیشِ نظر منصوبے کا ایک ضروری جزوی کام ہے جو حضرت شیخ الاسلام" کی سیاسی ڈائری کے تکملے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ چھوٹے بڑے گیارہ مستقل کتابچے ہیں جو پہلے شایع ہو چکے ہیں اور پانچ طویل و مختصر مقالے یا سلسلۂ مضمون ہیں جو ماہنامہ ''دارالعلوم'' - دیوبند سے اور سہ روزہ اخبار ''زمزم'' - لاہور سے ماخوذ ہو کر مقالاتِ سیاسیہ میں شامل کیے گئے ہیں۔ کئی مقالات کے ساتھ نہایت فکر انگیز ضمیمے شامل ہیں، ان کی تعداد پندرہ ہے۔ ان کی شمولیت سے مقالات کی علمی و فکری حیثیت میں اضافہ ہوا ہے۔

پیشِ نظر سولہ کتابچے اور مقالے، مضامین و مباحث کی مناسبت سے چھ

مجموعوں میں مرتب کیے گئے ہیں اور ہر مجموعے کا ایک عنوان یا نام ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے؛

پہلا مجموعہ: ”جمعیت علماے ہند - ایک تاریخی مطالعہ“

اس مجموعے میں مورخِ ملّت کے تین کتابچے اور اخبارات سے ماخوذ دو مقالے شامل ہیں۔ جن سے جمعیت علماے ہند کے قیام کی اہمیت، اس کے نصب العین، اغراض و مقاصد سے لے کر ۱۹۴۷ء میں اور اس کے بعد کے زمانے میں اس کی امدادی خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔

دوسرا مجموعہ: ”وطن - اس کی اہمیت اور وقت کے تقاضے“

اس میں مورخِ ملّت کا ایک مستقل رسالہ، ایک مقالہ، ایک استدارک اور تین ضمیمے شامل ہیں۔ جن میں مسلمانوں کے لیے ہندوستان کی وطنی حیثیت اور ہندوستان سے مسلمانوں کی ترک سکونت کے مباحث پر نہایت فکر انگیز بحث کی گئی ہے۔

تیسرا مجموعہ: ”ہندوستانی سیاست اور علماے ہند - ۱۸۵۷ء کے بعد!“

یہ حضرت مورخِ ملّت“ کا صرف ایک جامع رسالہ ہے۔ لیکن اس کے آخر میں شامل پانچ ضمیموں نے اس کی معنویت اور افادیت میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ اس کے مباحث میں کانگریس اور مسلم لیگ کے قیام کے مقاصد و مصالح، تحریکِ شیخ الہندؒ کے ظہور و فروغ اور اس کے نتائج، تقسیم ملک اور تبادلۂ آبادی کی قیامت خیزیاں اور ہندوستان کے سیکولر نظامِ حکومت کی اہمیت کے مضامین علماے کرام کی بلند خیالی اور ان کے سیاسی شعور کی جامعیت پر دلیل ہیں۔

چوتھا مجموعہ: اس مجموعے کا عنوان ”ہندوستانی سیاست اور اس کا تقابلی مطالعہ“ ہے۔ اس مجموعے کی تشکیل میں مورخِ ملّت کے ایک کتابچے اور دو مقالوں کی کارفرمائی ہے۔ کانگریس، مسلم لیگ اور جمعیت علماے ہند کے قیام کے پس منظر، مقاصد کے اختلاف اور ان کی تجاویز کی روشنی میں ان کے اندازِ فکر و خدمات اور ان کے فیصلوں اور اعمال کے تجزیے اور ان کے رویوں پر بحث کی گئی ہے۔ اس مجموعے کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس کی فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالنے ہی سے ہو جاتا ہے۔

پانچواں مجموعہ: ''شرکت کانگریس کا جواز - تھانوی، عثمانی نقطۂ نظر پر تنقید و تبصر کی ایک نظر''

یہ مجموعہ مورخِ ملت کے چار فکر انگیز اور مدلل رسایل ''مولانا ظفر احمد تھانویؒ کے فتوے پر تبصرہ،'' مفتی محمد شفیع دیو بندیؒ کے رسالے ''کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ'' پر تنقید اور ان کے اپنے فتوے ''شرکت کانگریس اور شریعت غرا'' کا جامع ہے۔ حضرت مورخِ ملتؒ کا یہ رسالہ جو دراصل مدرسۂ شاہی مراد آباد کے دارالافتاء سے جاری شدہ ایک فتویٰ ہے، گویا مذکورۃ الصدر دونوں رسایل پر حسن محاکمہ کی مثال اور قول فیصل ہے۔ یہ محاکمہ مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ کے ذوق تفقہ، سیاسی شعور، مطالعہ و نظر کی وسعت و بلندی اور نکتہ رسی پر دال ہے۔

چھٹا مجموعہ: ''مسلم لیگ کے دعاوی اور ان کی حقیقت - تحریک پاکستان کے پس منظر میں''

یہ ایک ہی رسالہ ہے، لیکن اس کے ساتھ نہایت معنی خیز طویل و مختصر آٹھ ضمیمے شامل ہیں۔ اس رسالے میں مورخِ ملتؒ نے مسلم لیگ کے استقلالِ مرکز، دو قومی نظریے اور اس کے دوسرے دعاوی پر بحث کی ہے اور تاریخ، حقایق اور مشاہدات و تجربات کی روشنی میں ان کا تار پود بکھیر دیا ہے۔ یہ رسالہ ان کے سیاسی شعور کی پختگی، بلند خیالی کی بڑی دلیل ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کا مطالعہ سبق آموز بھی! رسالے کی آخری بحث ''جمعیت علماے ہند کا شاہ راہِ مستقیم'' جمعیت علماے ہند کے رہنماؤں کی حقیقت پسندی کا بڑا ثبوت بھی ہے۔

یہاں ان رسایل پر تبصرہ مقصود نہیں، بلکہ ان کی ترتیب و تدوین کی خصوصیات کی طرف توجہ دلانی چاہتا تھا۔ جہاں تک ان رسایل کی تاریخی اہمیت اور افادیت کا تعلق ہے تو بعض رسایل پر مدون کے پیش لفظ، حرفے چند یا عرائضِ مرتب میں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے اور وہ ضرورت کے لیے بس کرتی ہے۔ یہاں ان مطالب کو دہرانے کی ضرورت نہیں!

ابو سلمان شاہ جہان پوری

۱

جمعیت علماء ہند ــــ ایک تاریخی مطالعہ

مقاصد و خدمات کی روشنی میں

اور

دیگر مباحثِ علمیہ و سیاسیہ

از قلم

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیو بندیؒ

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان

کراچی

جمعیت علماے ہند کی شرعی اہمیت

از

مؤرخ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

جمعیت علماے ہند کی شرعی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ الۡکَرِیۡمِ

جمعیت علما کی شرعی اہمیت

ا۔ خاتم المحدثین، استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند و صدر اجلاس ہشتم جمعیت علمائے ہند بمقام پشاور ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء نے اپنے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا تھا:

"ہندوستان کے علمائے کرام نے چند سال سے اپنے دائرے میں ایک نظام قائم کیا ہے، جس کا نام "جمعیت علمائے ہند" ہے، تاکہ موجودہ زمانے کے ہجوم مصائب و آلام میں جو واقعات و حالات پیش آئیں، خواہ وہ سیاسیات سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ مذہب و اخلاق سے اور خواہ معاشرت و تمدن سے متعلق ہوں یا اقتصادیات سے، ان کے متعلق باہمی بحث و تمحیص، تدقیق و تحقیق کے بعد جمہور اہل اسلام کے لیے وہ راہ عمل نکالیں اور ان کو صحیح راستے پر چلائیں۔ شریعت غرا کی یہی تعلیم اور سلف صالحین کی سیرت صالحہ یہی تھی۔

"عن علی، قال قلت یا رسول اللہ ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر و لا نہی فما تامرنی؟ قال تشاوروا العلماء والعابدین ولا تمضوا فیہ رأی خاصۃ" (رواہ الطبرانی فی الاوسط و رجالہ موثقون من اھل الصحیح کذا فی الزوائد)۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا:

میں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے، جس میں شریعت کی اجازت یا ممانعت واضح نہ ہو تو حضورؐ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ علما اور عبادت گذاروں سے مشورہ

کر لیا کرنا اور کسی شخصی رائے کو نافذ نہ کرنا"۔

اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سیرت میں مذکور ہے:

"وان اعیاه دالك دعا رؤس المسلمین وعلماء هم فاستشارهم فاذا اجتمع رائهم علی الامر قضی به"۔

اگر آپ کو کوئی مسئلہ پیش آجاتا اور کتاب و سنت میں اس کا حکم نہ ملتا تو آپ زعماء و علماء امت کو بلا کر مشورہ کرتے اور جب سب کسی رائے پر متفق ہو جاتے تو اسی کے موافق فیصلہ فرما دیتے۔

"و عن عمر ابن الخطاب کان یفعل ذلك فان اعیاه ولم یجد فی القرآن او السنة نظر هل کان لابی بکر فیه قضاء فان وجدابابکر قدقضی فیه بقضاء قضی به والادعا رؤس المسلمین وعلماء هم واستشارهم. فاذا اجتمعوا علی امرقضی بینهم"۔(رواہ الدارمی)

اسی طرح حضرت عمر بن الخطابؓ سے منقول ہے کہ اگر ان کو کوئی دشواری پیش آتی اور کتاب و سنت میں حکم نہ ملتا تو حضرت ابو بکر صدیقؓ کے فیصلوں کو تلاش کرتے۔ اگر صدیق اکبر کا کوئی فیصلہ مل جاتا تو اسی کے موافق فیصلہ فرما دیتے ورنہ زعماء و علماء کو بلا کر مشورہ فرماتے اور جب وہ کسی رائے پر متفق ہو جاتے تو اسی کے موافق فیصلہ صادر فرماتے۔

جمعیت علما کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی وقت زعمائے اُمت سے قومی مسائل میں کسی قسم کی مذہبی فروگذاشت ہو جائے تو احکام شرعیہ کا اعلان و اظہار کر دے یا جمہور مسلمین ادائے وظائف قومیہ میں غفلت اور تساہل ظاہر ہو تو وعظ و پند کے ذریعے سے ان کو آمادۂ عمل کرے اور ان میں بیداری اور مستعدی کی روح پھونکے"۔

(خطبہ صدارت جمعیت علمائے ہند، اجلاس ہشتم، مئی ۱۹۲۷ء، پشاور)

۲۔ فخر العلماء حضرت الشیخ مولانا محمد حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ مہتمم دار العلوم دیوبند و صدر اجلاس چہارم جمعیت علمائے ہند منعقدہ ۲۴، ۲۵ و ۲۶/ دسمبر ۱۹۲۲ء بمقام "گیا" نے اپنے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا تھا:

جمعیت علما کی مذہبی عظمت

جمعیت علمائے ہند کی مذہبی عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابتدا سے آج تک اطراف واکناف ہند کے وہ تبحر اور چوٹی کے علما جو اپنے اپنے مقام پر درس حدیث، درس تفسیر، درس فقہ اور افتاو مدارس عربیہ کے اہتمام وغیرہ کی عظیم الشان خالص مذہبی خدمات انجام دیتے ہیں، جو اپنے اپنے مقام پر رشد و ہدایت کے زعیم مانے جاتے ہیں، وہ مرکزیہ جمعیت علما کے ارکان رہتے ہیں، جو اس کے سالانہ اجلاسوں میں شریک ہوتے ہیں، جن کی تعداد کم از کم دو (۲۰۰) سو ہوتی ہے۔

مرکزیہ جمعیت علما کے سوا اس کی صوبائی شاخوں اور ضلع وار جمعیتوں کے ارکان بیشتر علما ہیں۔ ان سب کی مجموعی تعداد ایک ہزار ہوتی ہے جو جمعیت علمائے ہند کے نظام میں داخل اور اس کی تجاویز اور پالیسی کے مرتب کرنے والے ہیں۔

اس کے سالانہ اجلاسوں کے صدر ہندوستان بھر کے ممتاز علما ہوتے ہیں جن کا علم، تقویٰ، ایثار و صداقت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیائے اسلام میں ممتاز شان رکھتا ہے۔

ذیل میں ان حضرات کے اسمائے گرامی درج ہیں جنھوں نے جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت فرمائی۔

(۱) حضرت علامہ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی، صدر اجلاس اول منعقدہ امرتسر ۱۹۱۹ء و اجلاس خصوصی اجمیر ۱۹۲۲ء۔

(۲) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب (اسیر مالٹا)، صدر اجلاس دوئم منعقدہ دہلی ۱۹۲۰ء

(۳) مولانا ابوالکلام صاحب آزاد، صدر اجلاس لاہور، ۱۹۲۱ء و اجلاس کراچی، ۱۹۳۱ء

(۴) فخر العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، مہتمم دار العلوم دیوبند، صدر اجلاس گیا، منعقدہ ۱۹۲۲ء

(۵) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، صدر اجلاس کوکناڈا، ۱۹۲۳ء و اجلاس جون پور، ۱۹۴۰ء و صدر اجلاس لاہور، ۱۹۴۲ء و اجلاس سہارن پور، ۱۹۴۵ء

(۶) حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب، نائب امیر شریعت صوبہ بہار، صدر اجلاس مراد آباد، ۱۹۲۵ء

(۷) حضرت علامہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔ صدر اجلاس کلکتہ، ۱۹۲۶ء

(۸) رئیس المحدثین، بقیۃ السلف، استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند (قدس اللہ سرہ) صدر اجلاس پشاور، ۱۹۲۷ء

(۹) حضرت علامہ مولانا شاہ معین الدین صاحب اجمیری، صدر اجلاس امروہہ، ۱۹۳۰ء

(۱۰) حضرت علامہ الحاج مولانا عبد الحق صاحب مدنی، شیخ التفسیر و مہتمم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد۔ صدر اجلاس دہلی، ۱۹۳۹ء

"جمعیت علما کی اہمیت :

جمعیت علما کی اہمیت کو بس میں ایک ہی جملہ میں بیان کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ جمعیت علما مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کے لیے قایم ہوئی ہے۔ مذہبی رہنمائی کا جملہ بہت مختصر ہے، مگر وہ اپنے اندر بہت سے مطالب لیے ہوئے ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام کے احکام میں عبادات، معاملات، تنظیم بلاد و حراست ممالک اسلامیہ سب ہی داخل ہیں۔ شارع علیہ السلام نے ہر موقع کے لیے احکام صادر فرمائے اور فقہائے اسلام نے کلیات سے استنباطِ جزئیات کر کے ان کو مدوّن کیا۔

آپ نے دیکھا ہے کہ کتب فقہ میں جہاں صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج وغیرہ عبادات اور بیع و شرا، شفعہ و رہن، ودیعت، کفالت و ضمانت وغیرہ معاملات کے احکام بیان کیے گیے ہیں، وہیں "کتاب السیر" بھی موجود ہے، جس میں جہاد، اسر و غنیمت، ہدنہ، صلح، معاہدہ، ذمی و مستامن، حربی وغیرہ کے احکام مذکور ہیں، جن کا تعلق سیاسیات، ملم اور نظام ممالک سے ہے اور مسلمانوں پر کوئی غیر مسلم طاقت مسلط ہو جائے تو اس کے احکام بھی کتب فقہ میں موجود ہیں۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی کا کوئی شعبہ مذہب سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کو ہندوستان میں رہ کر غیر مسلم اقوام سے معاملات پڑتے ہیں۔ ان کو ضرورت پڑتی ہے کہ اپنی ہم وطن اقوام کے ساتھ کیوں کر رہیں۔ شرعاً کس قسم کے معاملے کے مجاز ہیں اور گورنمنٹ کے ساتھ ہمارا کیا معاملہ ہونا چاہیے! پھر مسلمانانِ عالم کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے، ان کی ہمدردی یا تعاون و تناصر کے احکام کا تعلق ہم سے کس حد تک ہے! پس کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج، نکاح، طلاق، بیع و شرا وغیرہ میں تو مذہبی فتوے کے محتاج ہوں اور معاملاتِ ملکی اور غیر مسلم اقوام کے ساتھ تعلقات کے احکام شریعت میں نہ ہوں یا ان کو اس کی حاجت نہ ہو۔

اگر سیاست کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں یا علما کا ان مسائل میں دخل دینا ان کے فرائض میں داخل نہیں ہے تو میرے خیال میں کتب فقہ ہی سے ابواب جہاد، اسر وغیرہ کو نکال دینا چاہیے اور جب ایسا نہیں ہو سکتا تو آپ سمجھ لیجیے کہ معاملات سیاست کے اس حصے کا جس کا تعلق مذہب سے ہے، مسلمانوں کو علما کی اس سے کم ضرورت نہیں جس قدر

مسائلِ عبادات و معاملات میں۔ بلکہ ایک معنی سے زیادہ ہے اور علما کے فرائض میں یہ فریضہ بھی اہم ہے کہ وہ ان ملی معاملات میں اپنے اوقاتِ عزیز کو صرف کریں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مسائلِ عبادات و معاملات میں علما کے انفرادی فتاویٰ بھی کافی ہو جاتے ہیں۔ مگر ان معاملاتِ ملی و اساسی میں علما کی انفرادی آرا یا فتاویٰ ہرگز مفید و مثمر نہیں ہیں۔ ان وجہ سے جمعیت علما کے وجود کی مسلمانانِ ہندوستان کو سخت ضرورت ہے۔

اگر ہمارے مسلمان بھائی تھوڑی دیر کے لیے اس سے قطع نظر کر لیں کہ جمعیت علما اب آکر میں قائم ہوئی ہے اور اس سے قبل ہندوستان میں سیاسی تعلیم وغیرہ بہت سی جمعیتیں موجود ہیں اور اس وجہ سے جمعیت علما کو کچھ فوقیت کا استحقاق نہیں تو وہ خود بخود سمجھ لیں گے کہ مسلمانوں کی تمام جمعیتیں اور کانفرنسیں جمعیت علما کی محتاج ہیں۔ کوئی جمعیت اس سے مستغنی نہیں ہے۔ وہ مسلمانوں کے نظامِ ملکی و ملی کی محور ہے، بلکہ میں تو اس سے ترقی کر کے یہ کہتا ہوں کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بر بنائے روابطِ اسلامی غیر ممالک کے مسلمان بھی جمعیت علمائے ہند سے مستغنی نہیں ہیں۔

حضرات علما! آپ کی بر وقت مستعدی سے جمعیت علما کا وجود تو قائم ہو گیا، جس کی سخت ضرورت تھی۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو در حقیقت ایک بڑے اور اہم فرض سے غفلت کا الزام آپ پر آتا ہے۔ لیکن یہ بھی سمجھ لیجیے کہ آپ کی ذمہ داریاں بہ نسبت سابق بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ اس وقت تک آپ حضرات جس قدر اسلامی خدمات ادا کرتے تھے اور ایک حیثیت سے انفرادی تھیں اور اب جو کچھ کرنا ہے اجتماعی شان سے ہے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ حضرات علما جزوی مناقشات اور باہمی اختلافات و منافرت کو نظر انداز کر کے اخلاص و یکجہتی کے ساتھ ملی معاملات کو سلجھائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری تنگدلی یا مناقشہ سے اصلی مقصد کو نقصان پہنچ جائے۔ یہ وقت ہے کہ ہم ایثار سے کام لیں، ترفع اور وجاہت سے دور ہیں۔ معاملاتِ شرعیہ میں مداہنت یا مدارات کو دخل نہ دیں کلمۂ حق کہنے میں "لومۃ لائم" کا خوف نہ کریں اور اصولِ شریعت اور طریقِ سنت کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھالیں"۔ (خطبۂ صدارت جمعیت علمائے ہند، اجلاس چہارم، ۱۹۲۲ء، گیا)

جمعیت علما کا نصب العین

"ابھی ابھی بیان کیا گیا ہے کہ جمعیت علما کا مقصد اور نصب العین مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی تعلقات ہندوستان کی حدود سے متجاوز ہیں۔ ان پر خلافتِ اسلامیہ کی حمایت واجب ہے۔ اس کے تحفظ کی تدابیر کرنا ضروری، مسلمانانِ عالم کے ساتھ ہمدردی لازم، مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا یا اعداے اسلام کو اس قسم کی امداد دینا جس سے مسلمانوں کو یا خلافت کو نقصان پہنچے قطعاً حرام ہے۔

پس جمعیت علما کا نصب العین بھی دو حصوں میں منقسم ہو گیا، اندرونِ ملک میں مذہبی رہنمائی، بیرونِ ہندوستان کے مذہبی تعلقات کا تحفظ اور چوں کہ مسلمانانِ ہندوستان بغیر حصولِ آزادی نہ ہندوستان میں مذہبی احکام پر آزادی کے ساتھ عمل پیرا ہو سکتے ہیں اور نہ بیرونِ ہندوستان اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اسلامی تعلقات قائم رکھ سکتے ہیں، اس لیے ہمارے نظامِ عمل کا پہلا حصہ حصولِ آزادی کی تدابیر اختیار کرنا ہے اور دوسرا حصہ اندرونِ ملک میں نظامِ مذہب کے استحکام وبقا کی صورتیں اختیار کرنا۔ اور چوں کہ حصہ دوم کی تحصیل میں بھی پوری کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ حصہ اول میں ہماری مساعی کامیاب ہو جائیں، اس لیے نظامِ عمل کی ترتیب میں حصہ اول ہی کو تقدم حاصل ہے اور یہی سخت اور کٹھن راستہ ہے"۔ (ایضاً)

اغراض ومقاصد جمعیت علماے ہند

ذیل میں اغراض و مقاصد درج کیے جاتے ہیں جو ہر ہمدردِ ملت کو جمعیت علماے ہند کے مذہبی احترام پر مجبور کردیتے ہیں۔

دفعہ ۳: اسلامی نقطۂ نظر سے ملتِ اسلامیہ کی حسبِ ذیل امور میں رہنمائی اور جدوجہد کرنا:

(الف) اسلام، مرکز اسلام (حجاز جزیرۃ العرب) اور شعائر اسلام کی حفاظت اور اسلامی قومیت کو نقصان پہنچانے والے اثرات کی مدافعت۔

(ب) مسلمانوں کے مذہبی اور وطنی حقوق اور ضروریات کی تحصیل و حفاظت۔

(ج) علما کو ایک مرکز پر جمع کرنا۔

(د) ملتِ اسلامیہ کی شرعی تنظیم اور محاکم شرعیہ کا قیام۔

(ہ) شرعی نصب العین کے موافق قوم اور ملک کی کامل آزادی۔

(و) مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی اصلاح، اور اندرون ملک میں حسبِ استطاعت اسلامی تبلیغ و اشاعت۔

(ز) ممالک اسلامیہ و دیگر ممالک کے مسلمانوں سے اسلامی اخوت و اتحاد کے روابط کا قیام و استحکام۔

(ح) شرعی حدود کے مطابق غیر مسلم برادرانِ وطن کے ساتھ ہمدردی و اتفاق کے تعلقات کا قیام۔

خدمات

اغراض و مقاصد کی تحریر کے بعد جمعیت علما کی بیشمار خدمات میں سے چند خدمات کی فہرست پیش کی جاتی ہے، جس میں صرف عنوانات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

رسالہ "جمعیت علما کیا ہے؟" حصہ اول و حصہ دوئم میں ان خدمات کو کس قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

(۱) مختلف الخیال علما کو ایک مرکز پر لانے کی سعی۔

(۲) مشہور عالم پانچ سو (۵۰۰) علمائے کرام کے متفقہ فتوے کی ترتیب واشاعت۔

(۳) تحریک خلافت کی رضاکارانہ تائید و حمایت اور فداکارانہ جدو جہد۔

(۴) مظلومین و شہدائے موپلا کی مالی امداد۔

(۵) انسدادِ فتنۂ ارتداد کی مؤثر تدابیر۔

(۶) امارتِ شرعیہ کے ذریعے مسلمانوں کی تنظیم۔

(۷) سارداایکٹ کی مخالفت۔

(۸) سائمن کمیشن کے خلاف اظہار رائے۔

(۹) مسلم کانفرنس دہلی کے دستوری فارمولے کی ترتیب۔

(۱۰) تبلیغ واشاعت اسلام کی سعی۔

(۱۱) نہرو رپورٹ پر تنقید۔

(۱۲) جمعیت علمائے ہند کا دستوری فارمولا۔

(۱۳) یونین بورڈ کے ماتحت کمیونل ایوارڈ کے متوازی تجاویز۔

(۱۴) قوانین شرعیہ میں گورنمنٹ کی مداخلت اور قصہ خوانی بازار کی ظالمانہ فائرنگ کے خلاف آزاد تحقیقاتی کمیشن کے مطالبے کی بنیاد پر ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۲ء کی جنگ آزادی میں کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل۔

(۱۵) صوبہ جات سرحد، سندھ کے استقلال کا مطالبہ۔

(۱۶) حج بل و معلمین حج بل کی مخالفت۔

(۱۷) سول میرج ایکٹ، آری بل، مرکزی اسمبلی کے شریعت بل میں ترمیم کی مخالفت۔

(۱۸) اسلامی اوقاف کی حفاظت کے سلسلے میں قانون اوقاف صوبہ جات متحدہ کی ترتیب۔
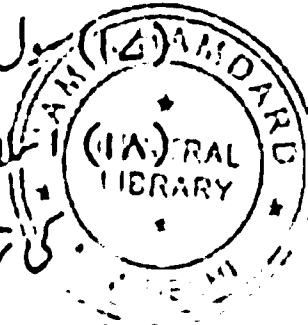
(۱۹) اسلامی کلچر کی حفاظت کے لیے ضروری وسائل و ذرائع پر غور۔

(۲۰) صوبہ بہار میں اسلامی اوقاف کا ٹیکس سے استثنا۔

(۲۱) صوبہ سرحد کی اسمبلی میں شریعت بل کے نفاذ کی سعی۔

(۲۲) فرنٹیر کے آزاد قبائل، وزیری، محسودی، مہمندی اور آفریدیوں پر بمباری کے خلاف احتجاج۔

(۲۳) خلع بل، قانون انفساخ نکاح کی غیر شرعی ترمیمات کے خلاف جدوجہد۔

(۲۴) موتمر اسلامی منعقدہ مکہ مکرمہ میں ذمہ دارانہ شرکت۔

(۲۵) موتمر اسلامی منعقدہ قاہرہ میں شرکت۔

(۲۶) مجاہدین فلسطین و شہدائے پشاور کی تصویب و تائید۔

(۲۷) حدودِ شرعیہ کے اندر ہندو مسلم اتحاد کی تائید۔

(۲۸) واردھا تعلیمی اسکیم میں اصلاح و ترمیم کی سعی۔

(۲۹) ہندو مسلم فسادات کے انسداد کی تدابیر۔

(۳۰) قربانی اور ذبیحہ گاؤ پر جہاں کہیں پابندیاں ہیں، ان کے ہٹائے جانے کی سعی۔

(۱۳) دوسری جنگ یورپ کے خلاف جمعیت علماے ہند کا اہم تاریخی فیصلہ۔

(۳۲) فلسطین، عراق، شام اور ایران کی پیچیدہ صورتِ حال کے متعلق جمعیت علماے ہند کا بروقت انتباہ اور اعلانِ حق۔

(۳۳) ۱۹۴۲ء کی تحریکِ حریت میں مجاہدانہ خدمات۔

تحریکِ آزادی اور جمعیت علمائے ہند

کا پروگرام

از

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان

کراچی

تحریکِ آزادی اور جمعیت علما کا پروگرام قرآن شریف اور احادیثِ مقدسہ کی روشنی میں

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"افضل الجهاد کلمة عدل عند سلطان جائر" (ترمذی شریف)۔

یعنی "ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات سب سے بڑا جہاد ہے"۔

آزادیٔ وطن کی جدوجہد ہر مسلمان پر فرض ہے۔ آزادیٔ وطن ہی آزادیٔ ملت کا ذریعہ ہے۔ آزادیٔ وطن کے بعد ہی اسلامی احکام نافذ کیے جا سکتے ہیں۔ مغلوب و مقہور رہ کر غلامانہ زندگی پر قناعت کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے قطعاً حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"من مات ولم یغزولم یحدث به نفسه مات علی شعبة من نفاق"۔

(مسلم شریف)

یعنی جس شخص نے اپنی زندگی میں جہاد نہیں کیا اور نہ جہاد کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوا اور اسی حالت میں وہ مر گیا تو ایک قسم کے نفاق کی حالت میں مر رہا ہے۔

اسلام اس لیے ہے کہ دنیا میں بلند و بالا ہو کر رہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"الاسلام یعلوا و لا یعلی علیه"۔

"اسلام بلند رہتا ہے پست نہیں ہوا"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولا تهنوا ولا تحزنوا۔ وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین"۔(۳: ۱۳۹)

"اور سست نہ ہو (یعنی کمزوری نہ دکھاؤ) اور غمگین مت ہو، تم ہی سب سے بلند ہو، اگر تم ایمان ویقین رکھتے ہو"۔

مسلمان اس لیے ہے کہ اپنی خدمات اور قربانیوں سے تمام انسانوں کو فائدہ پہنچائے، عدل وانصاف کے بہترین احکام و قوانین دنیا میں نافذ کرے، فسق وفجور اور ظلم و تعدی کی جڑیں اکھاڑ دے۔ چناں چہ ارشاد ربانی ہے:

"کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر و تؤمنون بالله"۔(۳: ۱۱۰)

یعنی "تم سب سے بہتر جماعت ہو جو انسانوں کے نفع کے لیے پیدا کی گئی۔ اچھی باتوں کا حکم کرتے ہو، بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان ویقین رکھتے ہو"۔

نیز خداوندِ عالم کا ارشاد ہے:

"ان الله یأمر بالعدل و الاحسان وایتاء ذی القربی وینهی عن الفحشا والمنکر"۔ (۱۶: ۹۰)

یعنی "خدا عدل واحسان اور رشتہ داروں کی امداد کا حکم کرتا ہے اور فحش اور بری باتوں سے روکتا ہے"۔

برطانوی شاہنشاہیت غاصبانہ اور ظالمانہ طور پر عرصے سے ہندوستان پر اپنا فولادی پنجہ گاڑے ہوئے ہے۔ بلا تفریق ہندو مسلمان تمام ہندوستانیوں کے ذرائع معاش اپنے قبضے میں کر کے ان کو بھوک اور افلاس کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔ خدا کی پناہ! حد ہو گئی کہ آج ہندوستان جیسے زرخیز ملک میں غلے پر بھی لائیسنس ہے اور پھر بھی روٹی کا ملنا دشوار ہے۔ ہر ایک ہندوستانی کو نہتا کر کے مجبور اور بے بس کر دیا ہے۔ ہندوستانیوں کے تمام علوم وفنون ختم کر کے اپنی زبان اور اپنے ملحدانہ خیالات کالجوں اور اسکولوں میں رائج کیے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ خود ہندوستانیوں کو اپنے اپنے مذہبوں سے بیزار کر کے تمام مذاہب کو فنا کے قریب پہنچا دیا ہے اور پھر بھی تعلیم یافتہ کو زندگی گزارنی دوبھر ہے۔ بلا تفریق مذہب و ملت ہر ایک

ہندوستانی کو ذلیل اور اس کے مقابلے میں گورے چمڑے والے بدیشیوں کو بلند اور برتر مانا جاتا ہے۔ ان کی تنخواہیں اور ان کے بھتے دو چند، سہ چند اور دیگر ذرائع آمدنی بھی ان کے لیے نہایت وسیع، اور لطف یہ ہے کہ خود ہندوستانیوں کے روپے سے یہ سب کچھ کیا جارہا ہے۔ کالے ہندوستانیوں کے پیٹ کاٹ کر ان کے بچوں کو بھوک، مرض اور جہالت میں مبتلا کر کے اپنی ناپاک خواہشات پوری کی جارہی ہیں۔ ہندوستانیوں کی نہ عزت محفوظ ہے، نہ آبرو، نہ دولت، نہ ان کی جان کی کوئی قیمت ہے، نہ ان کی وفاداری کی قدرومنزلت۔ انھیں کتوں سے بھی زیادہ ذلیل سمجھا جاتا ہے۔

پھر شاہنشاہیت کی انھیں ظالمانہ اور وحشیانہ اغراض کو محفوظ رکھنے کے لیے برطانوی شاہنشاہیت تین سال سے دوسری حکومتوں سے برسرپیکار ہے اور ہندوستانیوں کو ان کی مرضی کے برخلاف طرح طرح سے مجبور کر کے اس وحشیانہ جنگ میں شرکت پر مجبور کیا جارہا ہے۔ مثلاً ہندوستان کا کروڑوں من غلہ جو ہندوستانیوں کو کم از کم دو سال کے لیے افراط کے ساتھ کافی ہو سکتا تھا۔ غیر معلوم مقدار میں باہر بھیج دیا گیا ہے۔ چند سرمایہ داروں کے سوا آج ہر ایک ہندوستانی قحط اور فاقے میں مبتلا ہے اور پیٹ کے جہنم کو بھرنے کے لیے جنگ کے کاروبار میں شرکت پر مجبور ہے۔

ان انسانیت سوز وحشیانہ اور سفاکانہ حرکتوں سے بے چین اور بے قرار ہو کر اگر کوئی ہندوستانی بچی آواز بلند کرتا ہے تو گولی، پھانسی یا قید وبند کے ذریعے سے اس کو دبادیا جاتا ہے۔ وہ بڑے بڑے پیشوا اور لیڈر جن کی ہندوستانی یہاں تک عزت کرتے ہیں کہ ان کا نام لیتے وقت امیر الہند، شیخ الاسلام یا مہاتما جی جیسے خطابات کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں، ان کو نہایت مغرورانہ، ظالمانہ و وحشیانہ انداز میں جیل خانوں میں ٹھونس دیا گیا ہے اور اس طرح ہندوستانیوں کی ذلت و خواری پر مہر لگادی گئی ہے۔ ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ایران، عراق، حجاز، فلسطین، شام، مصر وغیرہ اسلامی ممالک بھی انھیں مصیبتوں کا شکار بنے ہوئے ہیں اور افسوس یہ کہ ان تمام ممالک کی یہ مصیبت ہندوستان کی غلامی اور صرف ہندوستان کی

غلامی کے سبب سے ہے۔ لہٰذا ہر ایک مسلمان کا مذہبی اور اسلامی فرض ہے کہ اس ظالم شاہنشاہیت کے پیس ڈالنے والے بارِ گراں کو جلد از جلد ہندوستان کے سر سے ہٹا کر عدل و انصاف کی حکومت قائم کر لے۔ اس جدوجہد میں اگر اس کی جان بھی کام آجائے تو سراسر سعادت اور نص حدیث کے بموجب شہادت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے :

"لمن قتل دون ماله فهو شهيد۔ ومن قتل دون دمه فهو شهيد ومن قتل دون دينه فهو شهيد۔ ومن قتل دون اهله فهو شهيد"۔

(ترمذی شریف، ص ۸۳۔ ۱۸۲)

یعنی "جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے خون (جان) کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔ اور جو اپنے گھر والوں کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے"۔

ہندوستان کی اسی زبانوں حالی، تباہی اور بربادی اور برطانوی شاہنشاہیت کی جابرانہ اور سفاکانہ چیرہ دستیوں سے تنگ آکر ہندوستان کی سب سے بڑی مشترک سیاسی جماعت یعنی "انڈین نیشنل کانگریس" نے ہندوستانیوں کے تمام مذاہب اور ہر ایک مذہب کے کلچر، معاشرت، زبان اور رسم الخط کی آزادی تسلیم کرتے ہوئے برطانوی شاہنشاہیت کو ہندوستان سے نکال دینے کی جدوجہد شروع کر دی ہے۔

۶/ اگست ۱۹۴۲ء تا ۸/ اگست ۱۹۴۲ء کے اجلاس بمبئی میں کانگریس نے یہ اصول بھی طے کر لیا ہے کہ

- جملہ صوبجات آزاد ہوں گے اور
- مرکز کو صرف وہی اختیارات دیے جائیں گے جو صوبجات طے کر دیں۔
- باقی تمام مصرحہ اور غیر مصرحہ اختیارات صوبجات کو حاصل ہوں گے۔
- نیز یہ کہ اگر کسی صوبے کی اکثریت اپنے صوبے کو مرکز سے علاحدہ کرنا چاہے تو اس کو یہ حق ہے اور
- ایسے علاحدہ ہونے والے صوبجات اپنا علاحدہ مرکز بھی بنا سکتے ہیں۔

طرح طرح کے بیانوں سے مسلمانوں کو بزدل بنا کر جدوجہدِ آزادی سے علاحدہ رکھنے کی کوشش عرصے سے کی جارہی ہے، لیکن حالات مذکورۂ بالا کے پیشِ نظر کسی مسلمان کے لیے بھی گنجایش نہیں رہتی کہ وہ جدوجہدِ آزادی میں دوسری قوموں کے دوش بدوش زیادہ سے زیادہ قربانیاں پیش کرنے میں تامل کرے، بلکہ اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ برطانوی شاہنشاہیت کے ہندوستانی نظام کو بیکار کرنے میں پوری جدوجہد صرف کر دے۔ یعنی عدم تشدد کے اختیار کردہ اصول کی پابندی کرتے ہوئے ایسی رکاوٹیں پیدا کریں کہ موجودہ حکومت کا کوئی کام نہ چل سکے۔ مثلاً اسکول، کالج، سرکاری دفاتر، سرکاری کارخانے، فیکٹریاں، کچہریاں بند کر دی جائیں۔ ملازمین ہڑتال کر دیں اور ایسا نہ کریں تو پرامن پکیٹنگ کیا جائے اور جو ملازمین آڑے آئیں، ان کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔ فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے کارخانے بند کر دیں، ورنہ کم از کم کوئی سرکاری آرڈر پورا نہ کیا جائے۔ لگان اور ہر ایک ٹیکس بند کر دیا جائے۔ حکومت کا کوئی مطالبہ ادا نہ کیا جائے۔ نوٹ ہرگز نہ لیے جائیں، اور جو نوٹ موجود ہوں ان کو واپس کر کے روپیہ فراہم کر لیا جائے۔ بینکوں سے اپنا روپیہ واپس لے لیا جائے۔ اپنی مکمل آزادی کا اعلان کرنے میں گاؤں گاؤں، محلہ محلہ، پنچایتیں بنادی جائیں۔ نوجوانوں کی حفاظتی جماعتیں تیار کی جائیں۔ یہی پنچایتیں آپس کے جھگڑوں اور جملہ معاملات کا فیصلہ کریں۔ یہی جماعتیں حفاظت اور جملہ ضروریات کی ذمہ دار ہوں۔ مسلمان اپنے میں سے کسی بہتر شخص کو اپنا امیر بنالیں۔

چوں کہ بدامنی کا دور بہ ظاہر طویل عرصے تک چلے گا، لہٰذا یہ پنچایتی نظام اور نوٹوں کے بجائے نقد روپیہ یا سونے چاندی کا محفوظ کر لینا اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے شرعی امارت کا نظام نہایت ضروری ہے۔

حضرت حق جل مجدہ کا ارشاد ہے:

> "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"۔ (۵ : ۲)
> یعنی "نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی امداد مت کرو"۔

مگر اس تمام تحریک میں قرآن پاک کے اصول "وجادلھم بالتی ھی احسن" (۱۲۵،۱۶) کے اصول کی سختی سے پابندی کی جائے، یعنی ایسا طرز اختیار کیا جائے جو سب سے بہتر ہو۔ جو آپ کے مخالف پر بھی اخلاقی دباؤ اس قسم کا ڈالے کہ وہ آپ کی ہمدردی پر مجبور ہو جائے۔ نیز عدم تشدد اور "مقاومت بالصبر" کے اس اصول کی سختی سے پابندی کی جائے جس کی طرف قرآن پاک کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے:

"کفوا ایدیکم واقیموا الصلوۃ"۔ (۴:۷۷)

"اپنے ہاتھوں کو روکو اور نماز قائم کرو"۔

یعنی کسی کا مال نہ چھینا جائے۔ لوٹ مار، ڈاکہ، چوری، قتل، عصمت دری، مار دھاڑ، ظلم و ستم، ہرگز ہرگز نہ ہو اور اس تمام جدوجہد کے ساتھ مذہبی عبادات اور مذہبی احکام کی پابندی کرو۔

سنا گیا ہے کہ جن مواضعات پر فوج کو معین کیا گیا وہاں فوجی سپاہیوں نے ہماری ماؤں، بہنوں کے ساتھ انسانیت سوز حرکتیں کی ہیں، ان کو بے آبرو کیا، لوٹا، کھسوٹا۔ یہ افواہ اگر غلط بھی ہو تب بھی فوج اور پولیس سے ایسی حرکتیں بعید نہیں۔ جرمنی اور جاپانی فوجیں بھی وحشت اور بربریت میں کسی سے کم نہیں۔ لہٰذا عورتوں کو سمجھا دیا جائے کہ ایسے خطرات کے موقع پر وہ سب ہندو ہوں یا مسلمان، امیر ہوں یا غریب ایک جگہ اکٹھی ہو جائیں اور کم از کم درانتی، چاقو، گنڈاسا جیسی کوئی چیز اپنے پاس رکھیں، اپنی حفاظت خود کریں اور اپنی جان سے زیادہ اپنی عصمت اور آبرو کی حفاظت کریں۔ اس حفاظت میں اگر مسلمان عورتوں کی جان بھی جاتی رہے تو وہ یقیناً شہید ہوں گی۔

محمد میاں عفی عنہ

۵ر رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ / ۷ار دسمبر ۱۹۴۲ء

حوالہ:

"علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" از مولانا سید محمد میاں (حصہ دوم، کراچی ایڈیشن، صفحہ ۱۵۹-۶۵)

جمعیت علمائے ہند

مقاصد و خدمات کے آئینے میں

از

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان
کراچی

جمعیت علمائے ہند

مقاصد وخدمات کے آئینے میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

الحمد للہ و کفی و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

(۱)

اغراض و مقاصد

دستور اساسی جمعیت علمائے ہند کی دفعہ ۵ ملاحظہ فرمایئے، جس کے الفاظ یہ ہیں :

دفعہ (۵) جمعیت علمائے ہند کے اغراض و مقاصد حسبِ ذیل ہوں گے۔

(الف) اسلام، شعائرِ اسلام اور مسلمانوں کے مآثر و معابد کی حفاظت۔

(ب) مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی، تمدنی اور شہری حقوق کی تحصیل و حفاظت۔

(ج) مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح۔

(د) ایسے اداروں کا قیام جو مسلمانوں کی تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی (سوشل) زندگی کی ترقی و استحکام کا ذریعہ ہو۔

(ہ) اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انڈین یونین کے مختلف فرقوں کے درمیان میل جول پیدا کرنا اور اس کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنا۔

(و) علوم عربیہ و اسلامیہ کا احیا اور زمانۂ حال کے مقتضیات کے مطابق نظامِ تعلیم کا اجرا۔

(ز) تعلیماتِ اسلامی کی نشر و اشاعت۔

(ح) اسلامی اوقاف کی تنظیم و حفاظت۔

(۲)

جمعیت علمائے ہند کے پیش رو اکابر

اس سے پہلے کہ جمعیت علمائے ہند کی خدمات کا تذکرہ کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگانِ دین، رہنمایان قوم اور زعمائے ملک کے اسمائے گرامی پیش کر دیے جائیں جو جمعیت علمائے ہند کے بانی اور اس کے معمار ہیں۔ جن کے تدبر و تفکر اور جن کی مخلصانہ جد وجہد کی آبیاری سے یہ گلشن شاداب ہوا۔ جس کے پودے آج پورے ہندیونین میں سرسبز ہیں اور جس کی شاخیں وطن عزیز کے قصبات و دیہات میں پھیلی ہوئی ہیں۔

شیخ الہند قطب عالم حضرت مولانا محمود حسن صاحب (اسیر مالٹا) قدس اللہ سرہ العزیز۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ العزیز۔

حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند قدس اللہ سرہٗ

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد رحمہ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا عبدالباری صاحب (فرنگی محل لکھنو) رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب رحمہ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ابو المحاسن مولانا محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبۂ بہار رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا سید محمد فاخر صاحب الٰہ آبادی قدس اللہ سرہٗ۔

(سجادہ نشین دایرہ حضرت شاہ اجمل صاحب)

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی قدس اللہ سرہٗ العزیز۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب (دہلوی) رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند)۔

حضرت مولانا معین الدین صاحب اجمیری قدس اللہ سرہٗ العزیز۔

عالی جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا ابو القاسم صاحب سیف بنارسی رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا عبد الماجد صاحب بدایونی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا محمد صادق صاحب (کراچی) رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا عبد الحق صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا بشیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا نور الدین صاحب بہاری رحمۃ اللہ علیہ۔

مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب، جو یکم ربیع الاول ۱۳۸۲ھ، ۲؍ اگست ۱۹۶۲ء تک مسلمانان ہند کے پشت پناہ اور جمعیت علمائے ہند کے روح رواں رہے، جن کو مسلمانوں کے اس دور کا جو انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد سے شروع ہوا، بانی اور ملت کی اس تعمیر جدید کا معمار اوّل کہنا درست اور بجا ہے۔ (رحمہ اللہ)

ان بزرگوں کی ایثار شیوہ پاک زندگی ہمارے لیے سبق ہے۔ رحمہم اللہ ورضی عنہم اللہ تعالیٰ توفیق بخشے کہ ہم ان کے لگائے ہوئے چمن کو شاداب رکھیں اور ترقی دیں۔

(۳)

تبلیغی، تعلیمی اور اصلاحی خدمات

............(۱)............

مشرقی پنجاب اور ہماچل پردیش:

۱۹۴۷ء میں جب مشرقی اور مغربی پنجاب کی آبادی کا تبادلہ ہوا تو یہ خیال کر لیا گیا تھا کہ مشرقی پنجاب اور ہماچل پردیش کے بائیس (۲۲) اضلاع میں مسلمان کو رہنے کا حق نہیں ہے۔ چناں چہ دیہات اور قصبات کے تقریباً تین لاکھ مسلمان جو غربت، افلاس اور معاشی مشکلات کی وجہ سے پاکستان نہیں جا سکتے تھے، اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے کے لیے تبدیل مذہب کے اظہار پر مجبور ہوئے (اگرچہ ان کے دل اسلام کی سچائی کے معترف تھے اور ان میں بہت سے وہ بھی تھے جو چھپ چھپ کر نماز بھی پڑھتے رہے)۔ جمعیت علمائے ہند کے سابق ناظم اعلیٰ حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازے اور آپ کے مراتب جنت الفردوس میں بلند فرمائے۔ آپ کی کوششوں سے پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہند نے مذہبی آزادی اور مشرقی پنجاب اور پیپسو کے ان مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ایک خاص سرکلر جاری کیا، جو دیہات کے

پٹواریوں اور چوکیداروں تک پہنچادیا گیااور جمعیت علماے ہند کے کارکنوں نے اس کی اطلاع عام مسلمانوں تک بھی پہنچادی۔

اس سرکلر میں خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ جو لوگ ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلمان تھے وہ اب بھی مسلمان ہی ہیں۔ وہ آزادی سے اپنے اسلام کا اظہار کر سکتے ہیں اور مذہبی عبادات ادا کر سکتے ہیں۔ ان پر نہ کوئی قانونی پابندی ہے اور نہ کوئی شخص یا کوئی جماعت ان کی مذہبی آزادی میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے۔

اس مبارک کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے فضل و کرم سے مشرقی پنجاب اور پیپسو کے یہ لاکھوں مسلمان جو دیہات میں اِکادُکا آباد ہیں آزادی سے اپنے اسلام کا اظہار کر رہے ہیں اور جمعیت علماے ہند کی طرف سے ان کی مذہبی تعلیم کا انتظام پوری جانفشانی سے کیا جارہا ہے۔ چناں چہ ہماچل پردیش پیپسو اور مشرقی پنجاب میں بہت سی مسجدیں کھلوا کر امام مقرر کر دیے گئے ہیں، جو نماز بھی پڑھاتے ہیں اور قرب وجوار میں نکاح خوانی اور نمازِ جنازہ وغیرہ کے اسلامی احکام بھی انجام دیتے ہیں۔

تقریباً ایک سو مذہبی تعلیم کے مکاتب اور مدرسے قائم ہو چکے ہیں، جن کی مالی ضرورتیں اگر اس علاقے کے مسلمان پوری نہیں کر سکتے تو جمعیت علماے ہند کی طرف سے ان کی امداد جاری کر دی جاتی ہے۔

جمعیت علماے ہند کے مبلغ ان علاقوں میں دورے کر رہے ہیں اور دیہاتی مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کر کے مکاتب قائم کر رہے ہیں۔

............(۲)............

الور، بھرت پور اور گوڑگانوہ :

الور، بھرت پور اور گڑگانوہ ضلع کے تقریباً چار لاکھ میو اور ایک لاکھ سے زیادہ غیر میو

مسلمان جو ۱۹۴۷ء میں تباہ و برباد ہو چکے تھے، جمعیت علماے ہند کے مخلص کارکنوں کی کوششوں، گاندھی جی، شری ونوبا بھاوے اور ان کے سوشل ورکروں کے تعاون سے بفضلہ تعالیٰ دوبارہ آباد ہو چکے ہیں۔ اور جو لوگ مذہب بدل کر اپنے گاؤں میں رہ گئے تھے، جمعیت علماے ہند اور قومی کارکنوں کی ہمت افزائی سے دوبارہ اسلام پر قایم ہو چکے ہیں۔

ان علاقوں میں دو سو (۲۰۰) سے زیادہ دینی اور مذہبی تعلیم کے مکتب اور مدرسے قائم ہیں، جن میں سے ابتدا تقریباً چالیس (۴۰) مدرسوں اور مکتبوں کو جمعیت علماے ہند کی طرف سے ماہانہ امداد دی جاتی رہی، یہاں تک کہ وہ خدا کے فضل سے خود متکفل ہو گئے۔

............(۳)............

علاقہ بیاور ضلع اجمیر شریف :

تحصیل بیاور (علاقہ اجمیر شریف) کے دیہات کے تقریباً ایک لاکھ (مراتی اور چیتا) مسلمانوں کو ۱۹۴۷ء میں مجبور کیا گیا کہ وہ سابق برادری میں مخلوط ہو کر انھیں کا مذہب اختیار کر لیں، ورنہ وہ پاکستان چلے جائیں۔ جمعیت علماے اجمیر شریف کے ذمہ دار ارکان کو جب اس کا علم ہوا تو باوجودے کہ زمانہ پر آشوب اور حالات حد سے زیادہ خطرناک تھے، مگر ان حضرت نے حوصلہ اور ہمت سے کام لے کر مخالفین کا پروپیگنڈا ختم کیا۔ ان پسماندہ مسلمانوں کی کانفرنس کرا کر چیف کمشنر صاحب سے مذہبی آزادی کا اعلان کرایا۔ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا اطمینان دلایا۔ چناں چہ خدا کے فضل و کرم سے یہ لوگ اپنی جگہ مطمئن ہیں اور جمعیت علماے ہند کے مبلغ اس علاقے میں دورہ کر کے ان کو تعلیم کی طرف متوجہ کر رہے ہیں اور دینی مکاتب قائم کر کے تعلیم کا سلسلہ جاری کر رہے ہیں۔ چناں چہ غیر معمولی مشکلات کے باوجود تیرہ (۱۳) مدرسے اس علاقہ میں قایم ہو چکے ہیں۔

............(۴)............

ضلع کھیڑا وغیرہ صوبہ گجرات:

ایک ناخواندہ اور تعلیم اسلام سے ناآشنا برادری، جس کو مولاء اسلام گراسیہ کہا جاتا ہے، جس کی تعداد ضلع کھیڑا اور ضلع سورت و احمد آباد میں تین لاکھ سے زیادہ ہے، مارچ ۱۹۵۲ء میں اس کو شدھ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مرکزی جمعیت علماء ہند اور جمعیت علماء صوبۂ گجرات کی فوری توجہ اور دوڑ دھوپ کی وجہ سے بفضلہ تعالیٰ مخالفین کی کوششیں ناکام رہیں۔ پھر جمعیت علماء صوبۂ گجرات کے ماتحت ایک خاص شعبہ "انجمن اصلاح المسلمین" کے نام سے قایم کر دیا گیا، جو اس علاقہ میں تقریباً دو سو (۲۰۰) مدرسے قایم کر چکا ہے اور جن مواضعات میں مسجدیں نہیں تھیں وہاں مکتبوں کے ساتھ مسجدیں بھی تعمیر کرائی جا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو مبارک اور کامیاب فرمائے۔

............(۵)............

تحریک شدھی کا مقابلہ:

اسی طرح ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں جب برطانوی سامراج کے ہوشیار ایجنٹوں نے چند اونچے درجے کے ہندو رہنماؤں کے ذریعے ارتداد (شدھی) کی تحریک چلا کر ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کی اس فضا کو جو تحریکِ خلافت کے زمانے (۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۲ء) میں پیدا ہوئی تھی برباد کرنا چاہا، جس کے نتیجے میں یو۔پی، گجرات اور راجستھان کے بعض اضلاع میں طرح طرح کے اثرات سے متاثر ہو کر ناآشنائے مذہب اور ناواقف مسلمان (معاذ اللہ) مرتد ہونے لگے۔ تو جمعیت علماء ہند نے شعبۂ تبلیغ قائم کر کے پوری قوت سے ارتداد کے اس فتنۂ عظیم کا مقابلہ کیا اور اس کو ناکام بنایا۔ جو مسلمان مرتد ہو چکے تھے ان کو دوبارہ اسلام سے مشرف کیا۔

دیہات میں جہاں ممکن ہو سکا مسجدیں تعمیر کرائیں۔ بچوں کی تعلیم کے لیے ڈیڑھ سو (۱۵۰) سے زیادہ مکاتب قایم کیے۔ تعلیم بالغان کا سلسلہ جاری کیا۔

............(۶)............

دینی تعلیمی تحریک اور دینی تعلیمی کنونشن

منعقدہ بمبئی ۱۹۵۴ء:

جمعیت علمائے ہند کا سب سے مقدم بنیادی کارنامہ یہ ہے کہ جیسے ہی جمہوریہ ہند کا نظامِ حکمت سیکولر (لادینی) قرار دیا گیا تو جس طرح اس کے مفید نتیجوں کی توقع میں سیکولر ازم اور جمہوریت کو کامیاب بنانے کی کوشش شروع کی، ایسے ہی بلکہ اس سے بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ مذہبی تعلیم کے حق میں جمعیت علمائے ہند نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا۔

کیا آپ اس بات کی قدر نہیں کریں گے کہ ابھی انقلاب کو چند ماہ گزرے تھے، مشتعل جذبات کے تنور ابھی دہک رہے تھے، یہاں تک کہ گاندھی جی جیسے صلح پسند انسان کی جان بھی محفوظ نہیں تھی (چناں چہ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو ان کے قتل کا اندوہناک حادثہ پیش آچکا تھا)، لیکن اس ہیبت ناک اور وحشت انگیز دور اور ان سخت ترین حالات میں جمعیت علمائے ہند اگر جان کی بازی لگا کر مسلمانوں کی جانیں بچانے اور ان کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھنے کا بنیادی فرض انجام دے رہی تھی، تو ساتھ ہی ساتھ وہ دین و ایمان کی حفاظت کا پروگرام بھی طے کر رہی تھی۔

جمعیت علمائے ہند کے اکابر اور ارکان کی بصیرت، دور اندیشی اور ایمانی فراست یقین رکھتی تھی کہ قتل و خونریزی اور لوٹ مار کے یہ ہنگامے کتنے ہی سخت سہی، مگر چند روزہ ہیں، ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں۔ ان کا نقصان بھی چند حلقوں میں محدود ہے۔ پوری ملت کے

لیے عام نہیں ہے۔ البتہ لادینی حکومت اور لازمی اور جبری تعلیم کے نتیجے میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا مسئلہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اس کے اثرات ہمہ گیر اور پشتہا پشت تک جاری رہنے والے ہیں۔ پھر جیسے جیسے سیکولر نظام کامیاب ہوگا، مذہبی اور دینی تعلیم کی اہمیت بڑھتی رہے گی اور اس کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی رہے گی۔

جمعیت علمائے ہند نے انھیں تصورات کے ساتھ ۱۹۴۸ء کے آغاز سے ہی کام شروع کر دیا۔ چناں چہ یکم فروری ۱۹۴۸ء، ۲۰ ربیع الاول ۱۳۶۷ھ یعنی گاندھی جی کے حادثے سے تیسرے ہی دن جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاس نے دینی تعلیم کی تحریک کی بنیاد ڈال دی۔ اس وقت اگرچہ اس تحریک کو "ملاگردی" کا شاخسانہ سمجھا گیا، مگر جمعیت علمائے ہند کی نظر مستقبل پر تھی۔ اس نے ہمت پست کرنے کے بجائے دینی تعلیم کو نصب العین اور اپنا سب سے مقدم پروگرام بنا لیا اور تقریروں، تحریروں، رسالوں اور پمفلٹوں کے ذریعے اس کی اہمیت اور ضرورت بیان کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی وہ عظیم الشان کنونشن تھا جو دسمبر ۱۹۵۴ء میں بمبئی میں کیا گیا۔ جس میں سنی اور شیعوں کے تمام فرقے مل کر بیٹھے اور دینی تعلیم کے حق میں سب نے اتفاق رائے سے فیصلے صادر کیے۔

............(۷)............

دینی تعلیم کا نصاب، چارٹ، طریقۂ تعلیم اور معاون کتابیں:

پراچین کلچر اور پرانی تہذیب کو لادنے کی جو آواز اٹھائی جا رہی ہے اور اس طبقے کی طرف سے غیر مذہبی لازمی تعلیم کے نفاذ سے جو خطرات پیش آسکتے ہیں، ان کے انسداد کے لیے جمعیت علمائے ہند کی کوششیں وسیع پیمانے پر جاری ہیں۔

اس سلسلے کی سب سے بہتر اور مستحق مبارک باد سنہری کڑی وہ نصاب ہے جس کی

کتابیں خدا کے فضل و کرم سے شائع کی جا چکی ہیں اور جہاں پہنچ رہی ہیں عام مقبولیت حاصل کر رہی ہیں۔ ان کتابوں میں نماز، روزہ وغیرہ عبادات کی تعلیم کے ساتھ سیرت رسول علیہ السلام، اسلامی عقاید، اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب کا بھی ایسا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے کہ اگر بچے اور بڑے اس سے واقف ہو کر اس پر عمل پیرا ہوں تو ان کا اسلامی رنگ ایسا نکھر جائے کہ پھر لازمی تعلیم کا کوئی بھی کورس اس کو زنگ آلود نہ کر سکے۔

ان کتابوں کی زبان نہایت آسان اور اُردو ادب کی پوری چاشنی لیے ہوئے ہے۔

طرزِ تحریر ایسا دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

آپ لازمی تعلیم کے تمام مضامین بچوں کو پڑھائیے، تاکہ آپ کے بچے دنیاوی تعلیم کے میدان میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔ البتہ صرف ڈیڑھ گھنٹہ اور زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے یومیہ بچے کا اس نصاب کی کتابوں اور قرآن شریف کے لیے مخصوص کر دیجیے۔ پرائمری تعلیم کے پانچ سال میں بچہ جس طرح پرائمری کے امتحانات میں کامیاب ہوگا، وہ اس نصاب کی تعلیم پاکر قرآن حکیم اور اسلام کی تمام ضروری تعلیمات سے بھی ایسا واقف ہو جائے گا کہ وہ ہندیونین میں خدا پرست، بااخلاق، علم بردار توحید، مہذب شہری کی حیثیت سے آگے بڑھے گا اور ترقی کرے گا اور جیسے وہ وطن کا سچا وفادار اور اہل وطن کا مخلص خادم ہوگا، اسی طرح وہ مذہب اور اسلامی تہذیب کا بھی بہادر محافظ ہوگا۔ (ان شاء اللہ العزیز)

اردو عربی رسم خط کو آسان کرنے کے لیے خاص طریقۂ تعلیم اور خاص قسم کا قاعدہ بھی ایجاد کر دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ مذہبی ماحول پیدا کرنے اور بچوں کے دماغوں میں دینی تصورات، اسلامی تہذیب اور اسلامی اخلاق کا رنگ پختہ کرنے کے لیے خاص خاص چارٹ بھی تیار کر دیے گئے ہیں، جو معنوی خوبیوں کے ساتھ ظاہری خوبیوں میں بھی اپنی نظیر آپ ہیں۔ چناں چہ کوئی بھی صاحبِ ذوق ان کی تعریف و تحسین کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نصاب کی کتابوں کے ساتھ ایسے کتابچوں کی بھی ضرورت محسوس کی گئی جو بچوں کی

ذہنی اور دماغی تربیت کے لیے مفید ہوں اور جس طرح وہ آسان اور ایسے دل چسپ ہوں کہ بچوں کا دل لگے، ایسے ہی وہ انبیاء علیہم السلام، صحابۂ کرام، خلفاے راشدین، ائمۂ مجتہدین، اکابر اولیاء اور مشاہیر اُمت کے ان حالات پر بھی مشتمل ہوں، جن سے بچے سلیقہ، تہذیب، شرافت اور اعلیٰ اخلاق کا سبق لے سکیں۔

خدا کا شکر ہے اس سلسلے کے بارہ کتابچے شائع ہو چکے ہیں۔ مزید زیرِ اشاعت ہیں۔

ایسے ہی دل چسپ طریقۂ تعلیم کے متعلق کتابیں بھی ترتیب دے دی گئی ہیں اور جگہ جگہ تربیتی کیمپ قائم کر کے استادوں کو تعلیم و تربیت کے طریقوں کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے اور اس بنا پر کہ جو بچے یا بڑے اردو سے ناواقف ہوں وہ بھی مذہبی تعلیم سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ تعلیم الاسلام کے چاروں حصوں اور دینی تعلیم کے رسالوں کا ترجمہ ہندی میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ ہندی کا ایسا نصاب بھی مرتب کیا گیا ہے کہ جو تین سال میں پانچ سالہ تعلیم کی قابلیت پیدا کر سکے، تاکہ جن اسلامی مدرسوں یا مکتبوں میں ہندی کی تعلیم درجہ ۲ سے شروع ہوتی ہے وہ اس نصاب سے فائدہ اٹھا سکیں۔ جنرل سائنس اور معلوماتِ عامہ کی کتابیں جو سرکاری کورس میں داخل ہیں اُن کے متبادل کتابیں بھی شائع کی جا رہی ہیں جو ان شاء اللہ بہترین نمونہ ہوں گی۔

(۴)

جمعیت علماے ہند کی سیاسی خدمات

(۱) جمعیت علماے ہند کے اکابر اور بانی حضرات نے ۱۹۱۲ء یعنی جنگِ بلقان کے زمانے میں ترکوں کی حمایت میں ہر طرح کی امداد دی اور جنگِ طرابلس کے زمانے میں ترکوں کی حمایت کے لیے وفد بھیجا۔

(۲) ۱۹۱۴ء سے انقلابی تحریک چلائی جو ریشمی خطوط کی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔

(۳) ۱۹۱۶ء میں کابل میں ہندوستان کی آزاد گورنمنٹ قائم کی، جس کا پریسیڈنٹ راجہ مہندر پرتاپ کو بنایا گیا، جو جنگِ جرمنی کے ختم ہو جانے سے اسی طرح ناکام ہو گئی جیسے ۱۹۴۴ء میں نیتاجی سوبھاش چندر بوس کی تحریک جاپان کی ہار کی وجہ سے ناکام ہوئی۔

(۴) ۱۹۱۶ء میں اس تحریک کے سب سے بڑے رہنما شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا عزیر گل صاحب اور ان کے رفقا کو حجاز شریف سے گرفتار کر کے چار سال تک مالٹا میں نظر بند رکھا گیا اور حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ، مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاری مرحوم کا ہندوستان میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔

(۵) ۱۹۱۹ء میں جمعیت علماے ہند کی باضابطہ تشکیل ہوئی، پہلا انتخاب عمل میں آیا

اور جمعیت علماے ہند نے اپنے سب سے پہلے اجلاس میں ہندوستان کی تمام جماعتوں سے پہلے وطن عزیز کی مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔

(۶) ۱۹۲۰ء میں جمعیت علماے ہند نے انگریزی حکومت اور انگریزی فوج سے بائیکاٹ کا فتویٰ صادر کیا۔ حکومت نے اس فتوے کو ضبط کیا۔ جمعیت علماے ہند نے اس کو بار بار شائع کر کے قانون شکنی کی۔ اس فتوے کے اعلان کی بنا پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اور ان کے ساتھ مولانا محمد علی صاحب جوہرؔ، مولانا شوکت علی صاحب، مولانا نثار احمد صاحب وغیرہ پر کراچی کا مشہور تاریخی مقدمہ چلا۔ پھر جمعیت علما کی اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہزاروں مسلمان گرفتار ہوئے۔

(۷) ۱۹۲۷ء میں ہندوستان کی تمام جماعتوں سے پہلے سائمن کمیشن کے خلاف اپنی راے ظاہر کی اور اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔

(۸) ۱۹۲۹ء میں جب گاندھی جی نے نمک کی تحریک شروع کی تو مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقا نے گاندھی جی کے مشہور مارچ میں جو ڈانڈی کی طرف ہوا تھا، گاندھی جی کا ساتھ دیا۔

(۹) اسی دور میں جب عدم ادائیگی لگان کی مشہور تحریک سردار پٹیل کی قیادت میں باردولی میں چلائی گئی اور اس سلسلے میں جائدادیں ضبط ہو کر نیلام ہونے لگیں تو مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب مدظلہ العالی (۱) نے تحریک کی حمایت اور نیلام ہونے والی جائدادوں خریدنے کی ممانعت کا فتویٰ صادر کیا۔

(۱۰) ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک تحریکِ آزادی ہند میں کانگریس کے دوش بدوش حصہ لیا اور ہزاروں مسلمانوں نے جمعیت علماے ہند کے پلیٹ فارم سے تحریکِ آزادی میں حصے لیتے ہوئے گرفتاری، نظر بندی، ضبطی جایداد، جرمانے، ملازمت سے برطرفی اور لاٹھی چارج وغیرہ کی سزائیں بھگتیں۔

(۱۱) ۱۹۳۶ء میں کیمونل ایوارڈ کی مخالفت کی اور کانگریس کے ساتھ آزاد انتخابات

میں حصہ لے کر رجعت پسند طاقتوں کو ناکام اور قوم پرور ہندو مسلمانوں کو کامیاب کیا۔

(۱۲) ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک تحریکِ آزادیٔ ہند میں کانگریس کے دوش بدوش جمعیت علمائے ہند کے اراکین نے عظیم الشان قربانیاں پیش کیں۔ ہزاروں کی جایدادیں ضبط ہوئیں۔ جرمانے بھگتے، جیلیں کاٹیں اور نظربند کیے گئے۔

(۱۳) ۱۹۴۵ء میں تقسیم ہند اور مطالبۂ پاکستان کے خلاف متحدہ ہندوستان اور متحدہ قومیت کے اصول پر الیکشن لڑا اور ثابت کر دیا کہ تقریباً چالیس (۴۰) فی صدی مسلمان اس تحریک کے مخالف اور متحدہ ہندوستان کے حامی ہیں۔

(۱۴) ۱۹۴۷ء سے آج تک فرقہ پرست طاقتوں کا سرگرمی سے مقابلہ کرتے ہوئے سیکولرزم کو کامیاب کرنے کی سرگرم جدوجہد جاری کیے ہوئے ہے، تاکہ ہندیونین کا ہر ایک فرقہ آزادیِ رائے، آزادیِ مذہب کی دولت سے بہرہ ور ہو اور ہندیونین مضبوط بنیادوں پر روز افزوں ترقی کر سکے۔

حاشیہ:

(۱) مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب (ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی، رکن مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند) اس زمانے میں اس علاقے کے مشہور تعلیمی ادارے "جامعۂ اسلامیہ، ڈابھیل" کے مفتی تھے۔

(۵)

کونسلوں اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں جمعیت علماے ہند کی خدمات

(۱) یاد ہوگا کہ ۱۹۲۹ء میں ایک بل مرکزی اسمبلی (دہلی) میں پیش کیا گیا، جو سار دا بل پھر سار دا ایکٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ جس کی رو سے اسلام کے قانون ازدواج میں بیجا مداخلت کی گئی تھی۔ جمعیت علماے ہند نے اس کی مخالفت کر کے اس کو بے اثر بنا دیا۔

(۲) ۱۹۳۰ء میں صوبۂ سرحد کی کونسل میں اور ۱۹۳۵ء میں صوبہ پنجاب کی کونسل میں شریعت بل پیش کرا کر پاس کرایا، تاکہ یو۔پی کی طرح ان صوبوں میں بھی ترکے کی تقسیم رواج کے بجاے اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق ہو۔

(۳) ۱۹۳۱ء میں حجاج اور معلمین کے سلسلے میں حکومتِ ہند کی طرف سے مرکزی اسمبلی میں جو بل پیش کیے گئے تھے، جن کی رو سے حجاج پر بے جا پابندیاں اور حجاز و عرب کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا راستہ کھلتا تھا، جمعیت علماے ہند نے ان کی مخالفت کر کے حجاج کو پابندیوں سے آزاد کرا دیا اور حجاز شریف میں مداخلت کا راستہ بند کیا۔

(۴) مظلوم عورتیں جو ظالم شوہروں کی وحشت و بربریت سے تنگ آکر خودکشی، اغواء اور معاذاللہ ارتداد جیسے شرمناک جرائم میں مبتلا ہو جایا کرتی تھیں اور شریعتِ مطہرہ کی عطا کردہ گنجایش سے فایدہ نہیں اٹھا سکتیں تھیں، ان کی گلو خلاصی کے لیے قانون انفساخ نکاح کا مسودہ مرتب کرا کر مرکزی اسمبلی میں پیش کرایا جو قانون بن کر عرصے سے نافذ ہے اور اگر مسلمان اپنے اپنے حلقوں میں شرعی پنچایتوں کا نظام باضابطہ کر لیں تو اس قانون کے نفاذ میں شرعی لحاظ سے جو مشکلات پیش آتی ہیں، وہ بھی ختم ہو جائیں۔

(۵) اسلامی اوقاف کی حفاظت کے لیے برطانوی دورِ حکومت یعنی ۱۹۳۲ء میں مسودۂ قانون مرتب کر کے یوپی کونسل میں پیش کرایا، پھر بہار کونسل میں یہ قانون پاس کرایا گیا۔ تقسیم ہند کے بعد ہند یونین کے تمام ہی اوقاف خطرے میں پڑ گئے تھے، کیوں کہ بہت سے صوبوں میں کوئی قانون نہیں تھا اور سوراشٹر، اڑیسہ، مشرقی پنجاب، ہماچل پردیش جیسے صوبوں میں جہاں مسلمانوں کا وجود لیجسلیچر اور قانون ساز اسمبلیوں میں قطعاً غیر موثر اور برائے نام یا بدرجۂ صفر ہے، اسمبلیوں کے ذریعہ مسلم اوقاف کے لیے کسی قانون کے بننے کا امکان ہی نہیں تھا تو کوشش کی گئی کہ مرکزی حکومت کی پارلیمنٹ کے ذریعے اوقاف کا قانون بنوایا جائے اور اس کو صوبجات میں نافذ کرایا جائے۔ باوجودے کہ تحفظ اوقاف صوبائی حکومتوں کے اختیارات کا مسئلہ ہے، مگر حضرت مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں سے یہ گنجائش پیدا کی گئی کہ ہند پارلیمنٹ صوبائی مسئلے کے متعلق قانون بنائے۔ الحمد للہ یہ جدوجہد کامیاب ہو گئی اور باوجودیکہ بہت سے عاقبت نااندیشوں نے اپنی غلط فہمیوں کی بنا پر شدید مخالفتوں کے باعث مشکلات میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا، پھر بھی خدا کے فضل و کرم اور اراکین جمعیت علمائے ہند بالخصوص حضرت مولانا آزادؒ و مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ سابق رکن ہند پارلیمنٹ کی غیر معمولی جدوجہد سے ۱۹۵۴ء میں پارلیمنٹ نے یہ وقف ایکٹ منظور کر لیا۔ آج اس ایکٹ کے ذریعے ہر ایک صوبے میں حفاظتِ اوقاف کا قانون رائج ہے، وقف بورڈ بنائے جا رہے ہیں، بالخصوص مشرقی پنجاب میں جہاں مسلمان سب سے کم اور اوقاف سب سے زیادہ ہیں وقف بورڈ قائم ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے کہ حضرات اراکین اور وقف بورڈ کے کارپرداز اخلاص و محنت سے کام کریں تو ان اوقاف کے ذریعے مسلمانوں کے بہت سے اجتماعی مقاصد سچے اور پکے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کر کے جس طرح مسلمانان افریقہ کو بدظن کر دیا گیا تھا اور "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی مشرقی افریقہ اور نیروبی وغیرہ میں جاری کر کے جس طرح وہاں کے مسلمانوں کو سیاسی گمراہی میں مبتلا کرنے کا پلان بنایا گیا تھا، مجاہد ملت کے اس دورے نے نہ صرف بدگمانیوں کا کالا نقاب چاک کیا، بلکہ اس خود غرضانہ پالیسی کی بھی تار و پود بکھیر دی، جو برطانوی سامراج وہاں اختیار کر کے جداگانہ انتخاب کی نفرت انگیز تاریخ اس علاقے میں دہرانا چاہتا تھا۔ (وَبِاللّٰہِ التَّوفِیقُ وَھُوَ الْمُسْتَعَانُ)

کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ملک کے اندر

(۱) امارت شرعیہ کا قیام۔

(۲) اسلامی کلچر کی حفاظت کے لیے ضروری وسائل وذرائع۔

(۳) صوبۂ بہار میں اسلامی اوقاف کو ٹیکس سے مستثنیٰ کرانے۔

(۴) مظلومین اور شہدائے موپلا کی مالی امداد اور ان کے ذمے لگائے ہوئے غلط الزامات کی تردید۔

(۵) اُردو کے سلسلے میں جدوجہد۔

اور بیرونِ ملک

(۱) فرنٹیر کے آزاد قبائل، وزیری، محسودی، مہمندی اور آفریدیوں پر بمباری کے خلاف احتجاج۔

(۲) موتمر اسلامی منعقدہ مکۂ مکرمہ ۱۹۲۵ء میں ذمہ دارانہ شرکت۔

(۳) موتمر اسلامی منعقدہ قاہرہ ۱۹۳۸ء میں ذمہ دارانہ شرکت۔

(۴) مجاہدین فلسطین اور شہدائے ارضِ مقدسہ کی حمایت اور ان کی امداد۔

(۵) فلسطین، عراق، شام، ایران، ٹیونس وغیرہ کی تحریکاتِ آزادی کی حمایت، وقتاً فوقتاً ان کی مالی امداد، ان کے لیے مؤثر احتجاج اور اس کے علاوہ ہر ایک ممکن کوشش وغیرہ وغیرہ۔ (خدمات جمعیت علمائے ہند کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو "جمعیۃ علماء کیا ہے" حصہ اول ودوم)

دسمبر ۱۹۵۳ء اور جنوری ۱۹۵۴ء میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا سفر نیروبی و مشرقی افریقہ، جمعیت علمائے ہند کی عظیم الشان خدمت ہے۔ ان وسیع اور طویل علاقوں میں نہ صرف یہ کہ جمعیت علمائے ہند کا تعارف ہوا، بلکہ ہندیونین کے چار کروڑ

(۶)

۱۹۴۷ء اور اُس کے بعد ہنگامی حالات میں جمعیت علماے ہند کی امدادی خدمات

(۱) قتل و غارت گری کا سیلاب جو مشرقی پنجاب سے گزر کر دہلی اور یو۔پی کے مغربی اضلاع سے ٹکرا رہا تھا، جمعیت علماے ہند کے جاں باز اور بہادر اراکین اس کے مقابلے میں ضبط و تحمل اور صبر و استقامت کی مضبوط چٹان بن کر کھڑے ہوئے۔ ان کی حوصلہ مندانہ ہمدردی نے تمام مسلمانوں کے حوصلے بھی بلند رکھے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے ان علاقوں میں مسلمان اسی نمایاں تعداد کے ساتھ باقی رہ گئے اور دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور، جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد جیسے عربی مدارس و اسلامی ادارے جو مسلمانوں کی سولہ سالہ کوششوں کا سرمایہ ہیں، بفضلہ تعالےٰ محفوظ رہے۔

(۲) ان علاقوں میں اس خونی سیلاب کو روک دینے کا عظیم الشان فائدہ (جس کو زمانے کا مورخ صفحات تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے گا) یہ ہوا کہ ہند یونین کے باقی مسلمان اس آفت سے محفوظ رہ گئے، کیوں کہ اگر یہاں قدم اکھڑ جاتے تو اس ہولناک سیلاب کی طوفانی موجیں ہند یونین کے آخری کناروں تک پہنچتیں اور ملتِ اسلامیہ کی شکستہ عمارت کو ہمیشہ کے لیے منہدم کر دیتیں۔ (معاذ اللہ)

(۳) فساد زدہ علاقوں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو اپنی جان پر کھیل کر، ان علاقوں سے نکالا اور اس طرح خدا کے فضل و کرم سے لاکھوں مسلمانوں کی جانیں بچائیں۔

(۴) دہلی، ضلع گڑگانوہ اور پلول وغیرہ میں مسلم پناہ گزینوں کے لیے کیمپ قائم کیے اور اللہ تعالیٰ کے لطف و احسان اور اہل خیر مسلمانوں کی امداد سے ان کے کھانے، پینے، بدن ڈھانکنے اور سردیوں میں جاڑے سے بچنے کا انتظام کیا۔

(۵) براہِ راست اپنے سرفروش کارکنوں کے ذریعے یا نیم سرکاری اداروں کی امداد سے ہزاروں اغواشدہ خواتین کو برآمد کر کے ان کے اعزا کے پاس پہنچایا۔

(۶) رات دن، بے پناہ اور انتھک کوششیں کر کے دہلی کے ہزاروں مکانوں کو شرنارتھیوں سے محفوظ رکھا۔ آج ان مکانوں میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان آباد ہیں۔

(۷) ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں قتل و غارت گری کی جو قیامت مسلمانوں پر نازل ہوئی تھی، اس کے علاوہ بہت بڑی آفت یہ تھی کہ یہی ستم رسیدہ مسلمان سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں بلوہ، قتل اور قاتلانہ حملہ وغیرہ وغیرہ کے الزام میں (جس کو متعصب کارپرداز تراش لیا کرتے تھے) گرفتار کر لیے گیے۔ جمعیت علماے ہند نے وکلا کے تعاون سے ایک قانونی امدادی کمیٹی قائم کی، جس کے ذریعے سے ہزاروں مسلمانوں نے اس مصیبت سے نجات پائی اور جب کسٹوڈین کی آفت برپا ہوئی تو بلاشبہ ہزاروں نادار مسلمانوں نے اس کمیٹی کے ذریعے کسٹوڈین کی اندھیر گردی سے نجات پائی۔

(۸) الور، بھرت پور (راجستھان)، گوڑگانوہ، انبالہ (مشرقی پنجاب)، دہرہ دون وغیرہ (مغربی یو۔پی) اور صوبۂ دہلی کے دیہات و قصبات میں ارکان جمعیت اور سوشل ورکروں کی کوششوں سے جو مسلمان دوبارہ آباد ہوئے ان کی تعداد آٹھ لاکھ کے قریب ہے۔ آبادکاری کے سلسلے میں ارکان جمعیت علما کی عملی جدوجہد ان علاقوں میں باربار آمد و رفت اور متعلقہ حکام اور وزرا سے باربار احتجاج کے علاوہ مرکزی جمعیت علماے ہند کو موقع بموقع ان کی مالی امداد بھی کرنی پڑی، جس کی تفصیل سالانہ رپورٹوں میں شائع ہو چکی ہے۔

(۹) تباہ شدہ علاقوں میں جہاں مسلمان آباد ہوئے، مسجدیں، امام باڑے، تکیے، قبرستان اور مزارات خالی کرائے گئے اور کرائے جارہے ہیں۔ جن مزارات پر عرس ہوا کرتے تھے (اختلافِ عقیدہ کے باوجود) وہاں عرس کی اجازت دلوائی، تاکہ مسلمانوں کے شہری حقوق بحال ہوں اور غیر مسلم حکومت اپنی ذمہ داری محسوس کرتی رہے اور اس کو یہ جرأت نہ ہو کہ اختلافِ عقیدہ کے بہانے مسلمانوں کے کسی اسلامی حق پر دست درازی کرے۔

(۱۰) جب مارچ ۱۹۴۸ء میں گودھرا (صوبہ بمبئی) میں قیامت خیز ہنگامہ پیش آیا، جس میں دو ہزار پانچ منزلہ اور چار منزلہ عظیم الشان بلڈنگیں نذر آتش ہوئیں اور کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔

(۱۱) ریاست جوناگڑھ کے خاتمے کے بعد جب دہشت انگیزی اور غارت گری کے تباہ کن سیلاب نے سوراشٹر (کاٹھیاوار) کے لاکھوں مسلمانوں کا ناطقہ بند اور ان کی زندگی دوبھر کر دی، یہاں تک کہ وہ مل بیٹھ کر اپنے مستقبل کے متعلق غور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

(۱۲) جب ستمبر ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد کے خلاف پولیس ایکشن کیا گیا، جس کی تباہی و بربادی کی داستانِ الم سے ہر شخص واقف ہے۔

(۱۳) دسمبر ۱۹۴۹ء میں جب فسادات کا ایک سلسلہ بنگال سے شروع ہوا، جس میں مغربی بنگال اور آسام میں لاکھوں مسلمان تباہ ہوئے، جس کے شعلے یو۔پی کو جھلتے ہوئے مارچ ۱۹۵۰ء میں دہلی تک پہنچے۔

جب فرقہ پرستوں کی ایک سوچی سمجھی اسکیم نے (کہ تجارت پیشہ مسلمانوں کو تباہ کیا جائے) دھوراجی، جیت پور (وغیرہ سوراشٹر)، نیمچ، برہانگر، اجین، گوالیار وغیرہ (مدھیہ بھارت)، امراؤتی (برار) کٹنی وغیرہ (مدھیہ پردیش)، دوحد، سید پور وغیرہ (گجرات)، مالپورہ، ٹونک، جے پور وغیرہ (راجستھان) میں دہشت انگیزی اور غارت گری کے ہنگامے برپا کیے۔

اور جب ہوس اقتدار اور اس ناپاک جذبے کی بنا پر کہ مسلمانوں کا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہو (اور وہ صرف اکثریت کے زیر دست اور ان کے رحم و کرم کے سہارے زندگی گزارنے پر مجبور ہوں) بھوپال، مبارک پور، لاہر پور، فیروز آباد وغیرہ میں ظلم و ستم کا ایک نیا کھیل کھیلا گیا، جس میں مقامی حکام اور پولیس بھی فرقہ پرستی کے روپ میں کھل کر سامنے آئے اور انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو فرقہ پرست پارٹی کے والنٹیر کر سکتے ہیں، تو جمعیت علماے ہند کے وفود ان علاقوں میں اِنھیں خطرناک حالات میں پہنچے، مسلمانوں کے زخمی دلوں پر ہمدردی اور غم خواری کا مرہم رکھا، ان کے پراگندہ اور مایوس دماغوں کو مطمئن کیا، ذمہ داران حکومت کو احساس فرض پر آمادہ کیا، ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کو ذمہ دار وزرا کے سامنے پوری قوت اور بے باکی سے پیش کیا، فرقہ پرست دماغوں کو جو مسلمانوں کو مرعوب اور دستِ نگر بنا کر رکھنا چاہتے ہیں، ان کو بتادیا کہ مسلمان ہند یونین میں کسی کے دستِ نگر نہیں، بلکہ اپنی باوقار حیثیت کے ساتھ رہیں گے اور مقامی طور پر آپس کے تعلقات خوش گوار بنا کر خوف و ہراس، نفرت و وحشت کی بجائے جذبۂ رواداری کی طرح ڈالی جو بفضلہ تعالیٰ مستقبل کے لحاظ سے کامیاب رہی۔

اور جب فساد زدہ علاقوں کے بے پناہ مسلمانوں نے اپنے یہاں ایسے وفود کو دیکھا (جو مرکزی جمعیت علماے ہند کی طرف سے ہندوستان کے دارالسلطنت (دہلی) سے سیکڑوں میل اور کہیں ہزار بارہ سو میل کی مسافت طے کر کے محض ہمدردی کی بنا پر ان کے یہاں پہنچے تھے اور ان کو اطمینان ہوا کہ اس دھرتی کے اوپر اس آسمان کے نیچے ان کے ایسے ہمدرد ہیں جو ان کو تسلی دے سکتے ہیں اور اونچے سے اونچے سرکاری حلقے تک ان کی بات کو پہنچا سکتے ہیں، تو ان کے حوصلے بلند اور جذبات بیدار ہوئے اور روشن مستقبل کی ایک چمک ان کی نظروں کے سامنے آئی۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمایئے "مختصر تذکرۂ خدمات جمعیت علماے ہند" ہر چہار حصہ اور "علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" جلد دوم) حالیہ واقعات میں فیروز آباد پھر جبل پور اور ساگر وغیرہ کے تباہ کن ہنگامے اور ان کے سلسلے میں جمعیت علماے ہند کی

امدادی خدمات سامنے ہیں، محتاج بیان نہیں۔ عیاں راچہ بیان۔

(۱۶) جب ۱۹۵۹ء سے فسادات نے نئی صورت اختیار کی کہ مبارک پور، بھوپال، لاہر پور، فیروز آباد، پھر ۱۹۶۱ء کے فروری میں جبل پور اور ساگر وغیرہ میں جو فسادات ہوئے وہ ایسی سازشوں اور ایسے منصوبوں کا نتیجہ نظر آنے لگے، جن میں مقامی حکام اور پولیس کی شرکت کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ فسادات کے علاوہ ملازمتوں، سرکاری اداروں مثلاً پارلیمنٹ، اسمبلی، لوکل باڈیز وغیرہ میں مسلمانوں کی حق تلفی کے مظاہرے ہونے لگے تو ہندیونین کے تمام مسلمانوں کا مشترکہ اجتماع "کنونشن" کیا، جس کے نتائج بڑی حد تک مفید رہے اور ارباب اقتدار کو محسوس ہوا کہ مسلمان عضو معطل یا قالب بے روح نہیں ہیں، اور یہ کہ ان کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہے خدمات جمعیت علماے ہند کی مختصر فہرست اور ان کا تعارف۔

آپ کس طرح امداد کر سکتے ہیں؟

(۱) جمعیت علماء ہند کے اغراض و مقاصد سمجھ کر آپ اس کے ممبر بنیے۔ (۲) جمعیت علما کے انتخابات میں حصہ لے کر ایسے حضرات کو عہدے دار بنایئے جو اپنی مخلصانہ جد و جہد اور محنت اور کوشش سے جمعیت علما کے مقاصد اور اس کے پروگرام کو کامیاب بنائیں۔ (۳) دینی تعلیم کے سلسلے کو زیادہ سے زیادہ وسیع کیجیے۔ مساجد میں ایسے امام مقرر کیجیے جو بچوں کی تعلیم و تربیت سے دل چسپی اور اس کا سلیقہ رکھتے ہوں۔ تربیتی سلسلے کی کوئی سند ان کے پاس ہو تو بہتر ہے۔ (۴) دینی تعلیم کے جو مکتب یا مدرسے آپ کے یہاں ہیں ان کی حتی التوسع پوری پوری امداد فرمایئے۔ (۵) مقامی جمعیت علما کے ذریعے اپنے یہاں مسلم فنڈ، دارالمطالعہ، کتب خانہ، دارالصنائع یا مسلم ہوسٹل قائم کیجیے۔ مسلم مسافر خانہ تعمیر کرایے۔ (۶) جمعیت ٹرسٹ کی اسکیم دفتر جمعیت علماء ہند، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی سے منگا کر مطالعہ فرمایئے اور اس میں حصہ لیجیے۔ (۷) ان مبارک مقاصد کے لیے دل کھول کر مالی امداد فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وما تقدموا لانفسکم (ت) اعظم اجراء (سورۂ مزمل) یعنی جو بھلائی بھی تم خود اپنے فایدے کے لیے پیش کر دو گے اس کو تم اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسی حالت میں پاؤ گے کہ وہ بہت بہتر ہو گی اور اس کا اجر و ثواب بہت بڑھا ہوا ہو گا۔

نیاز مند محتاج دعا

محمد میاں عفی عنہ

ناظم عمومی جمعیت علماء ہند

۲۵ر شعبان ۱۳۸۲ھ ۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۶۳ء

جمعیت علمائے ہند کا جھنڈا

از

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان

کراچی

جمعیت علماے ہند کا جھنڈا

صفحہ	فہرست	

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم
نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ الۡکَرِیۡم

جمعیت علمائے ہند کا جھنڈا

جب سے دنیا میں قومی اور جماعتی نظام کا وجود ہوا ایک ایسی چیز کو بھی ضروری سمجھا گیا جو اس قوم اور جماعت کی علامت ہو۔

جماعتی نظام کی ایک نشانی اور علامت وہ بھی ہے، جس کو عربی میں "علم" یا "رایة" اور اردو میں 'جھنڈا' کہا جاتا ہے۔

جھنڈے کی سیکڑوں اور ہزاروں صورتیں ہوتی ہیں۔ ہر ایک قوم یا جماعت کو حق ہے کہ وہ جو صورت چاہے، اختیار کرے، مگر عموماً اس اختیار وانتخاب میں قوم اور جماعت کے جذبات، عقائد یا تاریخی روایات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

۱۹۱۹ء میں جب جماعت علماء کی تحریک کا نیا دور شروع ہوا جس نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہ العزیز کی زیر سرپرستی جمعیۃ العلماء کی منظم شکل اختیار کی تو اس کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کی تنظیم کے لیے خلافت کمیٹی بھی وجود پذیر ہو چکی تھی۔

دونوں جماعتوں کا لائحۂ عمل ایک ہی تھا اور کارکن بھی تقریباً ایک ہی تھے، لہٰذا جمعیۃ العلماء کے لیے علاحدہ جھنڈے اور علاحدہ نشان کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

لیکن حوادث کی گردشوں نے خلافت کمیٹی کے نظام کو مضمحل کر دیا، حتی کہ رفتہ رفتہ اپنا وجود سنبھالنے کی طاقت بھی ختم ہو گئی۔ تو اب صرف جمعیت العلمائے ہند میدان میں باقی

رہ گئی اور کوئی ایسی جماعت نہیں رہی جو علما کی زیرِ قیادت حریتِ وطن اور تحفظِ ملت کے اہم ترین فرائض کو انجام دے۔ بے شک مسلم لیگ کا نظام ایک عرصے سے موجود تھا۔ وہ ۱۹۲۰ء میں ہی ثابت ہو چکا تھا کہ اس کے عافیت پسند، راحت کیش ارکان، انقلاب اور حریت کی پرخار وادیوں کا رخ بھی نہیں کر سکتے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم لیگ کا نظام اگر ترقی پذیر تحریکِ آزادی کا استقبال کر سکتا تو آل انڈیا خلافت کمیٹی کے مستقل ادارے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، بلکہ خلافت کمیٹی مسلم لیگ کے وسیع دائرے میں ایک سب کمیٹی کی حیثیت سے وجود میں آتی اور ضرورتِ وقت کے بموجب خدمات انجام دے کر اپنا ریکارڈ آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر میں محفوظ کرا دیتی۔

اس عرصے میں اس کو بار بار آزمایا گیا، اس کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا گیا، اس کے پلیٹ فارم پر پہنچ کر مانوس کرنے کی کوشش کی گئی، مگر افسوس واقعات نے یہی ثابت کیا کہ وہ فقرے غیر معمولی طور پر حقیقت افروز اور الہامی رنگ کے تھے جو ہندوستان کے بوڑھے مدبر علامہ شبلی نعمانی کے قلم سے سرزد ہوئے تھے:

> "لیگ کی بنیاد کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی گئی اس پر جو عمارت بنائی جائے گی ٹیڑھی ہوگی۔ لیگ کی پالیسی صرف یہ ہے کہ جو ملکی حقوق اور عہدے ہندوؤں نے حاصل کیے ہیں ان میں مسلمانوں کا حصہ معین کر دیا جائے۔ یہ حقیقی پالیٹکس نہیں۔ حقیقی پالیٹکس گورنمنٹ سے رعایا کے مطالبے کا نام ہے۔ اس جذبے میں مذہب کی برابر قوت ہوتی ہے۔ اس قوت کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کا ممبر کسی قسم کے نقصان اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا اور اپنے میں کوئی عزم اور دلیری نہیں پاتا"۔
>
> (حوالہ روشن مستقبل ص ۴۰۰)

گزشتہ چالیس سال کے عرصے میں دنیا کی چیزوں میں بے شمار تبدیلیاں ہو چکیں۔ مگر تعجب ہے کہ ان الفاظ کے مصداق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

بہر حال مسلم لیگ سے مکمل مایوسی کے بعد مسلمانوں کی صحیح تنظیم کی ضرورت اور اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ۱۹۳۹ء میں جب جمعیت علما کی ممبری کو عام کیا گیا تو

ضروری ہوا کہ اس جمعیۃ کا ایک جھنڈا بھی ہو! جماعت علما، جس کا طرۂ امتیاز اتباع سنت ہے اور جو ہر معاملے میں سرورِ کائنات رحمتہ للعالمین ﷺ کے نقش قدم پر چلنے کی عادی ہے، اور اسی کو معراج کمال سمجھتی ہے اور جو مسلمانوں کی صرف اُسی تنظیم کو ضروری اور مفید سمجھتی ہے جو اسوۂ نبویہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کے زیرِ سایہ سیرتِ مقدسہ کے آثار اور نشانات پر ہو اور جس کے نزدیک ترقیٔ مسلم صرف اسی حرکت میں ہے، جو قرون اولی کے مرکز کی طرف ان کو لوٹائے۔

اس نے جھنڈے کے متعلق بھی سیرت نبویہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کے صفحات پر نظر ڈالی۔ سید الکونین رحمتہ للعالمین ﷺ کے مشہور صحابی سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت نے نظر تجسس کو کامیابی بخشی۔

اس روایت کو علم حدیث کے چار جلیل القدر اماموں نے (احمد بن حنبل، ترمذی، ابوداؤد، نسائی (رحمہم اللہ) بالفاظ ذیل نقل کیا ہے:

"عن موسی بن عبیدة مولی محمد بن القاسم قال بعثنی محمد بن القاسم الی براء بن عازب رضی الله عنهما یسئله، عن رایة رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال کانت سوداء مربعة من نمرة"۔

ترجمہ: محمد بن قاسم رحمتہ اللہ علیہ کے غلام موسیٰ بن عبیدہ بیان فرماتے ہیں کہ محمد بن قاسم نے مجھ کو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ کے "رایۃ" کے متعلق دریافت کروں۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"سیاہ تھا مربع نمرہ کا"

حدیث شریف میں لفظ "سوداء" کے بعد لفظ من نمرۃ (نمرہ کا) نے یہ معین کر دیا کہ سودا سے خالص سیاہ مراد نہیں، بلکہ دھاری دار مراد ہے، جس میں سیاہ دھاریاں سفید کی نسبت زیادہ نمایاں ہوں۔ اس طرح کہ دور سے کالا نظر آتا ہو۔ کیوں کہ نمرہ اون کی چادر (یمنی) کو کہا جاتا ہے جس میں سفید دھاریاں ہوں۔

اس توضیح کے بعد معنی یہ ہوئے کہ وہ جھنڈا نمرہ کا تھا جس میں کالی دھاریاں زیادہ نمایاں تھیں اور وہ چوکور تھا۔ من نمرہ کی توضیح اور بیان کے بعد سوداء کو خالص سیاہ کے معنے میں لینا عرف اور لغت کے خلاف ہے۔

نمرہ کی وجہ تشبیہ بھی دھاریوں کے وجود کو لازمی اور ضروری گردانتی ہے، کیوں کہ نمر حقیقت میں چیتے کو کہتے ہیں۔ چیتے پر دھاریاں ہوتی ہیں۔ اسی تشبیہ کی بنا پر اس کملی کو نمرہ کہا جاتا ہے۔

علامہ علی قاری مشکواۃ کی شرح مرقاۃ میں فرماتے ہیں:

(قال القاضی) اراد بالسواد ماغالب لونه سواد بحیث یری من البعید اسودلا مالونه سواد خالص لانه قال من نمرہ (بالفتح والکسر) وھی بردۃ من صوف یلبسھا الا عراب فیھا خطیط من سواد و بیاض ولذالك سمیت نمرۃ تشبیھاً بالنمر ویقال لھا القباء ایضاً" (باب اعدادالة الجھاد الفصل الثانی ج م)

ترجمہ: سواد سے مراد ہے کہ سیاہ رنگ غالب تھا، اسی طرح کے دور سے کالا نظر آتا تھا۔ خالص سیاہ مراد نہیں، کیوں کہ اس کے بعد "من نمرہ" بھی کہا ہے اور نمرہ اون کی چادر (کملی) ہوتی ہے جس کو اعرابی پہنا کرتے ہیں اور اسی طرح قبا کو جس میں سیاہ اور سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔ اور دھاریوں کی وجہ سے نمرہ یعنی چیتے کی ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے اس کو نمرہ کہا جاتا ہے۔

مجمع البحار میں لاتلبسوا الخزّ والنمار کی تشریح کرتے ہوئے علامہ محمد طاہر فرماتے ہیں: "ھی الکساء المختلط" "وہ دھاری دار کملی ہوتی ہے"۔

حدیث: فجاء قوم مجتابی النمار، ھی کل شملة مخطط من ازرالاعرب بھی نمرۃ وجمعھا نمار کانھا اخذ من لون النمر لما فیھا من السوادو البیاض۔

کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "نمرہ ہر ایسے لباس کو کہا جاسکتا ہے جس میں دھاریاں ہوں۔ اعرابیوں کے تہبند اسی کے ہوتے ہیں، گویا وہ چیتے کے رنگ سے ماخوذ ہیں۔ کیوں کہ اس میں سیاہی سفیدی ہوتی ہے"۔

"فکفن ابی وعمی فی نمرۃ واحدۃ" کے تحت تفسیر بالا کا اعادہ کرتے ہوئے اتنا

اضافہ کردیا کہ "بردۃ من صوف او غیرہ مخطط" یعنی یہ ضروری ہے کہ دھاری دار ہو، مگر یہ ضروری نہیں کہ اون ہی کا ہو۔ علامہ فیروز آبادی نے "غرہ" کی تفسیر میں "حبرۃ" کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے۔ قاموس کی عبارت یہ ہے :

"الحبرۃ وشملۃ فیھا خطوط بیض وسودا وبردۃ من صوف یلبسھا الاعراب"

دھاری دار چادر اور کملی جس میں کالی اور سفید دھاریاں ہوں یا اون کی کملی جس کو اعراب پہنتے ہیں۔

ہمارے اطراف میں چیتے کی سرخ دھاریاں ہوتی ہیں مگر دورِ حاضر کا مشہور مستشرق اپنی کتاب المنجد میں لکھتا ہے :

وھو منقط الجلد نقطاً سوداً وبیضاً

چیتے کی جلد بوٹے دار ہوتی ہے۔ سیاہ اور سفید بوٹیاں ہوتی ہیں۔

علماء محققین کی مذکورہ بالا تصریحات نے امور ذیل کی وضاحت کردی :

(۱) سرورِ کائنات ﷺ کا جھنڈا مربع تھا۔

(۲) دھاری دار تھا۔

(۳) سیاہ و سفید دھاریاں تھیں۔

(۴) سیاہی سفیدی پر غالب تھی (حتی کہ دور سے سیاہ معلوم تھا)۔

جمعیۃ العلماء ہند کی مجلس عاملہ نے انھیں اوصاف کو جمعیۃ العلماء ہند کے جھنڈے کی خصوصیت قرار دیا۔ البتہ تمام ہندوستان کی جمعیتوں کے جھنڈوں میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے پٹیوں کی تعداد اور ان کے باہمی تناسب کو بھی بیان کردیا تاکہ تمام کارکن ایک وضع پر کاربند ہوسکیں۔ کیوں کہ اخلاص شیوہ کارکن تعمیل حکم کے لیے فلسفۂ حکم کے درپے نہیں ہوا کرتے، بلکہ سہولت کار کے لیے معین شکل کے خواہاں ہوا کرتے ہیں۔

یہ ہے لم نظامِ رضاکاران جمعیت علمائے ہند کی دفعہ ۷ کی جس کے الفاظ درج ذیل ہیں :

"رضا کاروں کا جھنڈا جمعیت علمائے ہند کا جھنڈا ہو گا، جس میں سیاہ اور سفید دھاریاں ہوں گی۔ دونوں جانب کے کنارے سیاہ دھاری کے ہوں گے اور درمیان میں پانچ سفید دھاریاں ہوں گی اور سفید دھاری سیاہ دھاری سے عرض میں نصف ہو گی۔"

ازالہ شکوک :

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لواء اور رایت یعنی جھنڈیاں اور جھنڈوں کے متعلق مختلف روایتیں واقع ہوئی ہیں۔ مثلاً حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے :

"ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل مکۃ ولواءہ ابیض" (ترمذی شریف)۔

رسول اللہ ﷺ جب مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو آپ کا لواء سفید تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے :

"کان لواء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابیض" (ابن حبان)

سرور کائنات ﷺ کا لواء سفید تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

"کانت رایتہ سوداء ولواءہ ابیض" (ترمذی، ابن ماجہ وغیرہما)

رسول اللہ ﷺ کا رایۃ سودا (سیاہ) تھا اور لواء سفید تھا۔

حضرت ابو ہریرہ، حضرت بریدہ وغیرہما سے بھی اس مضمون کی راویتیں نقل کی گئی ہیں :

"واخرج الحدیث ابوداؤد والنسائی ایضاً ومثلہ لابن عدی من حدیث ابی ہریرہ ولا بی لیلیٰ من حدیث بریدہ والطبرانی فی الکبیر من حدیث عبداللہ بن بریدہ"۔ (فتح الباری ج ۶، ص ۹۵، وعمدۃ القاری، ج ۷، ص ۲۳)

یہ تمام روایتیں ثابت کرتی ہیں کہ رحمت للعالمین ﷺ کے لواء کی رنگت سفید تھی۔ حضرت سماک بن حرب رضی اللہ عنہ نام کی تصریح کے بغیر یکے بعد دیگرے دو شخصوں کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ سید الکونین ﷺ کے رایت کا رنگ زرد تھا :

"وروی ابوداؤد من روایتہ سماک بن حرب عن رجل من قومہ عن

اخرمنهم قال رایت رایة رسول الله ﷺ اصفر"۔

حضرت سماک بن حرب (تابعی) اپنی قوم کے ایک شخص اور وہ شخص اپنی قوم کے دوسرے شخص کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا جھنڈا زرد دیکھا۔

ابن ابی عاصم نے کتاب الجہاد میں حضرت کرز بن اسامہ کی روایت نقل کی ہے۔ بنی سلیم کے لیے رحمت عالم ﷺ نے سرخ جھنڈا لہرایا تھا۔ یہی ابن ابی عاصم حضرت بریدہؓ کی مندرجہ ذیل روایت بھی نقل کرتے ہیں :

کنت جالساً عند رسول الله ﷺ فعقد رایة الانصار وجعلها صفراء

(عینی شرح بخاری ج ۷، ص ۲۴)

میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ نے انصار کا جھنڈا لہرایا، اس کا رنگ زرد تھا۔

ابن عدی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ

"کانت رایة رسول الله ﷺ سوداء ولوائه ابیض۔ مکتوب فیه لا اله الا الله محمد رسول الله۔

رسول اللہ ﷺ کا رایت سیاہ تھا اور لواء سفید، اس میں لا اله الا الله محمد رسول الله لکھا ہوا تھا۔

یہ سب روایتیں اس پر متفق ہیں کہ لواء کا رنگ سفید تھا اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی آخری روایت میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ اس پر

لا اله الا الله محمد رسول الله

لکھا ہوا تھا۔ البتہ رایت یعنی جھنڈے کی رنگتیں سیاہ، سرخ، زرد وارد ہوئی ہیں اور اگر لواء اور رایۃ میں کوئی فرق نہ مانا جائے تو ایک اور چوتھے رنگ کا اضافہ ہو جاتا ہے یعنی سفید رنگ! اور ایک پانچویں صورت یہ معلوم ہوئی کہ سفید جھنڈے پر کلمۂ طیبہ لکھا ہوا تھا۔

اس اختلاف کے متعلق علامہ بدر الدین عینی اور حافظ الحدیث حافظ ابن حجر رحمہما اللہ

کا جواب یہ ہے وجه الاختلاف باختلاف الاوقات (عینی، جلد ۷، ص ۲۳، فتح الباری، جلد ۶، ص ۶۶)

اختلاف اوقات کے باعث رنگوں میں اختلاف ہوتا رہا۔

اس جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ جھنڈے کی کوئی ایک رنگت سرور کائنات ﷺ کے عہد میں معین نہیں کی گئی، بلکہ ضرورت کے وقت جیسا کپڑا میسر آتا اس کا جھنڈا بنالیا جاتا اور جس طرح ہر ایک جنگ کے موقع پر آپس میں ایک دوسرے کی پہچان کے لیے شعار جس کو آج کل اصطلاح میں "پٹول" کہا جاتا ہے، علاحدہ مقرر کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح مختلف غزوات میں مختلف رنگوں کے جھنڈے بنا لیے گئے۔

اس توجیہ کی بنا پر کسی رنگ کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہ ہوگا، بلکہ سنت رسول اللہ ﷺ کا لب لباب یہ ہوگا کہ غزوہ اور جہاد کے موقع پر ایک جھنڈا بنالیا جائے خواہ وہ کسی رنگ کا ہو۔ البتہ افضل یہ ہوگا کہ مذکورہ بالا رنگوں میں سے کوئی ایک رنگ ہو تاکہ رنگت کے بارے میں بھی فعل رسول اللہ ﷺ سے مطابقت ہو جائے۔ لیکن اس قسم کے مختلف جھنڈے وقتی ضرورت کو تو پورا کر سکتے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ من حیث الجماعت شعار اور علامت نہیں بن سکتے۔ بالفاظ دیگر بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے کسی قسم یا ملت کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔

مثلاً ایک فوج اپنا جھنڈا بنا لیتی ہے تو اس فوج کے سپاہیوں کے لیے تو یہ سہولت ہو سکتی ہے کہ وہ اس جھنڈے کو دیکھ کر اپنی فوج کا نشان معلوم کر لیں، مگر کسی دوسری قوم کا کوئی شخص، بلکہ اسی قوم کا کوئی شخص جو اس فوج میں شریک نہ ہو وہ اس جھنڈے کو دیکھ کر یہ سمجھ جائے کہ فلاں ملک یا فلاں قوم کی فوج ہے، یہ فائدہ اس وقتی جھنڈے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

جیل خانوں یا فوجی بارکوں میں رات کے پہرے داروں کو کوئی لفظ مثلاً ۷۸۶ بتا دیا گیا! مثلاً سرور کائنات ﷺ کے عہد مبارک میں ایک مرتبہ حٰمٓ لاینصرون بتادیا گیا (ترمذی)، ایک دفعہ امت امت مقرر کیا گیا (ابوداؤد شریف)، تو اس لفظ مخصوص (پٹول) کا یہ فائدہ تو ہو

تاکہ پہرہ داروں کی جماعت کا ایک فرد دوسرے کو پہچان کر اس پر حملہ نہیں کرے گا۔ لیکن اس جماعت کے سوا کوئی دوسرا شخص خواہ اس قوم ہی سے تعلق رکھتا ہو ۸۶۷ یا حٰمٓ لا ینصرون سن کر کوئی مفید معنی معلوم نہیں کر سکتا۔ حتی کہ وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ جیل خانے کا وارڈر ہے یا فوج کا سپاہی؟

رفع اختلاف کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ امن، صلح یا جنگ وغیرہ کے لحاظ سے جو مختلف دور پیش آتے رہتے ہیں، ان کے پیش نظر جھنڈوں کے رنگ مختلف ہوں۔

دورِ حاضر میں تجارتی جہازوں اور مریضوں کے جہازوں کے جھنڈوں میں بھی امتیاز ہوتا ہے۔ رحمتِ عالم ﷺ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ ایک شخص کو جس نے عرب قدیم کی عادت کے مطابق باپ کی منکوحہ سے ازدواجی تعلق قایم کر لیا تھا، جاکر سزا دیں۔ اس خدمت کے لیے حضرت ابوہریرہؓ تشریف لے گئے تو ایک جھنڈا ان کے ساتھ تھا۔ (ترمذی شریف، ج ا، ص ۱۶۲)

بہر حال جب کہ مختلف حالات اور موقعوں کے لیے مختلف قسم کے جھنڈے اور نشان استعمال کیے جاتے ہیں تو ان رنگتوں کے اختلاف کی یہ توجیہ بھی ہو سکتی کہ مختلف ضرورتوں اور مختلف حالات کے پیش نظر جھنڈوں کے رنگ مختلف ہوتے رہے۔

ظاہر ہے کہ مکہ میں داخلہ اس حالت میں ہوا کہ جنگ ختم ہو چکی تھی اور باشندگان مکہ کو امن دے دیا گیا تھا۔ ایسے موقع پر سفید جھنڈیوں کا استعمال دورِ حاضر کے بین الاقوامی مذاق سے بھی مطابقت رکھتا ہے، اور ممکن ہے اس بین الاقوامی مذاق کا ماخذ یہی سنت ہو۔ اگرچہ اتنا فرق ضرور ہے کہ آج کل امن طلب کرنے والا سفید جھنڈا استعمال کیا کرتا ہے، وہاں امن دینے والے نے یہ جھنڈے استعمال کیے۔ مگر اس حقیقت کے پیش نظر کہ بیت اللہ کے حرم اطہر میں داخل ہونے والا فاتح ہونے کے باوجود حرم اطہر کی عظمت کے پیش نظر آمن ہے (من دخلہ کان امنا) اور آج قریش مکہ کے تمام متمردانہ جرائم و مظالم کو لطف و کرم

کے آبِ حیات سے دھو کر (لاتثریب علیکم الیوم) (آج کوئی سرزنش نہیں) کا پرچم لہرایا جائے گا۔ سفید جھنڈیوں کے استعمال کے کچھ اور بھی پر لطف نکات سمجھ میں آتے ہیں اور واضح کر دیتے ہیں کہ اس رنگ کا استعمال خاص مصلحت کے پیشِ نظر تھا۔

بہر حال علامہ عینی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ کی توجیہہ کے پیشِ نظر دفع تعارض کی یہ تاویل بھی ہو سکتی ہے کہ مختلف حالات و ادوار اختلافِ رنگ کا باعث بنے، لیکن ان دونوں بزرگوں کی توجیہہ کے علاوہ مطابقت و موافقت پیدا کرنے کی شکل یہ بھی ہے کہ سرخ رنگ اور زرد رنگ مخصوص قبیلوں کے لیے مقرر فرمائے تھے اور اسلام کے مرکزی عسکر کا جھنڈا حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی تصریح کے بموجب نمرہ کا سیاہ دھاری دار تھا۔ باقی رہیں وہ روایتیں جن میں لوائے نبی (علی صاحبہ الصلوۃ والسلام) کا رنگ سفید بتایا گیا ہے تو درحقیقت ان روایتوں سے تعارض ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ لواء اور رایت ایک نہیں، بلکہ ان دونوں میں فرق ہے۔ لواء کی تعبیر جھنڈی سے کی جا سکتی ہے اور رایت بڑا جھنڈا۔

چناں چہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

قال ابوبکر بن العربی: "اللواء غیر الرایۃ فاللواء مایعقد فی طرف الرمح ویلوی علیہ والرایۃ مایعقد فیہ ویترک حتی تصفقہ الریاح وجح الترمذی الی التفرقۃ۔ فترجم بالالویۃ ثم ترجم بالرایات" (ملخصاج ٦، ص ٩٥، فتح الباری)

لواء اور رایت جدا جدا ہوتے ہیں۔ لواء وہ ہے جو نیزے کے سرے پر باندھ کر نیزے پر لپیٹ دیا جاتا ہے اور رایت نیزے کے اوپر باندھ کر لپیٹتے نہیں بلکہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں، تاکہ ہوا کے جھونکے اس کو لہراتے رہیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ لواء اور رایت میں فرق ہے۔ چناں چہ اپنی کتاب (ترمذی شریف) میں ان دونوں کے بیان کے لیے علاحدہ علاحدہ دو باب رکھے۔

ایک باب لواء کے متعلق قایم کیا اور اس میں لواء کے متعلق حدیث پیش کی۔ دوسرا باب رایت کے متعلق رکھا اور اس میں رایت کے سلسلہ کی حدیث پیش کی۔

وفی المغرب: "اللواء علم الجیش وھو دون الرایۃ لانہ شقہ ثوب تلوی

وتشد الیٰ عود الربح والرایة علم الجیش ویکنے بام الحرب وھی فوق اللواء"۔

لواء لشکر کے جھنڈے کو کہا جاتا ہے یہ رایت سے چھوٹا ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ کپڑے کا ٹکڑا ہوتا ہے، جس کو لپیٹ دیا جاتا ہے اور نیزے کی لکڑی سے باندھ دیتے ہیں۔ رایت لشکر کا جھنڈا ہوتا ہے۔ اس کی کنیت 'ام حرب' بھی ہے یعنی 'جنگ کی ماں'۔ یہ لواء سے بڑا ہوتا ہے۔ (مغرب)

قال التوربشتی: "الرایة التی یتولاھا صاحب الحرب ویقاتل علیھا والیھا یمیل المقاتلة واللواء علامة کبکبة الامیرتدور معه حیث دارت۔

رایت وہ ہے کہ محاذ جنگ کا افسر اعلیٰ اس کا ذمے دار ہوتا ہے اور اس کے بلند یا سرنگوں ہونے پر جنگ کا مدار رہتا ہے اور لواء لشکر کے امیر کی علامت ہوتا ہے۔ امیر (افسر اعلیٰ) کے منتقل ہونے کے ساتھ وہ بھی منتقل ہوتا رہتا ہے۔ (توریشتی)

وفی عمدة القاری: "والرایة ثوب یجعل فی طرف الرمح ویخلی بھیئة تصفقه الریاح" (ج ۷، ص ۲۳)

"رایت وہ کپڑا ہے جو نیزے کے سر پر لگایا جاتا ہے اور ایسی صورت سے اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ ہوا کے جھونکے اس کو لہراتے رہیں"۔ (عمدة القاری)

فتح الباری میں ہے: "وقیل اللواء العلم الضخم والعلم علامة لمحل الامیر یدور معه حیث دار والرایة یتولاھا صاحب الحرب"۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ لواء بڑے علم کو کہتے ہیں اور علم اس جھنڈے کو کہتے ہیں جو افسر اعلیٰ (امیر) کے مقام کی علامت ہو اور افسر اعلیٰ کے مقام کے ساتھ ساتھ وہ منتقل ہوتا رہے اور رایت اس جھنڈے کو کہتے ہیں جس کا مالک و مختار وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں جنگ کی باگ ڈور ہو۔ تو بہر حال جب لواء اور رایت مین فرق ہو گیا، خواہ وہ کسی نوعیت سے ہو، لواء اور رایت کی رنگتوں کے فرق کو تعارض نہیں کہا جائے گا۔

باقی سماک بن حرب رضی اللہ عنہ کی روایت میں یکے بعد دیگرے دو شخص واقع ہوئے ہیں جن کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ طبقۂ صحابہ میں ایسا ابہام اگرچہ قابل برداشت ہوتا ہے، مگر جرح کی گنجایش ضرور پیدا کر دیتا ہے اور صحیح السند روایت کے مقابلے میں اس حدیث کو

مرجوع کر دیتا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جس میں درج ہے کہ جھنڈیوں پر

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

لکھا ہوا تھا، اس کے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "سندہ واہ" اس کی سند بے کار ہے، ج ٦، ص ٩٥۔

باقی جن روایتوں میں سودا کا لفظ واقع ہوا ہے، ان کی تفسیر وہی ہے جو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت میں گزری، یعنی وہ سیاہ نظر آتا ہے، ورنہ اصل میں دھاری دار تھا۔ احادیث مذکورۂ بالا میں ظاہری تعارض اور اختلاف کے رفع کرنے کے بعد یہ سوال خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت کو کیوں ترجیح دی۔

ظاہر ہے کہ اسلام کے مرکزی لشکر کے جھنڈے کے متعلق اس سے زیادہ واضح صاف اور مستند روایت کوئی دوسری نہیں۔

اور پھر محض نقل واقعہ کے طور نہیں، بلکہ سائل کے جواب میں ایک معین شکل کی ہدایت فرمانا، ترجیح کی ایک دوسری وجہ پیدا کر دیتا ہے۔ کسی دوسری حدیث کا اندازہ واضح اور کھلا ہوا نہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کہ شریعت میں جھنڈے کے متعلق کسی مخصوص رنگ کو لازم طور پر ضروری اور اس کی مخالفت کو ناجائز نہیں گردانا گیا۔ البتہ جمعیت علمائے ہند کی شان بالا کے لیے موزوں یہی تھا کہ اصح ما فی الباب اور اس سلسلے کی سب سے زیادہ مستند اور واضح حدیث کی نشان دہی کے مطابق اپنے جھنڈے کی صورت اور کیفیت تجویز کرے۔

الحمد للہ یہ سعادت اس کے جھنڈے کو میسر ہے اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ (وللہ الحمد)

عزم فیروز مندی و برتری کا تقاضا ہے کہ سلسلۂ مضمون کو اپنے عزیز دوست مولانا مقبول الرحمن صاحب سیوہاروی کے اس ولولہ انگیز شعر پر ختم کریں۔

لہرائے گا زمیں کے سیاہ و سپید پر
جھنڈا ہے یہ جنابِ رسالت مآب کا

ھٰذا کما قال اللہ تعالیٰ: "ولا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔"

بندۂ ناچیز

محمد میاں عفی عنہ

ناظم جمعیت علماے ہند

۲۵/جون ۱۹۴۶ء

ضمیمہ:

پرچم اسلامیان

از مولانا اقبال احمد خاں صاحب ایم اے علیگ۔ وکیل اعظم گڑھ

الٰہی شکر تیرا آج امیدِ دل بر آئی ہے
وطن میں رایتِ اسلام کی پرچم کشائی ہے

یہ پرچم اُن کا ہے جو رہنما ہیں ملک و ملت کے
محافظ ہیں جہاں میں جو کتاب اللہ و سنت کے

یہ پرچم اُن کا ہے جو قاسم فیض رسالت ہیں
یہ پرچم اُن کا ہے جو مظہر شانِ جلالت ہیں

اگر واللیل کی تفسیر ہے اس کی سیاہی میں
تو شرح والضحیٰ پنہاں بیاض صبح گاہی میں

ید بیضا اگر اس کا فروغ با مدادی ہے
تو ہم رنگِ غلاف کعبہ اس کی خوش سوادی ہیں

یہ پرچم ہے حقیقت میں دلیل خوش نگاہی بھی
خدا نے دی ہے آنکھوں میں سفیدی بھی سیاہی بھی

سرافرازی میں یہ ہم پایۂ طورِ تجلی ہے
یہ پرچم مردمک کی طرح معمور تجلی ہے
لوائے حمد کا ہم سایہ اس کا قد بالا ہے
بلند از صد ہلال و مہر اس کی شان والا ہے
عروجِ ملت توحید کا روشن نشاں یہ ہے
جہاں میں یادگار پرچم اسلامیاں یہ ہے
زمانے میں یہ پرچم رہ چکا ہے حکمراں برسوں
رہا ہے ابلق ایام اس کے زیر راں برسوں
کسی کا زخم گر اس سے ہرا ہوتا ہے ہونے دو
کوئی زہر غم حسرت سے روتا ہے تو رونے دو
یہی امید ہے ہم کو نگاہِ رحمتِ حق سے
رہے محفوظ یہ عین الکمال چشم ارزق سے
مسلماں کے لیے یہ سایۂ رحمت کا پرچم ہے
کہ یہ جمعیت شیرازۂ ملت کا پرچم ہے
نظر افروز ہے اس کی سفیدی بھی سیاہی بھی
کہ یہ پرچم بتاتا ہے اوامر بھی نواہی بھی
الٰہی تا ابد لہرائے یہ پرچم زمانے میں
رہے یہ یادگار سید عالمؐ زمانے میں

جمعیت علمائے ہند پر ایک ناواجب اعتراض

اور

اس کا جواب

از

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ ۔ پاکستان

کراچی

جمعیت علماے ہند پر ایک ناواجب اعتراض

اور

اس کا جواب

(از حضرت مولانا محمد میاں صاحب مراد آبادی)

۷ر فروری ۱۹۴۵ء کے "تیج" دہلی میں جناب مولانا عبدالرحمن صاحب کا مکتوب بنام حضرت شیخ الہند مولانا سید حسین احمد صاحب دامت برکاتہم احقر کے مطالعے سے گزرا۔

مولانا کو شکایت ہے کہ جمعیت علماے ہند کے جلسوں اور کانفرنسوں میں حضرات علماے اہل حدیث کو مدعو نہیں کیا جاتا اور اس طرح علماے اہل سنت والجماعت میں ایک تفریق پیدا ہوتی جارہی ہے اور جمعیت علماے ہند رفتہ رفتہ جمعیت علماے دیوبند بنتی جارہی ہے۔ مولانا نے اس سلسلے میں جمعیت علماے صوبہ آگرہ کے اجلاسِ عام منعقدہ مراد آباد اور اضلاع شرقیہ کی جمعیت علما کانفرنس منعقدہ مئو کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔

بے شک ان کانفرنسوں میں حضرات علماے اہل حدیث کے شریک نہ ہوسکنے کا افسوس احقر کو بھی ہے اور بلا شبہ جملہ خدام جمعیت علماے ہند کی یہ خواہش ہے کہ جمعیت علما کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع اور ہندوستان کے جملہ علما پر حاوی ہو، خواہ وہ مقلد ہوں یا غیر مقلد،

دیوبندی ہوں یا غیر دیوبندی، مگر مولانا موصوف معاف فرمائیں کہ خدام جمعیت علما کی یہ خواہش اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب ہر ایک خیال کے علمائے کرام بھی مساوی طور پر توجہ فرمائیں۔

بے شک پرانا طریقہ یہی تھا کہ کانفرنس کے موقع پر علما کو مدعو کرلیا جاتا تھا اور پھر کانفرنس میں آیندہ کے لیے ایک مجلسِ منتظمہ بنادی جاتی تھی، جس میں مناسب علما کو نامزد کردیا جاتا تھا۔ مگر جدید دستور العمل (منظور کردہ اجلاس جمعیت علمائے ہند منعقدہ مئی ۱۹۳۹ء بمقام مراد آباد) نے جس طرح جمعیت علما کی ممبری کو ہر مسلمان کے لیے عام کردیا ہے، اس کے انتخابات کو بھی عام ممبران کے حوالے کردیا ہے۔ میرا تعلق جمعیت علمائے صوبہ آگرہ سے ہے۔ مجھے اس صوبے کے متعلق جہاں تک علم ہے، میں اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہوں کہ الحمد للہ ۱۹۳۹ء سے اس صوبہ میں دستور پر پورے احتیاط کے ساتھ عمل ہورہا ہے۔

مقامی جمعیتیں آنے والے ابتدائی ممبر بناتی ہیں۔ یہ عام ممبران مقررہ تاریخوں پر مقامی جمعیت کا انتخاب کرتے ہیں۔ مقامی جمعیتیں جمعیت علمائے ضلع کے لیے ارکان منتخب کرتی ہیں۔

جمعیت علمائے ضلع اور جہاں جمعیت علمائے ضلع نہ ہو، وہاں مقامی جمعیت (جس کا الحاق براہِ راست صوبے سے ہو) اس تعداد کے بموجب جو جمعیت مرکزیہ نے اس کے لیے مقرر کردی ہو) جمعیت علمائے صوبہ کے لیے ارکان منتخب کرتی ہے۔ جمعیت علمائے صوبہ اپنے اجلاس عام میں اپنے ارکان میں سے معینہ تعداد کے بموجب جمعیت مرکزیہ کے لیے ارکان منتخب کرتی ہے۔

ان انتخابات میں نہ مسلک اور عقیدے کی قید ہے نہ عالم اور غیر عالم کی، بلکہ دستور العمل کی دفعہ نمبر ۷ اور دفعہ نمبر ۱۱ میں تصریح موجود ہے کہ جمعیت ضلع میں دو ثلث یعنی ۶۷ فی صدی اور جمعیت صوبہ میں پچاس فی صدی تک غیر عالم ہوں گے۔

بہر حال جب کہ کسی جمعیت کی رکنیت نامزدگی سے نہیں بلکہ انتخاب کے ذریعے کافی جدو جہد کے بعد حاصل کی جاتی ہے تو اب کسی کو دعوت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ذمہ داران جمعیت کی تمام مسلمانوں اور جملہ حضرات علما سے استدعا ہے کہ وہ خود توجہ فرما کر جمعیت علما کی ممبری قبول فرمائیں اور پھر انتخابات کے ذریعے سے مرکز تک پہنچیں اور عام ممبری یا انتخابات سے علاحدہ رہ کر جمعیت علما کو کسی خاص گروہ میں محدود نہ کردیں۔

اس مفہوم کی اپیل جناب صدر مرکزیہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب دامت برکاتہم، ناظم اعلیٰ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب، صدر صوبہ متحدہ اودھ و آگرہ حضرت مولانا ابو الوفا صاحب اور دیگر عہدیداران جمعیت علما کی جانب سے عام ممبری کے زمانے میں بار بار اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ عام تقریروں میں پوری قوت اور زور خطابت کے ساتھ توجہ دلائی جاتی ہے۔ اس پر بھی اگر کسی خیال کے حضرات کنارہ کش رہیں تو ذمہ داران جمعیت علما کو مخاطب کرنے کے بجائے ان کے ساتھ افسوس میں شریک ہونا چاہیے۔ جن جلیل القدر علمائے اہل حدیث کے اسمائے گرامی جناب مولانا عبدالرحمن صاحب اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: ان میں سے بعض تو جمعیت علمائے ہند کے باضابطہ ممبر اور رکن ہیں، بعض حضرات عہدے دار ہیں اور بعض حضرات وہ ہیں جن کی خدمت میں کاتب حروف اور حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیت علما اور موجودہ صدر جمعیت علمائے صوبہ یعنی مولانا ابو الوفا صاحب بار بار حاضر ہو چکے ہیں۔ مقامی جمعیت علما کے قیام اور ضابطے کے بموجب قبولِ رکنیت کی درخواست پیش کر چکے ہیں۔ مگر تعجب اور افسوس ہے کہ موافقتِ رائے اور اتحادِ خیال کے باوجود ان بزرگوں نے نہ اپنے یہاں جمعیت علما قائم کرنے کی کوشش کی اور نہ کسی دوسرے مقام سے ابتدائی ممبری قبول کرنے کی زحمت برداشت کی۔

جمعیت علمائے صوبہ آگرہ کے اجلاس منعقدہ مراد آباد میں صرف ارکانِ صوبہ شریک ہوئے تھے، جن کے اسمائے گرامی ماتحت جمعیتوں نے اپنے ہاں سے منتخب کر کے بھیجے تھے اور چوں کہ انھی تاریخوں میں مرکزیہ جمعیت علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس بھی مراد آباد میں

ہو رہا تھا، اس لیے اس کے ارکان بھی مراد آباد تشریف لائے تھے۔ اگر مولانا داؤد صاحب غزنوی آزاد ہوتے تو مرکزیہ جمعیت علماے ہند کے نائب صدر اور مجلسِ عاملہ کے رکن کی حیثیت سے وہ بھی یقیناً شرکت فرماتے۔

مئو ضلع اعظم گڑھ میں اضلاع شرقیہ کی جمعیتوں کی کانفرنس تھی۔ اس میں ان جمعیتوں کے نمایندگان مدعو ہوئے اور ان کا اجلاس ہوا۔ البتہ چوں کہ مدرسہ مفتاح العلوم کا جلسۂ دستار بندی بھی اسی موقع پر کیا گیا تھا اس لیے حضرات اراکین مدرسہ نے مدرسے کے جلسے میں ہندوستان کے چند مقتدر علماے کرام کو بھی مدعو کیا تھا۔ اس دعوت میں اہلِ مدرسہ آزاد تھے اور ان پر جمعیت علما کی طرف سے کوئی پابندی عاید نہیں کی جا سکتی تھی۔

اُمید ہے کہ حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب ان واقعی گذارشوں کی طرف توجہ فرما کر کوشش فرمائیں گے کہ جمعیت علماے اودھ میں شریک ہوں اور دیگر حضرات کو بھی شریک فرما کر نظام جمعیت علماے ہند کو زیادہ سے زیادہ وسیع اور مستحکم بنائیں۔ والسلام

محمد میاں

حوالہ: زمزم، لاہور۔ ۲۷ فروری ۱۹۴۵ء، صفحہ ۳

وطن، اس کی اہمیت اور وقت کے تقاضے

از

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان

کراچی

وطن - اس کی اہمیت اور وقت کے تقاضے

فہرست	صفحہ

حرفے چند

یہ کتاب مولانا سید محمد میاںؒ کے دو مقالوں پر مشتمل ہے؛
۱۔ پہلا مقالہ ''ہمارا وطن اور اس کی فضیلت'' مرحوم کا ایک کتابچہ ہے جو اس سے پہلے بھی چھپ چکا تھا۔
۲۔ دوسرا مقالہ ''ہماری اور ہمارے وطن کی حیثیت'' ہے۔ یہ کافی طویل اور بہت سے علمی، تاریخی اور سیاسی مباحث کا جامع مقالہ ہے۔ یہ مقالہ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ (جنوری ۱۹۵۲ء) سے جمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ (جنوری، فروری ۱۹۵۳ء) تک ماہ نامہ ''دارالعلوم دیوبند'' میں آٹھ قسطوں میں شایع ہوا تھا۔

اب یہی دونوں مقالے اس کتاب میں حصۂ اول حصۂ دوم کے طور پر شامل ہیں اور دونوں ہی مقالے اپنے اپنے دائرۂ تحریر و مباحث میں ایک خاص علمی و تحقیقی مقام رکھتے ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے فکری، علمی اور تاریخی نکتے ہیں جو تاریخ و سیاست کے طالب علموں کے لیے رہنما اور ہندوستان کے مسلمانوں کی پرسکون معاشرتی زندگی کی تلاش کے لیے چراغ ہدایت اور ماضی میں مسلم لیگ کے غلط اندازِ فکر و سیاست کے لگائے ہوئے ذہن و قلب کے زخموں کے لیے مرہم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ متعصب اور مسلمانوں سے کس قسم کا تاریخی و سیاسی عناد رکھنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ذہنی و فکری توازن اور اعتدال پیدا کرنے میں بہت مدد دے گا۔

پہلا مقالہ بنیادی طور پر دو حصوں اور تین ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے دو ابواب میں اسلامی روایات سے ہندوستان کی مذہبی قدامت اور اس کی سرزمین کی فضیلت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تیسرے باب میں ظہور اسلام کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، اسلام کی اشاعت، مسلمانوں کی حکومت کے قیام، مسلمانوں کے اقتدار اور علمی، تہذیبی مرکز کی حیثیت سے مسلمانوں کے لیے ہندوستان کی اہمیت اور برطانوی

عہد میں ہندوستان کے غلام بن جانے کے بعد اس کی آزادی کی جدوجہد اور تعمیر و ترقی کے کاموں میں مسلمانوں کے فرائض کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ جس مقالے پر مشتمل ہے اس میں ہندوستان پر برطانوی تسلط کے بعد ملک کی سیاسی حیثیت اور برٹش استعمار کے قبضے سے پیدا ہونے والے مسایل کی بحث ہے۔ مثلاً یہ کہ

۱۔ برطانوی تسلط کے بعد ہندوستان دارالاسلام رہا یا دارالحرب بن گیا، یا دار الامن تھا یا کچھ اور ہو گیا تھا۔

۲۔ اگر دارالحرب ہو گیا ہے تو پھر مسلمان کیا کریں؟ کیا غلامی پر قناعت کر لیں؟ ملک کو چھوڑ جائیں (ہجرت کر جائیں) یا ملک کو آزاد کرانے اور حکومتِ متسلطہ سے نجات دلانے کے لیے جہاد کریں، جہاد کریں تو کس طرح؟ -- صرف اپنی قوتِ بازو کے اعتماد پر یا ملک کی اکثریت اور برادرانِ وطن کے اشتراک و تعاون اور ان کی مدد سے؟ اور جنگ و جہادِ آزادی میں کامیابی کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کی اور برادرانِ وطن کی حیثیت کیا ہو؟ کیا مسلمان اس پوزیشن میں ہوں گے کہ وہ غیر مسلم برادرانِ وطن کو جو اکثریت میں ہیں۔ ذمی بنالیں اور کیا وہ خود اس صورتِ حال کو گوارا کر لیں گے کہ اکثریت کے تابع مہمل بن جائیں یا غیر مسلم اکثریت کی حکومت کے معاہد کی حیثیت قبول کر لیں یا کوئی ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ آزاد ہندوستان میں ان کی حیثیت ملک اور اس کی حکومت میں شریک اہلِ وطن کی حیثیت سے مساوی تسلیم کر لی جائے۔ جب کہ مسلمان بھی صدیوں سے ملک کے ویسے ہی باشندے ہیں جیسے کہ ملک کی دوسری اور ان سے قدیم قوم ہو سکتی ہے؟ مسلمانوں نے اس ملک کی تعمیر و ترقی میں، اس کے دفاع میں، آزادی کی جنگ میں اسی طرح حصہ لیا ہے اور قربانیاں دی ہیں جس طرح دوسرے اہلِ وطن نے!

۳۔ ایک اہم مسئلہ مسلمانوں کے ترکِ وطن اور پاکستان کی ہجرت کا زیرِ بحث آیا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ ہجرت ہو یا نہ ہو، سوال یہ ہے کہ ترکِ وطن کا جو عمل نقش پذیر

ہوا، اس کی کوئی اسلامی حیثیت ہے؟ اور اس ''ہجرت'' پر مصطلحۂ شریعت اسلامیہ کا اطلاق کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس عمل سے ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ حل ہو گیا؟ اور کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ پاکستان میں اس سے کوئی ایک یا کئی مسئلے پیدا ہو گئے ہوں۔ فاضل مصنف نے ہندوستان کے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بحث کی ہے اور بتایا کہ ہجرت کے اس عمل سے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کا مسئلہ حل نہیں ہوا بلکہ ان کی پوزیشن اور زیادہ کمزور ہوئی ہے۔ فاضل مصنف پاکستانی نقطۂ نظر سے اس مسئلے کو زیر بحث نہیں لائے اگر وہ غور فرماتے تو معلوم ہوتا کہ مرکزی حکومت کے چھوٹے بڑے تمام مسلمان ملازمین کے پاکستان آنے کی وجہ سے پاکستان میں بے روزگاری پھیلی، علاقائی تعصبات کو ہوا ملی، مقامی اور غیر مقامی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ یہ مسایل ہی پاکستان کی خانہ ویرانی کے لیے کچھ کم نہ تھے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے عام مسلمانوں کی پاکستان آمد نے حالات کو مزید سنگین، مزاجوں کو اس حد تک تلخ اور ذہنوں کو اس درجے مشتعل بنا دیا ہے کہ یہ تلخی اور اشتعال پاکستان کے ہر صوبے میں اور زندگی کے ہر دایرۂ فکر و عمل میں محسوس کر لیا جا سکتا ہے۔ عمل ہجرت کے جواز و عدم جواز کی بحث میں ان حالات سے کیسے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔ فاضل مصنف نے ہجرت کے مقدس نام پر مسلمانوں کے فرار کے اس عمل کو اور پاکستانی رہنماؤں کی طرف سے اس کی تحریک کو ہندوستان کے مسلمانوں سے غداری قرار دیا ہے۔

ان تمام مسایل میں فاضل مصنف نے ایک خاص حد تک ہی بحث کی ہے یا کسی پہلو پر اہم اشارات کر کے قارئین کی رہنمائی کی ہے۔ بہ ظاہر مصنف نے اپنے مطالعہ و فکر کے اہم نکات کو غور و فکر کے لیے پیش کر دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے قلم سے جو کچھ نکل گیا ہے، وہی حرف آخر ہے۔ اب ان اہم تاریخی اور فقہی مسایل پر غور کرنے اور لکھنے والا کوئی نہیں۔

لبِ لباب ان دونوں مقالوں اور اس کتاب کے تمام مطالب کا یہ ہے؛

۱۔ ہندوستان تاریخی، مذہبی، تہذیبی اور علمی عظمتوں کا ملک ہے اور مسلمانوں کو

اس سے اتنا ہی تعلق، محبت اور جذباتی لگاؤ ہے، جتنا کہ ہندوستان میں بسنے والی کسی دوسری قدیم قوم کو اس سے ہوسکتا ہے، بلکہ روایات کی روشنی میں تاریخی، سیاسی اور تہذیبی تعلق کی بنا پر مسلمانوں کو ہندوستان سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دل چسپی ہے۔ اس تعلق کا انھوں نے قدیم زمانے سے لے کر اب تک کے ہر دور میں اور ہر میدان میں ثبوت بھی دیا ہے۔ ہندوستان کی عظمت کے ہیکل کی تعمیر میں مسلمانوں کے حصے کے بغیر اس کی عظمت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ بیرونِ ہند سے جو قافلے ہندوستان آئے تھے اور ہمیشہ کے لیے یہاں بس گئے تھے، ان میں آخری قافلے مسلمانوں کا تھا۔ انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنالیا، اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیا، تعلیم کی روشنی پھیلائی، زراعت اور صنعت و حرفت کو ترقی دی، ایک نئے تمدن اور تہذیب سے ملک کو آشنا کیا۔ غیر ملکی دشمنوں سے یہاں بسنے والی قوموں کی حفاظت کی اور ملک کے دفاع کو مضبوط بنایا۔

۳۔ جب ملک پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو اس کی آزادی کے لیے کبھی تنہا اپنے بل بوتے پر اور کبھی اہل وطن کے ساتھ مل کر جدوجہد کی اور جان و مال کی قربانیوں سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ جیلوں کو آباد کیا، پھانسی کے تختوں کو زینت بخشی، کالے پانی اور ملک بدری کی سزائیں بھگتیں، جائیدادوں کو ضبط کرایا، ملک کی آزادی کی جدوجہد کا کوئی علمی و فکری اور عملی میدان ایسا نہیں جس میں مسلمانوں نے اپنے تناسب آبادی سے زیادہ اور بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لیا ہوا اور قومی زندگی کے ہر موڑ پر اپنے ہندوستانی ہونے کا ثبوت نہ دیا ہو۔

۴۔ اور یہی تمام اعمال سیاسیہ ملک کی آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد بھی انجام دیے اور دے رہے ہیں۔ قومی فلاح و بہبود کا کوئی عمل، ملک کی تعمیر و ترقی اور دفاع و استحکام کا کوئی اقدام ایسا نہیں جو مسلمانوں کی شرکت کے بغیر کیا گیا ہو۔ لیکن یہ آزادی کے بعد کے مسایل ہیں جو اس کتاب کا موضوع نہیں۔

دونوں مقالے مسلسل اور رواں تحریر کی شکل میں تھے۔ ابواب کا وجود نہ تھا، پیراگرافنگ کا اہتمام نہ تھا، بنیادی اور ذیلی مطالب کا پتا نہ چلتا تھا، ذیلی عنوانات اکثر د

بیشتر موجود نہ تھے۔اب اگر اس میں کتاب کی شان اور ترتیب وتدوین کی کوئی خوبی نظر آتی ہے تو خوش ہوں کہ محنت ٹھکانے لگی۔امید ہے کہ شائقین محترم اس کتاب کو نہ صرف مطالب کی افادیت، مباحث کی اہمیت اور زبان کی صحت اور اسلوب تحریر و نگارش کی شگفتگی اور دل کشی کی وجہ سے بلکہ حسن تدوین وتہذیب کے لحاظ سے بھی پسند فرمائیں گے۔

ابوسلمان شاہ جہان پوری

۱۴؍جون ۲۰۰۰ء

ہمارا وطن اور اس کی عظمت

از

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان

کراچی

حصہ اول:

ہمارا وطن اور اس کی عظمت

تمہید

مقالہ ذیل میں احادیثِ مقدسہ اور اقوالِ صحابہ کی روشنی میں ہندوستان کے فضائل پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس مضمون کا ماخذ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی قدس اللہ سرہ کی ایک بے نظیر تصنیف ہے، جس کا نام "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کی فصل اوّل میں تفسیر و حدیث کی کتابوں سے ہندوستان کے فضائل اخذ کر کے ایک جگہ جمع کیے گئے ہیں۔ یہ فصل بیس صفحات پر مشتمل ہے اور ہر ایک حدیث اور روایت کا حوالہ باقاعدہ اس میں درج ہے۔ علامہ آزاد بلگرامی کی ہستی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کے معاصرین میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور ملک کی ان چند مایۂ ناز ہستیوں میں ہیں، جن پر ہندوستان ہمیشہ فخر کرے گا۔

باب اوّل:

ہندوستان کی فضیلت

بلاشبہ مدینہ طیبہ و مکہ معظمہ اور بیت المقدس وہ متبرک مقامات ہیں، جن کا احترام ہر ایک مسلمان پر فرض ہے۔ اسلامی عقائد کے بموجب ان کے برابر تقدس دنیا کے کسی رقبے یا کسی خطے کو حاصل نہیں۔ لیکن اسلامی تعلیمات ہی نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ہمارا وطن ہندوستان بھی بہت سی عظمتوں کا سرچشمہ ہے۔ سیدنا امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت انسؓ، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت قتادہؓ جیسے صحابۂ کرام اور حضرت حسن و حضرت عطاء جیسے جلیل القدر تابعین کی روایات کا حاصل یہ ہے کہ حضرت آدم کو ہندوستان کے مشہور جزیرے سرندیپ میں اتارا گیا اور حضرت حوا کو جدہ میں۔ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان ہوتے ہوئے سرندیپ سے جدہ تشریف لے گئے۔ جنت سے اتارے جانے کے بعد یہ دونوں خلیفہ فی الارض ایک عرصے تک ایک دوسرے سے جدا رہے اور جنگلوں اور بیابانوں میں بھٹکتے پھرنے کے بعد مکہ معظمہ کے قریب مقام مزدلفہ میں، جس کو جمع بھی کہتے ہیں، جمع ہوئے۔ یہ جمع وہی مقام ہے جہاں دورانِ حج میں عرفات سے واپسی پر رات بھر حاجی صاحبان قیام فرماتے ہیں۔

یہ خاص لطیفہ ہے کہ لفظ مزدلفہ ازدلاف سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں "قریب ہونا"۔ جمع کا ترجمہ ہے "اکٹھا ہونا"۔

یہ بھی ایک روایت ہے کہ عرفات ہی کا مقام تھا جہاں ایک دوسرے کو پہچاننے اور جنت سے آنے کے بعد سب سے پہلا تعارف ہوا۔ عرفات کا لفظ جو عرف سے ماخوذ ہے، پہچاننے اور تعارف کے معنی میں آتا ہے۔

حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ اس زمانے میں خانۂ کعبہ کی جگہ ایک سرخ ٹیلا تھا۔ حضرت آدمؑ کو حکم ہوا کہ اس مقام پر بیت اللہ یعنی خانۂ خدا بنادیں اور جس طرح آسمان پر فرشتوں کو بیت معمور کا طواف کرتے ہوئے دیکھا، اسی طرح اس خانۂ خدا کا طواف کریں۔ چناں چہ سیدنا حضرت آدمؑ نے اس حکم کی تعمیل میں مقامِ ابراہیم پر اپنے طرز کے بموجب نماز پڑھی اور پھر یہ دعا مانگی۔ :

"خداوندا! تو میرے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ میری معذرت قبول فرما۔ تو میری ضرورتوں کو جانتا ہے، لہٰذا میری درخواست کو منظور فرما۔ جو کچھ میرے دل میں ہے تو اس سے آگاہ ہے، لہٰذا میرے گناہ بخش دے۔ خداوندا! میں ایسا ایمان چاہتا ہوں جو میرے قلب میں پیوست ہو اور ایک ایسے سچے یقین واذعان کی درخواست کرتا ہوں، جس کے بعد مجھے یقین ہو جائے کہ مجھے وہی ملے گا جو تو نے میرے لیے لکھ دیا ہے اور میں استدعا کرتا ہوں کہ ان چیزوں پر راضی اور خوش رہوں جو تو نے میرے حصے میں لگادی ہے"۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہا نے اسی مضمون کی حدیث سرورِ کائناتؐ سے بھی نقل کی ہے۔ اس کے بعد حضرت آدم، حضرت حوا کو لے کر ہندوستان واپس ہوئے۔ یہیں بود و باش اختیار کی۔ یہیں آپ کے اولاد ہوئی اور یہیں آپ کی اولاد نے قیام کیا۔ قتل ہابیل کا مشہور واقعہ ہندوستان ہی میں ہوا۔ پھر جب ہابیل جو صالح اور نیک تھے شہید ہو گئے اور قابیل اس جرم کی وجہ سے مردود ہو گیا تو خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کو ایک اور بیٹا عنایت فرمایا۔ جس کا نام شیث رکھا گیا۔ اس لیے کہ شیث کے معنی ہیں "ہبۃ اللہ" یعنی عطائے خداوندی۔ فیض آباد کے قریب اجودھیا جو ہندوؤں کا خاص تیرتھ ہے اور جسے رام چندر جی کی جنم بھومی اور ان کا پایۂ تخت سمجھا جاتا ہے، وہاں ایک بہت لمبی قبر ہے، جس کو حضرت شیث علیہ السلام کی قبر بتایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت آدم علیہ السلام نے ہندوستان سے پیادہ پا چالیس حج کیے۔ اس کے علاوہ آپ کے عمروں (مراد عمرۂ حج ہے) اور ان حجوں کی تعداد سات سو ہے، جو آپ نے قیامِ مکہ کے دوران میں کیے۔

باب دوم:

دورِ اوّل کے تاریخی اور مذہبی فضائل

ان واقعات کو جان لینے کے بعد مندرجہ ذیل فضائل ہندوستان کے لیے ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ خلیفہ اللہ کا سب سے پہلا مہبط ہونے کی وجہ سے انسانیت کا سب سے پہلا "دارالخلافہ" ہندوستان ہے۔

۲۔ چوں کہ یہ خلیفہ نبی تھا، جس کے پاس روح القدس تشریف لایا کرتے تھے، لہٰذا سرزمینِ ہند سب سے پہلے آفتابِ نبوت کا مشرق بنا۔

۳۔ اسی بقعۂ مبارکہ پر روح القدس کا سب سے پہلے نزول ہوا اور یہی ارضِ مقدس وحیِ الٰہی کا سب سے پہلے مہبط ہے۔

۴۔ ابن سعد نے طبقات میں، ابوبکر شافعی نے غیلانات میں اور عبد بن حمید اور ابن عساکر نے حضرت سعد ابن جبیرؒ سے نقل کیا ہے کہ خلق اللہ آدم من ارض یقال لہا وجنی یعنی اللہ تعالیٰ نے جسدِ آدمؑ کا خمیر وجنی نامی علاقہ کی خاکِ پاک سے بنایا ہے۔

محققین کے قول سے یہ ثابت ہے کہ یہاں وجنی کا جو لفظ مذکور ہوا ہے وہ ہندوستان ہی کے کسی مقام کا نام تھا۔ لہٰذا پورے کرۂ ارض میں صرف خاکِ پاک ہندوستان ہی کو یہ شرف حاصل ہے سب سے پہلا نبی یہاں ہی کی خاک سے بنایا گیا، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ چوں کہ حضرت آدمؑ انسانوں کے ابوالآباء تھے، اس لیے جملہ انبیاء علیہم السلام اور تمام انسانوں کے

روحانی اور مادی اصل واصول کا خمیر ہندوستان ہی سے ہے، مایا گیا تو الد اور تناسل کے اصول پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جملہ انبیاء، اولیاء اور صلحائے کرام اور علماء مشائخ اولین کا عنصر اسی خاک پاک سے وجود پذیر ہوا۔

۵۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے بموجب الست بربکم کا مشہور عہد بھی ہندوستان ہی کی سرزمین میں بمقام وجنی ہوا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت حق جل مجدہ نے ان تمام روحوں کو جو قیامت تک دنیا میں پیدا ہوں گی پشت آدم علیہ السلام سے برآمد کیا اور ان کو خطاب کر کے فرمایا "الست بربکم" کیا میں تمھارا رب و پروردگار نہیں؟ تمام روحوں نے متفقہ طور پر حضرت حق جل مجدہ کی ربوبیت و پروردگاری کو تسلیم کرتے ہوئے جواب دیا "بلیٰ" ضرور آپ ہمارے رب ہیں۔ اس روایت کے بموجب ہندوستان ہی وہ مقدس سرزمین ہے جہاں بندوں نے اپنے رب کی ربوبیت کا سب سے پہلے اعتراف کیا، جس سے تمام روحانی ترقیات و معارف کے سلسلے کا افتتاح ہوا۔

۶۔ اس موقع پر لامحالہ تمام ہی انبیاء علیہم السلام کے انوارِ مبارک سے یہ سرزمین متبرک ہوئی۔ چناں چہ حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں رسول اللہؐ سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم نے اپنی اولاد کی روحوں کے زمرہ میں کچھ روحیں دیکھیں، جن کے انوار غیر معمولی طور پر سب سے فائق تھے۔ حضرت آدمؑ کو خود حیرت ہوئی اور دریافت فرمایا کہ خداوند یہ کون ہیں؟ ارشاد ہوا کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی ارواحِ مبارکہ ہیں۔

۷۔ قرآن حکیم کی اطلاع کے بموجب عہد الست کے موقع پر ایک دوسرا عہد بھی جملہ انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا تھا، جس میں ہر نبی نے آنے والے نبی کی تصدیق و اعانت کا میثاق کیا تھا اور چوں کہ سب کے بعد میں سلسلۂ نبوت کا دورِ حضرت خاتم الانبیاء افضل الرسل پر ختم ہونے والا تھا، اس لیے ثابت ہوا کہ بلا استثناء جملہ انبیاء علیہم السلام نے سرورِ کائنات کی تصدیق کی، نیز آپ پر ایمان لانے اور امداد کرنے کا عہد اس سرزمینِ ہند ہی میں کیا تھا۔ بہر حال ارضِ ہند ہی وہ ارضِ مقدس ہے جہاں سلسلۂ رشد وہدایت خداوندی، معرفتِ قرب

الٰہی و نجات اُخروی، اور فوز و فلاحِ ابدی کے استحصال کے لیے عہد و پیمان ہوا۔

۸۔ سرورِ کائنات ﷺ کا وہ نورِ مقدس جو سب سے پہلے پیدا کیا جا چکا تھا، حضرت آدمؑ کے صلبِ مقدس سے منتقل ہو کر اپنے اپنے زمانے کے بہترین آباء اور بہترین امہات کے ذریعے سے جملہ منازل طے کرتا ہوا اُفقِ مکہ سے طلوع ہوا۔ چوں کہ حضرت آدم اور آپ کے بعد حضرت شیث علیہ السلام ہندوستان میں سکونت پذیر تھے، اس لیے لامحالہ نورِ محمدی اور اس افضل سرمدی کا سب سے پہلا مطلع ارضِ ہند ہے اور سب سے آخری مشرق حجاز پاک ہے۔ چناں چہ اس موقع پر عہدِ رسالت کے مشہور شاعر اور جلیل القدر صحابی حضرت کعب بن زہیرؓ کا یہ شعر کس قدر معنی خیز ہے:

ان الرسول لنور یستضابه

مهند من سیوف الله مسلول

یعنی بلاشبہ رسول اللہ ﷺ ایک نور ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک برہنہ تیز تلوار ہیں جو ہندوستانی ساخت کی ہے۔

۹۔ حضرت ابوہریرہؓ سرورِ کائنات ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی تسکین کے لیے حضرت جبریل علیہ السلام کو بھیجا گیا تو حضرت جبریلؑ نے تشریف لا کر ندا دی اللہ اکبر اللہ اکبر اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان محمد ارسول الله یعنی جس طرح اذان میں ہے چار مرتبہ اللہ اکبر اور دو مرتبہ باقی کلمات۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اسمِ گرامی محمد سنا تو عرض کیا خداوندا یہ کون ہے؟ جواب دیا گیا کہ آپ کی اولاد کے سب سے آخری نبی (طبرانی، ابو نعیم، ابن عساکر وغیرہ)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ روح القدس کا نزول اور خدا کی عظمت و توحید کا ذکر اور سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا اعلان سب سے پہلے اسی ہندوستان کی خاک پر ہوا جو آج خوش نصیبی سے ہمارا وطن عزیز ہے اور قدرتی طور پر پاکستان ہے۔

۱۰۔ علمائے تاریخ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال و آثار کی سند سے بیان

کیا ہے کہ حضرت آدمؑ کے ساتھ چند دیگر مقدس چیزیں بھی نازل کی گئی تھیں۔ مثلاً ابن عباسؓ سے روایت ہے حجر اسود جنت کا ایک یاقوت ہے جو حضرت آدمؑ کے ساتھ نازل کیا گیا۔ صحیح السند روایت سے ثابت ہے کہ یہ اس قدر روشن تھا کہ آفتاب کا نور بھی اس کے سامنے ہیچ تھا۔ اس کو رفتہ رفتہ ابن آدم کی خطاؤں نے سیاہ کر دیا۔ نیز ابن سعد، طبری، ابن جریر اور ابن منذر وغیرہ علمائے تاریخ نے عصائے موسیٰ اور بنی اسرائیل کے اس مشہور تابوت کو بھی (جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے) جنت کی انھیں یادگاروں میں شمار کرایا ہے جو حضرت آدمؑ کے ساتھ ہندوستان مین نازل کی گئیں۔

۱۱۔ اسلامی عقیدے کے بموجب تمام نعمتوں کا سرچشمہ اور مخزن جنت ہے۔ دنیا میں جو کچھ نعمتیں اور راحتیں ہیں، وہ ان ہی حقیقی اور پائیدار نعمتوں کا پرتو ہیں۔ اس چیز کو ذہن میں رکھنے کے بعد اب اس پر غور کیجیے کہ جب جنت کا وہ باشندہ جس کا نام نامی آدمؑ ہے جنت سے زمین پر لایا گیا تو جنت کی وہ تمام نعمتیں یا ان کے اثرات اس کے ساتھ تھے، پھر جس طرح توالد اور تناسلِ کے ذریعے اس زمین کے مخصوص اجزا اولاد آدم کی شکل اختیار کرتے رہے۔ اسی طرح اس زمین کے دوسرے اجزا نے فطرتی صلاحیت کے بموجب جنت کی دوسری نعمتوں کو جذب کر لیا اور اس طرح ارض ہند جو آدمؑ کی سب سے پہلے منزل تھی، تمام دنیا سے زیادہ جنت کی نعمتوں سے فیضیاب ہوئی۔ اسی مفہوم کو الہامی زبان میں حضرت سدی نے یوں روایت کیا ہے کہ آدم علیہ السلام جب دنیا میں تشریف لائے تو ایک ہاتھ میں جنت کا وہ یاقوت تھا جس کا نام حجر اسود ہے اور دوسرے ہاتھ میں جنت کے درختوں کے کچھ پتے تھے۔ چناں چہ ہندوستانی درختوں کی خوشبو انھیں پتوں کے اثرات باقیات میں سے ہے (دلائل نبوت بیہقی)۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نقل کرتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت سے آدمؑ کو روانہ کیا تو جنت کے پھلوں کا توشہ عنایت فرمایا اور ہر ایک صنعت سکھادی (بزاز، ابن ابی حاتم، طبرانی وغیرہم)۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور سیدنا امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت

ہے کہ ہندوستان میں تمام دنیا سے زیادہ خوشبو اسی لیے پیدا ہوئی ہے کہ جنت سے حضرت آدمؑ کو یہیں اتار آگیا (ابن جریر، بیہقی، ابن عساکر وغیرہم)۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ لونگ، الائچی، کیوڑا، گلاب، دار چینی، کافور، چمبیلی، بیلا وغیرہ اسی طرح مشک، عنبر، زعفران وغیرہ اشیاء ہندوستان ہی میں پیدا ہوتی ہیں۔ مشک اور عنبر کا تذکرہ تصریح کے ساتھ بعض روایات میں بھی وارد ہوا ہے اور یہ ظاہر ہی ہے کہ حبوب اور غلے اس خاکدانِ ارضی کو حضرت آدمؑ کے ذریعے سے ہی عطا ہوئے۔

۱۲۔ ابن عساکر وغیرہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ سونا، چاندی حضرت آدم علیہ السلام کی درخواست پر پیدا کیا گیا۔ چناں چہ اس کے فلزات سب سے پہلے ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ اسی طرح یاقوت، ہیرا، زمرد اور موتی وغیرہ ہندوستان کے پہاڑوں اور سمندروں میں بکثرت ہوتے ہیں۔ الہامی روایات ان سب کو حضرت آدمؑ کے ورودِ مسعود کی برکات ثابت کرتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو رسالہ شامتہ العنبر)

۱۳۔ صنعت و حرفت کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی (نمبر ا میں) گزر چکا ہے کہ خداوند عالم نے ہر ایک چیز کی صنعت حضرت آدمؑ کو سکھلا دی تھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ جیسے علمائے محققین کی تحقیق کے بموجب یہ تعلیم فطری الہامات کے ذریعے سے ہوئی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ فطری الہام جس چیز کا نام ہے وہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اس کا تجربہ ہم عام طور پر اپنی زندگی میں کرتے رہتے ہیں۔ جب کوئی ضرورت زیادہ مجبور کرتی ہے تو بسا اوقات قدرتی طور پر اس کا کوئی حل ہمارے دماغ میں آجاتا ہے۔ ہم اس وقت ضمیر میں ایک روشنی محسوس کرتے ہیں۔ یہی روشنی فطری الہام ہے۔

۱۴۔ حضرت آدمؑ تقریباً ایک ہزار سال تک دنیا میں رہے۔ لامحالہ اس طویل عرصے میں ہزاروں ضرورتیں پیش آئیں اور فطری الہامات نے ان کی عقدہ کشائی کر کے اولادِ آدم علیہ السلام کے لیے سیکڑوں صنعتوں کا ذخیرہ پیدا کر دیا۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی

میں اسی ذخیرے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ شیخ علی رومی نے ان صنعتوں کی تعداد ایک ہزار بتائی ہے۔ غرض اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چوں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت شیث علیہ السلام ہندوستان ہی میں رہے، لہٰذا ہندوستان ہی کو تمام دنیا کی صنعت و حرفت میں استادِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے۔

مورخین نے بیان کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو قدرتی عطیے کے طور پر ہتھوڑا وغیرہ لوہے کے چند آلات بھی دیے گئے تھے۔ بنابریں یہ لوہے کی صنعت کی ابتدا ہے، جس کا مرکز ہندوستان ہے۔

یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ امن اور جنگ کی تمام ضروریات میں لوہے اور لوہے کی صنعت کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ آج ہمیں ہر جگہ لوہے ہی لوہے کی کارفرمائیاں نظر آرہی ہیں۔ اسی بنا پر ارشادِ خداوندی بھی ہے:

وانزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس۔ (سورہ حدید: ۲۵) ہم نے لوہا نازل کیا۔ اس میں انسانوں کے لیے شدید خطرہ بھی ہے اور بہت زیادہ منافع بھی ہے۔

۱۵۔ حضرت آدمؑ کو جب جنت سے اتارا گیا تھا تو آپ نے اپنا جسم پتوں سے ڈھانکا تھا۔ لیکن پتوں سے بدن ڈھانکنے کا یہ دور زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہا، بلکہ حضرت آدم ہی نے صنعت پارچہ بافی کی ایجاد بھی کر دی۔ جیسا کہ حدیث مذکورۂ بالا اور شیخ علی رومی کے قول سے ثابت ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہندوستان کی سرزمین کو پارچہ بافی کی صنعت کا مرکز اول ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

۱۶۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ جب حضرت آدم و حوا حجاز میں خانۂ کعبہ کے قریب ملے تو انھیں بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیا گیا۔ اس حکم سے ثابت ہوتا ہے کہ فنِ تعمیر کا آغاز بھی حضرت آدمؑ کے زمانے ہی میں آپ کی ایجاد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس صنعت کی اوّلیت کا شرف بھی ہندوستان ہی کو حاصل ہے۔

۱۷۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ابتدا میں ہندوستان

ہی رہے۔ ہندوستان ہی میں حضرت آدمؑ کا بنایا ہوا وہ تندور تھا جس سے طوفان نوح کا چشمہ پھوٹا۔ نیز ہندوستان ہی کے ایک پہاڑ پر جس کا نام "بودھنیر" تھا حضرت نوح نے اپنی کشتی بنائی تھی۔ ماہرین کشتی کی ساخت سے ثابت ہوتا ہے کہ دریائی سفر اور صنعت تجاری کی ابتدا کا شرف بھی ہندوستان ہی کو حاصل ہے۔

۱۸۔ قصۂ آدم نے جس طرح ہندوستان اور حجاز کا قدیمی تعلق ثابت کیا اسی طرح خانۂ کعبہ کے سب سے پہلے بانی، سب سے پہلے زائر اور سب سے پہلے حج بیت اللہ کے لیے سفر کا شرف بھی باشندگان ہند کے لیے ثابت کر دیا۔

۱۹۔ علماء کا ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات ہندوستان میں ہوئی اور یہیں دفن کیے گئے۔ اس روایت کی بنا پر خاک پاک ہندوستان ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ ابوالبشر اور وہ اوّلین نبی جس کے دورِ حیات کا اوّلین گہوارہ خاک ہند تھی، اس کی آخری آرام گاہ کا فخر بھی اس سرزمین کو حاصل ہے۔

۲۰۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ہندوستان طوفان نوح سے محفوظ رہا۔ علمائے مورخین کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے مذکورہ بالا فضائل کی بنا پر یہ بعید بھی نہیں کہ فضائل و مناقب کے مرکز اوّل کو قدرت نے اس ہول و غضب کے اثر سے محفوظ رکھا ہو، واللہ اعلم بالصواب۔

باب سوم:

دور آخر کے فضائل اور وقت کا مطالبہ

یہاں تک ہندوستان کے جو فضائل و مناقب بیان کیے گئے وہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی بعثت اور اسلام کی تکمیل آخر کے بعد بھی یہ سرزمین فضائل و محاسن کا مرکز رہی ہے، جس کی مختصر تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(الف) اطرافِ سندھ میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تشریف لائے۔ اس لیے سندھ کا چپہ چپہ صحابہ و تابعین کا مورد ہونے کی وجہ سے عزت و احترام کا مستحق ہے۔

(ب) سیکڑوں، ہزاروں اولیاء، اقطاب اور ابدال و شہداء اور صلحاء و علماء خاکِ ہند میں مدفون ہیں۔

(ج) گیارہ سو برس تک مسلمانوں کی حکومت ہندوستان پر رہی اور یہ ملک دارالاسلام بنا رہا۔

(د) لاکھوں مسجدیں، ہزاروں علمی درس گاہیں، ہزاروں علمائے کرام اور لاکھوں کروڑوں دیندار مسلمان اس وقت یہاں موجود ہیں۔

وطن کا مطالبہ:

مذکورۂ بالا تمام احادیث و روایات کو جان لینے کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ خالص مذہبی نقطۂ نظر سے ہندوستان کی عظمت و تقدیس سے انکار نہیں

کیا جا سکتا۔ اس لیے اب سوال یہ ہے کہ وہ لوگ جن کو اس خاک میں بسنے کا شرف حاصل ہے ان کا فریضہ کیا ہے؟ بالفاظِ دیگر ہم جن کا وطن ہندوستان ہے ان پر ہندوستان کا مطالبہ کیا ہے؟ اس کا جواب وہی ہے جو فلسطین کے رہنے والوں نے یہود کو دیا ہے۔ وطن کا مطالبہ ہے کہ اسے آباد کرو، اس کو دن دونی رات چوگنی ترقی دو اور رحمتوں اور برکتوں کے انوار سے اسے معمور کرو۔ اور جو بیرونی طاقت اس پر تسلط جمائے اس کو نکال کر باہر کردو۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں یہاں قومیت و بین الاقوامیت یا محدود وطنیت و لامحدود وطنیت کا سوال ابھار رہا ہوں۔ اس بحث سے قطع نظر، سوال یہ ہے کہ ہر صورت میں وطن کا ایک حق ہے جسے ہر بسنے والے کو ادا کرنا چاہیے۔ سرورِ کائنات کا آبائی وطن مکۂ معظمہ تھا، لیکن ہجرت کے بعد جب مدینۂ طیبہ کو وطن قرار دیا تو مدینہ کے لیے حضور ﷺ کی دعا ہوا کرتی تھی کہ اے اللہ! ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما، ہمارے مدینہ میں برکت عطا فرما، ہمارے پیمانوں اور وزنوں میں برکت عطا فرما۔ خداوندا! حضرت ابراہیم علیہ السلام آپ کے بندے، آپ کے خلیل اور آپ کے نبی تھے اور میں بھی آپ کا بندہ اور آپ کا نبی ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے آپ سے دعا کی، خداوندا! میں مدینہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ مکہ سے دو چند برکتیں مدینۂ طیبہ کو عطا فرما۔ خداوندا! ہمارے اندر مدینہ کی محبت اتنی ہی پیدا کردے، جتنی تو نے مکہ کی محبت دی ہے۔ (ترمذی شریف، ج ۱، ص ۸۴!) یا اس سے بھی زیادہ خداوندا! مدینے کی آب و ہوا درست کردے، مدینے کے بخار کو حجفہ کی طرف منتقل کردے۔ (بخاری شریف، ج ۱، ص ۵۵۸)

ملاحظہ فرمائیے اس دعائے مبارک سے وطنِ قدیم اور وطنِ جدید کی محبت پھر اس کی اقتصادی ترقی اور آب و ہوا کی اصلاح کے جذبات کس طرح مترشح ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ حفظانِ صحت نیز ترقی اور برکت کے لیے روحانی طرز اختیار کیا گیا ہے جو شانِ نبوت کے عین مناسب ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہ تھے کہ مادی طرز اختیار کرنا ممنوع ہے۔ چناں چہ خلفائے راشدین نے مادی طریقے بھی اختیار کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مدینہ طیبہ بلکہ

پورے حجاز مقدس کو رشکِ فردوس بنا دیا گیا۔

اس قدر کہہ دینے کے بعد بھی کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ہندوستان کیا فرائض عائد کرتا ہے اور اس کا ہر ہر چپہ پکار پکار کر ہم سے کیا مانگ رہا ہے؟

محمد میاں عفی عنہ

ضمیمہ:

افاداتِ قاسمیہ

''عظمت ہند کے بعض آثار و روایات کے ذیل میں حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی کی ایک تحریر نقل کی جاتی ہے۔ اس کے مطالب کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ حضرت مخدومی قاری شریف احمد صاحب دامت فیوضہم جو مجلس یادگار شیخ الاسلام۔ پاکستان، کراچی کے صدر نشین بھی ہیں، کی تالیف لطیف تذکرۃ الانبیاء (مشتمل بہ دو جلد) شایع ہوئی تو حضرت قاسمی صاحب سے تعلقات دیرینہ کی تقریب سے اس کا ایک سیٹ حضرت مدظلہ العالی کو بھی ارسال فرمایا گیا۔ محترم قاسمی صاحب نے اس تحفۂ گراں مایہ کے جواب میں جن قیمتی خیالات کا اظہار فرمایا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے مورخ ملت مولانا سید محمد میاںؒ کے متعلقہ رسالے کے ساتھ شایع کر دیا جائے۔''

ابوسلمان شاہ جہاں پوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم مولانا قاری شریف احمد صاحب کی تالیف ''تذکرۃ الانبیاء'' کے دونوں حصے نظر نواز ہوئے۔

قاری صاحب نے عام مسلمانوں کی عملی زندگی کو حضرات انبیاء (علیہم السلام) کے اسوۂ حسنہ کی روشنی سے منور کرنے کی غرض سے یہ مرتب کیا اور اس تذکرہ کو تاریخی اور علمی بحثوں سے بچا کر واقعاتِ نبوت کے اہم عملی پہلوؤں اور خصوصیات کو نمایاں کرنے کی قابلِ قدر کوشش کی ہے۔

عربی میں قصص (واقعات) کا مادہ قصّ ہے جس کا مفہوم پیچھے چلنا اور پیروی کرنا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت لوضاؑ نے اپنی بیٹی کو نصیحت کی تھی:

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ. (قصص:۱۱)

''موسیٰ کی بہن سے اُن کی ماں نے کہا تو اس (صندوق) کے پیچھے پیچھے چلتی رہیو۔''

قرآن کریم نے واقعات نبوت کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ.

(یوسف:۱۱۱)

''ان کے واقعات میں دانش مندوں کے لیے عبرت ہے۔''

محترم قاری صاحب کی اصلی فضیلت کلام رب العالمین کی خدمت ہے۔ اسی فضیلت کی برکت ہے کہ قاری صاحب کے ہاتھ سے دین کی بڑی مفید کتابیں وجود میں آئیں۔

اس اصلی خدمت کے ذریعے خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے قاری صاحب کو ان شاء اللہ قربِ خداوندی میں خاص درجات حاصل ہوں گے اور ان کے توسل سے ان کے سیکڑوں شاگردوں کو بھی جنت کے اس شاہ زرد کے جلو میں بیٹھنے کی سعادت

حاصل ہوگی۔ اور ان شاء اللہ یہ خاک سار بھی ان میں شامل ہوگا۔ خدا تعالیٰ فرشتگانِ رحمت سے یہ دعا کراتا ہے:

وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآءِ هِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ.

(مومن: ۸)

''اے خدا! ان جنتیوں کے ساتھ ان کے آباء و ازواج اور ان کی اولاد کو بھی ترقی دے کر جنت میں داخل فرما۔''

مفسرین نے لکھا ہے کہ نسبی اور صلبی اولاد میں روحانی اور علمی اولاد بھی شامل ہے۔

حضرت قاری صاحب نے حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے اترنے کی بحث میں ایک اختلافی مسئلہ چھیڑ دیا ہے اور اس پر ایک طبقہ بحث و مباحثہ کا دروازہ کھول سکتا ہے۔

اس لیے اس مسئلے کے تاریخی ماخذ کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے۔

قاری صاحب نے مولانا محمد میاں صاحب دیو بندیؒ کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے ہندوستان کی زمین (سرندیپ) میں اتارے گئے۔

بعض تنگ نظر اہل قلم نے اس تاریخی قول پر علمائے حق کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ نیشنلسٹ علما نے مکہ اور مدینہ کے مقابلے میں ہندوستان کی عظمت کو نمایاں کرنے کے لیے یہاں تک لکھا کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں اتارے گئے۔

ہندوستان کی فضیلت کے عنوان سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے ایک کتابچہ تحریر فرمایا اور اسے مزید وضاحت کے ساتھ مولانا محمد میاںؒ صاحب نے جمعیت علمائے ہند کی طرف سے شایع کیا۔

ایک خاص طبقے کے نزدیک حریت پسند علما کو جا بہ جا بدنام کرنا اس کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور یہ پروپیگنڈا بھی اس کی ایک مثال ہے۔

حقیقت یہ ہے ساتویں صدی کے مشہور محقق اور محدث علامہ ابن کثیر دمشقیؒ نے اپنی تاریخی کتاب ''البدایہ والنہایہ'' میں اور اپنی مشہور کتاب ''تفسیر ابن کثیر'' میں اس قول کو ترجیح کے ساتھ نقل کیا ہے اور مکہ معظمہ میں نزول کے قول کے مرجوح ہونے کا اشارہ کیا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ اور ان کے مشہور شاگرد امام مجاہدؒ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے اور یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت جبرئیل امین تعمیر کعبہ کے وقت ہندوستان ہی سے حجر اسود لے کر گئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے بیت اللہ کی دیوار میں نصب کیا۔

ابن کثیرؒ کے بعد مشہور عرب مورخ البیرونی نے ہندوستان کے مذہبی اور تمدنی حالات پر ''کتاب الہند'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس میں حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق بحر ہند کے جزیرہ (لنکا) کے ایک پہاڑ (رُہون) پر نزول بیان کیا۔

اور آپ کے جانشین حضرت شیث علیہ السلام کی قبر کے متعلق لکھا کہ وہ اجودھیا (فیض آباد) میں موجود ہے۔

اس کے بعد حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کے ہم عصر محقق عالم علامہ آزاد بلگرامی نے ''شمامۃ العنبر'' (عنبر کی خوش بو) کے نام سے ہندوستان کی تاریخی عظمت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی اور حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ کے وہ آثار اس میں جمع کر دیے۔

پھر ایک مبسوط کتاب ''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' کے نام سے تحریر کی اور اس میں پہلی کتاب کو باب اول کے طور پر شامل کیا، یہ کتاب عربی میں تھی، بعد میں علما نے مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے شایع کیے۔

عالم اسلام کے جلیل القدر علمی اور روحانی بزرگ اور جہاد آزادی کے قاید جلیل مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے ان کتابوں کی روشنی میں ''فضایل ہندوستان'' کے نام سے ایک کتابچہ مرتب فرمایا۔

اہل حسد تو کیا توجہ کریں گے، لیکن اہل علم سے توقع ہے کہ وہ غور کریں کہ حضرت مدنیؒ نے یہ بحث کیوں چھیڑی؟

ہندو فرقہ پرست ہندوستانی مسلمانوں کو چور، ڈاکو اور باہر سے آئے ہوئے حملہ آور قرار دے کر ان میں خوف و ہراس پیدا کرنے کی متواتر کوشش کرتے ہیں۔

مولانا مدنیؒ نے اس کے جواب میں مسلمانوں کے اندر حوصلہ اور اعتماد پیدا کرنے کے لیے یہ بتایا کہ ہندوستان اصل میں مسلمانوں کا قدیمی وطن ہے۔ ہندوستان میں پہلے رسول آدم علیہ السلام آئے اور آدم کا مذہب توحید تھا، ایک ہزار برس تک حضرت آدم علیہ السلام نے اس سرزمین پر توحید کی روشنی پھیلائی، یہیں ان کی اولاد پھیلی، جس کا مذہب توحید تھا اور توحیدی مذہب کا نام ہی اسلام ہے۔

پس اسلام اور مسلمان انسانی وجود کے وقت ہی سے ہندوستان کے باشندے ہیں۔

عربوں کے ذریعے ہندوستان میں اسلام کی پہلی آمد نہیں بلکہ اپنے وطن اصلی کی طرف واپسی ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے کہا

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

خاک سار حضرت قاری صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ موصوف نے اپنی اس عمدہ کتاب کے ذریعے خاک سار کو موقع دیا کہ اس اہم مسئلے کی وضاحت کرے۔

اخلاق حسین قاسمی دہلوی
مہتمم جامعہ رحیمیہ ۔ مرکز شاہ ولی اللہؒ
شیخ چاند اسٹریٹ، لال کنواں ۔ دہلی

۱۱؍جنوری ۱۹۸۸ء

ماہ نامہ دارالعلوم، دیوبند کا ایک سلسلۂ مضمون

مسلمان اور ہندوستان کی وطنی حیثیت

اور

دوسرے مسائل

از قلم

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ ۔ پاکستان

کراچی

پیش لفظ

میرا منصب نہیں کہ مذکورۂ بالا عنوانات پر خامہ فرسائی کروں۔ مگر جب عزیز محترم مولانا سید ازہر شاہ صاحب مدیر رسالہ دار العلوم، دیوبند کا اصرار ہوتا ہے تو میرے دل ودماغ پر حضرت الاستاذ علامہ سید انور شاہ صاحب (قدس سرہ العزیز) سابق شیخ الحدیث دار العلوم، دیوبند کا تصور حکومت کرنے لگتا ہے اور مجھے لامحالہ تعمیل ارشاد کے لیے آمادہ ہونا پڑتا ہے۔ لہذا، چند صفحات ہدیۂ ناظرین ہیں۔ جو کچھ لکھوں خدا کرے صحیح ہو واللہ الموفق وھو المعین وھو یھدی الی الرشاد۔

کوئی فیصلہ اسی وقت تک پردۂ خفا میں رہتا ہے، جب تک مقدمے کے تمام پہلو سامنے نہ آئیں۔ شہادتوں، بیانوں اور وکلا کی جرح کا منشا یہی ہوتا ہے کہ مقدمے کے تمام پہلوؤں کو "جج" کے سامنے اجاگر کردیا جائے۔

جب مقدمے کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں تو وہ خود فیصلے کا اعلان کردیتے ہیں۔

لہذا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ مذکورۂ بالا عنوان سے متعلق تاریخی اور نفس الامری حقایق پیش کردیے جائیں۔ یہ حقایق انشاءاللہ خود بخود پکار اٹھیں گے کہ فیصلہ کیا ہو۔

بایں ہمہ یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ ہم اس تمام تحریر کو استفسار کی حیثیت دیں گے اور تمام اہل علم اور ارباب فہم سے توقع رکھیں گے کہ غلطیوں کی اصلاح کریں اور رائے عالی سے مطلع فرما کر ہمارے دلی شکریے کو قبول فرمائیں۔

(مولانا) سید محمد میاں

باب اول:

ہندوستان کی گذشتہ تاریخ پر ایک نظر

مسلمان اور برٹش دورِ حکومت

(الف) مسلمان دورِ حکومت:

(۱) اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان تقریباً ایک ہزار سال تک دارالاسلام رہا۔ یہاں کے حکمران مسلمان تھے یا مسلمان بادشاہوں کے ماتحت اور ان کے باجگزار تھے۔

مسلمان حکمران داخلی اور خارجی پالیسی میں کسی کے ماتحت نہیں تھے اور خود اپنی فوجی قوت سے اپنے ملک اور اپنی حکومت کی حفاظت کیا کرتے تھے۔

(۲) اس ملک کے زیادہ تر مسلمان خود یہاں کے قدیم باشندے ہیں اور تقریباً ایک چوتھائی مسلمان وہ ہیں جو دوسرے ملکوں سے آکر یہاں آباد ہوئے اور انہوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔

(۳) مسلمانوں کی کافی تعداد مسلمان حکمرانوں سے پہلے گجرات، کاٹھیاواڑ، مدراس وغیرہ جنوبی سرحد کے شہروں میں آکر آباد ہوئی۔ اقتصادی ضرورتیں ان کو کھینچ کر یہاں لاتی تھیں یا تبلیغی مقاصد نے ان کی اس ملک کی طرف رہنمائی کی تھی۔ بہر حال تاجر اور مبلغ

یہاں پہنچے اور انھوں نے بود و باش اختیار کی اور رفتہ رفتہ ان کی اولاد کا آبائی وطن یہ ہندوستان ہی بن گیا۔ سا اوقات ان پاکباز نفوسِ قدسیہ کو جو نوعِ انسان کا درد دل میں لے کر تبلیغ و اصلاح کی غرض سے تشریف لائے تھے، بے پناہ مصائب برداشت کرنے پڑے۔ جن کو ان بندگان خدا پرست نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ نتیجہ کامیابی رہا، جو آج ہماری تاریخ کا سنہری باب ہے۔

(۴) مسلمان حکمرانوں کے دور میں اور اس سے پہلے اور بعد میں مسلمانوں نے کروڑوں، اربوں روپے کی جائدادیں جائز اور صحیح طور پر حاصل کیں اور آج تک ان کی املاک جن کی قیمت کئی ارب روپے ہو سکتی ہے یہاں موجود ہیں۔

(۵) مسلمانوں نے اس ملک میں اسلامی آثار و روایات کو قائم اور سربلند اور مستقبل میں اپنی نسلوں اور جدید مسلمانوں کے اسلام اور تعلیم اسلام کو محفوظ اور جاری رکھنے کے لیے ہزاروں مدرسے قائم کیے، لاکھوں مسجدیں تعمیر کیں اور کروڑوں روپے کی جائدادیں وقف کیں جو آج ہمارا ملی سرمایہ ہیں۔

(ب) برٹش دورِ حکومت:

(۶) ایک دور آیا کہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی۔ سات سمندر پار کر کے ایک قوم یہاں پہنچی۔ اس نے دھوکا، مکر، فریب اور پھر جبر، تشدد اور ہولناک مظالم سے مسلمانوں کی حکومت ختم کی۔ اپنی قاہر اور جابر سلطنت قائم کی۔ اس کے بے پناہ مظالم کا تذکرہ بھی لرزہ خیز ہے۔ مثلاً مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے انگریزوں کے بیانات کے حوالے سے لکھا ہے:

> "بنارس اور الٰہ آباد میں کان پور کے واقعے سے پہلے ایک موقع پر چند نوجوان لڑکوں کو محض اس بنا پر پھانسی دی گئی کہ انھوں نے شوقیہ طور پر باغیوں کی جھنڈیاں اٹھا کر بازاروں میں منادی کی تھی۔ سزائے موت دینے والی عدالت کے ایک افسر کے پاس جاکر درخواست کی کہ ان نابالغ مجرموں پر رحم کر کے پھانسی کی سزا کو تبدیل کر دیا جائے۔ لیکن بے سود۔ اس تمام سلسلے میں ایسے بے شمار واقعات ہیں، جن میں اس قسم کی نمائشی عدالتوں

سے بھی گریز کیا گیا اور دھگناد انسانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ پھانسیاں دینے کا سامان بھی مکمل نہ تھا اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریقے سے پوری طرح واقفیت تھی۔ چناں چہ ان میں سے ایک شریف آدمی اپنی شاندار کامیابی کا اس طرح فخریہ اظہار کیا کرتا تھا کہ ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کیا کرتے تھے۔ یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے تھے اور گلے میں اوپر سے رسہ ڈال کر ہاتھی کو ہنکا دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ملزم اس طرح تڑپنے اور جانکنی کی حالت میں انگریزی کے آٹھ کے ہندسے کی دلچسپ شکل(8) بن کر رہ جاتا تھا۔

(انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ، ص ۶۴)"

"لکھنو پر قبضہ کرنے کے بعد قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا گیا۔ چناں چہ ہر ایسے ہندوستانی کو قطع نظر اس سے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی، بے دریغ تہ تیغ کیا گیا۔ یہاں تک کہ نہ کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ اس قسم کا کوئی تکلف روا رکھا جاتا تھا، بلکہ محض سیاہ رنگ ہی اس کے مجرم ہونے کے لیے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی اور سزا دینے کے لیے ایک رسہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔" (...... تصویر کا دوسرا رخ، ص ۶۸)

"دہلی وغیرہ میں شہر کے بلند مقام پر ایک چوگوشہ سولی نصب کی گئی تھی۔ جہاں پانچ، چھ اشخاص کو روزانہ پھانسی دی جاتی تھی۔ جس کے قریب ہی انگریز افسران سگریٹوں کے کش پر کش اڑاتے ہوئے، لاشوں کے تڑپنے کے نظاروں میں محو دکھائی دیتے تھے"۔

(ایضاً، ص ۶۶)

لارڈ رابرٹس اپنی والدہ کو ایک چٹھی میں لکھتا ہے:

"ہم پشاور سے جہلم تک پیادہ سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستہ میں کچھ کام بھی کرتے آئے۔ یعنی باغیوں سے اسلحہ چھیننا اور ان کو پھانسیوں پر لٹکا دینا۔ چناں چہ توپ سے باندھ کر اڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے اکثر استعمال کیا ہے، اس کا لوگوں پر ایک خاص اثر ہوا۔ یعنی ہماری ہیبت لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی۔" (ایضاً ص ۳۴)

"شمال مغربی سرحدی صوبے اور پنجاب میں اندھادھند پھانسیاں دی گئیں۔ جن میں مرد، عورت اور بچوں کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی تھی۔ بے شمار دیہات جلائے گئے۔"

(ایضاً، ص ۵۱)

"راستے میں سیکڑوں میل تک سڑک کے دونوں طرف دیہاتیوں کو بے دریغ قتل و غارت اور برباد کر کے ملک کو صحرا کی طرح ویران کر دیا گیا"۔

"دہلی سے باغیوں کے فرار ہونے کے بعد انگریز ناحین نے باشندوں کا قتل عام کیا اور بے ضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہری پھانسی کے تختے پر لٹکا دیے گئے، حال آں کہ ان کو بغاوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا"۔

(۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ، ص ۷۵۔۷۶)

"مختصر یہ کہ بے شمار دیہات کو ایسے وقت میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا جب کہ عورتیں، بوڑھے اور بچے گھروں کے اندر موجود تھے"۔ (ایضاً، ص ۷۸)

ٹائمنر کے نامہ نگار نے لکھا تھا:

"میں نے دہلی کے بازاروں میں سیر کرنا مطلقاً چھوڑ دیا، کیوں کہ کل ایسا دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب ایک افسر چیں سپاہی لے کر شہر کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی ان کے ہمراہ ہو لیا اور راستہ میں ہم نے چودہ عورتوں کی لاشوں کو شالوں میں لپٹے ہوئے بازار میں پڑا پایا، جن کے سر دھڑوں سے ان کے خاوندوں نے خود جدا کیے تھے۔ چناں چہ ایک عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دردناک حادثہ اس لیے ظہور پذیر ہوا کہ ان کے خاوندوں کو خطرہ تھا کہ اگر انگریز سپاہیوں کے قابو میں آ گئیں تو وہ ان کی عصمت دری کریں گے۔ لہٰذا تحفظ ناموس کا یہی طریقہ مناسب خیال کیا گیا جس کے بعد خاوندوں نے بھی خودکشی کر لی۔ چناں چہ ان کی لاشوں کو بھی ہم نے دیکھا۔" (ایضاً، ص ۲۸)

"والپول" کا بیان ہے

"صرف دہلی میں تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ مؤلف 'تبصرۃ التواریخ' کی تحقیق یہ ہے کہ تیس ہزار مسلمان قتل کیے گئے اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔"

(افسانۂ غم، ص ۲۸، ۲۹)

مذکورۂ بالا اقتباسات میں بہت ہی مختصر طور پر پشاور سے لے کر لکھنؤ اور کان پور تک کے واقعات کا خفیف سا عکس پیش کیا گیا ہے جو بہت ہی نا تمام ہے۔

صوبۂ بہار، کلکتہ اور بنگال جہاں سے ۱۸۵۷ء کے واقعات کا آغاز ہوا تھا، وہ اس سے

بھی زیادہ سخت ہیں۔ ان کی تفصیلات مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے اپنی کتاب "دی آدر سائڈ آف دی مڈل" میں پیش کی ہیں اور ان تمام لرزہ خیز تفصیلات کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ جتنے واقعات قلمبند کیے گئے ہیں ان میں سے ایک بھی کسی ہندوستانی قلم یا زبان سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ یہ سب انگریزوں اور بالخصوص انگریز افسران کے بیانات سے ماخوذ ہیں۔ بہر حال سرحد سے بنگال تک پورے شمالی ہند میں درختوں پر لٹکا کر پھانسی دینے، توپ دم کرنے، کمروں میں بند کر کے بھوکے پیاسے مار ڈالنے، گرم سلاخوں سے داغ داغ کر مارنے، چونے کی بھٹی میں ڈال دینے، ہاتھی کے پیروں سے باندھ کر سسکا سسکا کر مارنے، سور کی کھال میں سی کر چونے کی بھٹی میں ڈال دینے کے واقعات اتنے بکثرت ہیں کہ ان کے قلمبند کرنے کے لیے ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں بطور اشارہ چند واقعات نقل کیے گئے (اس سے مزید تفصیل آپ "علماء ہند کا شاندار ماضی" حصہ چہارم میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں)۔

بطور نمونہ دو اقتباس اور ملاحظہ فرمائیے۔

ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈی لبن نے لکھا تھا:

"زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی لملنا یا زندہ آگ میں جلا دینا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بد فعلی کریں، ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب بھی کبھی اجازت نہیں دیتی۔ ہماری گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہیں۔" (ترجمہ دی آدر سائڈ آف دی مڈل، ص ۴۲)

مجینڈی لکھتا ہے: -

"وہ رات ہم نے جامع مسجد (دہلی) پر پہرہ دیتے ہوئے بسر کی اور ہمارا زیادہ تر وقت ان قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے یا پھانسی پر لٹکانے میں گزرتا تھا جن کو ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا۔ لیکن آخر وقت تک ان کے چہروں سے شجاعت اور ضبط کے آثار ہویدا تھے، جو اس سے کسی بڑے مقصد کے لیے شایانِ شان علامات تھیں۔" (۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ، ص ۴۵)

(۷) انگریزی مظالم کی چیرہ دستیاں مسلمانوں کی حکومت اور ان کے جان و مال تک ہی محدود اور منحصر نہیں رہیں، بلکہ اس نے مسلمانوں کے دین اور مذہب کو تباہ کرنے میں بھی کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ بے شمار اوقاف کو ضبط کیا، مساجد کو شہید کیا اور قبرستانوں کو مسمار کر دیا گیا۔

آج ان شاہی جاگیروں کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا جو تاج محل، آگرہ، جامع مسجد، دہلی جیسے شاہی اداروں کے لیے مسلمان بادشاہوں نے شاہانہ انداز میں وقف کی تھیں۔ صرف تاریخ کے اوراق ہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اوقاف کروڑوں روپے کے تھے۔ جامع مسجد دہلی جو سرزمین ہند میں مرکز اسلام کی حیثیت حاصل کر چکی ہے، اس کے ضبط کرنے کے واقعات دہلی کے ہر باشندے کو معلوم ہیں۔ تاریخ ان واقعات کو اس لیے نہیں محفوظ کر سکی کہ نوکِ شمشیر کے سامنے نوکِ قلم کو قوتِ تحریر باقی نہیں رہی تھی۔

لاہور، لکھنو، احمد آباد وغیرہ میں آپ کو بہت سی مسجدیں مل سکتی ہیں جو منہدم کی گئیں یا دفتروں، تھانوں اور پولیس چوکیوں کے کام میں لائی گئیں، جو بعد میں بہت سے اپیلوں اور درخواستوں کے بعد واگذار کر لی گئیں۔ اور تقریباً پندرہ سال پہلے لاہور میں ایک مسجد دکھائی گئی تھی جس میں ایک محکمے کا دفتر تھا۔ وہ اب بھی دفتر کے کام ہی میں استعمال کی جا رہی ہے۔

(۸) انگریز کے مقابلے میں استخلاصِ وطن کی جو تحریک شروع ہوئی ۱۹۴۷ء میں اس کا خاتمہ اس پر ہوا کہ

(ا) ہندوستان کے دو حصے کر دیے گئے۔

(ب) ہر حصہ ملک کو داخلی اور خارجی امور میں آزادی دی گئی۔

(ج) اور اس کا بھی حق دیا گیا کہ وہ برطانیہ سے اپنا تعلق منقطع کر سکتے ہیں۔

اس تقسیم کی بنا پر یہ ضرور ہوا کہ مسلم اکثریت کا علاقہ پاکستان بن گیا اور ہندو اکثریت کے علاقے نے ہندیا انڈین یونین اپنا نام تجویز کیا۔

مگر اس تقسیم نے کسی بھی اقلیت کو اکثریت کے علاقے میں وطنی اور شہری حقوق سے

محروم نہیں کیا۔ بود و باش، کاروبار، ملازمت، تجارت، مذہبی مراسم اور امورِ معاشرت وغیرہ میں اس تقسیم کی رو سے جو حیثیت اکثریت کو حاصل ہوئی، وہی اقلیت کی بھی تسلیم کی گئی۔

جس طرح ایک مسلمان کو پاکستان میں، ایک ہندو کو ہندوستان میں رہنے سہنے، ملازمت، مذہبی عبادتوں، مذہبی تہواروں اور نکاح، بیاہ شادی یا مراسم تعزیت انجام دینے کا حق ہے، ایسے ہی ہر ایک اقلیت کو ان امور کا حق حاصل ہے۔ تقسیم نے ان امور میں اقلیت اور اکثریت کے درمیان کوئی امتیاز نہیں قائم کیا۔ اسی بنا پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ تقسیم فرقہ واریت کے اصول پر نہیں ہوئی۔

(۹) جب ملک تقسیم ہو رہا تھا تو دونوں ملکوں کے کچھ علاقوں میں بلوؤں اور ہنگاموں کا ایک طوفان اٹھا، جس کی قیامت خیزیاں کم و بیش تین ماہ تک جاری رہیں، جس سے پاکستان کا تقریباً نصف علاقہ اور ہند یونین کے چند سرحدی علاقے (مشرقی پنجاب، دہلی اور بھرت پور وغیرہ) تہ و بالا ہو گئے۔ فوج اور پولیس تک اس طوفان سے متاثر ہوئی۔ حکومت کا نظم و نسق معطل ہو گیا۔ یہاں تک کہ ان متاثرہ علاقوں کی اقلیتیں ترکِ وطن پر مجبور ہوئیں۔

(۱۰) تقسیم کے بعد ہند یونین کے اربابِ حل و عقد (دستور ساز اسمبلی) نے یونین کا ایک دستور بنایا، جس میں بلا لحاظ مذہب و ملت ہر باشندۂ ملک کے بنیادی حقوق مساوی تسلیم کیے گئے۔ دستوری اور آئینی طور پر تسلیم کیا گیا کہ ہر فرقہ کو مذہبی امور میں آزادی ہو گی۔

حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہو گا۔ یعنی وہ مذہب و ملت کی بنا پر باشندگانِ ملک میں کوئی امتیاز روا نہ رکھے گی۔

ملک کے تمام باشندے اپنی آزادانہ رائے سے نمائندے منتخب کریں گے جو غیر مذہبی حکومت کی تشکیل کیا کریں گے اور ہر باشندۂ ملک بلا لحاظ مذہب و ملت اپنی صلاحیت، قابلیت اور جد و جہد کے بموجب حکومت میں حصہ لے سکے گا۔

(۱۱) آزادی ملنے کے بعد اصول آزادی، نیز ان اصول کے پیشِ نظر جو تقسیم کے وقت فریقین نے تسلیم کر رکھے تھے اور جن کو ہند یونین کی دستور ساز اسمبلی نے بنیادی حقوق اور

اصول موضوعہ کی حیثیت دے دی ہے۔ ہند یونین کے مسلمانوں کی حیثیت اس حیثیت سے متفاوت ہوگئی، جو انگریزی حکومت کے دور میں ان کو حاصل تھی۔ مثلاً :

(الف) انگریزی دور حکومت میں ملک کا مالک برطانوی سامراج تھا۔ اس ملکیت میں نہ کسی مسلمان کا حصہ تھا، نہ ہندو کا۔ چناں چہ وہ جس کو چاہتا تھا، اپنی صوابدید کے مطابق اپنے اغراض کے لیے استعمال کرتا تھا۔ کبھی وہ مسلمان کو آگے بڑھا دیتا تھا اور کبھی ہندو کو آگے بڑھا کر مسلمانوں کو پٹوا دیتا تھا۔

بیرونی معاملات میں بھی وہ جس سے چاہتا تھا صلح کرتا تھا، جس کو چاہتا تھا تجارتی مراعات دیتا تھا اور جس سے چاہتا تھا جنگ کرتا تھا اور ہندوستان کے باشندوں اور اس کی دولت کو ہندوستان سے مشورہ کیے بغیر جنگ میں جھونک دیتا تھا۔

چناں چہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۵ء تک اکتیس سال میں اس نے دو مرتبہ جرمنی اور خود مسلمانوں کے مرکز خلافت حکومت ترکی سے عظیم الشان لڑائیاں کیں، جن میں ہندوستان کے لاکھوں نوجوانوں اور اربوں روپے کی دولت تباہ و برباد کی گئی اور ہندوستانیوں سے استصواب بھی نہیں کیا گیا۔

(ب) انگریز کے دور حکومت میں اسمبلی وغیرہ کے جملہ حقوق انگریز کے عطا کردہ تھے، کیوں کہ ہندوستان کا مالک برطانوی سامراج کو مانا جاتا تھا۔ آزادی کے بعد یہ جملہ حقوق ہندوستانیوں کو ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں، کسی کے رحم و کرم پر نہیں، بلکہ اسی بنا پر کہ وہ اس ملک کے باشندے اور مجموعی طور پر اس ملک کے مالک ہیں اور باشندۂ ملک ہونے کی بنا پر فطری طور سے ان کو اپنے گھر بار، اپنے شہر اور اپنے وطن کے حقوق اور اختیارات حاصل ہیں۔

(ج) انگریز کے زمانے میں مذہبی آزادی جو کچھ بھی تھی وہ تاج برطانیہ کی عطا کردہ تھی۔ لیکن اب یہ آزادی کسی عطا اور بخشش کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ دنیا بھر کے اس مسلمہ اصول کی بناء پر ہے کہ آزاد ملک میں ہر ایک باشندۂ ملک کو قدرتی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ اس کا مذہب آزاد ہو اور اس کو اپنے عقائد، خیالات اور تہذیب و طرز معاشرت میں آزادی حاصل ہو۔

(۱۲) مذکورہ بالا اصول کے خلاف عمل درآمد، خیانت اور جرم تسلیم کیا گیا ہے اور

حکومت کے کسی رکن یا کسی افسر کو یا کسی بھی کار پرداز کے لیے جائز نہیں کہ ان اصول کے خلاف عمل کرے، جن کو دستوری اور آئینی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور جن کو ہر انسان کا پیدائشی حق قرار دیا گیا ہے۔ لیکن جس طرح حکومت کے اصول اور آئین کے بر خلاف رشوت، بلیک مارکیٹ وغیرہ کا سلسلہ جاری ہے، اسی طرح اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں ملکوں میں اقلیتوں کے بر خلاف عمال اور افسران حکومت کی فرقہ وارانہ ذہنیتیں کار فرما رہتی ہیں اور ان کی بنا پر ہند یونین میں مسلمانوں کو اور پاکستان میں ہندوؤں کو انفرادی اور اجتماعی پریشانیاں در پیش ہیں اور اس وجہ سے دونوں ملکوں میں ترکِ وطن کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن جس طرح رشوت یا بلیک مارکیٹ کو حکومت کا آئین یا اس کی پالیسی نہیں قرار دیا جا سکتا، باوجودیکہ بکثرت موجود ہے، اسی طرح ظاہر ہے کہ اس فرقہ پرستی کو بھی آئین حکومت نہیں مانا جا سکتا اور نہ اس کی وجہ سے امن اور دستورِ ہند کو ناقابل اعتبار گردانا جا سکتا ہے۔

باب دوم:

ہمارے وطن کی شرعی حیثیت

(۱) مذکورۂ بالا نمبروں میں پس منظر کی طرف اشارہ کرنے کے بعد وقت آیا ہے کہ ہم اصل عنوان کی طرف رجوع کریں۔ عنوان کے تین جزو ہیں:

۱۔ ہمارے وطن کی حیثیت

۲۔ ہماری حیثیت اور

۳۔ ترکِ وطن کا شرعی حکم

پہلا جزو: "دار" کی بحث سے متعلق ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام یا کسی اور قسم کا "دار" ہے؟ لیکن آپ کو تعجب ہوگا کہ دار کی بحث جس درجے ہمارے زمانے میں اہمیت رکھتی ہے، فقہائے کرام نے اپنے مباحث میں اس کو اتنی اہمیت نہیں دی۔

حتیٰ کہ فقہ کی بہت سی مشہور اور متداول کتابیں جو درس میں بھی داخل ہیں، ان میں دارالاسلام اور دارالکفر کی تعریف بھی نہیں بیان کی گئی۔ ردالمختار میں تعریف بیان کی گئی ہے، لیکن اس کے آخر میں یہ عبارت بھی ہے:

"هذا ثابت فی نسخ المتن ساقط من نسخ الشرح فكانه تركه لمحتی بعضه و وضوح باقيه" ۔ (ردالمختار، جلد ۳، ص ۲۷۷)

"یہ عبارت متن کے نسخوں میں ہے، مگر شرح کے نسخوں میں نہیں ہے۔ غالباً شارح نے اس کو اس لیے نظر انداز کر دیا کہ اس کا کچھ حصہ ضمناً آچکا ہے اور باقی حصہ واضح

ہے محتاج بیان نہیں۔ یہ واضح حصہ جو محتاج بیان نہیں دار الاسلام اور دار الکفر کی تعریف ہے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ فقیہ یعنی ماہر قانون، قانون کی دفعات اور اس کی امکانی یا احتمالی شکلوں کو تو بیان کرے گا، لیکن وہ اس بحث میں نہیں پڑے گا کہ یہ قانون کہاں نافذ ہوگا، کہاں نہیں ہوگا؟ یہ کام حکومت کا ہے کہ وہ اس قانون کے حدودِ نفاذ کو وسیع کرے یا اپنی کوتاہیوں سے ان کو تنگ کردے۔ فقیہ یعنی ماہر قانون کے نزدیک یہ ایک مُسلمہ اور واضح امر ہوتا ہے کہ یہ قانون انھیں حدود میں نافذ ہوگا، جہاں تک اس حکومت کے اقتدار کا دامن پھیلا ہوا ہے، جس کا یہ قانون ہے۔ لہٰذا کوئی عدالتِ عالیہ، ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ حدودِ نفاذ سے بحث نہیں کرتا، بلکہ دفعاتِ قانون کے مقصد و منشا اور امکانی اور احتمالی شکلوں سے بحث کیا کرتا ہے اور انھیں صورتوں کے متعلق اس کے امثال اور نظائر ہوا کرتے ہیں۔

البتہ جہاں تک جنگی قوانین اور دو ملکوں کے باہمی نزاعات کا تعلق ہے، ان کے لیے دورِ حاضر نے بین الاقوامی عدالتیں ایجاد کی ہیں۔ لیکن اسلام چوں کہ بین الاقوامی وسعت کا حامل ہے، لہٰذا اس نے وسیع ترین نقطۂ نظر سے انسانی اخوت اور انسانی حقوق سے متعلق خود ہی بنیادی اصول کی تعلیم دی ہے۔ ان اصول کے پیشِ نظر فقہائے کرام ”ابواب السیر“ یعنی جہاد سے متعلق ابواب میں جنگ، صلح، امن، ضبط کردہ مال اور جائیداد، اسیرانِ جنگ، مفتوحہ ممالک میں فاتح مسلمانوں کے طرزِ عمل اور شکست کی صورت میں مسلمان اگر قید ہو جائیں تو ان کے طریق کار اپنے ملک (دار الاسلام) کے باشندے اگر غیر ممالک میں جائیں تو ان کے اخلاق اور طرزِ عمل اور دیگر ممالک کے باشندے اگر دار الاسلام میں آئیں تو ان کے ساتھ سلوک، ان کے لیے اجازت وغیرہ کے متعلق مسائل بیان کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں دار کا تذکرہ بھی آتا ہے جو قدرتی طور پر اس قابل نہیں ہوتا کہ اس کو خاص اہمیت دی جائے اور اس کی تفصیلات کے لیے صفحات رنگین کیے جائیں۔

دارالاسلام :

(۲) جنگ اور جہاد کے مسائل بیان کرتے ہوئے جب "دار" کا تذکرہ آئے گا تو دو ہی عنوان سامنے آئیں گے : 'دارالاسلام' اور 'دارالحرب'۔ اور ان کی تعریف بھی ایک بدیہی مسئلہ ہوگا۔ یعنی جہاں امن اور سیاسی اقتدار حاصل ہو وہ دارالاسلام ہے اور جہاں یہ باتیں مفقود ہوں وہ دارالحرب ہے۔

كما قال شمس الائمه السرخسي رحمه الله: "الموضع الذى لايامن فيه المسلمون من جملة دارالحرب فان دارالاسلام اسم للموضع الذى يكون تحت يد المسلمين وعلامة ذلك ان يامن فيه المسلمون"۔

(شرح السیر الکبیر، ص ۸۱، ج ۳۔ مطبوعہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد)

دارالاسلام کا دارالحرب بن جانا :

اس سلسلے میں ایک ذیلی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دارالاسلام دارالحرب بن سکتا ہے ؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ دارالحرب، دارالاسلام کس صورت میں بن سکتا ہے ؟

ان دونوں سوالوں کا جواب ظاہر ہے کہ اثبات ہی میں ہوگا۔ یہ دنیا جس طرح تغیرات کا گہوارہ ہے، دن سے رات اور رات سے دن، گرمی کے بجائے سردی اور سردی کی جگہ گرمی آتی اور جاتی رہتی ہے، اسی طرح وہ انقلابات کی آماجگاہ بھی ہے۔ کوئی ملک کبھی ایک کے زیرنگیں ہوتا ہے اور دوسرا دور آتا ہے تو دوسری قوم وہاں حکمران ہوتی ہے۔ تلك الايام نداولها بين الناس (قرآن حکیم) البتہ یہ کہ دارالاسلام، دارالحرب کب بنے گا، اس کے متعلق "ملک العلماء" علامہ علاء الدین کاشانی فرماتے ہیں :

قال ابوحنيفه: "انها لا تصير دارالكفر الابثلاث شرائط؛ احدها ظهور احكام الكفر فيها۔ والثانی ان تكون متاخمة لدارالكفر والثالث ان لايبقى فيها مسلم ولا ذمى آمنا بالامان الاول"۔ (بدائع الصنائع۔ جلد ۷، ص ۱۳۰)

یعنی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ جب تین باتیں ثابت ہو جائیں اس وقت دارالاسلام دارالحرب ہو جائے گا :

اول: یہ کہ کفر کے قوانین اور فرامین علانیہ صادر ہوں۔

دوم: اس کے متصل دوسرا ملک بھی دارالکفر اور دارالحرب ہی ہو۔

سوم: یہ کہ مسلمانوں کے اقتدار کے باعث جو امن تھا اور اس ملک میں آنے جانے کی جو اجازت تھی وہ ختم ہو جائے اور اب کوئی مسلم یا غیر مسلم (ذمی) اس جدید اقتدار کی اجازت کے بغیر نہ اس ملک میں داخل ہو سکے اور نہ محفوظ و مامون ہو سکے۔

ہندوستان کی شرعی حیثیت :

۱۸۰۶ء میں دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد اگرچہ انگریزوں نے بساط سیاست پر "شاہ عالم" کو ایک تاجدار کی حیثیت سے نمایاں کیا اور مملکت اور حکومت میں ایک عجیب و غریب تقسیم کر کے یہ اعلان کیا کہ "ملک بادشاہ کا اور حکم انگریز بہادر کا" اور اس بنا پر کچھ علما کو یہ خیال بھی ہوا کہ ہندوستان بدستور "دارالاسلام" ہے، مگر اس زمانے کے فقیہ اعظم عالم ربانی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی ایمانی فراست و حمیت اور آپ کی دقیقہ رس بصیرت اس سیاسی شعبدے کی حقیقت سے واقف تھی۔ آپ نے فتویٰ صادر فرمایا کہ ہندوستان دارالحرب ہو گیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں :

> زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم مے نمایند و ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر و نواح آں نمی تواند آمد۔ برائے منفعت خود از دین و مسافرین و تجار مخالفت نمی نمایند۔ اعیان دیگر مثل شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی تواند شد۔ واز یں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ ممتد است۔ آرے در چپ و راست مثل حیدر آباد و لکھنو و رام پور احکام خود جاری نکردہ اند بسبب مصالحت و اطاعت مالکان آں ملک۔
> (فتاویٰ عزیزی۔ جلد اول، ص ۱۷)

۱۸۵۷ء کے بعد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ

العزیز سے استفسار کیا گیا۔ آپ کا جواب بھی یہی تھا۔(۱)

گذشتہ باب کے نمبر ۶ اور ۷ میں انگریز کی خونیں کارگذاریوں کے جو نشانات دیے گئے ہیں وہ ان دونوں فتوؤں کی علت واضح کر دیتے ہیں۔

ان دونوں فتوؤں میں اگرچہ نصف صدی سے زائد کا فصل تھا۔ لیکن ہندوستان کی سیاسی حیثیت میں اگر کچھ فرق واقع ہوا ہے تو صرف یہ کہ انگریزی اقتدار حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ کے دور میں ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد وہ عروج اور استحکام کے آخری نقطے پر پہنچ گیا تھا۔ یعنی باہر کی غیر مسلم طاقت جس نے ہندوستان سے اقتدار مسلم کو ختم کیا۔ جو لا محالہ حربی طاقت تھی۔ اس کا تسلط ہندوستان پر روز افزوں ہوتا رہا۔ لہذا ہندوستان بدستور دارالحرب رہا۔

چوں کہ ان بزرگوں کی کوشش یہ رہی کہ اس جابر و قاہر اقتدار کو ہندوستان سے ختم کیا جائے۔ لفظی معنی کے لحاظ سے بھی ہندوستان "دارالحرب" بنا ہوا تھا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء تک یہ حرب اسلحے سے رہی اور ۱۸۵۷ء کے بعد اسلحے ضبط ہو گئے۔ لیکن مجاہدین حریت کے جذبات اور جنگی منصوبوں کو ضبط نہ کیا جا سکا۔ وہ امکانی حدود میں بدستور مصروفِ پیکار رہے۔

انگریزی دورِ میں مسلمانوں کی حیثیت :

(۲) انگریزی اقتدار، اس کے جابرانہ تسلط اور اس کی اسلام کش کارگذاریوں کے لحاظ سے ہندوستان یقیناً دارالحرب تھا۔ لیکن ایک دوسرا سوال بھی قابل توجہ تھا۔ وہ یہ کہ خود ہماری حیثیت کیا ہے؟ اور باشندگان وطن کا لحاظ کرتے ہوئے ہمارا ملک کیا حیثیت اختیار کرتا ہے۔ آیا ہم حربی ہیں؟

اگر ہم حربی ہیں تو کیا مسلمان حربی ہوا کرتا ہے۔ اور پھر ہماری جنگ کس مسلم ملک سے ہے؟ کہ ہم اپنے آپ کو حربی تصور کریں۔

اگر ہم حربی نہیں ہیں تو کیا ہم مُستامن ہیں؟ مگر اصطلاحِ فقہ میں "مستامن" وہ ہوگا جو اس ملک کا باشندہ نہ ہو۔ ہم جب ہندوستان کے باشندے ہیں، ہندوستان ہمارا وطن ہے تو کیا کسی ملک کا اصل باشندہ خود اپنے وطن میں "مستامن" ہو سکتا ہے؟

کیا ہم "مستضعفین" ہیں؟ لیکن مستضعفین کے زمرے میں اس وقت داخل ہو سکتے ہیں جب معاذ اللہ نماز، روزہ، جمعہ اور عیدین وغیرہ شعائر اسلام سے بھی محروم ہو جائیں۔

لیکن اس دور میں بالخصوص ملکہ وکٹوریہ کے اعلان ۱۸۵۸ء کے بعد کہ کسی کے مذہب میں حکومت کی طرف سے مداخلت نہ کی جائے گی، ہماری یہ حالت نہیں رہی۔

عیسائی مشنریاں یقیناً عیسائیت کی تبلیغ کرتی رہیں اور کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ کر کے ہندوستانیوں کو عیسائی بھی بناتی رہیں، مگر حکومت کی طرف سے ۱۸۵۷ء تک تبلیغ عیسائیت کے بارے میں جو جبر کی شکل جاری تھی (۲) وہ ۱۸۵۸ء کے بعد باقی نہیں رہی۔

مسلمانوں نے اسلامی مدارس، یونیورسٹیاں، کالج قائم کیے۔ تبلیغی انجمنیں نہ صرف عیسائیت کا مقابلہ کرتی رہیں، بلکہ عیسائی بننے والوں کو دوبارہ اسلام میں داخل کرتی رہیں۔ عالی شان مسجدیں تعمیر کی گئیں، حتی کہ سرکاری دفاتر، چھاؤنیوں، سکریٹریٹ کے قریب اور خود ان کے حلقوں میں مسجدیں تعمیر کی گئی۔

انتہا یہ کہ ہمیں اس کا بھی حق تھا کہ اندرونی معاملات کے لیے ہم پنچایتی نظام قائم کریں (۳)۔ چنانچہ "امارت شرعیہ" صوبۂ بہار میں قائم کی گئی اور کوشش کی گئی کہ ہم فقہائے کرام کی تصریح کے مطابق اس دار الحرب کو دار الاسلام بنالیں (۴)۔

فقہا کی تصریح یہ ہے:

"اما فی بلاد علیہا ولاۃ کفار۔ فیجوز للمسلمین اقامۃ الجمع والا عیاد۔ ویصیر القاضی قاضیاً بتراضی المسلمین"۔ (رد المختار، ص ۲۷۷، ج ۳)

"لیکن ایسے شہر جن کے فرمانروا کفار ہیں، وہاں مسلمانوں کے لیے جمعہ اور عیدین

کی نمازیں پڑھنا درست ہے اور ایسے شہر میں مسلمان نجی طور پر آپس کے اتفاق سے کسی کو قاضی بنا سکتے ہیں، جو ان کے معاملات کا فیصلہ کرے۔ (یعنی یہ ضروری نہیں کہ وہ حکومت کی طرف سے باضابطہ مجسٹریٹ ہو) مسلمانوں کے معاملات میں اس کا فیصلہ واجب العمل ہو گا)"۔

اس مذہبی آزادی کا لحاظ کرتے ہوئے (۵) اگر در مختار کی مندرجہ ذیل عبارت پر اعتماد کر لیا جائے تو ہندوستان کو دار الاسلام بھی کہا جا سکتا ہے۔ عبارت یہ ہے:

دارالحرب تصیر دارالاسلام بأجراء احکام الاسلام فیھا کجمعۃ وعید۔ وان بقی فیھا کافر اصلی وان لم یتصل بدارالاسلام۔ ردالمختار، ص ۲۷۷، ج ۳)

جمعہ اور عید جیسے احکام اسلام جاری کر دینے سے دار الحرب دار الاسلام بن جاتا ہے اگرچہ اس میں کافر باقی رہیں اور اگرچہ اس کا اتصال کسی دار الاسلام سے نہ ہو۔

جن باتوں کے ثابت ہونے پر بقول امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ دار الاسلام دار الحرب بن جاتا ہے وہ تمام باتیں بھی اس دور میں مشکوک تھیں۔ کیونکہ

(۱) حکومت کا کوئی قانون یا حکم بھی عیسائیت کی بنیاد پر نہیں ہوتا تھا، لہٰذا "ظہور احکام الکفر" کی شرط مشتبہ اور مشکوک ہو گئی تھی۔

(۲) پورا ہندوستان ایک مملکت تھا اور اس کا اتصال، افغانستان اور ایران سے تھا۔ جو اس تمام عرصہ میں دار الاسلام رہے۔

(۳) بیشک وہ امن جو مسلم اقتدار کے باعث ہونا چاہیے تھا وہ نہیں تھا۔ فوج اور پولیس جو امن کی محافظ تھی انگریزی اقتدار کے ماتحت تھی اور انگریزی پاسپورٹ کے بغیر ہندوستان میں نہ کوئی آسکتا تھا، نہ جا سکتا تھا۔ لیکن مسلمان ہونے کی بنا پر کوئی خطرہ بھی نہ تھا۔ لہٰذا یہ شرط بھی ایک حد تک مشتبہ ہو گئی تھی۔

حضرت انور شاہ کشمیری کی تحقیق:

بہر حال ان سہولتوں اور رعایتوں کے پیش نظر یہ سوال یقیناً جواب طلب تھا کہ ہم اپنے وطن کو کیا کہیں۔ خداوند عالم حضرت الاستاذ علامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس اللہ

سرہ العزیز کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ کی دقیقہ رس ذکاوت نے اس طرف توجہ فرمائی اور ۱۹۲۷ء مطابق ۱۳۴۶ھ میں جمعیت علمائے ہند کے اجلاس ہشتم کی صدارت فرماتے ہوئے آپ نے واضح فرمایا کہ ہندوستان نہ دار الحرب ہے نہ دار الاسلام، بلکہ "دار الامن" ہے۔ ارشاد ہے :

"مسائل شرعیہ تین قسم کے ہیں :

☆ اول وہ جو اسلامی حکومت اور اس کی شوکت کے ساتھ متعلق ہیں۔

☆ دوسرے وہ جو دار الامان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

☆ تیسرے وہ جو دار الحرب میں جاری ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ حالت کو دیکھنا ہے کہ وہ دار الاسلام ہے یا دار الامان یا دار الحرب۔ جہاں تک غور و فکر اور اصول شرعیہ کا تعلق ہے زیادہ سے زیادہ اس کو دار الامان کا حکم دیا جا سکتا ہے۔ دار الاسلام کے احکام جاری ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی"

(خطبہ صدارت، ص ۲۲، جمعیت علمائے ہند اجلاس ہشتم، بمقام پشاور)

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں :

"ہندوستان کے دار الاسلام نہ ہونے کی حالت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم دار الامان کے احکام کتب مذہب میں تلاش کریں اور ان احکام کی روشنی میں ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیں"۔ (ص ۲۳)

حضرت شاہ صاحبؒ نے بطور مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ معاہدہ پیش کیا ہے جو آپ نے ابتدائے زمانۂ ہجرت میں مسلمانوں اور یہود مدینہ کے درمیان کرایا تھا۔

اس معاہدے میں فریقین کی مذہبی آزادی تسلیم کرتے ہوئے یہ طے کیا گیا تھا کہ دفاع کے وقت یہود اور مسلمان ایک جماعت ہوں گے، ہر ایک فریق پر دوسرے کی ہمدردی اور اعانت لازم ہو گی، دونوں فریق کوشش کریں گے کہ ظلم اور ناانصافی ختم ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن چوں کہ اس معاہدے میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ یہود اور مسلمانوں کے باہمی

نزاعات کی آخری اپیل آنحضرت ﷺ کی بارگاہِ عدالت پناہ میں ہو سکے گی، اس لیے ہندوستان کے حالات پر اس معاہدے کو منطبق کرنے میں بعض حضرات کو تامل ہوتا ہے۔ لیکن اس معاہدے کے علاوہ سیرتِ مقدسہ کے دوسرے دور بھی ہمارے لیے سبق آموز ہیں اور ہمارے احکام کے لیے سرچشمہ اور اصول اساسی کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کے پیش نظر اس تامل کی گنجایش نہیں رہتی۔ مثلاً حیاتِ مقدسہ کے ابتدائی دور میں مکہ معظمہ کی مختلف جماعتوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا جو حلف الفضول کے نام سے مشہور ہے۔ آنحضرت ﷺ اس معاہدے میں شریک تھے۔

یہ معاہدہ اگرچہ قبل از نبوت ہوا تھا، اس بنا پر اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر نبوت کے بعد جن الفاظ سے آپ اس معاہدے کی تحسین اور تعریف فرمایا کرتے تھے، وہ بموجب روایت ابن ہشام یہ تھے:

> "ما احب ان لی به حمر النعم ولو ادعی به فی الاسلام لاجبت"۔ (سیرۃ ابن ہشام، ص ۸۴، ج ۱)
>
> "میں سرخ اونٹوں (زیادہ سے زیادہ گراں قدر چیز) کے بدلے میں بھی اس معاہدے سے روگردانی پسند نہیں کر سکتا اور اگر مجھ کو اسلام کے دور میں بھی اس کی دعوت دی جائے تو میں یقیناً منظور کر لوں"۔

دورِ نبوت میں کسی چیز کی تحسین خود ایک شرعی دلیل ہے اور یہاں تو خود لسان نبوت تصریح فرما رہی ہے کہ: "اگر دور اسلام میں اس کی دعوت دی جائے تو میں یقیناً منظور کر لوں۔"

یہ معاہدہ کیا تھا؟ محدثین اور اربابِ سیر کی تصریح کے مطابق اس کی حقیقت یہی تھی کہ

- ☆ مظلوم کی امداد
- ☆ ضمیر اور رائے کی آزادی اور

☆ درماندہ اور افتادہ انسانوں کی ترقی کی کوشش۔

اسلام میں اس کو منظور کر لینے کا مفاد یہ تھا کہ جب آنحضرت ﷺ کفارِ مکہ کے سامنے دعوت اسلام پیش فرما رہے تھے تو اگر کفارِ مکہ اس معاہدے پر عمل کرتے ہوئے دعوت اور تبلیغ کے راستے میں بے پناہ جبر و تشدد سے کام نہ لیتے اور ان کی جارحانہ جدوجہد اس آوازِ حق کو دبانے میں صرف نہ ہوتی تو مکۂ معظمہ سے ہجرت فرض نہ ہوتی۔ آپ کفارِ مکہ کے ساتھ اسی "بلدہ" میں قیام فرماتے اور نظام زندگی میں بدستور شریک رہتے۔ ایسی صورت میں کہ مسلمان اقلیت میں تھے اور مکۂ معظمہ میں اقتدار غیر مسلموں کا تھا۔ اگر اس معاہدے پر عمل ہوتا رہتا تو ہم فقہی اصطلاحات کے لحاظ سے جو لفظ مکۂ معظمہ کے لیے استعمال کر سکتے تھے، وہ دارالامان ہے۔ سب دلائل سے بالا قرآن حکیم نے ہمارے سامنے ایک روشن اصول پیش فرمادیا ہے۔ جس کو دارالامن کا دستور اساسی کہا جا سکتا ہے۔

سورۂ ممتحنہ کی مندرجۂ ذیل آیت اس اصول کی تلقین کرتی ہے:

"لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم۔ ان اللہ یحب المقسطین۔ انما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظالمون (آیت ۸،۹)

سیدنا حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے الفاظ میں ان آیات کا ترجمہ یہ ہے:

"اللہ تم کو منع نہیں کرتا اُن سے جو لڑے نہیں تم سے دین پر، اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے۔ کہ کرو ان سے بھلائی اور انصاف کا سلوک۔ اللہ چاہتا ہے (محبت کرتا ہے) انصاف والوں کو۔ اللہ تو منع کرتا ہے تم کو ان سے جو لڑے تم سے دین پر اور نکالا تم کو تمہارے گھروں سے اور میل باندھا تمہارے نکالنے پر کہ ان سے کرو دوستی اور جو کوئی ان سے دوستی کرے سو وہ لوگ وہی ہیں گنہگار"۔

یہ آیت صرف ان غیر مسلموں کے ساتھ دوستی کو ممنوع قرار دے رہی ہے جو

(الف) دین کے بارے میں جنگ کریں،

(ب) مسلمانوں کو وطن سے نکالیں اور

(ج) مسلمانوں کو وطن سے نکالنے میں امداد کریں۔

ان کے علاوہ جملہ غیر مسلموں کے ساتھ اجازت دے رہی ہے کہ بر اور قسط کے اصول پر ان سے معاہدہ کریں ان کے ساتھ نظام ملکی یا نظام زندگی میں اشتراک و تعاون کریں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

آزادی کے بعد ہندوستان کے بارے میں شرعی حکم :

(۴) حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ارشاد کے مطابق انگریزی دور کے ہندوستان کو اگر دار الامن کہا جا سکتا ہے تو ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ہندوستان کو بدرجہ اولیٰ "دار الامان" کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ انگریزی دور میں ہماری مذہبی آزادی انگریز کی عطا کردہ تھی اور اس وقت یہ آزادی کسی کی عطا نہیں، بلکہ ہمارا ایک فطری یا وطنی حق ہے۔ جیسا کہ نمبر ۸ تا ۱۱ (باب اول) میں بیان کیا جا چکا ہے۔

اس موقع پر یہ خلجان یقیناً پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک طبقہ اس کے درپے ہے کہ ہندو تہذیب کو حاوی کرے (۶)، عوام کے رجحانات یہ ہیں کہ ذبیحۂ گاؤ ایک فتنہ بن گیا ہے جس کے نتیجے میں فریضۂ قربانی کی ادائیگی میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں تو ہندوستان کو دار الامان کس طرح کہا جائے۔ بالخصوص جب کہ جگہ جگہ میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈوں نے ذبیحۂ گاؤ کی ممانعت کر کے اس کو قانون کی حیثیت بھی دے دی ہے (۷)۔ مسجدوں کے سامنے باجے کی پہلے ممانعت تھی، اب وہ ختم ہو گئی ہے۔

اس قسم کے تمام خلجانات کے متعلق ہمیں یہ غور کرنا ہوگا کہ ان امور کو خود اسلام میں کیا حیثیت حاصل ہے۔ آیا وہ اسلام کے ضروری احکام اور شعائر ہیں یا ہمارے مصنوعی رجحانات نے ان کو مذہبی شعائر کی حیثیت دے دی ہے؟

جہاں تک ہندو تہذیب کے حاوی کرنے کا تعلق ہے تو بیشک ٹنڈن.جی ٹائپ کے کچھ آدمی یہ نعرہ لگاتے ہیں۔ لیکن اگر کچھ افراد یا کوئی جماعت ملک کے دستور اساسی کے بر خلاف کوئی نعرہ لگائے تو اعتبار دستور اساسی کا ہو گا۔ اس جماعت کے نعرے قابل التفات نہ ہوں گے۔ کیوں کہ اربابِ اقتدار اور اصحابِ حل و عقد کے قول و فعل کا اعتبار ہوتا ہے۔ افراد یا کسی جماعت کے قول و فعل پر پورے ملک کے متعلق فیصلہ نہیں کیا جاتا۔

مثلاً: کسی ملک میں اگر صلح کا معاہدہ ہوا ہے، تو اگر اس ملک کے کچھ آدمی دار الاسلام میں گھس کر ڈاکہ ڈال دیں اور قتل اور غارت کر جائیں تو اس کو پورے ملک کی طرف سے نقضِ عہد نہیں تصور کیا جاتا۔ کما قال فی الهدایه:

"اذا دخل جماعة منهم فقطعوا الطريق ولا منعة لهم حيث لا يكون هذا نقضاً للعهد" (ہدایہ باب الموادعۃ)

ہندو تہذیب کے نعرے لگانے والوں کے اقتدار اور مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت نہیں سنبھال سکے، پورے ملک کے مزاج کو تو کس طرح بدل سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے قول یا فعل کو پورے ملک کے سر تھوپنا نہ صرف بے ضابطہ ہے، بلکہ مرعوبیت بے جا بھی ہے۔ ذبیحہ گاؤ کو اسلامی شعار قرار دینا سراسر تکلف ہے (۸)۔ قربانی یقیناً شعار اسلام ہے، مگر نہ وہ گائے پر موقوف ہے اور نہ اس کی ممانعت ہے۔ باقی رہا مسجد کے سامنے باجہ! تو اگر یہ مسجد کے احاطے میں ہو تو بیشک تعدی اور جبر ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا، نہ اس کی قانوناً اجازت ہو سکتی ہے۔ البتہ عام راستے پر باجہ بجاتا، بجاتے ہوئے گزرنا، تو اس کی ممانعت تو ہر موقع پر دار الاسلام میں بھی نہیں کی جا سکتی، دار الامان میں اس کی ممانعت کا مطالبہ انگریز کی تفرقہ انگیز پالیسی کا ثمرہ ہے، اسلامی حکم یقیناً نہیں۔ بہر حال ایسے مسائل میں ہمیں پوری طرح غور کر کے فیصلہ کرنا چاہیے۔

حواشی:

(۱) حضرت گنگوہی کے کئی فتوے اس باب میں یادگار ہیں۔ ابتداءً حضرت کا ذہن اس باب میں پوری طرح صاف نہ تھا لیکن بعدہ غور و فکر کے بعد آپ نے ایک نہایت مفصل اور مدلل فتویٰ دیا جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فتوے کے عین مطابق تھا۔ ضمیمے میں حضرت گنگوہی کا فتویٰ بھی شامل کر دیا ہے۔ (ا۔ س۔ ش)

(۲) ملاحظہ ہو: "اسبابِ بغاوتِ ہند۔ از سر سید احمد خاں مرحوم

(۳) حق نہیں تھا، اجازت تھی یا رعایت دی گئی تھی۔ (ا۔ س۔ ش)

(۴) برٹش قبضہ و تسلط تسلیم کرتے ہوئے ایک خاص حد تک، جہاں تک حکومت اجازت دے۔ (ا۔ س۔ ش)

(۵) بخشے ہوئے اختیار اور دی ہوئی رعایت کی حد تک اور اس صورت میں کہ فریقین مقدمے کے فیصلے کو تسلیم کر لیں۔ (ا۔ س۔ ش)

(۶) ہندوستان میں دستور سازی کے موقع پر ہندو فرقہ پرستوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا لیکن وہ ہندو مذہب کی بنیاد پر دستور نہ بنوا سکے۔ ان کی نہایت مؤثر مخالفت کرنے والے بھی ہندو ہی تھے۔ اب رہ گیا ہندو تہذیب کو حاوی کرنے کا مسئلہ تو اگر مسلم تہذیب کے مقابلے میں ہندو تہذیب زیادہ قوی، جان دار اور نفیس و شائستہ ہے تو اسے حاوی ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ غور کیجیے کہ یہاں قدیم سے ہندو اور صدیوں سے مسلمان آباد ہیں اور دونوں مذہبوں اور تہذیبوں میں کشمکش جاری ہے، لیکن آج تک اس کشمکش کا نتیجہ کیا نکلا؟ (ا۔ س۔ ش)

(۷) جہاں کہیں ایسا قانون بنایا گیا ہے وہاں اس کے بنانے میں مسلمان برابر کے شریک رہے ہیں۔ پھر یہ کہ ہندوؤں کے علاقے کے باہر ذبیحہ کیا جا سکتا ہے اور گوشت حدود میں لایا جا سکتا ہے۔ پھر یہ کہ ذبیحہ مطلقاً ممنوع نہیں ہے، خاص مقامات و حدود میں ممنوع ہے۔ خاص مقامات یا شہروں (آبادیوں) کے اندر تو پاکستان میں بھی قانوناً ممنوع ہے۔ ذبیحہ کے لیے خاص جگہیں (مذبح) مقرر ہیں۔ آبادیوں میں ذبح کرنا خلافِ قانون اور قابلِ سزا و جرمانہ فعل ہے۔ پس اگر اسی قسم کی پابندیاں اور قوانین ہندوستان کے شہروں میں ہوں تو یہ باعثِ خلجان کیوں ہو سکتی ہے؟ (ا۔ س۔ ش)

(۸) یہ درست ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ نے قربانی گاؤ کو شعار قرار دیا تھا، مگر اس کے مخاطب اکبر بادشاہ اور اس کے وہ افسر تھے جنھوں نے اکبر کی اتباع میں خاص خاص تہواروں کے

موقع پر اور پہلے ہفتہ میں دوروز اور پھر تین روز ذبیحہ کی ممانعت کر دی تھی اور دین الٰہی کے ماننے والے اس قانون کو دین کی حیثیت دیتے جا رہے تھے۔ لیکن آج کل جب کہ نہ اکبر بادشاہ ہے نہ مسلم اقتدار، ہمیں غور کرنا ہوگا کہ

☆ جادلهم بالتی هی احسن،

☆ لا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدواً بغير علم ۔اور

☆ ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة

کے اصول پر ذبیحۂ گاؤ کے لیے اصرار کرنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ بے شک یہ غلط حرکت ہے کہ ایک جانور کا اس درجہ احترام کیا ہے لیکن جب آپ مورتیوں کو نہیں توڑتے تو گاؤ کشی میں کیوں اصرار ہے۔ (محمد میاں)

باب سوم:

ہماری اور ہمارے وطن کی حیثیت

اور

ترکِ وطن کا شرعی حکم

دار الامان اور فرائض مسلمہ

(۱) دار الامان میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ لیکن اقتدارِ اعلیٰ تنہا مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہو گا۔ لہٰذا مسلمان مکلّف نہ ہوں گے کہ وہ احکام جن کے لیے اقتدار اعلیٰ (بہ عنوانِ دیگر "قوت و شوکت") شرط ہے اور خالص اسلامی نظام حکومت کے بغیر وہ نافذ نہیں ہو سکتے، ان کو دار الامان میں نافذ کرنے کا تکلف کریں۔ لایکلف الله نفسا الا وسعها۔

مثلاً: اسلامی حدود و تعزیرات یعنی قتل عمد، قتل خطا، زنا، تہمت، چوری، ڈکیتی، شراب نوشی وغیرہ کی وہ مخصوص سزائیں جو اسلام نے مقرر کی ہیں، اسلامی نظام حکومت کے بغیر ان کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا دار الامان میں ان کا نفاذ شرعاً واجب بھی نہیں ہو گا۔

اسلام ان جرائم کو انسانیت کے لیے لعنت قرار دیتا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی روادار نہیں کہ ان جرائم کا ادنیٰ سا شائبہ بھی مہذب سوسائٹی میں باقی رہے، اس لیے ان کی

سزائیں نہ صرف یہ کہ سخت مقرر کی ہیں، بلکہ ایسی عبرتناک مقرر کی ہیں کہ اگر ایک مرتبہ بھی صحیح طور پر ان کو نافذ کر دیا جائے تو مدتوں تک دل و دماغ ان جرایم کے تصور سے بھی لرزتے رہیں گے۔ دوسری قوموں کے نافذ العمل قوانین میں ان کی سزائیں اتنی سخت نہیں ہیں، لیکن جرائم کی قباحت کو ہر ایک مذہب اور ہر ایک قانون تسلیم کرتا ہے اور صحیح معاشرت کے لیے ان کے انسداد کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔ لہذا اگر کوئی غیر مسلم حکومت ان کے انسداد کے لیے قانون بنائے تو باوجودے کہ ہمارے عقیدے کے لحاظ سے وہ قانون اصلاح نوع انسان اور عدل و انصاف کے اس اعلیٰ معیار سے گرا ہوا ہو گا، جو کتاب اللہ نے قایم فرمایا ہے۔ مگر چوں کہ مقصد بہتر ہو گا، لہذا تعاون و اشتراک میں مضائقہ نہیں ہو گا۔ قال اللہ تعالیٰ: "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان۔

اس تعاون و اشتراک کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

(الف) مثلاً: آنحضرت ﷺ نے اس معاہدے میں شرکت فرمائی، جس کا مقصد خدمتِ خلق، امدادِ مظلوم اور رفعِ ظلم تھا۔ جس میں قریش کے بڑے بڑے سرداروں نے شرکت کی۔ جس کو اوراق تاریخ میں "حلف الفضول" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (اس کا مختصر تذکرہ باب ۲ کی ضمنی سرخی ذیل "انگریزی دور میں مسلمانوں کی حیثیت" گزر چکا ہے۔)

(ب) جب آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو غیر مسلموں کے اشتراک سے ایک دستور اساسی مرتب فرمایا جو بعد میں یہود کی بد عہدی کی وجہ سے درہم برہم ہو گیا (اس کا مختصر تذکرہ بھی گذشتہ باب میں اسی ذیل میں گزر چکا ہے)۔

(ج) غزوۂ احزاب کے موقع پر رسول ﷺ آمادہ تھے کہ عیینہ بن حصن سے اس شرط پر صلح کر لیں کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک تہائی عیینہ اور اس کے قبیلے کو دیا جائے گا۔ لیکن انصار کے شیوخ حضرت سعد بن معاذ اور "حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما" نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! اگر یہ مصالحت کسی آسمانی اشارے پر ہے تو ہم سر تسلیم خم کیے دیتے ہیں اور اگر "وحی" کی بنا پر نہیں ہے، تو ہم اس کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ جن کو ہم نے زمانۂ جاہلیت میں کبھی خراج نہیں دیا، آج اسلام سے مشرف ہونے کے بعد ہم یہ ذلت کیسے گوارا کر سکتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے انصار کی اس خودداری کی قدر فرمائی اور

جو گفتگو ہو رہی تھی، اس کو ختم کر دیا۔" (شرح السیر الکبیر ج ۴، ص ۴)

(د) صلح حدیبیہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فریق مخالف کے مطالبے پر لفظ "رسول اللہ" کو معاہدے کے مسودے سے محو کرا دیا۔

اس صلح کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ فریق مخالف کا کوئی شخص اگر اسلام قبول کر کے آنحضرت ﷺ کی پناہ میں جائے گا تو اس کو واپس کرنا ہو گا اور اگر معاذاللہ کوئی مسلمان مرتد ہو کر مکہ آجائے گا تو مکہ والے اس کو واپس نہیں کریں گے۔

اس قسم کی بہت سی نظیریں حامل وحی، رموز شناس دفتر قدس رحمتِ عالم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ کے ۲۳ سالہ دور میں بکھری ہوئی ہیں، جو ہمارے سامنے یہ زریں اصول پیش کرتی ہیں کہ جب اقتدارِ اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل نہ ہو تو حفاظتِ ملت کو نصب العین قرار دے کر "بر اور قسط" (بھلائی اور عدل وانصاف) کے اصول پر ہم غیر مسلموں کے اشتراک سے ایک دستورِ اساسی بھی بنا سکتے ہیں۔ ملکی نظم و نسق میں شرکت کر کے خدمتِ خلق کے مقدس فرض کو بھی انجام دے سکتے ہیں۔

(الف و ب) اور تحفظِ ملت اور بقاء امن کے لیے ہم نرم و گرم شرطوں پر معاہدہ بھی کر سکتے ہیں۔

(ج۔د) البتہ اقتدارِ اعلیٰ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو تو لامحالہ فرض ہو جاتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں کتاب اللہ کے فرامین نافذ کریں، کیوں کہ وہ نور و ہدیٰ ہیں، رحمت و بشریٰ ہیں، وہی سراسر عدل ہیں: "ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الكافرون" (سورۂ مائدہ، آیت ۴۴) ...... هم الظالمون (ایضاً، آیت ۴۵) ...... هم الفاسقون (ایضاً، آیت ۴۷)۔

لیکن اس موقع پر یہ حقیقت فراموش نہ ہونی چاہیے کہ اس حکومت کو جس کا دستورِ اساسی کتاب اللہ ہو، آپ خلافتِ راشدہ کہیں یا اسلامی حکومت اس کا نام رکھیں، وہ عملاً سیکولر اور غیر فرقہ ورانہ حکومت ہو گی۔ کیوں کہ اس میں

(۱) غیر مسلموں کی جان، مال، عزت اور آبرو اسی طرح محفوظ ہو گی، جیسے مسلمانوں کی۔

(۲) غیر مسلموں کو ضمیر اور رائے، مذہب اور اعتقاد کی آزادی حاصل ہو گی۔ وہ اپنے اصول اور قواعد کے مطابق مذہبی فرائض انجام دیں گے۔ اپنی عبادت گاہوں کی حفاظت کریں گے۔

(۳) ملک اور اہل ملک کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہو گی۔ وہ مذہبی فریضے کی حیثیت سے اس ذمہ داری کو پورا کریں گے۔ لہٰذا ان کو حق نہیں ہو گا کہ غیر مسلموں کو جبراً فوج یا پولیس میں بھرتی کریں۔ البتہ اگر غیر مسلم پیش کش کریں تو ان کو مزید رعایتیں دی جائیں گی۔ (فتوح البلدان، ص ۱۶۶ و ۱۶۸)

(۴) کاروباری امور میں غیر مسلموں کو مسلمانوں سے زیادہ آزادی حاصل ہو گی۔ مثلاً: شراب، خنزیر، مردار (خون، پلیدی وغیرہ) کی تجارت مسلمان نہیں کر سکتے۔ غیر مسلموں کے لیے ان چیزوں کی تجارت ممنوع نہ ہو گی۔ وہ بیرونی تجارت میں بھی آزاد ہوں گے۔ البتہ مہاجنی سود عام طور پر ممنوع ہو گا۔

(۵) جس طرح کسی مسلمان کو ستانا، نقصان پہنچانا ناجائز اور حرام ہو گا اسی طرح غیر مسلم پر بھی کسی قسم کا ظلم جائز نہ ہو گا۔ بلکہ فقہائے کرام کا فیصلہ یہ ہے:

ظلم الذمی اشد من المسلم ۔ (در مختار شامی ج ۵، ص ۳۹۶)

غیر مسلم پر ظلم کرنا مسلمان پر ظلم کرنے کے مقابلہ میں زیادہ سخت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"لاتسبوا الذین یدعون من دون اللہ، فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم"۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

"المومن من امنہ الناس بوائقہ"۔ (وامثال ذالک کثیر فی الاحادیث)

دار الامن اور جہادِ اکبر:

(۲) اقتدار اعلیٰ اور اجتماعی شوکت و قوت کے فقدان کا ثمرہ یہ بھی ہو گا کہ "دار الامن" میں مسلمانوں پر "جہاد اصغر" فرض نہیں ہو گا، بلکہ ان پر فرض ہو گا کہ وہ "جہاد اکبر" کو پوری قوت سے انجام دیں۔ "جہاد اصغر" کا مشہور نام "جہاد بالسیف" ہے اور جہاد اکبر وہ ہے جس کی ابتدا "جہاد نفس" سے ہوتی ہے، یعنی خود اپنے "نفس امارہ" سے جہاد۔

کما قال رسول اللہ ﷺ: "المحاهد من حاهد نفسه"۔

چناں چہ رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "مجاہد وہ ہے جو خود اپنے نفس سے جہاد کرے"۔

یعنی اپنے نفس کی کجی کو درست اور اس کی تمام ناہمواریوں کو ہموار کر کے ٹھیک ٹھیک احکامِ الٰہیہ اور سید الانبیاء والمرسلین ﷺ کے ارشادات کے تابع کر لینا اور خدا اور رسول کی مرضی کا اس طرح حریص بنا دینا کہ خود اس کی تمام خواہشات ختم ہو جائیں اور اللہ اور رسول کی مرضی اس کی رضا اور دلی خواہش بن جائے۔ یہ ہے جہادِ نفس!

قال رسول اللہ ﷺ: "لا یومن احدکم حتی یکون هداه تبعاً لما جئت به"۔

"کوئی شخص اس وقت تک صحیح معنی میں مومن نہیں ہے، جب تک اس کی خواہش اور اس کے جذبات میری پیش کردہ سنت کے تابع نہ ہو جائیں"۔

دشمن کو مارنا جہادِ اصغر ہے۔ اور جہادِ اکبر یہ ہے کہ خود اپنے نفس کو "موتوا قبل ان تموتوا"۔ (موت سے پہلے مر جاؤ) کا مزہ چکھائے۔

یہ جہاد میدانوں میں نہیں ہوتا، بلکہ مکانات کی کوٹھریوں میں اور مسجدوں کی محرابوں میں ہوتا ہے، جہاں انسان اور اس کے معبودِ حقیقی کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ جہاں وہ اپنے رب کے سامنے اپنے افعال و اعمال کا محاسبہ کرتا ہے۔ آنحضرت ﷺ ایک مرتبہ میدانِ جنگ سے واپس ہوئے تو ارشاد فرمایا:

"رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر"۔

"ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی جانب واپس ہوئے ہیں"۔

اس جہاد میں ہاتھ بڑھائے نہیں جاتے بلکہ ہاتھ سکوڑے جاتے ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

"کفوا ایدیکم واقیموا الصلوة وآتوا الزکوة"۔ (سورۃ نساء، آیت: ۷۷)

"اپنے ہاتھ روکو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو"۔

اقامتِ صلوٰۃ اور صبر واستقامت :

قیام صلوٰۃ اس جہاد کا سب سے بڑا حربہ ہوتا ہے اور دوسرا حربہ ضبط و تحمل اور صبر و استقامت ہوتا ہے۔ چناں چہ تمام شدائد و مصائب کے مقابلے میں انھیں دو حربوں کے استعمال کرنے اور ان سے مدد حاصل کرنے کا حکم ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

"یاایہا الذین آمنوا استعینوا بالصبر و الصلوۃ، ان اللہ مع الصابرین۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات، بل احیاء ولکن لاتشعرون۔ ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والا نفس والثمرات وبشر الصابرین۔ الذین اذا اصابتہم مصیبۃ، قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اولئک علیہم صلوات من ربہم ورحمۃ واولئک ہم المہتدون"۔(سورہ بقرہ، آیات ۵۷۔ ۱۵۳)

"مسلمانو! مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جو اللہ کے راستے میں مارے جائیں ان کو مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں، لیکن تمھیں خبر نہیں۔ اور تمھیں ہم آزمائیں گے 'خوف، بھوک، مالوں، جانوں اور میووں میں کمی کر کے'۔ اور بشارت دیجیے ان صبر کرنے والوں (ضبط و تحمل کے ساتھ ثابت قدم رہنے والوں) کو کہ جب ان پر آتی ہے کوئی مصیبت تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم خدا کے ہیں اور خدا کی طرف ہی ہمیں رجوع کرنا ہے۔ یہی ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے شاباش و آفرین رحمت اور مہربانی ہے اور یہی لوگ ہیں ہدایت پانے والے"۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے دوران میں اور ان کے بعد عرصے تک پاکستان ریڈیو پر یہ آیت پڑھائی جاتی اور اس کی تفسیر ہوتی رہی۔ مگر لطف کی بات یہ تھی کہ اس آیت کے صحیح مصداق وہ نہیں تھے، جو پاکستان کے باشندے تھے یا پاکستان پہنچ گئے تھے، بلکہ اس کے صحیح مصداق وہ باخدا سچے مسلمان تھے، جنھوں نے ہر قسم کی مصیبت برداشت کی، صبر واستقامت سے کام لیا، آثار وروایات کے حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا دی جو اسلاف کرام نے سرزمین ہند میں ایک ہزار برس کی قربانیوں سے قایم کی تھیں (لیکن ان تمام مصائب و مشکلات کے باوجود ترکِ وطن کا دل میں خیال تک نہ لائے)۔

ادائے زکوٰۃ:

اس جہاد کا تیسرا حربہ یا پروگرام کا تیسرا جز "آتوا الزکوۃ" ہے۔ زکوٰۃ ادا کرو۔
چناں چہ حافظ الحدیث علامہ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت: "کفوا ایدیکم" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"کان المومنون فی ابتداء الاسلام وھم بمکۃ مامورین۔ بالصلوۃ والزکوۃ وان لم یکن ذات النصب۔ وکانوا مامورین بمواساۃ الفقراء وکانوا مامورین بالصفح والعفوعن المشرکین والصبرالی حین۔ وکانوا یتحرفون ویودون لوامر وابالقتال" (تفسیر ابن کثیر۔ ج ۱، صفحہ ۵۲۵)

"ابتدائے اسلام میں جب کہ مسلمان مکہ میں تھے ان کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم تھا، اس وقت زکوٰۃ کے لیے نصاب کی شرط نہیں تھی۔ مسلمانوں کو حکم تھا کہ وہ ضرورت مندوں کے ساتھ پوری پوری ہمدردی کریں۔ مشرکین کے مقابلے میں عفو اور درگزر کا حکم تھا اور یہ کہ ایک مدت تک ضبط و تحمل سے کام لیں۔ مسلمان دشمنان اسلام پر دانت پیسا کرتے تھے۔ وہ تمنا کیا کرتے تھے کہ ان کو جنگ کا حکم مل جائے"۔

کاش ہند یونین کے مسلمان بھی اس حقیقت کو محسوس کریں کہ حفاظت و ترقیء ملت کے لیے مالی جہاد اہم ترین فریضہ ہے۔ اس کا معیار شریعت کا مقرر کردہ نصاب نہیں، بلکہ قوم و ملت کی ضرورت اس کا معیار ہے۔ زکوٰۃ، یتیموں، بیواؤں اور مصیبت زدہ و مفلوک الحال مسلمانوں کا مخصوص حصہ ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی قومی اور ملی ضرورتیں ہیں، جن کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ امدادی رقوم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ حکومت ان کی متکفل نہیں تو ان ضرورتوں کو پورا کرنا مسلمانوں ہی کا فرض ہے۔

جہادِ اکبر اور جہادِ اصغر کا فرق:

غزوۂ احد کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے اپنی مخصوص تلوار حضرت ابو دجانہؓ کو عطا فرمائی تو آپ کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس غیر متوقع عزت نے دماغ میں کیف بے

خودی پیدا کر دیا۔ آپ نے سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے فوج سے نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ نے حضرت ابودجانہ کو اکڑ کر چلتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

"انھا لمشیة یبغضھا اللہ الا فی مثل ھذا الموطن"۔ (سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۶۹)

"یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے، مگر اس جیسے موقع پر (پسند ہے)"۔

مختصر یہ کہ جہادِ اصغر کے میدان جنگ میں تبختر (اکڑ کر چلنا) پسندیدہ رفتار ہے۔ لیکن جہادِ اکبر کے مجاہدین کی شان یہ ہے:

"عباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا واذاخاطبھم الجاھلون قالو اسلاما والذین یبیتون لربھم سجدًا وقیاما"۔ (سورۂ فرقان، آیات ۶۳، ۶۴)

بندے رحمٰن کے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں (عاجزی کے ساتھ) اور جب بات کرنے لگیں ان سے بے سمجھ لوگ، تو وہ کہتے ہیں صاحب سلامت (ایسا جواب دیتے ہیں جس کا مقصد امن، سلامتی اور رفع شر ہوتا ہے) اور جو رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدے میں یا کھڑے۔ (موضح القرآن و بیان القرآن)

والذین لایشھدون الزورواذامر واباللغو مروا کراما (سورۂ فرقان، آیت ۷۲)

"اور وہ جو شامل نہیں ہوتے جھوٹے کام میں اور جب ہو نکلیں کھیل کی باتوں پر نکل جاویں بزرگی رکھ کر" (موضح القرآن)

یعنی متانت اور سنجیدگی سے گزر جاتے ہیں۔ نہ دلچسپی لیتے ہیں، نہ وہاں کے لوگوں سے الجھتے ہیں۔

مجاہدین جہادِ اکبر کے متعلق حکم یہ ہے:

"اقم الصلوٰة وامر بالمعروف وانه عن المنكر واصبر علی ما اصابك ان ذلك من عزم الامور۔ ولا تصعر خدك للناس ولاتمش فی الارض مرحاً، ان اللہ لایحب كل مختال فخور۔ واقصد فی مشیك واغضض من صوتك ان انكر الاصوات لصوت الحمیر"۔ (سورۂ لقمان، آیات ۱۹۔۱۷)

"کھڑی رکھ نماز اور سکھلا بھلی بات اور منع کر برائی سے اور سہار جو تجھ پر پڑے۔

بے شک یہ ہیں ہمت کے کام۔ اور اپنے گال نہ پھلا لوگوں کی طرف (بے رخی نہ برت) اور مت چل زمین پر اتراتا۔ بے شک اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اتراتا۔ بڑائیاں کرتا اور چل بیچ کی چال اور نیچی کر اپنی آواز۔ بے شک بری سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے"۔ (موضح القرآن)

جہادِ اصغر میں اغاظۂ کفار (کافروں کا دل جلانا) گویا نصب العین اور مطمحِ نظر بن جاتا ہے۔ چناں چہ ہر ایسا فعل موجبِ اجر و ثواب ہوتا ہے، جس سے دشمنوں کو کوفت ہو اور ان کے احساسات پست ہوں۔ ملاحظہ ہو ارشادِ ربانی:

"ذلك بانهم لايصيبهم ...... تا ...... ليجزيهم الله احسن ما كانوا يعملون"

(سورۃ توبہ، آیات ۱۲۰۔۱۲۱)

لیکن مجاہدینِ جہادِ اکبر کو اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی کا دل دکھائیں یا سخت بات کہیں ؎

شنیدم کہ مردان راہ خدا
دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام
کہ بادوستانت خلاف است و جنگ

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو جب فرعون جیسے دشمنِ خدا کی طرف بھیجا گیا تو ان دونوں پیغمبروں کو ہدایت یہ تھی:

"قولا له قولا ليناً لعله يتذكر او يخشى"۔ (سورۂ طٰہٰ، آیت ۴۴)

"فرعون سے نرم بات کہیے۔ بہت ممکن ہے وہ غور کرے اور خوف پیدا ہو"۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو دعوتِ اسلام کے لیے بھیجا تو ہدایت فرمائی:

"بشرا ولا تنفرا۔ يسرا ولا تعسرا"۔

"بشارت دیجیے اور نفرت مت دلایئے۔ سہولت پیش کیجیے دشواریوں میں مت ڈالیے"۔

خود آنحضرت ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی:

"قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسهم لاتقنطوا من رحمة الله ان الله یغفر الذنوب جمیعا، انه هو الغفور الرحیم"۔ (سورۂ زمر، آیت ۵۳)

"آپ (سوال کرنے والوں سے میری طرف سے) کہہ دیجیے، اے میرے بندو! جنھوں نے (کفر و شرک کرکے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں! تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ بے شک وہ غفور رحیم ہے"۔

آیتِ کریمہ کے الفاظ پر غور کیجیے، کس قدر رقت انگیز ہیں۔ گویا لطف و کرم کے چشمے ان کے نقوش سے امنڈ رہے ہیں۔

جہادِ اصغر کے میدان جنگ میں حکم ہوتا ہے:

"اقتلوهم حیث ثقفتموهم" (سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۱) اور "فاضربوا فوق الاعناق واضربوا منهم کل بنان" (سورۂ انفال، آیت ۱۲)۔

"ان کو قتل کر ڈالو جہاں پاؤ"

"گردنوں کے اوپر مارو اور ہر ہر جوڑ پر مارو"۔

لیکن جہادِ اکبر میں قتل و ضرب کے بجائے حکم ہوتا ہے:

"ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة" (سورۂ نحل، آیت ۱۲۵)

"بلا اپنے رب کے راستے کی طرف دانش مندی اور اچھی نصیحت کے ذریعے"۔

قتل و ضرب تو در کنار، بحث و مجادلہ کے لیے بھی حکم یہ ہے:

"جادلهم بالتی هی احسن" (سورۂ نحل، آیت ۱۲۵)

"ان سے ایسی طرح بحث و مباحثہ کیجیے جو بہت ہی بہتر (بہت ہی حسین) ہو"۔

"جزاء سیئة سیئة مثلها" (سورۂ شوریٰ، آیت ۴۰)

"برائی کا بدلہ عام طور پر برائی ہوتا ہے"۔

لیکن جہادِ اکبر کا مجاہد برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتا ہے۔ دشنام کے عوض دعا کرتا ہے۔

تم نے دیکھا، طائف کے اوباشوں نے جب رحمت عالم ﷺ کے جسد اطہر کو اینٹوں اور پتھروں سے لہولہان کر دیا تو رؤف رحیم نے کیا فرمایا تھا۔ آپ نے اس جور و ستم کے مقابلے میں دعا کی:

"اللہم اھد قومی فانھم لایعلمون"

"اے اللہ میری قوم کو ہدایت فرما وہ مجھے جانتے نہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ کفار اور اعداء دین جن کو جہاد اصغر کا مجاہد قتل کرتا ہے، جہادِ اکبر کے مجاہد کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کے مشرک اور کافر دل وہ کھیت ہوتے ہیں، جن کے جھاڑ اور کانٹوں کو صاف کر کے مجاہدِ اکبر ایمان و یقین کی تخم ریزی کرتا ہے۔

وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتا، کیوں کہ اس صورت میں برائی ختم نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات انتقام در انتقام کا تسلسل برائی کو زندہ کر دیتا ہے۔ وہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتا ہے، تاکہ برائی ختم ہو اور برے لوگ بھلے آدمی بن جائیں۔ وہ دشمنوں کو ختم نہیں کرتا ہے، بلکہ دشمنی کو ختم کرتا ہے۔ وہ دشمن کی طرف محبت اور شفقت کے پھول پھینکتا ہے جس کا نتیجہ جلد یا بدیر اخلاص و مودت ہوتا ہے۔ سورۃ حٰم السجدہ کی مندرجہ ذیل آیتیں تلاوت کیجیے، ان میں آپ کو ایسا کامیاب لائحہ عمل (پروگرام) ملے گا، جو ناکامی سے قطعاً ناآشنا ہے اور جو ہمیشہ سو فیصدی کامیاب ہی رہا ہے:

"من احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحاً وقال اننی من المسلمین۔ ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔ وما یلقٰھا الا الذین صبروا وما یلقاھا الا ذوحظ عظیم۔ واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ انہ ھو السمیع العلیم"۔
(آیات ۳۶۔۳۳)

"اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو (لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور (اظہار اطاعت کے لیے) کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں (یعنی بندگی کو فخر سمجھے، متکبرین کی طرح عار نہ سمجھے)"۔

اور (چوں کہ دعوت الی اللہ میں جس کا ذکر ہے اکثر جہلا کی طرف سے ایذارسانی بھی ہوتی ہے۔ اس کے متعلق خصوصاً اور دوسرے حالات میں عموماً اچھے معاملے اور حسن سلوک کی تعلیم فرمائی جارہی ہے اور نبی ﷺ کو اور آپ کے تمام متبعین کو اول بطور تمہید کے ایک بات سمجھائی جارہی ہے کہ)

"نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی (بلکہ ہر ایک کا اثر جدا ہے۔ جس کو ہر شخص جانتا ہے۔ جب یہ بات ذہن نشین ہوگی تو اب) آپ نیک برتاؤ سے بدی کو ٹال دیا کیجیے۔ پھر یکایک (دیکھ لینا) کہ آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے"۔

(یعنی بدی سے بدی کا بدلہ دینے میں تو عداوت بڑھتی ہے اور نیکی کرنے سے عداوت گھٹتی ہے۔ بشرطیکہ دشمن میں کچھ بھی شرافت ہو) حتی کہ اکثر بالکل عداوت جاتی رہتی ہے)۔

"یہ بات انھیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو (اخلاق کے لحاظ سے بڑے مستقل مزاج) ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو (ثواب کے اعتبار سے) بڑا صاحب نصیب ہے اور اگر ایسے وقت آپ کو شیطان کی طرف سے غصے کا کچھ وسوسہ آنے لگے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجیے۔ بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے"۔ (بیان القرآن از حضرت تھانویؒ۔ بتغییر یسیر فی الالفاظ)

بہر حال کج روی، کج فہمی، بد خلقی اور معاندانہ سرگرمیوں کے مقابلے میں قرآن پاک کی تعلیمات کے مطابق وسعتِ ظرف، فراخیٔ حوصلہ اور مکارم اخلاق پیش کرتے ہوئے سعیٔ پیہم اور مسلسل جدو جہد کو "جہاد بالقرآن" کہا جاتا ہے۔ دار الامان میں "جہاد بالقرآن" فریضۂ مسلم ہے، جس کو قرآن حکیم میں "جہاد کبیر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"فلا تطع الکافرین و جاهدهم به جهادا کبیرا (سورۃ فرقان، آیت ۵۲)

("قال ابن عباس جاهدهم به ای بالقران وقال ابن زید۔ ای بالاسلام" تفسیر ابن جریری۔ جلد ۱۹، ص ۱۵)

"آپ کافروں کی خوشی کا کام مت کیجیے اور قرآن سے ان کا مقابلہ کیجیے۔ بڑے زور سے"۔

(ملاحظہ ہو موضح القرآن از حضرت شاہ عبد القادر صاحب اور تفسیر بیان القرآن از حضرت تھانوی رحمہ اللہ)

حافظ الحدیث علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"هذه سورة مكية امر فيها بجهاد الكفار بالحجة والبيان وتبليغ القرآن وكذالك جهاد المنافقين انما هو بتبليغ لانهم تحت قهر اهل الاسلام"۔

یہ مکی سورت ہے۔ اس میں حکم ہوا ہے کہ دلیل و حجت، تحریر و تقریر اور تبلیغ قرآن کے ذریعے کفار سے جہاد کیا جائے۔ منافقوں سے بھی جہاد اسی طرح تھا (یعنی دلیل، حجت تحریر و تقریر اور تبلیغ قرآن سے)، کیوں کہ منافق حکومت اسلام کے ماتحت تھے، لہٰذا ان سے جہاد بالسیف کے کوئی معنی نہیں۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"فجهاد المنافقين اصعب من جهاد الكفار وهو جهاد خواص الامة وورثة الرسل۔ والقائمون به افراد فى العالم والمشاركون فيه والمعاونون عليه وان كانوا هم الاقلين عدداً فهم الا عظمون عند الله قدرا" (زاد المعاد، ج ۱، ص ۲۹، مطبوعہ مصر)

"منافقوں سے جہاد کرنا جہاد کفار کے مقابلے میں بہت سخت ہے۔ جہاد کفار جو توپ و تفنگ سے ہوتا ہے، اس میں ہر ایک نوجوان شریک ہو سکتا ہے، لیکن جہاد منافقین جو حجۃ و استدلال سے ہوتا ہے وہ ہر ایک کا کام نہیں۔ امت کے خاص خاص افراد جو انبیاء علیہم السلام کے صحیح وارث ہوتے ہیں، وہی اسی جہاد کے شہ سوار ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ گنتی میں کم ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے"۔

اس کے بعد تحریر ہے:

"ولما كان جهاد اعداء الله فى الخارج فرعاً على جهاد العبد نفسه فى ذات الله تعالى كما قال النبى ﷺ المجاهد من جاهد نفسه فى ذات الله و المهاجر من هجر ما نهى الله عنه۔ كان جهاد النفس مقدماً على جهاد العدو فى الخارج واصلاً له"۔ (ایضاً ص ۲۹۳)

چوں کہ دشمنان خدا سے جہاد ایک ثمرہ ہوتا ہے، اس جہاد کا جو انسان اللہ سے

تعلق قائم کرنے سے خود اپنے نفس سے کرتا ہے، چناں چہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے
کہ مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔ اور مہاجر وہ ہے جو ان باتوں کو چھوڑ دے، جن
کو اللہ نے منع فرمایا ہے۔ لہٰذا اپنے نفس سے جہاد کرنا مقدم ہوگا اور دشمنان دین سے جہاد
درحقیقت نتیجہ ہوگا اس صحیح جذبے کا جو خود اپنے نفس سے جہاد کر کے انسان نے اپنے اندر
پیدا کیا ہو (کہ کلمۃ اللہ کے بلند کرنے کا جذبہ یہاں تک بڑھ جائے کہ خود اپنی جان بھی اس
کے مقابلے میں ہیچ ہوتی ہے)۔

مسائل کا اختلاف اور عمل کی صورتیں :

(۳) معاملات، یعنی خرید و فروخت۔ لین دین، اجرت، ملازمت، شرکت چوں کہ
افراد سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے لیے ہیئۃ اجتماعی قوت و شوکت کی ضرورت نہیں ہے۔
لہٰذا ان کے احکام میں بھی کوئی خاص تفاوت نہیں ہوگا۔ مثلاً شراب، خنزیر، مردار وغیرہ کی
خرید و فروخت جس طرح دارالاسلام میں مسلمان کے لیے حرام ہے، دارالامان، بلکہ
دارالحرب میں بھی حرام رہے گی۔ قمار، جوا، سٹہ وغیرہ کی حرمت بدستور رہے گی۔ یہ شیطانی
اعمال ہیں۔ ان کی شیطنت کسی ملک یا کسی دار کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قال اللہ تعالیٰ:

انما الخمر والمیسر۔ والانصاب و الازلام رجس من عمل الشیطان
فاجتنبوہ۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۹۰)

دھوکا، فریب، بلیک مارکیٹ صرف معاملات کے لحاظ ہی سے جرم نہیں، بلکہ اخلاقی
جرم بھی ہیں۔ وہ ہر حالت میں ممنوع رہیں گے۔

اسی طرح ان امور سے اجتناب لازم ہوگا جس کا ارتکاب معصیت ہے۔ مثلاً: عصمت
فروشی، رقص، سرود، سحر، کہانت، نجوم اور جوتش وغیرہ بالمعاوضہ ہوں یا بلا معاوضہ۔

علیٰ ہذا وہ معاملات بھی ممنوع ہوں گے جن کے نتیجے میں لازمی طور پر معصیت کا
ارتکاب یا جرائم کی پرورش ہوتی ہے۔ مثلاً آلات لہو و لعب یا مورتیوں اور تصاویر کی خرید و
فروخت۔ (ملاحظہ کتب فقہ اور حجۃ اللہ البالغہ)

یہ تمام امور وہ ہیں جن سے شریعت مطہرہ نے شدت سے ممانعت کی ہے۔
ان کی حرمت نہ قوت و شوکت پر موقوف ہے، نہ دارالاسلام کے حدود میں محدود۔
فرق صرف یہ ہوگا کہ دارالاسلام میں ان کی ممانعت کے لیے قانون ہوگا۔ دارالحرب یا دارالامان میں مسلمانوں کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہوگی کہ قانوناً ممنوع کر سکیں، مگر مذہبی نقطۂ نظر سے ان کی حرمت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

رہ گئے وہ تمام مسائل جو اخلاق یا عبادات سے متعلق ہیں۔ چوں کہ ہر ایک مسلمان بہ حیثیت مسلمان ان کا مکلف ہے۔ لہٰذا ملک اور دار کے اختلاف اور سیاسی حالات کی تبدیلیوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ سچائی، دیانت، رحم، انصاف وغیرہ اخلاق جمیلہ مسلمانوں پر ایسے ہی فرض ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔

جھوٹ، فریب، ظلم، قتل، خیانت، حسد، کینہ وغیرہ ایسے ہی ممنوع ہیں، جیسے شرک، کفر، اصنام پرستی یا بدعات، مراسم قبیحہ۔ لہٰذا ان کے احکام میں کوئی تفاوت نہیں ہوگا۔ اللھم وفقنا لما تحب و ترضی۔

باب چہارم:

امتِ اسلامیہ کا تبلیغی موقف

اور

ہجرت کا عمل

امتِ اسلامیہ کا تبلیغی موقف :

(۱) کوئی ملک ہو یا کوئی شہر، یہ لازم نہیں ہے کہ آپ اپنے دین و ایمان کو اس سے وابستہ کریں۔ ہندوستان کو تو ہم نے دارالامن قرار دیا ہے، اگر کوئی دارالاسلام بھی ہو تب بھی وہاں کا قیام جزوِ دین یا فرض نہیں ہے۔ ہمارے اسلاف کرام، بزرگان طریقت اور حاملان دعوت عرب، عراق، بلخ، بخارا، طوران و ایران وغیرہ کے دارالاسلام کو ترک کر کے ہندوستان تشریف لائے۔ مدغاسکر، بورنیو، آسام، برما، چین، فلپائن وغیرہ تشریف لے گئے۔ ان کو اپنا وطن بنایا۔ وہیں ان کے مرقد اور مزارات ہیں اور وہیں ان کی اولاد نسلاً بعد نسل ترقی کر رہی ہے۔ ہندوستان پر تو ایک دور ایسا بھی آیا کہ یہ دارالاسلام ہو گیا، مگر اور ممالک تو آج تک دارالاسلام ہی نہیں بنے۔

ان حضرات نے دارالاسلام ترک کیا اور دارالکفر میں آئے۔ اس فعل پر عدم جواز کا

فتویٰ تو کوئی کیا دیتا، ان کی ہمت مردانہ تاریخ کا سنہری باب قرار دی گئی۔ جو حضرات دعوت اسلام لے کر ان ممالک میں پہنچے، ان کی خدمات کو سراہا گیا اور جو قربانیاں اور مصیبتیں انھوں نے برداشت کیں ان کو حقیقی جہاد تصور کیا گیا۔ امتِ اسلامیہ ان کی خدمات پر آج تک فخر کرتی ہے۔

پس جب دارالاسلام ترک کر کے دارالکفر میں جانا ممنوع اور حرام نہیں تو ظاہر ہے کہ ہندوستان جیسے دارالامن کو ترک کر کے کسی دوسرے ملک میں جانا کب ممنوع یا حرام ہو سکتا ہے۔

(۲) یہ مسئلے کا ایک پہلو ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ آبائی ملک یا خاندانی وطن ہونے کی حیثیت سے کسی ملک کے ترک پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی اور اس بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جانا مذہباً ممنوع نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے کا صرف ایک ہی پہلو نہیں ہے، اس کے متعدد پہلو ہیں اور آخری فیصلے کے لیے ان تمام پہلوؤں کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔

ترکِ وطن کا فیصلہ کرنے کے وقت ہمیں غور کرنا ہوگا کہ کیا مسلمان کی صرف یہی حیثیت ہے کہ وہ ہندوستان کا ایک شہری ہے یا اس کے علاوہ اس کی اور حیثیتیں بھی ہیں اور وہ کیا ہیں؟ اگر ہم کتاب اللہ جل جلالہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی ان تمام بشارتوں کو جو امتِ اسلامیہ کے متعلق ہیں، فراموش کر ڈالیں تو بے شک یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندیونین کا مسلمان صرف ایک شہری کی حیثیت رکھتا ہے، جس کو اختیار ہے کہ شہری مفادات کے پیش نظر قیام یا ترکِ وطن کا فیصلہ کرے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ دینی افلاس اور اسلامی تعلیم و اخلاق سے تہی دامنی کے باوجود مسلمان ابھی اس درجہ پست، مذہب سے غافل اور خدا فراموش نہیں ہوئے ہیں کہ وہ خداوند کی بشارتوں کو (معاذ اللہ) پس پشت ڈال دیں اور قیام یا ترکِ وطن کو صرف ایک شہری یا اقتصادی مسئلہ سمجھنے لگیں۔

اسلام کی عالم گیری :

قرآن حکیم اور ارشادات رحمۃ للعالمین ﷺ کا مطالعہ فرمایئے۔ امتِ اسلامیہ کو ایک خاص منصب عطا ہوا ہے اور ہر ایک کلمہ گو امتِ اسلامیہ کا فرد ہونے کے باعث اس منصب کی انجام دہی کا ذمہ دار ہے۔

مسلمان وہ ہے جو خاتم الانبیاء نبی الثقلین رحمتہ للعالمین ﷺ کے دامان رحمت کو سنبھالے ہوئے ہو۔ جس کا عقیدہ ہو کہ وہ داعی بر حق جو مکۂ معظمہ میں پیدا ہوا اور جو مدینۂ منورہ میں آرام فرما ہے، نبی الثقلین ہے، رحمتہ للعالمین ہے۔ قال اللہ تعالیٰ :

"وما ارسلناك الا رحمة للعالمین"۔

رحمۃ للعالمین کی تفسیر و تشریح میں بہت سے سیاسی، تاریخی (۱) اور فلسفی نکات بیان کیے جاسکتے ہیں، مگر یہ موضوع ان کی گنجایش نہیں رکھتا۔ یہاں اس کے سادہ اور صاف مفہوم سے بحث ہے۔ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہونے کا سادہ اور واضح مفہوم یہ ہے کہ سردارِ دو جہاں خاتم الانبیاء ﷺ صرف حجاز یا عرب کے لیے یا کسی خاص قوم، نسل یا کسی خاص زمانے کے لیے نہیں مبعوث ہوئے، بلکہ آپ کی دعوت جو رحمتِ خداوندی کے لیے مقناطیس کی حیثیت رکھتی ہے، تمام انسانوں کے لیے ہے خواہ وہ کسی نسل سے متعلق ہوں، کسی جماعت اور قوم سے ان کا رابطہ ہو، کسی ملک کے رہنے والے ہوں یا کسی زمانے میں ہوں :

"وما ارسلناك الا كافةً للناس بشیراً و نذیراً"۔ (سورۃ سباء، آیت ۲۸)

"ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے"۔

اس مضمون کی ایک دو آیتیں نہیں، بلکہ قرآن حکیم کی بہت سی آیتیں اور آنحضرت ﷺ کی بے شمار احادیث اس مضمون کو واضح کرتی ہیں اور مسلمانوں کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی خاص قوم، نسل یا کسی خاص ملک کے لیے نہیں، بلکہ تمام دنیا کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپ کی دعوت سارے عالم کے لیے ہے، وہ موجودہ ہو یا آیندہ آئے۔ آپ کی دعوت نہ کسی حد میں محدود ہے اور نہ اس کے لیے کسی امت کی تعیین

ہے۔ وہ قیامت تک کے لیے ہے۔ کیوں کہ آپ خاتم الانبیاء ہیں۔ آپ نے جو خداوندی تعلیم پیش فرمائی وہ آخری پیغام اور مکمل تعلیم ہے۔ اب نہ کوئی پیغام آنے والا ہے اور نہ کوئی نبی یا رسول مبعوث ہونے والا ہے۔

(۳) لیکن تیرہ سو ساٹھ سال ہو گئے (۲) کہ رحمت عالم ﷺ اس عالم سے پردہ فرما چکے ہیں۔ آپ کے فیوض و برکات مادّیات سے بلند ہو کر روحانیات سے پرتو افگن ہو رہے ہیں۔ ایسی صورت میں مادّی انسانوں تک ان فیوض و برکات کے پہنچانے والے کون ہوں گے ؟ وہ کون سے تار ہوں گے جو طالب فیض کا رشتہ اس مرکز روحانیت سے جوڑیں اور اس کو رحمت للعالمین ﷺ کی ابدی رحمۃ ورافت سے ہم آغوش کریں ؟

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ملتِ اسلامیہ کو وہ واسطہ قرار دیا ہے۔ امتہ اسلامیہ وہ ساقی ہے جو چشمۂ حیات سے جام حیات حاصل کرتا ہے اور تشنہ کامانِ سعادت کے لبوں تک پہنچا دیتا ہے۔ چناں چہ ارشاد خداوندی ہے :

"كذلك جعلناكم امة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا"۔ (سورہ بقرہ، آیت ۱۴۳)

"ہم نے تم کو ایک افضل امت بنایا۔ تاکہ تم انسانوں کے سامنے شاہد حق رہو اور رسول تمہارے سامنے حق و صداقت کی شہادت پیش کرنے والے ہوں"۔

"كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر و تومنون بالله"۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۱۰)

"تم بہت ہی بہتر امت ہو جو تمام انسانوں کے لیے پیدا کی گئی۔ تم اچھی باتوں کا حکم کرتے ہو۔ بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔

(۴) حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہ العزیز جو شہاب الدین غوری کی آمد سے تقریباً بیس سال پہلے دہلی رونق افروز ہوئے اور پھر اجمیر شریف کو ارشاد و تبلیغ کا قطب مینار بنایا۔ اسی طرح حضرت خواجہ بہاء الدین، سید سالار مسعود، شرف الدین یحیٰی منیری قدس اللہ اسرارہم اور بہت سے وہ مقدس نقوش جو گجرات، کاٹھیاوار، مالابار

وغیرہ ساحلی علاقوں میں اس وقت پہنچے کہ نہ محمود غزنوی کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے سرزمین ہند کو روندا تھا اور نہ تغلق اور التمش کی فوجوں نے یہاں چھاؤنیاں ڈالیں تھیں۔ وہ اسی راز کو سینے میں لے کر اپنے اپنے وطن سے نکلے۔ سربکف اور کفن بردوش اس ظلمت کدے میں آئے۔ ارشاد و تبلیغ کی شمع روشن کی اور فاتحین ہند کے لیے مشعل راہ بن گئے۔

آج ہم اس دھوکے میں ہیں کہ اسلام کو ترقی، فوجوں کی شان و شوکت، چھاؤنیوں کے حصار اور کوہ نما قلعوں کی سربفلک چوٹیوں سے ہوئی۔ لیکن کیا تاریخ اس کی تصدیق کر سکتی ہے؟

کیا ابراہیم لودھی، ہمایوں، شیر شاہ، اکبر اور جہانگیر کو اپنی عیش و عشرت یا آپس کی خانہ جنگیوں سے کبھی اتنی فرصت ملی کہ وہ دعوت اسلام کی طرف توجہ کر سکتے۔

معاذاللہ! ان خود غرضوں کو تبلیغ اسلام کی تو کیا فرصت ہوتی، واقعات تو یہ بتاتے ہیں کہ دوسروں کی چاپلوسی میں اپنوں کو دھکے دیتے رہے اور اپنی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے اسلام کی جڑیں اکھیڑتے رہے۔

یہ صرف ان پاکیزہ صفات قدسی نفوس کے فیوض و برکات تھے جو گلشن ہند کے گل و لالہ میں رنگ و بو کی طرح سما گئے اور ہر ایک باسعادت دماغ کو معطر کر کے اپنا گرویدہ بناتے رہے۔

دورِ آخر کے علمائے دین کی خدمات:

پھر جب حشمت و شوکت کا دور ختم ہو گیا اور ہندوستان ان فرنگیوں کی غلامی میں مبتلا ہوا جن کا کفر مجدد الف ثانی کی نظر میں سب سے زیادہ سخت اور نفرت انگیز تھا، تب انھیں پاکبازوں کے پاکباز پیرو تھے جنھوں نے تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں قرون اوّل کی یاد تازہ کی اور جب کہ بغداد، بخارا، غرناطہ اور قرطبہ کے علمی مرکزوں کو ٹوٹے ہوئے صدیاں گزر گئیں تھیں، ہندوستان میں دیوبند، سہارن پور، دہلی، فرنگی محل لکھنؤ، رام پور،

ٹونک، گنگوہ، تھانہ بھون وغیرہ سے نقلی و عقلی علوم اور طریقت و معرفت کے چشمے جاری کیے۔

(۵) غلامی کے اس دور میں خداوند عالم نے مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائی کہ انھوں نے وہ عظیم الشان، تعلیمی، تہذیبی اور مذہبی ادارے قایم کیے جن کی نظیر خود ان کے عہد حکومت میں بھی مشکل سے ملتی ہے۔

یہ انگریز کی مہربانی یا اس کا طفیل نہیں تھا، بلکہ اسلافِ کرام کی روحانیت کا طفیل اور احساس ضرورت اور تقاضاے احساس تھا۔ چناں چہ یہ ادارے خصوصیت سے اس علاقے میں قایم ہوئے جہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مظاہر العلوم سہارن پور، جامعہ ملیہ دہلی، جامعہ قاسمیہ مراد آباد، شمس الہدیٰ پٹنہ، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، ندوۃ العلماء لکھنو، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین دہلی، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور بہت سے چھوٹے بڑے تعلیمی اور تبلیغی ادارے، کتب خانے اور لائبریریاں ان علاقوں میں قایم ہوئیں جہاں مسلمان آٹھ دس فیصدی سے زاید نہ تھے (۳)۔

کیوں کہ یہاں کے مسلمانوں نے بقاو تحفظ کے لیے جدو جہد کو ضروری سمجھا اور ان کی کوششوں نے ان اداروں کی شکل اختیار کرلی۔

اس کے بر خلاف آپ ان علاقوں پر نظر ڈالیے۔ جہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ جو اس غلامی کے دور میں بھی اپنی اکثریت اور اپنے اقتدار و تسلط کے باعث اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے رہے۔ مثلاً صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ، مغربی پنجاب، مشرقی بنگال (جو علاقے آج پاکستان کا جز بن گئے ہیں) یہاں نہ ایسی درس گاہیں ہیں، نہ تہذیبی اور ثقافتی ادارے اس درجے کے قایم ہو سکے، کیوں کہ یہاں کے مسلمان بڑی حد تک اپنے تحفظ اور بقا کی طرف سے مطمئن رہے۔

مسلم اکثریت کے صوبوں سے زیادہ حیرت انگیز اور عبرت ناک حالت ان ممالک کی

ہے، جہاں مسلمانوں کے علاوہ کوئی دوسرا فرقہ موجود ہی نہیں، یا اگر وجود رکھتا ہے تو برائے نام، جن کو نہ کوئی سیاسی حیثیت حاصل ہے اور نہ وہ اقتصادی اور کاروباری لحاظ سے کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً عرب ممالک، ایران، افغانستان وغیرہ۔ ان ممالک کے حالات کا اگر جائزہ لیں گے تو نہ صرف علم، بلکہ عمل کا خانہ بھی خالی ہی نظر آئے گا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل :

ماضی کے حالات سے سبق لے کر اگر مستقبل کے متعلق کوئی رائے قایم کی جاسکتی ہے تو ہمیں اس بارے میں خدا کے فضل و کرم سے پوری توقع ہے کہ ہند یونین کے مسلمانوں نے اگر سعی پیہم میں کوتاہی نہیں کی اور اگر ان کی جدوجہد کا اسپ لاغر کم از کم اس رفتار سے بھی چلتا رہا جو آج کل قایم ہے تو ان شاء اللہ ہند یونین میں وہ بھی زندہ رہیں گے۔ اور ان کا مذہب اور ان کی تہذیب بھی ان شاء اللہ باقی اور محفوظ رہے گی۔

(٦) کوئی مذہب ہو یا کوئی تہذیب، اس کے بقا اور تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ اس کے حاملین بھی موجود ہوں۔ اہل مذہب یا حامیان تہذیب کی غیر موجودگی میں نہ مذہب باقی رہ سکتا ہے، نہ تہذیب زندہ رہ سکتی ہے۔

اور چوں کہ مذہب یا تہذیب سے متعلق اجتماعی ضرورتیں جماعت کے مختلف عناصر سے پوری ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کی بقا اور تحفظ کے لیے ان مختلف عناصر کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی ایک عنصر ناپید یا ناقص ہو جاتا ہے تو اس کا نقصان صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس تمام گل دستے کو منتشر کر دیتا ہے جس کے شیرازے میں یہ عنصر منسلک تھا۔ مثلاً کالج، یونیورسٹی یا دارالعلوم کے لیے جس طرح طلبہ کی ضرورت ہے ایسے ہی پروفیسر اور اساتذہ بھی درکار ہوتے ہیں اور ان کی ضرورت کے لیے انتظامی کارکنوں اور اس شیرازے کو قایم رکھنے کے لیے ٹرسٹیوں اور ارکان شوریٰ کی بھی ضرورت ہے اور ان سب سے زیادہ ان چشموں کی ضرورت ہے، جن سے مالی تشنہ کامیوں کو سیراب کیا جائے۔

اسی طرح کتب خانے، اکاڈمیاں، مساجد، محفل خانے وغیرہ یعنی کوئی بھی علمی، ادبی یا ثقافتی ادارہ ہو، جب تک مختلف عناصر موجود نہ ہوں، وہ ادارہ باقی نہیں رہ سکتا اور ظاہر ہے کہ تہذیب و مذہب کے بقا کی عملی صورت یہی ہے کہ یہ ادارے باقی ہوں اور ترقی پذیر ہوں۔

ہندوستان سے مسلمانوں کا ترکِ وطن :

(الف) ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے :

بس اس صورت میں جب کہ ہند یونین کا مسلمان آزادی کے بعد بھی مذہب و تہذیب کی طرف سے مطمئن نہیں ہوا، بلکہ ان کے بارے میں پہلے سے زیادہ وہ خطرات محسوس کر رہا ہے، کسی مسلمان کا خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو، ترکِ وطن کرنا مجموعی حیثیت سے مضر ہے۔ کیوں کہ وہ جماعتی طاقت کو کمزور کرتا ہے اور اقلیت کو خطرات کے دامن میں ڈال دیتا ہے۔ دولت مند حضرات نقل مکانی کر کے گویا رگِ زندگی پر نشتر لگاتے ہیں۔ اہلِ علم، اہل ادب اگر تشریف لے جاتے ہیں تو محفل کو بے نور اور گلشن پژمردہ کو دستِ خزاں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ نوجوانان عزیز گلشن کے نونہال ہیں۔ انھیں کے دم سے یہ گلشن، گلشن ہے ورنہ وہ صحرا اور بیابان ہو جائے گا، جہاں نہ گل ہوگا، نہ بلبل۔ غرض یہ نقل مکانی ہند یونین کی جڑ پر ایک تیشہ ہے جس کو مفاد ملت کے لیے غداری قرار دیا جائے گا۔

(ب) پاکستان کے نقطۂ نظر سے :

یہ بھی عجیب بات ہے کہ یہ انتقال پاکستان کے لیے بھی کچھ مفید نہیں، بلکہ سراسر مضر ہے۔ کیوں کہ اضافۂ آبادی اس کی اقتصادیات کے لیے تباہ کن بار ہے۔

اور بقول مسٹر لیاقت علی مرحوم، پاکستان کی مثال اس بوتل کی ہے جس میں ایک قطرے کی بھی گنجایش نہیں۔ زیادہ دباؤ ڈالا جائے گا تو بوتل پھٹ جائے گی مگر قطرے کی گنجایش نہ پیدا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کا پرمٹ دینے میں جس درجے ہند یونین کے

افسر سخاوت اور سیر چشمی سے کام لیتے ہیں پاکستان کا ہائی کمشنر اس سے کہیں زیادہ بخل سے کام لیتا ہے۔ ایسی صورت میں اس نقل مکانی اور ترکِ وطن کو جائز قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں پیش کی جا سکتی۔ بلکہ اگر کسی قدر جذبات سے کام لیا جائے تو اس کو "زحف عن القتال" کے مشابہ قرار دے کر حرام کہا جا سکتا ہے۔

چناں چہ ۱۹۴۷ء کے اس خطرناک دور میں کہ پاکستان کے شیدائی مسلمان متاعِ جان کے عوض بھی ہوائی جہاز کے ٹکٹ کو ارزاں سمجھ رہے تھے، ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانے میں پاکستان تو کیا مکۂ معظمہ اور مدینہ منورہ چلا جانا بھی معصیت ہے۔

بظاہر اسی قسم کے وجوہات اس وقت بھی پیش نظر تھے، جب ہندوستان سے سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہوا تھا کہ سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے لے کر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب تک بڑے بڑے علما، فضلا اور اربابِ طریقت ہندوستان کو "دارالحرب" تو قرار دیتے رہے مگر ہجرت کا حکم کسی نے بھی نہیں دیا۔ حال آں کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد اس سے کم تھی اور افغانستان، ایران اور بالخصوص ترکی حکومت اِس وقت سے زیادہ وسیع اور صاحب اقتدار تھی۔

اور ہندوستان کی تاریخ سے صحیح واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ خطرات اس وقت بھی موجودہ دور سے کم نہیں تھے، بلکہ زیادہ تھے۔ چناں چہ ہم نے نمبر ۲ اور نمبر ۳ (باب اول) میں کچھ ان خطرات کا ذکر بھی کیا ہے۔

اب آیئے "ہجرت" کے متعلق کچھ تحقیق کریں کہ وہ کیا ہے اور آیا موجودہ ترکِ وطن "ہجرت" ہو سکتا ہے یا نہیں؟

حواشی:

(۱) عرصہ ہوا اس موضوع پر احقر کا ایک طویل مضمون شائع ہو چکا ہے، جس کا عنوان تھا "عقیدۂ رحمۃ للعالمین کا اثر سیاسیات عالم پر"۔ اگر کسی صاحب کے پاس یہ مضمون ہو تو ملاحظہ فرمالیں۔ یہ مضمون

"مسلم سوشلسٹ" کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ دونوں نایاب ہیں۔
(محمد میاں)

(۲) اب اس مدت میں تقریباً پچاس برس کی مدت اور شامل کر لینی چاہیے۔ (ا۔ س۔ ش)

(۳) اس وقت بہار اور یوپی میں مسلمانوں کی تعداد تیرہ، چودہ فی صد ہے، لیکن جب یہ ادارے قائم ہوئے تھے تو ان کا تناسب آٹھ، دس فیصد سے زیادہ نہ تھا۔ اس کی شہادت اس سے ملتی ہے کہ ہر مردم شماری پر مسلمانوں کا تناسب بڑھتا رہا۔ (محمد میاں)

باب پنجم:

ہجرت کی حقیقت اور اس کا حکم

ترکِ وطن کا نامبارک اور نامسعود حادثہ جو کم و بیش دو کروڑ ہندوستانیوں کو برداشت کرنا پڑا، اس نے بھی غیر اختیاری طور پر اسلام کے دین مکمل ہونے کی ایک دلیل پیش کر دی۔ کیوں کہ جس طرح مجاہد، شہید، جہاد اور شہادت کا صحیح مفہوم ادا کرنے سے دوسری زبانیں اور دوسرے مذہبوں کے اصطلاحی الفاظ قاصر تھے، ترکِ وطن کے اس حادثے نے ثابت کر دیا کہ ہجرت کے صحیح مفہوم سے بھی دوسرے مذاہب کے دامن خالی ہیں۔

شرنارتھی، پرشارتھی، رفیوجی، پناہ گزین اور نکاسی وغیرہ بہت سے الفاظ استعمال کیے گئے، مگر ان مصیبت زدہ تارکینِ وطن کی تسکین کسی سے بھی نہ ہوئی، کیوں کہ ان الفاظ سے اس گروہ کی لاچاری اور ماندگی اور بے کسی و بے بسی تو ثابت ہوتی تھی جو ایک خوددار کے لیے قابلِ برداشت نہیں تھی، لیکن کسی ایسے ایثار اور قربانی کا پتا ان الفاظ سے نہیں ملتا جو ان برباد شدہ انسانوں کی عزت و عظمت قائم کر سکے اور یہ بتا سکے کہ جو کچھ انھوں نے برداشت کیا وہ ذاتی منفعت، راحت طلبی اور جان بچانے کے لیے نہیں تھا، بلکہ ملک و ملت کے مفاد کے لیے تھا۔

البتہ ہجرت اور مہاجر کے الفاظ وہ ہیں، جو اس عظمت و عزت کا سہرا مصیبت زدہ تارکینِ وطن کے سر پر باندھ دیتے ہیں۔ ترکِ وطن اور تارکینِ وطن کے لیے اسلام نے نہ صرف پر شوکت خطاب عطا فرمایا، بلکہ اس کا پورا پروگرام اور لائحۂ عمل بھی بخش دیا۔ حال آں

کہ دوسروں کے پاس اس کے لیے کوئی موزوں لفظ بھی نہیں ہے۔

لیکن جس طرح ہر جنگجو، مجاہد کے خطاب کا مستحق نہیں، ہر موت کو شہادت یا ہر مرنے والے کو شہید نہیں کہا جا سکتا، اسی طرح اسلام کے تعلیم فرمودہ پروگرام اور لائحۂ عمل کے مطابق ہر تارکِ وطن کو مہاجر بھی نہیں کہا جا سکتا۔

ہجرت کے معنی ہیں چھوڑنا۔ "ہجرت" یعنی چھوڑنے کا خاص انداز ہے، لیکن وہ خاص انداز کیا؟ وہ ہے للٰہیت ۔ یعنی اللہ اور رسول کے لیے، دین و ایمان کی خاطر اور مفادِ ملت کے پیش نظر وطن کو چھوڑنا۔ چناں چہ آنحضرت ﷺ نے وضاحت فرمادی:

"انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرء مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فہجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ لدنیا یصیبہا او امراۃ یتزوجہا فہجرتہ الیٰ ماھا جرالیہ"۔ (بخاری شریف)

"عمل (۱) کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر شخص کو وہی ملے گا جو اس نے نیت کی ہے۔ پس جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر وطن چھوڑا، اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے مانی جائے گی اور جس شخص نے دنیا کی خاطر، جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی عورت کی خاطر جس سے وہ نکاح کرنا چاہتا ہے، ترکِ وطن کیا (تو باوجودے کہ فعل ایک سا ہی ہے) مگر اس ترکِ وطن کو ہجرت نہیں کہا جائے گا"۔

چند مستثنیات:

اب ان مسلمانوں کا ترکِ وطن زیرِ بحث نہیں، جن کے سامنے ترکِ وطن یا موت کا سوال درپیش تھا۔ کرپانیں، خنجر، آبدار تلواریں یا گولیوں کی بارش سامنے تھی۔ جس کی زندگی تھی وہ بچ گیا، جس کی موت مقدر ہو چکی تھی وہ وہیں ڈھیر ہو رہا۔

بلاشبہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ ان حضرات کو بھی اپنی جگہ یعنی اپنے گھروں میں اور اپنے آبائی وطن میں ثابت قدم رہتے ہوئے شہادت کو لبیک کہنا چاہیے تھا۔ مگر ہمارے قلم میں جرأت نہیں ہے کہ ان حضرات کے بارے میں جنبش کر سکے۔

بے شک شہادت کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ لیکن جب عورتوں اور بچوں کی بے بسی، جگر پاروں کی لاچارگی اور ان کی عصمت وعفت کا مسئلہ پوری ہولناکی کے ساتھ سامنے ہو، خوف وہراس سے چہرے زرد ہوں، بدن میں لرزہ ہو اور دل دھڑک رہا ہو اور نہ خودکشی کی اجازت ہو اور نہ اپنے ہاتھوں اپنے بیوی، بچوں اور اہل وعیال کے ذبح کرنے کو شریعت جائز قرار دیتی ہو تو ایسی نازک اور لرزہ خیز صورت میں شہادت کا مرتبہ بلند، بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے اور ایسے ہیبت ناک تصور کے ساتھ جب ہم خود اپنے عزم واستقلال کا موازنہ کرتے ہیں، تو یہی دعا کرنی پڑتی ہے کہ ربنا لا تجعلنا فتنة للقوم الظالمين۔

اسی طرح ان مسلمانوں کا مسئلہ بھی زیرِ بحث نہیں، جن کے سامنے ترکِ وطن یا ارتداد، اور نہ موت کا سوال درپیش تھا۔ ان لوگوں نے ارتداد اور موت پر ترکِ وطن کو ترجیح دی یعنی اپنی جان اور ایمان کو باقی رکھنے کے لیے وطن ترک کیا۔ لامحالہ اس کو ہجرت کہا جائے گا۔ احادیث میں اس کو "فرار بالدین" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی تحسین کی گئی ہے۔ بحث ان کے متعلق ہے جن کے سامنے نہ موت کا سوال تھا، نہ معاذ اللہ ارتداد کا۔ اس کے باوجود انھوں نے ترکِ وطن کیا یا کر رہے ہیں، آیا اس کو ہجرت کہا جائے یا نہیں؟

ہجرتِ پاکستان اور اس کے مقاصد :

فیصلہ سے پہلے ہمیں آثار و قرائن سے یہ اندازہ لگانا ہوگا کہ یہ حضرات کیوں تشریف لے گئے یا کیوں جا رہے ہیں؟ آثار و قرائن اور بسا اوقات خود جانے والوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے ترکِ وطن کے مقاصد یہ ہیں :

(۱) وہاں روزگار مل جائے گا۔

(۲) وہاں عزت ملے گی۔

(۳) وہاں بال بچوں کا مستقبل روشن ہوگا۔

(۴) رات دن کے خطرات اور خوف وہراس سے اطمینان نصیب ہوگا۔

(۵) وہاں اپنے تمام اعزا و اقارب پہنچ گئے ہیں، جن کے ساتھ رہنے کی عادت تھی۔

(۶) بال بچوں کے نکاح و بیاہ کا یہاں موقع نہیں رہا، کیوں کہ خاندان کے تمام آدمی وہاں پہنچ چکے ہیں۔

ان مقاصد کی بنا پر اگر وطن کو "الوداع" کہا گیا تو شرعی نقطۂ نظر سے اس کو ہجرت نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ یہ ترکِ وطن طلب دنیا یا ازدواجی مقاصد کے لیے ہے اور مذکور الصدر حدیث کا فتویٰ ہے کہ یہ "ہجرت" نہیں اور جیسا کہ گذشتہ ابواب میں تفصیل سے ذکر کیا گیا، چوں کہ اس ترکِ وطن اور فرار سے ملی مفادات کو نقصان پہنچ رہا ہے، لہٰذا اس کو جائز بھی نہیں کہا جا سکتا۔

ان تارکین وطن کو حضرت حق جل مجدہ کے اس سوال کا جواب سوچنا چاہیے :

"من ذا الذی یعصمکم من اللہ ان اراد بکم سوءً او اراد بکم رحمۃ ولا یجدون لھم من دون اللہ ولیا ولا نصیراً"۔ (سورۂ احزاب، آیت ۱۷)

"وہ کون ہے جو تم کو اللہ سے بچاوے؟ اگر اللہ تمھارے ساتھ برائی یا تم پر رحم کرنے کا ارادہ کرے! اور وہ لوگ اللہ کے سوا کسی کو ولی اور مددگار نہ پائیں گے"۔

غلط استدلال :

کچھ صاحبان ترکِ وطن کا مقصد بیان کرنے میں جدت اور ذہانت سے کام لیتے ہیں اور دار الاسلام و دار الحرب کی بحث چھیڑ کر ان احادیث سے استدلال شروع کر دیتے ہیں، جن کے الفاظ سے سطحی طور پر دار الکفر میں رہنے کی ممانعت سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً ایک استدلال حضرت سمرہ بن جندبؓ کی روایت سے ہوتا ہے، جس کو ابو داؤد نے کتاب الجہاد کے آخر میں نقل کیا ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں :

"من جامع المشرک و سکن معہ، فھو مثلہ"۔

"جو مشرک کے ساتھ اکٹھا ہو اور اس کے ساتھ رہے وہ اسی جیسا ہے"۔

ایک دوسری حدیث حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:

"انا بریٔ من کل مسلم یقیم بین اظہر المشرکین۔ قالوا یا رسول اللہ ولم؟ قال لا تترائ ناراھما"۔ (ابوداؤد شریف و ترمذی شریف)

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکوں کے بیچ میں قیام پذیر ہو۔ صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کیوں؟ فرمایا یہ دونوں آگیں ساتھ ساتھ نظر نہ آنی چاہئیں"۔

رفع اشکال:

اس قسم کی احادیث کے مفصل جواب سے پیشتر ان دونوں روایتوں کے بارے میں یہ عرض ہے کہ پہلی روایت کے متعلق تو حدیث کے مشہور امام حافظ "ذھبی" رحمہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے:

"اسنادہ مظلم۔ لا تقوم بمثلہ حجۃ"۔ (نیل الاوطار للقاضی الشوکانی، ج ۸، ص ۱۷۶)

"اس کی سند تاریک ہے۔ اس جیسی روایت سے استدلال نہیں ہو سکتا"۔

باقی رہی دوسری حدیث جس کو حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے نقل کیا وہ صحیح السند ضرور ہے، لیکن اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ کسی وقت بھی مسلم اور غیر مسلم ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے۔

کیا مدینہ طیبہ میں ابتدائی دور میں تقریباً پانچ سال تک مسلم اور غیر مسلم ساتھ ساتھ نہیں رہے؟

اور کیا ان دونوں کے درمیان تعاون باہمی کا عہد و پیمان نہیں ہوا تھا؟

عہدِ نبوت کے آخری دور میں بے شک حدودِ حجاز میں مشرک نہیں رہے، لیکن کیا تمام دنیا کے لیے وہی حکم تھا جو ارضِ حجاز کے لیے تھا؟ مصر، شام، طرابلس، عراق وغیرہ خلافتِ راشدہ کے عہدِ مبارک میں فتح ہو گئے تھے۔ کیا سب جگہ کے غیر مسلموں کو ختم کر دیا گیا تھا یا

مسلمانوں کے لیے ان کے شہروں میں رہنا حرام قرار دیا گیا تھا؟

حجاز کے علاوہ تمام ممالک میں کم یا زیادہ غیر مسلم آج تک موجود ہیں، ان سے کبھی چھوت چھات نہیں کی گئی، نہ یہ حکم دیا گیا کہ غیر مسلموں کے شہروں میں مسلمانوں کے لیے رہنا ممنوع ہے، بلکہ خود صحابہ کے واقعات اس کے برعکس بکثرت موجود ہیں۔ عہدِ صحابہ کا آخری دور تھا، جب محمد بن قاسم ہندوستان پہنچے اور عرب خاندانوں کو "سندھ" میں ہندوؤں کے ساتھ آباد کر گئے، جن کی نشستیں آج تک موجود ہیں۔ اسی دور میں گجرات، مالابار اور جنوبی ہند کے ساحلوں پر مسلمانوں کے قافلے فروکش ہوئے اور ہندوؤں کے بیچ میں اپنے جھونپڑے ڈال لیے۔ اور آج بھی یہ حضرات اگر اس حدیث کی بنا پر پاکستان کا رخ کرتے ہیں تو کیا صرف پاکستان کے ان علاقوں میں رہنا جائز سمجھیں گے جہاں غیر مسلموں کا نام و نشان نہیں رہا اور لاہور، کراچی اور مشرقی پاکستان جہاں اب بھی ایک کروڑ سے زاید ہندو آباد ہیں وہاں قیام کرنا ناجائز قرار دیں گے؟

ایک روایت اور اس کی تشریح:

اس کے علاوہ اگر پوری روایت سامنے آئے تو معلوم ہوگا کہ حدیث ایک جنگی قانون کی توضیح کر دیتی ہے۔ ارشادِ گرامی کا منشا یہ ہے کہ اگر دورانِ جنگ میں اسلامی فوج کے ہاتھوں وہ مسلمان مارے جائیں جو غیر مسلموں کے ساتھ رہتے ہیں، تو اسلامی فوج پر مسلم ہونے کی حیثیت سے ان کی کوئی ذمہ داری عاید نہ ہوگی۔ چناں چہ اس ارشاد کا شانِ نزول ایک ایسا ہی واقعہ ہے، جو حملے کے وقت پیش آیا۔ چناں چہ حدیث کے جو الفاظ اوپر ذکر کیے گئے ان سے پہلے اسی حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ

> آنحضرت ﷺ نے قبیلۂ خثعم پر حملہ کرنے کے لیے ایک دستہ بھیجا۔ اہل خثعم نے حملہ آور دستے کو دیکھا تو سجدہ ریز ہو کر جان بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ان کے سجدوں کا اعتبار نہیں کیا اور حملہ جاری رکھا۔ چناں چہ اہل خثعم کے

کچھ آدمی مارے گئے۔ یہ معاملہ رحمتِ عالم ﷺ کی عدالتِ عالیہ میں پیش ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے مقتولین کا نصف خون بہا (آدھی دیت) دلوائی اور فرمایا: میں اُن مسلمانوں کا ذمہ دار نہیں جو مشرکین کے بیچ میں قیام پذیر ہوں۔ (الحدیث ابو داؤد و ترمذی شریف: غیر بہ روایت مذکور)

نصف دیت کیوں دلوائی گئی، پوری دیت کیوں نہیں دی گئی؟ اس کے متعلق علمائے کرام نے اپنی جگہ بحث کی ہے، وہ ہمارے موضوعِ بحث سے خارج ہے۔ ہمیں تو یہ عرض کرنا ہے کہ سیاق کلام ایک جنگی قانون بتا رہا ہے۔ چناں چہ حضرات فقہائے کرام نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے ایسے مسلمانوں کا خون ''ہدر'' اور غیر قابل مطالبہ قرار دیا ہے، جو شب خون میں غیر مسلموں کے ساتھ اسلامی فوج کے ہاتھوں مارے جائیں۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: شرح السیر الکبیر و بدائع الصنائع وغیرہ)

یہ الزامی جوابات تھے۔ اب ہم ہجرت کے مسئلے پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

آزاد مرکز کی تلاش:

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کا آغاز ایسے وقت ہوا جب دنیا میں ''داعی'' کے علاوہ ایک بھی راہِ حق پر نہیں تھا۔ دعوت پر چند حضرات نے لبیک کہا، مگر عرصے تک یہ موقع نہ تھا کہ دوسروں کے سامنے علانیہ دعوت پیش کی جائے یا خود اپنے مسلمان ہونے کا کھلم کھلا اعلان کیا جائے۔

گلشن رشد و ہدیٰ میں یہ کونپل بہر حال سرسبز رہی لیکن یہ خطرہ ہر وقت تھا کہ بادِ سموم کا کوئی جھونکا اس کو ہمیشہ کے لیے خشک کر ڈالے۔

ہزاروں مصیبتوں کے بعد رفتہ رفتہ تیرہ سال کے عرصے میں یہ موقع آیا کہ دعوت کو قبول کرنے والوں کی ایک چھوٹی سی جماعت قائم ہو گئی۔ جماعت کے افراد پوری طرح

تربیت پا چکے تھے، مگر وہ منتشر تھے۔ ان کا کوئی نظم نہیں قائم ہو سکتا تھا۔ تب ایک آزاد مرکز کی ضرورت تھی جہاں اس منتشر جماعت کی شیرازہ بندی ہو سکے اور اسلام کے اجتماعی احکام پر بھی عمل ہو سکے۔ چناں چہ مدینہ منورہ "دارالہجرت" قرار پایا۔ مسلمان یہاں پہنچے۔ تب ان کو اجتماعی احکام کی تلقین کی گئی۔ مثلاً اذان، جماعت، جمعہ، عیدین وغیرہ۔ اسلامی شعایر جو نظام اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، مدینہ منورہ پہنچ کر شروع ہوئے۔

مدینہ طیبہ کے علاوہ کسی جگہ نہ اذان ہو سکتی تھی، نہ جماعت، نہ جمعہ اور نہ عیدین کا امکان تھا۔

ہجرت کا حکم :

اس دور میں فرض کیا گیا کہ جو اسلام میں داخل ہو وہ لامحالہ ہجرت بھی کرے، تاکہ ان فرایض کو بھی ادا کر سکے جن کا تعلق اگرچہ سیاست، معاشرت اور اقتصادیات سے نہیں، بلکہ صرف معادات سے ہے، لیکن ان کی ادائیگی کے لیے اجتماعی حیثیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

رفتہ رفتہ یہ آزاد مرکز ایک جنگی محاذ بھی بن گیا اور سب طرف سے مخالفینِ اسلام کی کوششیں ہونے لگیں کہ اس محاذ کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے۔ اس صورت میں لامحالہ مذہبی، سیاسی اور اخلاقی فرض تھا کہ اس محاذ کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنایا جائے اور اس کا حامی جہاں بھی کوئی ہو سمٹ کر یہاں پہنچ جائے۔

یہی دور تھا جب ہجرت فرض کی گئی اور ترکِ ہجرت کو گناہِ عظیم قرار دیا گیا۔ چناں چہ ارشادِ خداوندی ہے :

"ان الذین توفاھم الملائکۃ ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم قالوا کنّا مستضعفین فی الارض قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا فاولئک ما واھم جھنم وساء ت مصیراً۔ الا المستضعفین من الرجال و النساء والولدان

لایستطیعون حیلۃً ولا یھتدون سبیلا۔ فاولئک عسی اللہ ان یعفو عنھم و کان اللہ غفورا رحیما"(سورۂ نساء، آیات ۹۹۔۹۷)

"فرشتے جن لوگوں کی جان اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر رہے تھے، (روح قبض کرنے کے بعد) فرشتے ان سے پوچھیں گے "تم کس حال میں تھے؟" (یعنی دین کے لحاظ سے تمہارا کیا حال تھا؟) وہ جواب میں کہیں گے (ہم کیا کر سکتے تھے!) ہم تو دبے ہوئے کمزور تھے، (نہ آزادانہ غور و فکر کر سکتے تھے اور نہ اپنی رائے اور اعتقاد پر عمل کر سکتے تھے۔ فرشتے کہیں گے کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ ہجرت کر کے چلے جاتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ مگر وہ مجبور و بے بس مرد، عورتیں اور بچے جو کوئی چارہ نہیں رکھتے اور نہ (ہجرت کی) کوئی راہ پاتے ہیں تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ (ان کی معذوریوں پر نظر فرماتے ہوئے) ان کو معاف فرما دیں گے۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

کم و بیش سات سال تک یہ دور رہا۔ اس دور کے حالات کا تقاضا یہ تھا اور یہی آنحضرت ﷺ کا ارشاد تھا کہ مسلمان اور مشرک ساتھ ساتھ نہ رہیں، ان دونوں کی آنکھیں ساتھ ساتھ نظر نہ آئیں۔

دورِ ہجرت کا خاتمہ:

لیکن رمضان ۸ھ میں جب مکۂ معظمہ فتح ہوا اور مدینۂ منورہ کا اسلامی محاذ سارے حجاز پر چھا گیا تو یہ دور ختم ہو گیا، اب ہجرت کی فرضیت جو عارضی تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ چناں چہ خاتم الانبیاء والمرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اعلان فرمایا:

"لا ھجرۃ بعد الفتح ولکن جھاد و نیۃ واذا استنفرتم فانفروا"[۶]۔

"فتح (فتح مکہ) کے بعد ہجرت نہیں رہی۔ اب جہاد اور نیت باقی ہے اور جب شرکتِ جہاد کے اعلان عام کے بعد تم سے مطالبہ کیا جائے تو تم جہاد میں شریک ہونے کے لیے نکل کھڑے ہو"۔

بخاری، مسلم وغیرہ جملہ ائمۂ حدیث نے رسول اللہ ﷺ کے اس اعلانِ مبارک کو

نقل فرمایا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس پس منظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"لا هجرة اليوم كان المومن يفر بدينه الى الله ورسوله مخافة ان يفتن فاما اليوم فقد اظهر الله الاسلام والمومن يعبد ربه حيث شاء" (بخاری شریف)۔

"آج ہجرت کا حکم نہیں رہا (ایک دور ایسا گزرا ہے) کہ مسلمان اپنے دین کو لے کر اللہ اور رسول ﷺ کی طرف بھاگتے تھے، اس خوف سے کہ اگر وہ وطن میں رہیں تو کہیں آزمائش میں نہ پڑ جائیں (یعنی دشمنان دین کا کوئی منصوبہ کامیاب ہو جائے اور یہ معاذ اللہ ترکِ دین پر مجبور ہو جائیں) لیکن اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو پھیلا دیا ہے اور مومن جہاں چاہے اپنے رب کی عبادت کر سکتا ہے (۲)"۔

پہلے ہجرت پر بیعت لی جاتی تھی، لیکن اب حضرت مجاہد بن مسعودؓ حاضر خدمت ہوتے ہیں اور ہجرت پر بیعت کرنا چاہتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے:

"لا هجرة بعد فتح مكة ولكن ابايعه على الاسلام والايمان والجهاد" (متفق علیہ)

"فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں رہی۔ البتہ اسلام، ایمان اور جہاد پر میں ان سے بیعت لوں گا"۔

اس کے بعد جنگ کے سلسلے میں بھی ہدایت یہ ہوئی:

"اذا لقيت عدوك من المشركين فادعهم الى احدى ثلاث خصال ايتها اجابوك فاقبل منهم وكف منهم۔

ادعهم الى الاسلام والتحول من دارهم الى دار المهاجرين واخبرهم انهم ان فعلوا ذلك فان لهم ما للمهاجرين وعليهم ما على المهاجرين۔

وان ابوا ان يتحولوا فاخبرهم انهم يكونون كاعراب المسلمين يجرى عليهم ما يجرى على الاعراب وليس لهم فى الغنيمة والفئى شئى الا ان يجاهدوا (الحدیث، ترمذی شریف، ج ۱، ص ۹۵)

جب تمھارا مشرک حریفوں سے مقابلہ ہو تو ان کو تین باتوں میں سے ایک کی دعوت دو۔ ان میں سے کوئی ایک بھی اگر وہ قبول کر لیں تو تم بھی منظور کر لو اور جنگ کرنے سے باز رہو۔

ان کو اسلام کی دعوت دو اور یہ کہ وہ اپنے ملک (دارالحرب) کو چھوڑ کر دارالمہاجرین میں آجائیں۔ اور ان کو آگاہ کر دو کہ اگر انھوں نے ایسا کر لیا تو ان کو وہی رعایتیں ملیں گی جو مہاجرین کے لیے ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مہاجرین پر ہیں۔

اور اگر وہ اپنے ملک سے منتقل ہونے پر آمادہ نہ ہوں تو ان کو بتا دو کہ وہ اعراب مسلمانوں کی طرح سے ہوں گے، جو جہاد وغیرہ میں شریک نہیں ہوتے بلکہ اپنے دیہات میں رہ کر دیہاتی زندگی گزارتے ہیں۔ جو احکام ان اعراب پر جاری ہوتے ہیں، وہ ان پر بھی جاری ہوں گے۔ اور (یہ کہ مال) غنیمت اور سرکاری جاگیروں کی آمدنی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ البتہ اگر وہ جہاد کریں تو غنیمت میں وہ حصہ دار ہوں گے (۳)۔

یہ حدیث واضح کر رہی ہے کہ

(۱) دیہاتی مسلمانوں پر لازم نہیں تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچیں اور اسلامی فوج میں شامل ہوں۔

(۲) اسی طرح دارالحرب کے باشندے اگر مسلمان ہوں تو ان پر بھی لازم نہیں ہے کہ وہ ہجرت کر کے دارالمہاجرین میں پہنچیں۔

چناں چہ عام حالات میں دارالحرب سے ہجرت کرنے کو علما نے مستحب اور پسندیدہ فعل قرار دیا ہے، واجب یا فرض نہیں کہا۔

دارالحرب کا قیام:

اب ایک سوال دوسرا ہے کہ اگر کسی دارالحرب میں قیام کرنا تبلیغی مقاصد کے لحاظ سے مفید ہو تو کیا اس وقت بھی ہجرت کرنا مستحب رہتا ہے یا اس وقت پسندیدہ ہے کہ دارالحرب میں قیام کرے اور خاتم الانبیاء رحمۃ للعالمین ﷺ کے ادنیٰ جان نثار کی حیثیت سے تبلیغی

مشن کو کامیاب بنانے کی کوشش کرے۔

علامہ ماوردی اس صورت میں قیام دار الحرب کو افضل قرار دیتے ہیں:

"لما یترجی من دخول غیرہ فی الاسلام" (نیل الاوطار، ج ۲، ص ۱۷۸)

"کیوں کہ (اس صورت میں) دوسروں کے مسلمان ہونے کی توقع ہے"۔

ہند یونین میں قیام کی اہمیت و مصلحت:

اب ایک تیسرے مسئلے پر غور فرمایئے، وہ یہ ہے کہ جب اس توقع پر کہ "ممکن ہے کوئی اور بھی دایرہ اسلام میں داخل ہو جائے" دار الحرب میں قیام کرنا افضل ہو جاتا ہے، تو اگر قیام کرنے سے کروڑوں مسلمانوں کو فایدہ پہنچتا ہو، اسلافِ کرام کی ہزار سالہ جدو جہد کے نتائج محفوظ رہتے ہوں اور ترکِ وطن سے نہ صرف ایک دو مسلمانوں کو دھکا لگتا ہو، بلکہ مجموعی حیثیت میں کروڑوں مسلمانوں کے شیرازے کو نقصان پہنچ رہا ہو، ان کی ہمتیں پست ہو رہی ہوں، ان کی ساکھ اور ان کے وقار کو دھکا لگ رہا ہو، معابد، مساجد، مقابر، مآثر، مدارس اور ہزاروں اسلامی اداروں کی تباہی اور بربادی کا خطرہ ہو تو اس صورت میں ترکِ وطن کا کیا حکم ہوگا؟

کوئی بھی مذہب یا سوسائٹی اگر اپنے دستورِ اساسی میں تعاون اور امدادِ باہمی کی کچھ رعایت رکھتی ہے، تو ایسی صورت میں ترکِ وطن کی اجازت نہیں دے سکتی، تو غور فرمایئے اسلام کا مقدس آئین مذکورۂ بالا حالات میں ترکِ وطن کی کب اجازت دے سکتا ہے؟

کون نہیں جانتا کہ تعاون باہمی کی تعلیم میں اسلام کا درجہ سب سے بلند ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کی احادیثِ مبارکہ میں مختلف عنوانات سے تعاونِ باہمی، آپس کی ہمدردی اور حمایت کی تعلیم دی گئی ہے۔

کبھی ارشاد ہوا ہے:

"مسلمانوں کی مثال ایک عمارت جیسی ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کو سنبھالے

ہوئے ہے اور تقویت پہنچاتا رہتا ہے"۔ (صحاح)

کبھی ارشاد ہوا ہے :

"ملت اسلامیہ کے جملہ افراد گویا ایک بدن کے اعضا ہیں۔ اگر چھوٹے سے عضو میں بھی درد ہو جاتا ہے تو سارا بدن بے چین اور مضطرب ہو جاتا ہے"۔ (صحاح)

ایک موقع پر ارشاد ہوا :

"ما من امرء یخذل امرأ مسلماً فی موضع ینتھک فیه حرمته وینتقص فیه من عرضه الا خذله الله فی موطن یحب فیه نصرته" (ابو داؤد شریف)

"جو شخص کسی مسلمان کی امداد سے ہاتھ روک لیتا ہے، ایسے موقع پر جہاں اس کی حرمت و عظمت برباد ہو رہی ہو اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچ رہا ہو تو خداوند عالم اس شخص کی امداد نہیں فرمائے گا، اس موقع پر جہاں اس کو اللہ کی امداد محبوب ہو گی"۔

آنحضرت ﷺ کی انھیں تعلیمات کا اثر یہ تھا کہ "ایک مرتبہ جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حرم شریف میں حاضر تھے تو آپ نے خانۂ کعبہ کی طرف نظر اٹھا کر فرمایا :

"ما اعظمك و اعظم حرمتك۔ والمومن اعظم حرمةً عندالله حرمتك"
(ترمذی شریف ج ۲، ص ۲۴)

"تو کس قدر واجب التعظیم ہے، تیری عزت و حرمت کیسی عظیم الشان ہے! (مگر) مومن کی حرمت و عظمت خدا کے یہاں تیری عزت و حرمت سے بہت زیادہ ہے"۔

قرآن حکیم نے اس تعاون اور امداد باہمی کے درجے کو آخری حد تک پہنچا دیا۔ ارشاد ہوا :

"انما المومنون اخوة" (سورۂ حجرات، آیت ۱۰)

"تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔

اخوت سے بڑھ کر تعاون باہمی کا اور درجہ کیا ہو سکتا ہے ؟

ملت سے غداری :

جس شخص کی نظر اسلام کی ان تعلیمات پر ہو گی وہ ان مقاصد کی خاطر جن کو ہم نے

ابتدا میں بیان کیا ہے، ترکِ وطن کی اجازت ہر گز نہیں دے سکتا، بلکہ ترکِ وطن کو ملی مقاصد سے غداری قرار دے گا۔ جس کو کوئی خود دار اور باحمیت مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔ (معاذاللہ منہ)

غور فرمایئے قرآن حکیم تو جہاد کا مقصد یہ قرار دیتا ہے کہ "کمزوروں اور لاچاروں کو پنجۂ جبر واستبداد سے رہا کرایا جائے"۔ چناں چہ ارشاد ہے:

"مالکم الا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنک ولیاً واجعل لنا من لدنک نصیراً۔ (سورۂ نساء، آیت ۷۵)

"تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے؟ حال آں کہ کتنے ہی بے بس مرد ہیں، کتنی ہی عورتیں ہیں اور کتنے ہی بچے ہیں جو فریاد کر رہے ہیں۔ خدایا ہمیں اس بستی سے جہاں کے رہنے والوں نے ظلم پر کمر باندھ لی ہے، نجات دلا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے اور کسی کو ہماری مدد کے لیے کھڑا کر دے"۔

اور آپ کا مشورہ یہ ہو کہ راہِ فرار اختیار کر کے یہاں کے کمزور باشندوں کو اور بے بس اور لاچار بناؤ، ان کی امداد کے لیے کمر کسنے کے بجائے ان کی کمر توڑ جاؤ۔

ہمارے بزرگوں کی عزیمت:

اس مسئلے کی یہی نزاکت ہے جس کی وجہ سے سیدنا حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور آپ کے معاصرین کرام نے باوجودے کہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا، مگر ہجرت کا حکم نہیں دیا۔ حال آں کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ سے بھی کم تھی۔ دوسرے مسلم ممالک میں جگہ کی بھی اتنی قلت نہیں تھی اور ترکی حکومت جو شان وشوکت سے قائم تھی، وہ مسلمانوں کے اقتصادی مسائل کو بھی حل کر سکتی تھی۔ اس کے ماوراء افغان، ایران وغیرہ بھی اس وقت اس سے بہتر حالت میں تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال کے

عرصے میں ہندوستان میں لاکھوں علما، صلحا اور اتقیا گزرے، ان میں سے بیشتر حضرات ہندوستان کو دارالحرب ہی کہتے رہے، مگر اسی سرزمین میں رہے۔ یہیں نکاح بیاہ کیا، یہیں عمریں گزاریں اور اسی دارالحرب کی خاک میں وہ آرام فرما ہیں۔

آج ہمارا فرض ہے کہ ان بزرگوں کی سیرت سے سبق حاصل کریں اور جو امانت ان بزرگوں نے ہم جیسے ناکارہ اور کمزور انسانوں کے حوالے کی ہے، اس کو اگر ترقی نہ دے سکیں تو کم از کم اس کے محفوظ رکھنے میں اپنی عمریں صرف کر دیں۔ وفقنا اللہ لما یحب و یرضی۔

حواشی:

(۱) عمل سے مراد ہے عمل نیک اور منشا یہ ہے کہ وہ عمل جو شرعاً نیک اور اچھے ہیں ان پر ثواب جب ملے گا جب کہ نیت درست ہو۔ ورنہ اگر نماز جیسی کار خیر کا مقصد نمائش ہو، صدقہ خیرات اس لیے کیا جائے کہ الیکشن میں ووٹ مل جائیں گے تو ان اعمال نیک پر بھی ثواب کی توقع عبث ہے۔ جیسا کہ دوسری احادیث میں صراحت ہے: وکما قال اللہ تعالیٰ: "ویل للمصلین الذین ھم عن صلوتھم ساھون الذین ھم یراؤن"۔ باقی رہے اعمال بد: مثلاً شراب نوشی، چوری، زنا، داڑھی منڈانا وغیرہ تو ان میں ثواب کی اہلیت ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ان میں اگر کسی طرح کے ثواب کی نیت بھی کی جائے تو معاذاللہ شریعت غرا کے ساتھ تمسخر ہوگا۔ صرف یہ ہوگا کہ حالت اضطرار میں گناہ نظر انداز کر دیا جائے گا۔ کمال قال اللہ تعالیٰ: "الا ما اضطررتم الیہ"۔ (محمد میاں)

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اگر مسلمان دارالحرب میں رہ کر فرائض ادا کر سکتا ہے تو اس پر ہجرت فرض نہیں ہے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز سورۂ نساء کی مذکورۂ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "اس سے معلوم ہوا کہ جس ملک میں مسلمان کھلا نہ رہ سکے، وہاں سے ہجرت فرض ہے (محمد میاں)۔

(۳) دو باتیں یہاں تک ذکر کر دی گئیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اگر وہ جنگ کے لیے آمادہ ہوں تو تم خدا سے مدد مانگو اور جنگ کا جواب جنگ سے دو، لیکن اگر وہ ماتحتی قبول کر لیں تو جنگ ختم کر دو۔ (محمد میاں)

استدراک:

ایک شبہ اور اس کا جواب

رسالہ "دارالعلوم" میں حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیت علمائے ہند کا
ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا، جس میں ممدوح نے ہند یونین کی شرعی حیثیت اور ترکِ
وطن کے مسئلے پر خامہ فرسائی کی تھی۔ مولانا نے خود بھی اس مضمون میں لکھا تھا اور احقر مدیر
نے اپنے اداریے میں خاص طور پر عرض کیا تھا کہ اس موضوع پر یہ کوئی آخری فیصلہ نہیں،
بلکہ یہ مسئلہ دوسرے علما کے اظہار خیال اور رائے زنی کا محتاج ہے۔ گویا مضمون نگار اور مدیر نے
اپنی رائے کو دوسروں پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بڑی دیر کے بعد ہمارے ایک
دوست اور رسالہ "دارالعلوم" کے قدر دان مولانا عبدالشکور صاحب ترمذی نے ساہی وال
ضلع سرگودھا سے ہمیں خط لکھا اور اس مضمون کے بارے میں اپنی یہ رائے ظاہر کی:

> "مسئلۂ علمیہ کے طور پر قربانی کی بحث میں مجدد صاحبؒ کے مکتوب کا حوالہ دینے
> کے بعد جو صاحبِ مضمون نے اپنی رائے سے تطبیق دی ہے، میرا قلب اس سے بہت
> متوحش ہے اور صاف بے تکلف بات یہ ہے کہ مصنف مضمون کی رائے مجدد صاحب کی
> رائے سے قطعاً متصادم ہے۔"

ترمذی صاحب نے اس رائے کے ساتھ ہم سے فرمائش کی کہ مخصوص حالات کے
پیشِ نظر مصلحت وقت کے خلاف نہ ہو تو پھر صاحب مضمون سے اس کی مناسب توضیح
کرنے کی درخواست کی جائی ضروری ہے اور چوں کہ اس موضوع پر اظہارِ خیال سے ہمارے

لیے مصالح وتقیہ مانع نہیں، اس علیے ہم نے حضرت مولانا کی خدمت میں ترمذی صاحب کا خط پیش کیا۔ مولانا نے جواب میں خاکسار مدیر کو جو تحریر بھیجی ہے وہ حاضر خدمت ہے۔ موضوع اپنی اہمیت کے لحاظ سے اب بھی دوسرے حضرات کے غور و فکر کا محتاج ہے"۔

(سیّد محمد ازہر شاہ قیصر)

محترم المکرّم جناب شاہ صاحب دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی

گرامی نامہ کے ساتھ جناب مولانا سید عبدالشکور صاحب ترمذی کے مکتوب گرامی سے بھی مشرف ہوا۔ فرصت واقعی مفقود ہے۔ حتیٰ کہ یہ سطور بھی ٹرین میں لکھ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ لکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ جو حضرات ان مسائل کی طرف توجہ ہی نہیں فرماتے، یا اپنی ایک راے قایم کر چکے ہیں، اس میں کسی ترمیم کو برداشت نہیں کر سکتے، ان کے لیے اگر کچھ لکھا جائے تو کیا فائدہ؟

احقر نے اس مضمون کے آغاز ہی میں بھی لکھ دیا تھا اور پھر آپ نے بھی اداریے میں وضاحت کر دی تھی کہ یہ تمام مضمون فیصلہ نہیں، بلکہ اس کو استفسار خیال کیا جائے۔ خیال تھا کہ کچھ علماے کرام اس کے متعلق موافق یا مخالف راے ظاہر فرمائیں گے اور اس طرح یہ مسئلہ منقح ہو جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ خیال خام ثابت ہوا۔ گویا کسی نے التفات بھی نہیں فرمایا۔ اگر سوال کیا گیا تو صرف "ذبیحۂ گاؤ" کے بارے میں۔ مولانا ترمذی کا ارشاد بھی اس کے متعلق صادر ہوا ہے۔ اور اسی سلسلے میں ایک اور بزرگ کا بھی ایک مکتوب موصول ہوا تھا۔ یہ ضلع مظفر گڑھ کے باشندے ہیں۔ احقر نے ان کو بہت دنوں کے بعد جواب دیا تھا، کیوں کہ اس میں بیان القرآن کا حوالہ تھا اور کچھ ایسا اتفاق ہوتا رہا کہ جب وہ خط جواب کے لیے سامنے آتا تھا تو بیان القرآن موجود نہیں ہوتی تھی۔

بہر حال جواب لکھ کر میں نے یہ عرض کیا تھا کہ مناسب خیال فرمائیں تو "دارالعلوم" میں اشاعت کے لیے بھیج دیں، مگر پھر وہ بھی خاموش ہو گئے۔

ترمذی صاحب تحریر فرماتے ہیں :

"بعض جگہ مجھے اس میں کوفت ہوتی رہی، مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے مخصوص حالات کی بناپر ایسے امور میں رائے زنی کرنا مناسب نہیں"۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ مخصوص حالات کی بنا پر ترمذی صاحب کو رائے زنی سے کیا چیز مانع ہے۔ اگر اظہارِ رائے میں کچھ رکاوٹ ہو سکتی ہے تو ہمیں ہو سکتی ہے۔ مگر جب ہم اپنی رائے صاف صاف ظاہر کرتے ہیں، بفضلہ تعالیٰ کبھی تامل نہیں کرتے تو ترمذی صاحب کو کیوں تامل ہے ؟

بہر حال اس تمام مضمون کے بنیادی نقطے دو ہیں :

۱۔ ہندیونین کی حیثیت، شرعی نقطۂ نظر سے اور

۲۔ ترکِ وطن کی حیثیت۔

باقی جو کچھ بھی ہے انھیں دو مسئلوں پر کھل کر رائے ظاہر کریں، تاکہ اپنی رائے کے خطاو صواب ہونے کا اندازہ ہو۔

شعائر کے اقسام و صور :

باقی حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی عظمت و جلالت کے سامنے اس ناکارہ کی حقیقت کیا ہے کہ کچھ لکھ سکے یا کہہ سکے۔ لیکن یہ بات یقیناً غور طلب ہے کہ ذبیحۂ گاؤ کے شعار ہونے کے کیا معنی ہیں ؟ اس کا منشا تصادم نہیں بلکہ تفہم ہے۔ یعنی معارضہ مقصود نہیں، بلکہ سمجھنا مقصود ہے۔ کیوں کہ واقعۂ شعار کی متعدد صور تیں ہوتی ہیں اور ان صورتوں کے پیش نظر حضرت مجدد صاحب کا فتویٰ غور طلب بن گیا ہے۔

انفرادی شعائر :

خیال فرمایئے کوئی شعار ایسا ہوتا ہے کہ اس کا تعلق افراد سے ہوتا ہے۔ مثلاً ڈاڑھی

رکھنا ایک شعار ہے۔ اس کی ادائیگی ہر ایک مسلمان پر لازم ہے، یا حج کے موقع پر ارشاد ہوا ہے: "والبدن جعلناها لکم من شعائر الله لکم فیها خیر (۱) (سورۃ حج) اس شعار کی ادائیگی انفرادی طور پر لازم ہوتی ہے۔ علی ہذا القیاس

جماعتی شعائر:

قربانی شعار اسلام ہے۔ ہر صاحبِ نصاب پر اس کی ادائیگی انفرادی طور سے لازم ہوتی ہے اور کچھ شعار ایسے ہوتے ہیں جو انفرادی طور پر نہیں، بلکہ جماعتی طور پر پوری جماعت پر لازم ہوتے ہیں، مثلاً: اقامۃ الحدود یا عیدین و جمعہ قایم کرنا یا قاضی مقرر کرنا وغیرہ۔ یہ بھی شعائرِ اسلام ہیں، یہ بھی فرض ہیں، یہ بھی واجب الادا ہیں، مگر یہ انفرادی واجبات و فرائض نہیں بلکہ جماعتی فرایض ہیں۔ چناں چہ جب تک جماعت نہ ہو، یہ فرض فرد پر عائد بھی نہیں، ہوتے۔ اسی طرح شہریت وغیرہ کی وہ شرطیں ہیں جو وجود کے لیے ضروری ہیں، کیوں کہ ان کا تعلق مسلمانوں سے جماعتی طور پر ہے، انفرادی طور پر نہیں ہے۔

جماعتی شعائر...... مزید صورتیں:

پھر جو شعائر جماعتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی بھی مزید صورتیں ہیں:

۱۔ کچھ ایسے شعار ہیں جن کا منشا اظہارِ شوکت و حشمت ہوتا ہے۔ ترهبون به عدو الله وعدو کم۔

۲۔ کچھ شعار ایسے ہوتے ہیں جن کا منشا ذکر الله ہوتا ہے فاسعوا الی ذکر الله۔ ولکل امه جعلنا منسکاً لیذکروا اسم الله۔

۳۔ کچھ شعار ایسے ہوتے ہیں جن کا منشا کبت العدو اور اغاظة الکفار ہوتا ہے۔ وہ شعار جن کا منشا کبت العدو اور اغاظة الکفار ہو، وہ جنگ کے وقت عمل میں لایا جاتا ہے۔ جنگ کے بعد جب امن دے دیا گیا یا صلح ہو گئی اور آپ نے طے کر لیا کہ وہ یعنی غیر

مسلم، اپنے عقیدے، مذہب اور عبادت کے بارے میں آزاد ہیں۔ مزید براں فقہا کی تصریحات کے مطابق ان کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت آپ کے ذمے فرض ہو گئی، تو اب اس شعار کے اظہار کا موقع نہیں رہا، جس کا مقصد کبت العدو اور اغاظۃ الکفار ہے۔ اور اگر صورت یہ ہو جائے کہ ہندیونین کی طرح کوئی ملک دارالاسلام بھی نہ رہے تو جب شوکت و حشمت بھی نہ رہے گی۔ تو ظاہر ہے کہ قسم اول کے شعائر مثلاً اقامۃ الحدود بھی نہ رہے گی، تو ظاہر ہے کہ قسم اوّل کے شعائر مثلاً :اقامۃ الحدود بھی فرض نہ ہوں گے۔اب صرف نمبر دوم کے شعائر جن کا منشا اور مقصد ذکر اللہ ہے واجب الادارہ جائیں گے۔

اب غور طلب یہ ہے کہ حضرت مجدد صاحب نے اگر ذبیحۂ گاؤ کو شعار قرار دیا ہے تو وہ کس قسم کا شعار ہے ؟

ظاہر ہے کہ اس کا منشا ذکر اللہ تو ہے نہیں۔ یہ تو ان دو قسموں میں سے ایک ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ جب وہ حالات موجود نہیں تو اب اس کی شعاریت کا فتویٰ دینا ایسا ہی ہو گا جیسے ہندیونین میں ''اقامۃ الحدود'' کی فرضیت کا فتویٰ صادر کیا جائے۔

بے شک ترمذی صاحب پر فرض ہو گا کہ وہ پاکستان سے اقامۃ الحدود کا مطالبہ کریں اور اس کو یہ فرض یاد دلائیں۔ نیز اگر پاکستان ذبیحۂ گاؤ کی مخالفت کرے، تو اس کے سامنے حضرت مجدد صاحب'' کا فتویٰ پیش کر دیں، لیکن ہندیونین کے مسلمان ترمذی صاحب کے اس فتوے کے پابند نہیں ہوں گے۔ اور یہ ایک کھلی ہوئی چیز ہے۔ اس میں نہ کسی ابہام کی ضرورت ہے اور نہ کچھ ایسے حالات کا تقاضا ہے جن کا ذکر کرتے ہوئے ترمذی صاحب کو ہندیونین کے مسلمانوں پر ترس آئے۔ پھر آپ یہ بھی خیال فرمائیں کہ مجدد صاحب کے زمانے کا ہندوستان پاکستان سے مشابہ ہے یا ہندیونین سے ؟

ظاہر ہے کہ ہندیونین سے مشابہ نہیں، کیوں کہ یہاں وزیراعظم پنڈت نہرو ہیں اور صدر جمہوریہ راجندر پرشاد۔ ہاں پاکستان اور مجدد صاحب کے ہندوستان میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ اس وقت اکبر ذی اقتدار اور خود مختار بادشاہ تھا اور آج پاکستان کے گورنر جنرل غلام

محمد صاحب ہیں اور با اختیار وزیر اعظم خواجہ سر ناظم الدین۔

فتوے کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ حالات اور ماحول میں مطابقت باقی رہے۔ ایسا اختلاف نہ پیدا ہو جیسا کہ ہندیونین اور پاکستان میں کھلی آنکھوں نظر آرہا ہے۔

آخر میں اس کی وضاحت کر دوں کہ گفتگو خاص ذبیحۂ گاؤ اور قربانی گاؤ کے متعلق ہے۔ مطلق قربانی کے متعلق نہیں کہ "فاذکروا اسم اللہ علیہا صواف" پیش کر کے اعتراض کر دیا جائے۔

اور اگر ٹھیک تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ ذبیحۂ گاؤ "ھدم اصنام" کی طرح "کبت عدو" کی چیز تھی۔

محمود غزنوی نے "ھدم اصنام" میں نام پیدا کیا۔ اور بعد کے مسلمان بادشاہوں نے ذبیحۂ گاؤ کو بھی اسی فعل میں شامل کر لیا۔

چناں چہ جہانگیر تزک میں ایک موقع پر اپنی فوجوں کی فتح یابی کا ذکر کرتے ہوئے مکمل فتح یابی کی شہادت کے طور پر ان دونوں چیزوں کو بیان کرتا ہے۔

یہ بات علما کرام کے لیے غور طلب ہے کہ آنحضرت ﷺ اور سیرتِ صحابہؓ کے پیش نظر ان چیزوں کو کس درجے کا شعار قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور ان شعائر کے اظہار کا موقع کیا ہو سکتا ہے؟

(مولانا) سید محمد میاں

حاشیہ:

(۱) حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: "اور کعبے کے چڑھانے کے اونٹ ٹھہرائے ہیں ہم نے، تمہارے واسطے نشانی اللہ کے نام کی، تمہارا اس میں بھلا ہے"۔ (سورۂ حج، آیت ۳۶)

اس استدلال سے مولانا سید محمد میاںؒ کا اشارہ اس طرف ہے کہ پھر کیا اونٹ کی قربانی کا خلاف شرعاً قابل گرفت ہے؟ یا کسی دوسرے جانور کی قربانی خیر سے خالی ہوگی؟ پس اگر اونٹ کی قربانی کا ترک قابل اعتراض و گرفت نہیں تو ترک ذبیحۂ گاؤ کیوں کر قابل گرفت ہو سکتا ہے؟

(ا۔س۔ش)

ضمیمہ نمبر ۱

پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت

(از جناب مولانا سید محمد میاں صاحب مرادآبادی ناظم جمعیت علمائے ہند)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم نے "پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت اور اس میں غیر مسلموں کا درجہ و مقام" کے عنوان سے برہان (مئی ۱۹۵۰ء) میں ایک مقالہ لکھا تھا۔ اسے پڑھ کر مولانا سید محمد میاںؒ نے یہ خط لکھا تھا۔ مولانا اکبر آبادی نے یہ خط برہان میں شائع کرتے ہوئے لکھا تھا:

"مولانا کی علمی اور دینی بصیرت و تفقہ کسی تعارف کی محتاج نہیں، اس لیے اس خط میں جو چند نقاط زیرِ بحث لائے گئے ہیں وہ کافی غور طلب ہیں"۔

مولانا کا یہ تبرک جس میں کئی فکر انگیز نکتے ہیں(۱)، یہاں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

(ا۔ س۔ ش)

محترم مولانا! دامت فیوضکم و عمت

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج گرامی۔

جناب کا مضمون میں نے کل ہوائی جہاز کی فرصت میں مطالعہ کیا۔

محترم مولانا! آپ نے اس مضمون سے اہل علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ غور و فکر کی ایک سبیل معین کر دی۔ بہت سی جزئیات کے لیے ایک صحیح اصول پیش کر دیا۔

اسلامی حکومت کی تعریف کر کے در حقیقت نواب زادہ لیاقت علی خان اور ان کی پارٹی پر بھی بہت بڑا احسان ہو گیا۔ شاید یہ توجیہ ان کے سامنے بھی اس انداز سے نہ ہو گی۔ اسی

طرح ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا بھی جواب دیا جا سکتا ہے۔ تقسیم کے وقت اگر کوئی معاہدہ نہ بھی ہوا ہو تو نہرو لیاقت معاہدے نے اقلیت کے آئینی اور دستوری حقوق پاکستان پر لازم کر دیے۔ لیکن آپ کے مضمون کے مطالعے سے ایک شبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے اور میری طرح خیال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو ہوا ہوگا۔ آپ کے مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان حالتِ موجودہ اس بنا پر کہ جمعہ اور عیدین کی اجازت ہے اور مسلمانوں کی شہری اور قومی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے، دارالاسلام ہے۔ حالاں کہ جس عبارت سے آپ استدلال کر رہے ہیں، اس میں سخت حکم ولاۃ امور نا موجود ہے۔

اس فقرے کا جو ترجمہ آپ نے کیا ہے وہ بھی خلجان میں اضافہ ہی کر دیتا ہے۔ در مختار وغیرہ کی بہت سی عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے اور اکابر علما کے فیصلوں سے بھی یہ ہی ثابت ہے کہ جب تک مذہبی امور میں مسلمانوں کا بااختیار نظام نہ ہو، دارالاسلام نہیں ہے اور اگر کسی ملک میں یہ بااختیار نظام نہ ہو تو اس کا قایم کرنا ضروری ہے اور اسی بناء پر در مختار میں غالباً باب قضاء میں یہ ہے کہ مسلمانوں پر واجب ہوتا ہے کہ وہ اپنا ایسا امیر بنائیں جو جمعہ قائم کر سکے اور نکاح وغیرہ کے معاملات انجام دے سکے۔

حضرت مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تمام عمر اسی مسئلے کو پیش کرتے رہے اور جمعیت علمائے ہند کا مطالبۂ نظام قضاء جس کو غالباً کلچرل اٹانمی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، وہ بھی یہی ہے۔

علاوہ ازیں مسلمان حکام اور نمازوں کی آزادی انگریزی دور میں بھی تھی مگر اس زمانے میں علما نے ہندوستان کو دارالاسلام نہیں کہا۔ البتہ بھوپال اور حیدر آباد کو در مختار کی اس عبارت کے بموجب دارالاسلام تسلیم کرتے رہے۔

گویا دارالاسلام کے لیے یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، البتہ اگر کسی ملک میں مسلمانوں کے اندرونی معاملات ان کے وُلاۃِ امور نواب کے حوالے کر دیے گئے ہیں تو وہ دارالاسلام ہو جائے گا۔ اس جرح کے بعد موجودہ ہندوستان کی حیثیت کا

سوال پھر باقی رہ گیا، دارالحرب یقیناً نہیں ہے، کیوں کہ اقتدارِ اعلیٰ محارب نہیں۔ مکہ کی مثال بھی صادق نہیں آتی اور مدینہ طیبہ کے ابتدائی دور میں اگرچہ مسلمانوں اور یہودیوں کو ملا کر سیاسی وحدت قائم کر دی گئی تھی، مگر عدالتِ عالیہ، حضرت سرورِ کائنات ﷺ کا عدل و انصاف تھا۔ اور اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی کے سپرد تھا۔

حبشہ میں مسلمان مستامن تھے، پناہ گزین تھے۔ حبشہ کو وطن نہیں بنایا اور اس دورِ پناہ گزینی میں جو حبشہ نے امداد کی اس کے عوض میں مسلمانوں نے بھی جنگ میں شاہ حبشہ کی فوجوں کی امداد کی بموجب "هل جزاء الاحسان الا الاحسان"۔ لہٰذا حبشہ پر بھی ہندوستان کو قیاس نہیں کر سکتے۔

اب ایک اہم خدمت یہ ہے کہ آپ ہندوستان کی حیثیت معین کریں۔ کتب فقہ میں دو ہی "دار" کا تذکرہ آتا ہے، دارالاسلام اور دارالحرب۔ لیکن قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ "دار" اور بھی ہوں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خطبۂ صدارت جمعیت علمائے ہند میں غالباً "الدر المنتقی" کے حوالے سے ایک تیسرا دار بھی بیان فرمایا ہے، یعنی دارالامن۔ لیکن یہ کتاب مجھے ملی نہیں۔ اس کتاب کا صحیح نام تو خطبۂ صدارت سے معلوم ہو سکتا ہے (۲)۔ اگر جناب کے پاس نہ ہو تو احقر دہلی پہنچ کر لکھ دے گا، مگر بہر حال یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس کا فیصلہ کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ دو باتیں اور بھی عرض کر دوں۔ ان دونوں سے احقر کو مسرت ہوئی۔ کیوں کہ آج تک ان دونوں خیالات میں کسی کی تائید نہیں حاصل ہوئی تھی۔ آپ کی تحریر سے تائید حاصل ہو گئی۔

اوّل یہ کہ خلافتِ راشدہ خیر القرون سے اس لیے آگے نہیں بڑھ سکی کہ ایسے آدمی نہیں رہے تھے، احقر کا خیال بھی یہی ہے۔

بظاہر خلافتِ راشدہ کے لیے ضرورت ہے کہ اس کے تمام ذمہ دار تقویٰ اور عبادت کے تربیت یافتہ اور صاحبِ بصیرت و تفقہ ہوں۔

سید الانبیاء علیہ السلام کے فیض صحبت نے جن کی تربیت کی تھی ان کا ایسا دور جس میں اقتدارِ اعلیٰ ان کے ہاتھ میں ہوتا وہ کم وبیش تیس سال تک رہنے والا تھا۔

سید الانبیاء علیہ السلام کو یہ بات بھی منکشف ہو چکی تھی، آپ کے بعد دیانت وامانت کی ترقی نہ ہوگی، بلکہ تدریجی تنزل شروع ہو جائے گا۔ لہٰذا آپ کا یہ ارشاد کہ میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی پھر ملک عضوض شروع ہو جائے گا، ایک ایسی پیشین گوئی ہے جو طبعی حالات کے قیاس پر مبنی ہے۔

اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا یہ فیصلہ ہر ایک خلجان کو ختم کر دیتا ہے کہ قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت پر ختم ہو جاتے ہیں، البتہ حضرت شاہ صاحبؒ بے شمار احادیث کی روشنی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کو بھی خلافتِ راشدہ ہی قرار دیتے ہیں۔ البتہ خلافتِ راشدہ غیر منتظمہ اور حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات کے مطابق خیر القرون کے علی الترتیب یہ تین درجے ہوتے ہیں:

۱۔ دورِ نبوت۔

۲۔ خلافتِ راشدہ علی منہاج النبوت۔

۳۔ خلافت راشدہ منتظمہ: جو حضرت عثمانؓ کی خلافت پر ختم ہوتا ہے۔

لیکن آپ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دور کے بعد، امامت، خلافت یا دینی حکومت صحیح معنی میں کبھی قائم نہیں ہوئی۔ ابتدائی دور کے ساتھ تحدید پر مجھے شبہ ہے۔

دوسری بات جس سے مجھے اطمینان ہوا کہ آپ سے اس کی تائید حاصل ہوئی وہ یہ کہ ستی کی رسم جو مسلمان بادشاہوں کے دور میں جاری رہی تو اس کا سبب مسلم حکام کی بے پرواہی اور بے اعتدالی نہیں تھی، بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کے رسم و رواج میں مداخلت کبھی بھی گوارا نہیں کی، اگرچہ احقر کے خیال میں اصولاً ان کے لیے لازم تھا کہ وہ اس رسم کو بند کرتے، کیوں کہ یہ ایسا فعل ہے جو نہ صرف اسلام کی رو سے ناجائز ہے بلکہ

اقوامِ عالم کے مسلمات کے خلاف ہے اور جس طرح نکاح وغیرہ کے سلسلے میں آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی اجازت نہ ہوگی کہ مجوسی ماں یا حقیقی بہن سے شادی کر سکے، اسی طرح ستی کی رسم بھی تھی۔ تاہم اگر اس کو ختم نہیں کیا گیا تو اس کا باعث ان کا یہی تخیل تھا کہ ہندوؤں کی مذہبی آزادی میں کوئی مداخلت نہ ہونی چاہیے۔

میں نے کافی وقت لے لیا اور اپنا بھی اتنا ہی وقت صرف کر دیا مگر میرا خیال ہے کہ اس طویل تحریر میں جس تحقیق کی آپ سے درخواست کی ہے اگر وہ منظور ہوئی تو مجھے بھی فائدہ ہوگا اور عام مسلمانوں کو بھی۔ محترم مولانا عتیق الرحمن صاحب کی خدمت میں سلام پیش فرما دیجیے۔ بچوں کو دعا فرما دیجیے۔

(برہان، دہلی۔ جون ۱۹۵۰ء)

حواشی:

(۱) تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے "برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت" از مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری۔

(۲) شاہ صاحب سے حضرت انور شاہ صاحب علیہ الرحمہ مراد ہیں۔ کتاب کا نام شاہ صاحب نے "در منتق" ہی لکھا ہے۔ (ا۔س۔ش)

ضمیمہ نمبر ۲

ہندوستان کی حیثیت

مولانا سید محمد میاں

مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ نے "علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" حصہ اوّل میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مسلکِ سیاسی کی وضاحت کے سلسلے میں جو نہایت مفید بحث فرمائی ہے، اس میں چند سوالات کے جوابات میں ہندوستان کی شرعی حیثیت بھی موضوع بنی ہے۔ یہ بحث اگرچہ بہت مجمل ہے، لیکن بہت اہم ہے اور دیوبندی مکتبہ فکر کی انقلابی جماعت کے خیالات کی صحیح ترجمانی اس مختصر تحریر سے ہوتی ہے۔ یہ تحریر اسی کتاب سے مقتبس ہے۔ (ا۔ س۔ ش)

سوالات:

(۱) ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام؟

(۲) کیا انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی جدو جہد ضروری ہے؟

(۳) آزادیٔ وطن کی کیا صورت ہو؟

(۴) جانشینانِ ولی اللہ نے آزادی کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟

(۵) کیا وطنی مطالبات اور ملکی مفاد کے لیے ہندوؤں کے ساتھ کانگریس میں شرکت جائز ہے؟

جوابات :

نمبر ۱ : سو سال کامل گزر گئے، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ صاف اور صریح الفاظ میں دے چکے ہیں۔ جہاد کا لائحۂ عمل بنا چکے۔

تحریک حضرت سید صاحب کا تمام ہنگامہ برپا ہوا۔

ملت اسلامیہ کے ہزاروں عزیز نوجوان شہید ہوئے، سیکڑوں خاندانوں کے چراغ گل ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کا خونی معرکہ ہندوستان کے چپے چپے کو خونِ شہداء سے رنگین کر چکا، ہزاروں نوجوان توپوں کے لقمے بنا دیے گئے، لاکھوں درخت وحشت ناک پھانسیوں کا نظارہ دیکھ چکے۔

یہ سب کچھ ہو چکا مگر انگریزی فتنہ اور یوروپین دغل و فریب کا یہ اثر تھا کہ ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے متعلق اب بھی شبہ تھا۔

چناں چہ مولانا سعد الدین صاحب کشمیری اور مولانا امان اللہ صاحب کشمیری نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے متعلق حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز سے استفتا کیا۔

جس کے جواب میں حضرت امام ربانی نے نہایت مبسوط اور مدلل فتویٰ فارسی زبان میں تحریر فرمایا، جس کی اشاعت کانگریسی وزارتوں سے پہلے ناممکن رہی، اور جیسے ہی (۱۹۳۷ء میں) کانگریس وزارت قائم ہوئی تو بازار کی چلنے والی چیز تصور کر کے اس کو ایک ایسے بزرگ نے شائع فرمایا جن کا مسلک اس فتوے کے خلاف ہے (ا)۔ اور پھر آخر میں شمس الہدیٰ پٹنہ کے سابق پرنسپل نے ایک صفحے کا بے معنی فتویٰ لگا کر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا۔

امام ربانیؒ سات صفحے کی مفصل اور مدلل تحریر کے بعد بطورِ نتیجہ فرماتے ہیں :

"اکنوں حال ہند را خود غور فرمائند کہ اجرائے احکام کفار نصاریٰ دریں جا چہ قوت و غلبہ ہست۔ اگر ادنیٰ کلکٹر حکم کرد کہ در مساجد جماعت ادا مکنید۔ ہیچ کس از امیر و غریب قدرت ندارد کہ ادائے آں نماید"۔

اب ہندوستان کی حالت پر آپ خود غور فرمائیے کہ اس جگہ کفار و نصاریٰ کے احکام کا اجرا کس قوت اور غلبے کے ساتھ ہے۔ اگر ایک ادنیٰ کلکٹر حکم کر دے کہ مسجدوں میں جماعت نہ ادا کریں تو کسی بھی امیر یا غریب کی مجال نہیں رہتی کہ مسجد میں جماعت ادا کر سکے۔

چند سطور کے بعد فرماتے ہیں:

"بہر حال تسلط کفار بر ہند بداں درجہ است کہ در ہیچ وقت کفار دار حرب زیادہ ازیں نبود۔ وادائے مراسم اسلام از مسلمانانِ محض باجازت ایشاں است واز مسلمان عاجز ترین رعایا کے نیست ہنود راہم رسوخ ست مسلماناں رانیست"۔

بہر حال کفار کا تسلط ہندوستان پر اس درجہ ہے کہ کسی وقت بھی کفار کا کسی دارالحرب پر اس سے زیادہ غلبہ نہیں ہوتا اور جو اسلامی رسومات اور شعائر مسلمان یہاں ادا کرتے ہیں، وہ صرف ان کی اجازت سے۔ کوئی رعایا مسلمانوں سے زیادہ عاجز نہیں۔ ہندو کو بھی کسی قدر رسوخ حاصل ہے، مسلمانوں کو وہ بھی نہیں۔

نمبر ۲: ہندوستان جب کہ مسلمانوں کا ملک تھا (انگریزوں نے اس کو غصب کیا اور دارالحرب بنایا تو انگریزوں کو نکالنا لامحالہ فرض ہوا۔ جواب نمبر ۱ کے بعد اس پر بحث کی حاجت نہیں رہتی۔

نمبر ۳: یعنی آزادیٔ وطن یا انگریزوں کے اخراج کی کیا صورت ہو، بے شک یہ مسئلہ قابل غور تھا اور زمانے کی رفتار نے اس کو بہت زیادہ پیچیدہ بنا دیا تھا۔

صورت یہ ہے کہ جب تک ظاہری اسباب کی بنا پر اس درجہ قوت نہ ہو کہ فتح کی امید کی جا سکے، شرعی حیثیت سے اقدام کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

اٹھارھویں صدی کے آغاز تک سر فروشوں کی کثرت سامانِ فتح ہوا کرتی تھی، لیکن اب توپوں، رائفلوں وغیرہ جدید آلاتِ حرب نے نوجوانوں اور سر فروشوں کے بجائے آلاتِ حرب اور فراہمیٔ سرمایہ پر فتح و شکست کو منحصر کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں ہندوستانیوں سے آلاتِ حرب چھین کر ان کو فن سپہ گری سے قطعاً نابلد کر دیا گیا تھا۔

نمبر ۴ : لیکن ان تمام مایوس کن حالات کے ہوتے ہوئے ان حضرات نے ہمت نہ ہاری۔ ایک دوسرا نقشۂ جنگ تیار کیا گیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تنظیم کرتے ہوئے دیگر ممالک سے امداد حاصل کی جائے اور ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔

نمبر ۵ : پانچواں نمبر یہ کہ وطنی مطالبات اور ملکی ضروریات کے لیے کانگریس میں شریک ہونا جائز ہے یا نہیں؟

یہ وہ مسئلہ ہے جو ۱۸۸۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء تک طے نہیں ہو سکا اور جب تک انگریزی شہنشاہیت ہندوستان پر مسلط ہے ممکن نہیں کہ اس قسم کے مسئلے طے ہو سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ علما دیانت داری کے ساتھ عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، مگر اصولی غلطی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو یعنی دارالحرب کو دارالاسلام پر قیاس کیا کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی مقدس حیات انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فرماتی ہے۔

ہجرت کے بعد تک مکہ معظمہ دارالحرب رہا۔ آپ کی مقدس زندگی کا بیشتر حصہ اسی دارالحرب میں گزرا۔ ہندوستان کی سیاست پر بحث کرتے وقت سیرتِ مقدسہ کا یہی حصہ ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔

سیرتِ مقدسہ کی مبسوط اور مستند کتابوں پر عمیق نظر رکھنے والے حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ قریش کی اندرونی رقابت نے کس طرح ظہورِ اسلام کے وقت قریش کو دو گروہ میں منقسم کر دیا تھا، جن میں سے ایک گروہ جس کے لیڈر ابو طالب تھے حضور ﷺ کے ساتھ رہا، حالاں کہ اس کے بہت سے افراد آخر تک مسلمان نہیں ہوئے۔ کیا یہ غلط ہے کہ انگریز کے مقابلے پر مسلمانانِ ہند کا ہندوؤں سے تعلق وہی نوعیت رکھتا ہے جو مسلمانانِ مکہ کا قریش کے اس گروہ کے ساتھ تھا۔

کیا رسول اللہ ﷺ ابو طالب کی پناہ میں نہیں تھے، کیا صدیق اکبرؓ نے ابن دغنہ کی پناہ نہیں لی اور کیا رسول اللہ ﷺ ابو طالب کی وفات کے بعد مطعم بن عدی کی پناہ میں نہیں

آئے ؟ کیا اس عرصے کے لیے قرآنِ پاک کے یہ احکام نہ تھے ؟

(الف) "تبع ما اوحی الیك من ربك لا اله الا هو و عرض عن المشركين"۔

"تم اس وحی کی پیروی کرو جو تم پر تمھارے رب کی جانب سے نازل کی جا رہی ہے۔

اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں اور مشرکین سے اعراض کرتے رہو"۔

(ب) اعراض کی تفسیر دوسری آیت میں وارد ہوئی۔

"دع اذاهم و توكل على الله"۔

"ان کی ایذا رسانی سے قطع نظر کرو اور اللہ پر بھروسا رکھو"۔

"كفوا ايديكم و اقيموا الصلوة"۔

"اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز کی پابندی کرو"۔

"لكم دينكم ولى دين"۔

"تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین"۔

اور کیا یہ غلط ہے کہ دار الحرب کے لیے یہ تعلیمات آج تک بدستور قائم ہیں، منسوخ نہیں ہوئیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (حجۃ اللہ البالغہ) باب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، تفسیر اتقان، سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد وغیرہ۔ مزید توضیحات کے لیے ملاحظہ ہو: رسالہ جواز شرکت کانگریس وازالۂ شکوک۔

بہر حال دلائل کچھ بھی ہوں ہمیں اس وقت امام ربانی کا فتویٰ پیش کرنا ہے۔ دلائل پر بحث کرنا موضوعِ کلام سے خارج ہے۔

حاشیہ:

(۱) اشارہ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی کی طرف ہے، جنھوں نے اس کا نہایت خوب صورت ترجمہ کر کے "فیصلة الأعلام فی دار الحرب و دار الاسلام" کے نام ۱۳۵۳ھ میں دیوبند سے شائع کیا تھا۔ یہ مکمل ترجمہ "برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت" مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری میں شامل ہے۔

ہندوستانی سیاست اور علمائے ہند

۱۸۵۷ء کے بعد!

مؤلفہ

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

ہندوستانی سیاست اور علماے ہند

۱۸۵۷ء کے بعد!

فہرست	صفحہ
حرفے چند — ڈاکٹر ابو سلیمان شاہ جہان پوری	۲۲۷
تمہید — مولانا سید محمد میاںؒ	۲۳۱
باب اول:	
انڈین نیشنل کانگریس کا قیام --- اور اس کے مقاصد	۲۳۳
باب دوم:	
اختلافات کی تخم ریزی	۲۳۵
فرقہ وارانہ سیاست	۲۳۵
زبان کا مسئلہ	۲۳۷
اکثریت سے خوف اور بدگمانی	۲۳۷
جداگانہ انتخاب	۲۳۸
باب سوم:	
مسلم لیگ کا قیام --- اور اس کے مقاصد و مصالح	۲۴۰
علما کی دارو گیر	۲۴۲
باب چہارم:	
مسئلۂ تعلیم	۲۴۴
مسلمانوں کی تعلیم اور انگریزی حکومت کی پالیسی	۲۴۶
سر سید مرحوم کی بعض خدمات	۲۴۶
باب پنجم:	
تحریک شیخ الہند کی ایک جھلک	۲۴۹
علامہ شبلی نعمانی	۲۴۹
جمعیت الانصار کا قیام	۲۵۱
بیسویں صدی کی پہلی دھائی	۲۵۴

فہرست	صفحہ
ضمیمے:	

حرفِ چند

حضرت مورخِ ملت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کے ''مقالاتِ سیاسیہ'' کو چھ مجموعوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس کا تیسرا مجموعہ صرف ایک ہی رسالے پر مشتمل ہے، لیکن اس کے ساتھ شامل نہایت فکر انگیز اور پُر معنی پانچ ضمیموں نے اسے نادر افکار کا ایک یادگار دستہ بنا دیا ہے۔

مولانا کا یہ رسالہ ان کی زندگی کی آخری تحریروں میں سے ایک یادگار تحریر ہے۔ یہ تحریر انھوں نے ۱۹ر شوال ۱۳۹۴ھ/ ۵ر نومبر ۱۹۷۴ء کو مرتب کی تھی۔ اس کے ایک سال بعد ۱۶ر شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ان کا انتقال ہوا تھا۔

اس رسالے کا نام اس طرح تھا:

تاریخ علمائے ہند کا ایک باب

از ۱۸۵۷ء تا ۱۹۷۵ء

مسلم علماء کا کردار

از مولانا سیّد میاں صاحب

لیکن آغازِ رسالہ پر یہ نام اس طرح نمایاں ہوا تھا:

دورِ جدید کی ہندوستانی سیاست میں

مسلم علماء کا کردار

کتب و رسایل کے ناموں کا یہ بھی ایک انداز ہے اور اسے پسند کرنے والے بھی بہت لوگ ہوں گے لیکن اب ذوق بدل گیا ہے۔ یہ سوچ کر اس کا نام اس طرح کر دیا گیا ہے:

ہندوستانی سیاست اور علمائے ہند

۱۸۵۷ء کے بعد!

اس رسالے کے موضوع کا دورانیہ بہت طویل ہے۔ یعنی ''۱۸۵۷ء تا ۱۹۷۴ء'' گویا کہ مورخِ ملّت مرحوم نے جس عہد کی سیاست اور اس کے مسلمان رجالِ کار کے افکار و خدمات کے تذکرے کے نوے برس کی تاریخ ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' دو جلدوں کے ایک ہزار صفحے میں تالیف کی تھی اور جنوری ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کے سانحۂ قتل اور اس کے ردِ عمل کے تذکرے پر ختم کی تھی اسی دور کے ایک سو سترہ برس کی تاریخ کو اس رسالے کے اٹھاون صفحے میں سمو دیا تھا۔ سمندر کو کوزے میں بھرنے کی مثل پڑھی تھی۔ اس کی مثال یہاں نظر آ گئی، لیکن اس تاریخی رسالے کی آخری بحث ہندوستان کے سیکولر دستور کے نفاذ کا واقعہ ہے اس لیے سمجھ لینا چاہیے کہ کتاب کے مباحث کی آخری حد ۱۹۵۰ء قرار پاتی ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان کا سیکولر دستور جنوری ۱۹۵۰ء میں نافذ ہوا تھا اور اس کے تحت ۱۹۵۳ء میں آزاد ہندوستان کے پہلے انتخابات کا انعقاد ہوا تھا۔

اس رسالے کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۵۰ء تک کی تاریخ کو مورخِ ملّت نے کس جامعیت سے تالیف کیا ہوگا۔ حضرت مرحوم نے اس میں یہ طریقہ استعمال کیا ہے کہ پہلے انھوں نے اس عہد کے اہم واقعات کو چن کر ان کی روح کشید کر لی ہے اور ان میں ربط قایم کر دیا ہے۔ مثلاً حضرت موصوفؒ نے ۱۸۵۷ء کے بعد ایک طرف تو کانگریس (۱۸۸۵ء)، مسلم لیگ (۱۹۰۶ء) اور جمعیت علمائے (۱۹۱۹ء) کے قیام و مقاصد کے تذکرے کو چن لیا ہے کہ خالص سیاسی جدوجہد کے یہ سنگ میل ہیں۔ چوں کہ جمعیت کے قیام و مقاصد کی تاریخ کا سرا دارالعلوم دیوبند کے قیام و مقاصد کی تاریخ سے جڑا ہوا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک اور اس کے اطراف کا تذکرہ آ گیا ہے۔ اس سلسلے کو تحریک خلافت اور ترکِ موالات کے دور سے گزر کے جمعیت کی مکمل آزادی کی تجویز (۱۹۲۶ء) سول نافرمانی (۱۹۳۰ء) اور ہندوستان چھوڑ دو تحریک (۱۹۴۲ء) کے نتائج اور فرقہ واریت اور دو قومی نظریے کی فتنہ سامانیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے جنگِ آزادی کے آخری معرکۂ کارزار تک پہنچ گئے ہیں۔ اس مقام تک پہنچ کر نا گزیر تھا

کہ ملک کی تقسیم کی ہلاکت خیزیوں اور تبادلۂ آبادی کی محشر سامانیوں کا ذکر نہ آجاتا۔

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے زمانے میں اہلِ وطن پر جو قیامت ٹوٹی تھی اس میں اگر شیخ الاسلامؒ اور امام الہندؒ کی عزیمتوں اور بے مثال خدمات کا تذکرہ نہ کیا گیا ہوتا تو قصور واقع ہوتا۔ اس سلسلے میں دونوں رہنماؤں کی کوششوں کو خاص طور پر سراہا گیا ہے جوانھوں نے ملک کو فرقہ واریت کے جہنم سے نکالنے اور سیکولر جمہوریت کے قیام کے لیے انجام دی تھیں۔ دستور سازی کی سطح پر ان دونوں بزرگوں نے جو کارنامہ انجام دیا تھا اس کا شاید ابھی صحیح جائزہ نہیں لیا گیا ہے اور نہ ان کی عظیم الشان خدمات کا صحیح اعتراف کیا گیا ہے۔ لیکن اب وہ وقت دور نہیں کہ ان کی خدمات کو واقعی خراجِ تحسین پیش کیا جائے۔ اس رسالے میں محترم مورخِ ملّتؒ نے علماے ہند کے خالص ملّی نقطۂ نظر سے ان کے تاریخی سیاسی کردار پر نظر ڈالی ہے۔

رسالے میں ابواب کے قیام کا اہتمام نہ تھا، لیکن اب دیکھیں گے کہ ابواب کے قیام سے مطالب کا حسن نکھر گیا ہے۔ اور ضمیموں کی شمولیت نے اس کے مطالب کی بنیادوں کو مستحکم کردیا ہے۔

یہ رسالہ اپنی تاریخی اہمیت سے اس لائق ہے کہ اسے ''علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' (حصۂ دوم) کے آخر میں ''مسلم تاریخ سیاست وافکار پر ایک سرسری نظر'' کے عنوان سے شامل کرلیا جائے۔

ہمیں خوشی ہے کہ حضرت مورخِ ملّتؒ کا یہ اہم تاریخی رسالہ بھی ان کے ''مقالاتِ سیاسیہ'' میں مدون کردیا گیا۔ والحمدللہ

خاک سار

ابوسلمان شاہ جہان پوری

ہندوستانی سیاست میں علمائے ہند کا کردار

(۱۸۵۷ء کے بعد!)

تمہید:

"دورِ جدید کی ہندوستانی سیاست میں مسلم علما کا کردار ۱۸۵۷ء کے بعد"

یہ ایک سوال ہے ----- پیش دست صفحات میں اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

ترتیب جواب کے لیے یہ تجزیہ ضروری ہے:

(الف) ہندوستانی سیاست اندرونِ ملک

(ب) ہندوستانی سیاست بیرونِ ملک

فرقہ وارانہ جماعتیں اگرچہ اب تک حکمراں نہیں بن سکیں، مگر ان کو سیاست سے خارج نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا اندرونِ ملک ہندوستانی سیاست کے بھی دو حصے ہو گئے:

۱۔ فرقہ وارانہ

۲۔ غیر فرقہ وارانہ (سیکولر)

دورِ جدید سے مراد ہم وہ دور لیتے ہیں جب سے انڈین نیشنل کانگریس نے نظریات کی اسٹیج سے آگے بڑھ کر میدانِ عمل کا رخ کیا اور گاندھی جی کو اپنا قائد مانا۔ لہٰذا اس سے پہلے کی تحریکات مثلاً:

۱۔ حضرت سید احمد شہید اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ کی تحریک جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے مسلح جہاد کی تحریک تھی۔

۲۔ پھر ۱۸۵۷ء کی مشترک جنگِ آزادی، جس کے نتیجے میں کمپنی کی حکومت ختم ہوئی اور ہندوستان کا تعلق براہِ راست تاجِ برطانیہ سے ہوا۔

۳۔ اس کے بعد علماے صادق پور کی تحریک جو سید صاحب کی تحریک کا دورِ ثانی تھا۔

۴۔ کانگریس میدانِ سیاست میں۔

۵۔ اس کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تحریک جس کا آغاز جمعیت الانصار کے قیام (۱۹۰۹ء) سے ہوا، جو ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اور حکیم اجمل خاں صاحب، ڈاکٹر مختار احمد انصاری (عرف ڈاکٹر انصاری)، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، خان عبدالغفار خاں، یعنی وہ مسلم رہنما جو کانگریس کی اسٹیج پر صفِ اول کے رہنما مانے گئے، اس سے تعلق رکھتے تھے اور مولانا عبیداللہ سندھی اس جمعیت الانصار کے مشہور قائد تھے۔

ان تحریکات میں کام کرنے والے حضرات کی سرگرمیاں اور قربانیاں خواہ کتنی ہی عظیم اور قابلِ قدر ہوں، مگر ان کا تعلق ہمارے قائم کردہ دورِ جدید سے نہیں ہے۔ لہٰذا یہ مضمون ان تحریکات کے تذکرے کا شرف نہیں حاصل کر سکے گا۔ البتہ کانگریس کی ابتدا اور اس کے نصب العین کی وضاحت ضروری ہوگی اور فرقہ وارانہ سیاست نے جس طرح اس کے خدوخال اُبھارے، انگریزوں کی مخالفانہ ڈپلومیسی نے جس طرح اس کے حُسن کو نکھارا اور حضرات علما نے جس طرح اس کی بکھری ہوئی زلفوں کو سنوارا اس کا ذکر بھی ضروری ہوگا، تاکہ ہندوستانی سیاست کی صحیح تصویر سامنے آسکے اور علما کے کردار اور رول پر روشنی پڑ سکے۔

مولانا سید محمد میاں

باب اول:

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام
اور اس کے مقاصد

عجیب بات ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کا سنگِ بنیاد انگریزوں نے رکھا، پھر اسی جنس کے اصحابِ اقتدار نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے فرقہ واریت کے پودے اگائے اور ان کی آبیاری کی۔ جو جذبات ۱۸۵۷ء میں ابھرے تھے ان کو بہت کچلا گیا۔ ان کو کچلنے کے لیے درندوں سے درندگی، پہاڑوں کی چٹانوں سے سخت دلی اور طوفانوں اور زلزلوں سے تباہ کاری بھی مانگ لی گئی اور حددرجہ بہیمانہ بلکہ سفاکانہ جوش و خروش سے ان کا مظاہرہ کیا گیا، جس کی مثال تاریخ میں شاذونادر ہی ہے۔ اس مظاہرے کی وحشت انگیزیاں اگرچہ ستم رسیدہ دلوں کے احساسات کو ختم کرنے میں پھر بھی ناکام ہی رہیں، مگر یہ کامیابی ان کو ضرور حاصل ہو گئی کہ بولنے والوں کی زبانوں پر تالے پڑ گئے اور نعرۂ حریت تو کیا اتنی ہمت بھی نہ رہی کہ کراہنے کی آواز زور سے نکال سکیں۔ دس بارہ سال کا دور اسی حالت میں گزر گیا کہ ہندوستان کی سیاسی سطح پر وحشت آمیز جمود طاری تھا۔

وائسرائے ہند اپنی رائے یا بہت سے بہت اپنے نامزد مشیروں کے مشورے سے جو کچھ چاہتے، کرتے تھے، نہ کوئی مخالف پارٹی تھی نہ کوئی نکتہ چیں جماعت!

اس طرح کی خاموشی جو مُردنی کی مرادف تھی، اگرچہ اقتدار پسند انگریزوں کے لیے

باعثِ مسرت تھی، لیکن مدبّرین برطانیہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔

۱۸۷۲ء میں بنگال میں "انڈین ایسوسی ایشن" اور ۱۸۸۴ء میں مدراس میں "مہاجن سبھا" قائم ہوئی۔ ان انجمنوں کے قیام نے اور اس کے علاوہ علاقۂ بمبئی میں لوکمانیہ تلک کے اخبار "کیسری" نے جو جرأت مندانہ روش اختیار کی، اس نے بھی مدبرینِ برطانیہ کو سوچنے پر مجبور کیا۔ چناں چہ تقریباً ۱۸۸۴ء میں وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن نے اپنے دوست مسٹر ہیوم کو مشورہ دیا:

"حاکم و محکوم دونوں کے لیے یہ مفید معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیاست داں اصحاب سالانہ جمع ہو کر گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ اس کا نظام کن امور میں ناقص ہے اور اس کی حالت کس طرح بہتر کی جا سکتی ہے"۔

وہ انجمن جس نے انڈین نیشنل کانگریس کا لقب اختیار کیا اسی مشورے کی عملی شکل تھی، جس کا پہلا اجلاس ۱۸۸۵ء میں پونا میں ہوا اور اس کی سب سے پہلی تجویز میں قیامِ کانگریس کا مقصد یہ طے کیا گیا:

۱۔ ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے، ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔

۲۔ اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو، اس کی دماغی، اخلاقی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔ (اہلِ ہند کا قومی ارتقا، از اے۔ سی مزمدار، بحوالہ روشن مستقبل، صفحہ ۳۵۲)

لارڈ ڈفرن اگرچہ قیامِ کانگریس کے محرک تھے مگر عجیب بات یہ ہے کہ کانگریس نے جو مقصد تجویز کیا وہ ان کے منشاء سے ہٹا ہوا تھا۔ لارڈ ڈفرن ایسی جماعت چاہتے تھے جو اقتدارِ برطانیہ کے لیے خیر اندیش ہو اور اسی جذبے کے ساتھ وہ کارپردازانِ حکومت کو ان کی غلطیوں سے آگاہ کرے، لیکن کانگریس نے جو ایک قوم بنانے کا منصوبہ طے کیا، وہ برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کے لیے خطرۂ عظیم تھا، کیوں کہ یہ ہندوستانی قوم جس کی دماغی، اخلاقی اور سیاسی صلاحیتیں دوبارہ زندہ ہوں گی، وہ کسی وقت اقتدارِ اعلیٰ کو چیلنج بھی کر سکے گی، جس کے نتیجے میں انقلاب بھی ہو سکے گا۔

باب دوم:

اختلافات کی تخم ریزی

کسی قانونی اور آئینی وجہ کے بغیر کانگریس کو ختم کرنا مشکل تھا، البتہ یہ کوشش شروع کر دی گئی کہ اس کے نقصان دہ اثرات سے انگریزوں کی حکومت محفوظ رہے۔ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی وہ تھی جس پر ہندوستان میں انگریزی سامراج کی پوری عمارت قائم تھی۔ اس پالیسی کو زندہ رکھنے کے لیے ایک لائحۂ عمل تجویز کیا گیا۔ آپس کے بلوے اور فسادات حکومت کے لیے باعثِ بدنامی ہوتے اور وہ حکومت کے لیے مشکلات بھی پیدا کر سکتے تھے اور ان کے اثرات بھی عارضی ہوتے۔ لہٰذا ایسے تخم تلاش کیے گئے، جن کے پودے نفرت آمیز ہوں اور ان کے پھل تفرقہ انگیز، جو متحدہ قومیت کے تصور کے لیے بھی بارود کا کام کرتے رہیں۔

(۱): پہلا تخم ---- فرقہ وارانہ سیاست:

یہ بیج کیا کیا تھے؟ ان کی تفصیل بہت طویل ہے۔ صرف چند عنوانات پیش کیے جاتے ہیں:

پہلا مسئلہ شرکت کانگریس کے جواز اور عدم جواز کا تھا۔

کانگریس کے آغاز کو دو ہی سال گزرے تھے کہ ۱۸۸۸ء میں سر سید مرحوم کی زیرِ قیادت ''مسلم ایسوسی ایشن'' قائم کی گئی اور شرکتِ کانگریس کے متعلق علما سے فتویٰ طلب کیا

گیا۔ "مسلم ایسوسی ایشن" کو کامیاب بنانے کے لیے جارحانہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔ استفتاء یعنی سوال کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے، اور جارحانہ طرزِ عمل کا اندازہ فرمالیجیے۔ استفتاء کے الفاظ یہ ہیں:

"جو شخص ایسوسی ایشن میں شامل ہونا نہیں چاہتا اس کے ساتھ طرح طرح کا فساد اور فتنہ برپا کر کے اس کو جبراً لانا چاہتے ہیں"۔

یہ تخم تھا جس کا پوذا مسلم لیگ اور پھل تقسیم ہند کی شکل میں سامنے آیا۔

بے شک کچھ علما سرسید مرحوم کے حامی بھی تھے، لیکن علما کی غیر معمولی اکثریت خصوصاً وہ علما جن کو بہ حیثیت عالمِ دین و مفتی شرع متین مسلمانانِ ہند کا اعتماد حاصل تھا، انھوں نے شرکت کانگریس کے جواز کا فتویٰ صادر کیا اور "مسلم ایسوسی ایشن" اور اس کے طریق کار کو غلط قرار دیتے ہوئے اس کے بانیوں کے متعلق نہایت سخت رائے ظاہر کی۔ اس فتوے پر سو سے زیادہ علما کے دستخط ہیں، جس کو لدھیانہ کے علما نے پمفلٹ کی شکل میں "نصرۃ الابرار" کے نام سے اس وقت بھی شائع کیا اور پھر برابر شائع کیا جاتا رہا۔

علمائے محققین کے سربراہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ نے جو جواب لکھا تھا اور جو نصرۃ الابرار میں موجود ہے۔ اس کا ایک فقرہ ملاحظہ ہو:

"مگر سید احمد صاحب سے تعلق نہ رکھنا چاہیے۔ اگرچہ وہ خیر خواہی قومی کا نام لیتا ہے یا واقع میں خیر خواہ ہو، مگر اس کی شرکت مآل کار اسلام اور مسلمانوں کے لیے سم قاتل ہے"۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، جلد اول، صفحہ ۱۰۱)

کانگریس نے اس وقت تک میدانِ عمل میں کوئی قدم نہیں بڑھایا تھا۔ صرف مقاصد طے کیے تھے، جن سے نظریات کا اندازہ ہوتا تھا۔ ان مقاصد سے اتفاق کر لینا ہی حضرات علما کے لیے ایک آزمائش بن گیا۔ علما کے خلاف سخت سے سخت پروپیگنڈا کیا گیا۔ حتیٰ کہ ان کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

پھر چوں کہ خود کانگریس سرد پڑ گئی اور تقریباً پچیس سال ایسے گزرے کہ عرض و

معروغں سے آگے اس کی صد لبلند نہ ہو سکی تو اس کی مخالفت کا بازار بھی مندا رہا۔

(۲) دوسرا تخم ---زبان کا مسئلہ :

ہندو مسلم اختلاف وافتراق کا دوسرا تخم زبان کا مسئلہ تھا۔ ہندوستان میں عموماً مسلم اور غیر مسلم حکومتوں کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ حتیٰ کہ شمالی ہند کی پہاڑی ریاستوں چمبہ، گڑھوال، بلاسپور وغیرہ میں اہم دستاویزات عموماً فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس کی سرکاری زبان بھی فارسی تھی۔

۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے انگریزی کو فارسی کی جگہ رکھا اور فارسی کو سرکاری دفاتر سے خارج کیا۔ اس وقت اردو زبان نے بھی ایک حیثیت حاصل کر لی تھی، چناں چہ دوسری زبان کے طور پر اردو کو استعمال کیا جاتا رہا، جس کا رسم خط فارسی تھا۔ لیکن اپریل ۱۹۰۰ء میں سر اینٹونی میکڈانل لیفٹنٹ گورنر یو۔پی نے ایک گشتی حکم اس مضمون کا جاری کیا :

"عدالتوں اور کچہریوں میں ہندی حروف میں لکھی ہوئی درخواستیں لی جاسکیں گی"۔

اس گشتی حکم کا نتیجہ ظاہر تھا، ہندوؤں کی طرف سے شکریہ اور مسلمانوں کی طرف سے اظہارِ ناراضگی کے جلسے منعقد ہونے لگے، یعنی ساکن فضا متحرک بلکہ پُر آشوب ہو گئی۔

حضرات علما نے اس کش مکش میں زیادہ حصہ نہیں لیا، کیوں کہ جب اردو باقی تھی تو اگر برادرانِ وطن کو کچھ قانونی مراعات مل رہی تھی تو اس کی مخالفت رواداری کے خلاف تھی۔ تاہم یہ تخم پرورش پاتا رہا اور اس کا خاردار پودا کتنا بڑھا اور کتنا بڑھ رہا ہے کہ نہ صرف اردو، ہندی بلکہ ہر زبان کی کیاریوں میں اس کی شاخیں پھیل گئی ہیں، وہ محتاج بیان نہیں۔

(۳) تیسرا تخم ---اکثریت سے خوف اور بد گمانی :

برطانوی آمریت کے بقاو تحفظ اور مقاصدِ کانگریس کو ناکام کرنے کے لیے جو تیسرا تخم

تلاش کیا گیا، اگرچہ اس کے پوست کے رنگ بدلتے رہے، مگر اس کا مغز ایک ہی تھا جس کی تاثیر روز افزوں ترقی کے ساتھ اپنا کام کرتی رہی۔ اس کا مغز تھا مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کرنا اور ان کو اکثریت کی طرف سے مایوس اور وحشت زدہ کرنا۔ جس کا دوسرا رخ یہ تھا کہ وہ برسر اقتدار گروہ کے خیر خواہ، وفادار اور اکثریت کی طرف سے خوف زدہ اور بدگمان رہیں۔

اس مغز کا پہلا پوست یہ تھا۔ ۱۸۸۸ء میں جب مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج کی رہنمائی میں "انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" (جماعت محبانِ وطن) قائم کی گئی، جس کا اہم مقصد تھا، ہندوستان میں امن و امان اور برٹش گورنمنٹ کے استحکام کی کوشش کرنا اور کانگریس کے خیالات کو لوگوں کے دلوں سے دور رکھنا۔ (روشن مستقبل، صفحہ ۹۵۔ ۲۹۴)

تو مسلمانوں کی طرف سے ایک عرضِ داشت مرتب کی گئی کہ اس ملک میں طریق انتخاب اور جمہوریت کا جاری ہونا اس وجہ سے خلافِ مصلحت ہے کہ یہاں مختلف اقوام کے لوگ بستے ہیں۔ (روحِ روشن مستقبل، صفحہ ۹)

اس عرض داشت پر "پچاس ہزار دستخط تمام ہندوستان سے کرائے گئے"۔

(روشن مستقبل، صفحہ ۳۰۲)

گویا ہندوستان میں مسلمان جہاں بھی رہتے تھے، ان کے دلوں میں کمتری کا احساس پیدا کیا گیا اور ان کو اکثریت سے بدگمان کیا گیا۔

جداگانہ انتخاب :

اس نقطۂ نظر کے موجب کام کرنے والے برطانوی مدبّرین اور ہوا خواہوں کی یہ کوششیں پوری نہیں ہوئی تھیں کہ برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۸۹۲ء میں کونسلوں کا قانون پاس کر دیا۔ جس کی رو سے صوبائی کونسلیں قائم کی گئیں اور طریقۂ انتخاب جاری ہوا۔ اگرچہ اس کا حلقۂ انتخاب بہت محدود تھا؛ ہر ایک بالغ تو کیا ہر ایک تعلیم یافتہ بھی اس کا ووٹر نہیں ہوتا تھا، بلکہ میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، یونیورسٹیوں اور تجارتی جماعتوں کے خاص حیثیت

کے افراد اس کے ووٹر ہوتے تھے، مگر یہ بات غنیمت تھی کہ یہ انتخاب مشترک تھا۔

مگر یہ اشتراک اس مقصد کے خلاف تھا جس کے لیے ہندوستان کے گوشے گوشے سے مسلمانوں کے دستخط کرائے گئے تھے، کیوں کہ مشترک انتخاب کی صورت میں جب ہندو کو بھی مسلمان سے میل ملاپ رکھنا ضروری ہوتا اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس آنا پڑتا تو نہ مسلمان کے دل میں احساس کمتری جڑ پکڑ سکتا تھا نہ بدگمانی کی وبا پھیل سکتی تھی۔ تو اب برطانوی مفادات کے حامی مدبرین کی کوشش یہ ہوئی کہ انتخاب جداگانہ کرایا جائے۔

باب سوم:

مسلم لیگ کا قیام
(اور اس کے مقاصد و مصالح)

چناں چہ اس مغز کا (یعنی مسلمانوں کی اکثریت سے خوف زدہ کرنے اور ان میں احساس کمتری پیدا کرنے اور ان کو انگریز کا وفادار بنانے کا کام) دوسرا پوست تھا، جداگانہ انتخاب۔ یہ مطالبہ مسلمانوں کے دماغوں کا اختراع نہیں تھا، بلکہ خاص خاص الہامات کی بنا پر یہ مطالبہ مسلمانوں کی زبان پر آیا۔ پھر اس مطالبے کے جواز کے لیے کچھ وجوہات بھی پیدا ہو گئیں یا پیدا کر دی گئیں۔ مثلاً ۱۸۹۲ء میں مذکورہ بالا آئینی اصلاحات کی منظوری سے اگلے ہی سال ۱۸۹۳ء میں بمبئی میں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ پونا میں گنپتی کا دس دن کا ایک میلہ جاری کیا گیا، جس کے جلوس میں مسلمانوں اور انگریزوں کے خلاف گیت گائے جاتے تھے۔ ایک مسجد پر حملہ کیا گیا، پھر ایک انجمن انسدادِ ذبیحہ گاؤ قائم کی گئی۔ اس کے مقابلے پر مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج نے ایک جماعت قائم کی، جس کا نام تھا: ”محمڈن اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا“ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: روشن مستقبل، صفحہ ۳۰۰)

چند سال بعد ۱۹۰۰ء میں اردو، ہندی کا سوال کھڑا کر دیا گیا، جس کا کچھ تذکرہ پہلے گزر چکا ہے اور بقول پنڈت جواہر لال نہرو جس کا اثر یہ ہوا:

”اول تو ہندو قومیت کا جذبہ پیدا ہوا اور پھر اس کے بعد آہستہ آہستہ

مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا ہوا اور انھوں نے اُردو کو اپنی مخصوص زبان قرار دیا۔ پھر لکھنے کے حروف اور عدالتوں اور دفاتر میں ان کے اجرا کے باب میں بحثیں چھڑ گئیں۔ اسی طرح زبان اور حروف کی علاحدگی سے سیاسی اور قومی احساس پیدا ہوا، جس نے ابتدا ہی میں فرقہ وارانہ شکل اختیار کرلی"۔ (بحوالہ روشن مستقبل، صفحہ ۳۲۰)

بہر حال ذبیحہ گاؤ، زبان اور احترامِ مسجد (یعنی مسجد کے سامنے باجہ) وغیرہ کے وہ مسائل جو فرقہ واریت کی بنیاد تھے، سب پیدا کردیے گئے تھے۔ مگر ان مسائل کے باوجود مسلمانوں نے از خود جداگانہ انتخاب کا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ شملہ کی چوٹیوں سے ان خاص مسلمانوں پر جو برطانوی ڈپلومیسی کے مرکز سے خاص تقرب رکھتے تھے، اس مضمون کا الہام کیا گیا۔ کہا گیا کہ وہ وائسرائے بہادر کی بارگاہ میں ایک ڈیپوٹیشن لے کر حاضر ہوں اور ہندوؤں کے تسلط کا شکوہ کرتے ہوئے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کریں۔ اس وفد کی قیادت کے لیے اتفاق سے ان کو سر آغاخاں جیسا لیڈر بھی مل گیا، جو برطانوی مقاصد کی کامیابی کے لیے بہترین شخص تھا۔ اس مطالبے کے ساتھ ساتھ ایک جماعت کی تشکیل کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ چناں چہ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو وائسرائے بہادر کی خدمت میں وفد پیش ہوا اور تین ماہ کے اندر ۳۰؍دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھ دی گئی۔ (روحِ روشن مستقبل، صفحہ ۴۸)

پھر اس بیت کا دوسرا مصرع یہ تھا کہ اسی ماہ دسمبر میں "ہندو مہا سبھا" قائم کردی گئی۔ اس سے قبل ۱۹۰۰ء میں ایک جماعت "مہامنڈل" کے نام سے اس وقت قائم ہوئی تھی، جب حکومت نے اردو کے مقابلے میں ہندی جاری کی تھی۔ اسی مہامنڈل کو "ہندو مہاسبھا" میں منتقل کردیا گیا اور اس کا اجلاس لاہور میں کیا گیا اور اس میں مسلمانوں کے مقابلے میں عہدوں اور ملازمتوں کے مطالبوں کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ اس کے علاوہ مختلف صورتوں میں باہمی اختلافات اور فسادات ہونے لگے۔ (روحِ روشن مستقبل، صفحہ ۵۲)

بہر حال غلامی کا یہ دور نہایت عجیب تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں لیلائے برطانیہ کی سنہری زلفوں میں الجھے ہوئے، آپس میں ایک دوسرے کے دشمن، مگر انگریز بہادر کے چشم و

ابرو پر رقص کرنے میں ہر ایک کو آگے بڑھنے کا شوق۔ یہ زمانہ تقسیمِ خطابات کے لیے بھی موسمِ بہار تھا۔ خاں صاحب، خاں بہادر، رائے صاحب، رائے بہادر، سر، نائٹ وغیرہ درجہ بدرجہ خطابات تھے۔ وفاداری اور چاپلوسی کا پیمانہ جتنا وسیع ہوتا اتنے ہی بڑے خطاب سے وہ سرفراز کیا جاتا تھا۔

غلامی کے اس دور کا پورا قصہ دل خراش اور ہر ایک حریت پسند کے لیے توہین آمیز ہے۔ قلم کو شرم آتی ہے کہ اس کو نقل کرے۔ روحِ روشن مستقبل، صفحہ ۵ تا صفحہ ۶۰ میں اور روشن مستقبل کے باب ہشتم و نہم میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ ہم نے کچھ اختصار اس لیے پیش کر دیا کہ حضرات علما اور قوم پرور مسلمانوں کے موقف کی وضاحت ہو سکے۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیت علمائے ہند کی باضابطہ تشکیل کی گئی اس کی روئیداد کی طویل عبارت کا ایک فقرہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، جس سے اس زمانے کی سیاست پر روشنی پڑتی ہے اور اس سیاست سے حضرات علما کو کنارہ کش رہنے کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ فقرہ یہ ہے:

> "ہندوستان کی سیاست محض چاپلوسی، خوشامد اور اظہارِ وفاداری پر محدود ہو چکی تھی۔ گویا کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا سیاست داں وہ شخص سمجھا جاتا تھا جو حکومت تسلطہ کا سب سے بڑا وفادار ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ علمائے مذہب جو طبعاً خوشامد اور چاپلوسی سے متنفر ہیں اور جو بڑے بڑے جابر بادشاہوں کے مقابلے میں بھی اعلائے کلمۃ الحق کے عادی رہے ہیں، اس سیاست سے علاحدہ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے"۔

(روشن مستقبل، صفحہ ۵۲، طبع پنجم)

علما کی دارو گیر

اس دور میں حضرات علما کے موقف کی وضاحت کے لیے ہمیں کچھ ماضی کی طرف لوٹنا ہو گا، یعنی ۱۸۵۷ء سے متصل برسوں کی طرف، یعنی اس دور کی طرف جب اس انقلاب کی تباہ کاری کے بعد ہندوستانیوں نے کچھ ہوش سنبھالا اور بدلے ہوئے حالات میں

نئے ڈھنگ سے زندگی کا آغاز کیا گیا۔

اس انقلاب کے سب سے زیادہ اثرات علما پر پڑے تھے۔ اربابِ اقتدار کی نظر میں وہ یہاں تک ناپسندیدہ اور معتوب ہو گئے تھے کہ مولویت بغاوت کے ہم معنی قرار دے دی گئی تھی اور ہر وہ شخص مشتبہ تھا جو مولویانہ وضع رکھتا تھا۔ (ملاحظہ فرمایئے "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ" اور "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، جلد چہارم)

جن علمائے کرام کے لیے تختۂ دار مہیا نہ ہو سکا ان پر برصغیر کا طول و عرض اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ کر دیا گیا۔ بہت کم وہ تھے جو از خود نکلے اور ہجرت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ورنہ بڑی تعداد وہ تھی جن کو ججوں کے فیصلے نے ہندوستان بدر کر کے انڈمان وغیرہ بھیج دیا۔ بایں ہمہ یہ اسلام کا ایک معجزہ تھا کہ وہ علما باقی رہ گئے جو کم از کم طبقۂ علما میں انقلابی جدوجہد کے محرک بلکہ روحِ رواں تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ و حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ شاملی کے میدان میں انگریزی فوج کے مقابلے میں صف آرا رہے۔ ایک معرکے میں انگریزی فوج کی ایک کمپنی کو تباہ بھی کر دیا۔ لیکن یہ قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ گرفتار ہی نہ ہو سکے۔ حتیٰ کہ ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہو گیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ گرفتار کر لیے گئے۔ تقریباً چھ ماہ تک حوالات میں بھی رہے، مگر حکومت ان کے خلاف شہادت مہیا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: علمائے ہند کا شاندار ماضی، جلد چہارم)

بہر حال ۱۸۵۷ء کے بعد ان حضرات کا موقف تھا: انگریزوں سے مکمل مقاطعہ اور انگریزیت سے نفرت۔ ان حضرات سے تعلق رکھنے والے علما میں سے چند افراد وہ بھی تھے جو کسی وجہ سے کسی کالج یا کسی سرکاری حلقے سے وابستہ رہے، مگر انگریز سے ان کو بھی ایسی ہی نفرت تھی۔ حتیٰ کہ اگر کسی وقت ہاتھ ملانے کی ضرورت پیش آجاتی تو وہ بعد میں ہاتھ دھونا ضروری سمجھتے تھے۔

باب چہارم:

مسئلۂ تعلیم

لیکن ان حضرات کی یہ ہوش مندانہ ہمدردی اور ملت کے لیے یہ بھی خواہی صفحاتِ تاریخ میں روشن حروف سے درج رہنا چاہیے کہ دورِ پُر آشوب کے بعد جیسے ہی سکون میسر آیا انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم بالخصوص تعلیمِ دین کی طرف توجہ مرکوز کر دی اور ابھی ۱۸۵۷ء کی قیامتِ صغریٰ پر دس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ مئی ۱۸۶۶ء (۱۵ر محرم الحرام، ۱۲۸۳ھ) کو دیوبند میں مرکزی درس گاہ کی بنیاد رکھ دی گئی، جس کے پندرہ سالہ نصاب میں انگریزی زبان کے علاوہ وہ تمام فنون داخل تھے جو دینی اصلاحات کے ساتھ دنیاوی ضرورتوں کے لیے بھی متکفل ہو سکتے تھے۔ ابتدائی سات درجات میں قرآن پاک اور فارسی زبان کی پوری قابلیت کے ساتھ تحریر و انشا اور ریاضی و مساحت وغیرہ سے بھی یہاں تک واقفیت ہو جاتی تھی کہ ان درجات کا سند یافتہ اس زمانے کی عام ملازمت کی شرائط پوری کر سکتا تھا اور اردو مڈل کے درجات میں داخل ہو کر وہ سرکاری تعلیم گاہوں کے ایسے سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر سکتا تھا، جو اس کو تحصیل داری، منصفی، ڈپٹی کلکٹری، ہیڈ ماسٹری یا وکالت تک (جو اس زمانے میں ہندوستانیوں کے لیے سب سے اعلیٰ منصب تھے) پہنچا سکتے تھے۔ دیوبند کے بعد اسی سال سہارن پور میں مظاہر العلوم قائم کیا گیا۔ پھر مراد آباد، امروہہ، علی گڑھ، وغیرہ میں اسی نمونے کے مدرسے قائم کر دیے گئے تھے، جن کے لیے نہ کسی سرکاری ایجنسی سے منظور لینے کی ضرورت تھی نہ امداد کی، صرف مسلمانوں کے عزم کی

ضرورت ہوتی تھی۔ پھر سلسلہ بڑھتا رہا۔ ہندوستان کے طول وعرض میں ہزاروں مدرسے اور مکتب صرف مسلمانوں کی امداد کے اصول پر قائم ہو گئے اور آج بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی تعلیم و تربیت میں کم از کم پچیس فی صد ان مدارس اور مکاتب کا حصہ ہے، جن کے تمام مصارف مسلمانوں نے برداشت کیے۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد بھی ان مدارس کے مصارف کا بار حکومت پر نہیں پڑا۔ حضرات علما مسلمانوں کی تعلیم کا یہ نظم اس وقت قائم کر چکے تھے جب انگریزی سرکار کی پالیسی مسلمانوں کے حق میں یہ تھی کہ ان کو تعلیم سے بھی محروم رکھا جائے اور سرکاری ملازمتوں سے بھی۔

جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بقول سر ولیم ہنٹر:

"۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں مشکل ہی سے کوئی دفتر ایسا ہوگا جس میں بجز چپراسی یا چٹھی رساں یا دفتری کے مسلمانوں کو کوئی اور نوکری مل سکے"۔ (ملاحظہ ہو مسلمانوں کے افلاس کا علاج، منجانب آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۳۴ء و مسلمانوں کا روشن مستقبل، صفحہ ۱۷۲)

اور نہ صرف تعلیم و ملازمت سے محرومی بلکہ بقول ہنٹر صاحب اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا بھی کسرِ شان سمجھتے تھے۔

(مسلمانانِ ہند از ڈاکٹر ہنٹر۔ بحوالہ روشن مستقبل، صفحہ ۱۷۲، طبع پنجم)

آزادیٔ ضمیر، حریتِ فکر، انگریز اور انگریزیت سے مقاطعہ، جو بانیانِ دارالعلوم کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ ان درسگاہوں کی بنیاد بھی انھیں اصول اور نظریات پر رکھی گئی۔ چناں چہ اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ حکومت سے کسی قسم کی کوئی امداد حاصل کی جائے یا حکام اور اربابِ اقتدار سے کوئی رابطہ رکھا جائے۔ اللہ پر توکل اور دیندار مسلمانوں سے رابطہ ان درسگاہوں کا بنیادی سرمایہ تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، جلد اول، صفحہ ۱۰۷ تا ۱۰۷)

مسلمانوں کی تعلیم اور انگریزی حکومت کی پالیسی :

دارالعلوم دیوبند کے قیام سے چار سال بعد ۱۸۷۰ء میں وہ وقت آیا کہ حکومت نے سمجھ لیا کہ وہ مسلمانوں کو تعلیم و ملازمت سے نکال کر ان کی ذہنیت نہیں بدل سکتی۔
(روشن مستقبل، صفحہ ۱۷۱، طبع پنجم)

لہٰذا تعلیم کے سلسلے میں حکومت کی پالیسی بدلی اور

"۷ر اگست ۱۸۷۱ء کو مختلف صوبجات کے پاس احکام بھیجے گئے، جن کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ دی جائے"۔(روشن مستقبل، صفحہ ۱۸۰، طبع پنجم)

سرسید مرحوم کی بعض خدمات :

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر سرسید مرحوم کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے۔ آپ دورِ شباب ختم کر چکے تھے، لیکن مسلمانوں کی تباہی اور ان کی تحقیر و تذلیل کے جو اضطراب انگیز حالات آپ کے سامنے آئے، انھوں نے مایوس اور پست ہمت کرنے کے بجائے آپ کی حمیت اور غیرت میں وہ حرارت پیدا کر دی، جس نے آپ کو جوانوں کا جوان بنا دیا۔

تباہی اور تنزل کے نشیب میں گرتے ہوئے مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو چکی تھیں۔ وہ انگریزی دور میں اپنے مستقبل سے قطعاً مایوس ہو چکے تھے۔ آپ نے ان کی ہمتیں بڑھائیں، ان کو جدوجہد پر آمادہ کیا۔ سرکاری حلقوں میں جو غیظ و غضب اور جو بدگمانیاں مسلمانوں کے متعلق تھیں ان کو دور کرنے کی پوری کوشش کی۔

پھر ۱۸۷۰ء میں تعلیم کے سلسلے میں حکومت کی پالیسی بدلی تو یہ نہیں کہ آپ نے کوشش کی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی شخصیت ایک والہانہ جدوجہد کا پیکر بن گئی کہ مسلمان اس بدلی ہوئی پالیسی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ اسی ہمہ گیر جدوجہد کا ایک شعبہ یہ تھا کہ یکم جون ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں ایک اسکول کا افتتاح کیا گیا جو کچھ دنوں بعد ایسا

کالج بن گیا جو مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کا بھی مرکز تھا۔ پھر یہی کالج یونی ورسٹی بن گیا۔
(روشن مستقبل، صفحہ ۲۱۶، طبع پنجم)

لیکن بد قسمتی یہ ہوئی کہ سر سید کو آزادانہ کام کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ آپ کا ماحول ایسا بنا دیا گیا، جس نے آپ کے سیاسی ذوق میں یہاں تک تبدیلی کر دی کہ ہندو مسلم تعلقات اور ہندوستانی قوم کی ترقی کے متعلق جن اصول کی آپ تبلیغ کیا کرتے تھے، جب انڈین نیشنل کانگریس نے انھیں اصول کو اپنا کر آگے بڑھنا شروع کیا تو آپ نے نہ صرف کانگریس کے مقابلے میں "انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" پھر "محمڈن ایسوسی ایشن" قائم کر کے کانگریس کی مخالفت کی، بلکہ خود اپنے سابق اصول و خیالات کی تردید میں بھی خطابت و صحافت کی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں۔

دوسری طرف تعلیم و تہذیب کے سلسلے میں آپ کا عقیدہ یہ ہو گیا کہ مسلمانوں کی ترقی کا مدار اس پر ہے کہ وہ مکمل طور پر یورپین تہذیب اپنا لیں۔ آپ کی فطرت سرگرم جدوجہد کی عادی تھی۔ آپ نے اس عقیدے کی اشاعت و تبلیغ میں بھی یہی سرگرمی اختیار کی۔ اس غیر معمولی سرگرمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علما اور تہذیبِ قدیم کے حامیوں اور سر سید صاحب اور ان کے ہم نواؤں کی دو جماعتیں بر سر پیکار ہو گئیں۔ یہ دو جماعتیں گویا دو مکتبۂ خیال ہو گئے، جن کے آپس کے بعد کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ شرکتِ کانگریس کے جواز اور محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کے متعلق جو فتویٰ حضرات علما نے مرتب کیا تھا۔ اس میں حضرات علما کے امام اور مقتدا حضرات مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ نے تحریر فرمایا تھا:

> "اگر ہندو مسلمان باہم شرکت بیع و شراء اور تجارت میں کر لیویں، اس طرح کہ اس میں کوئی نقصان دین کا نہ ہو، خلافِ شرع معاملہ کرنا اور سود اور بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آوے، جائز ہے۔ مگر سید احمد صاحب سے تعلق نہ رکھنا چاہیے۔ اگر چہ وہ خیر خواہیٔ قومی کا نام لیتا ہے یا واقع میں خیر خواہ ہو، مگر اس کی شرکت مآل کار مسلمانوں کے لیے سم قاتل ہے۔ ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہرگز نہیں چتا۔ بس اس کے شریک مت ہونا اور ہنود سے شرکتِ معاملہ کر لینا"۔ الخ۔

(نصرۃ الابرار، صفحہ ۱۹، ۲۶، ۱۷ محرم الحرام ۱۳۰۶ھ، اکتوبر ۱۸۸۸ء)

سرسید کی ابتدائی خدمات پھر ماحول کے تغیر اور خود سرسید مرحوم اور ان کے ذریعے عام مسلمانوں اور ان کی سیاست پر اس ماحول کے جو اثرات ہوئے ان کی تفصیل بہت طویل ہے۔

"مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے باب پنجم، باب ہفتم اور باب ہشتم کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات میں یہ تفصیل پھیلی ہوئی ہے، جو قابلِ مطالعہ ہے۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ "روشن مستقبل" کے مصنف سید طفیل احمد صاحب منگلوری، علی گڑھ کالج کے ان قدیم طلبہ میں سے ہیں، جنھوں نے ان تمام تغیرات کو بچشم خود دیکھا ہے۔ لہٰذا آپ کی پیش کردہ تفصیل حقائق اور صحیح واقعات کا مرقع ہے۔

باب پنجم:

علمائے ہند کا سیاسی موقف

۱۸۵۷ء کے بعد تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم تھا اور اس سلسلے میں حضرات علما کا موقف بہت زیادہ قابلِ احترام اور قابلِ قدر تھا، جس کو نظر انداز کر دینا انصاف کے خلاف تھا۔ اس لیے ہمیں ماضی کی طرف لوٹ کر ۱۸۶۶ء تک پہنچنا پڑا۔ اب ہم اسی بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کا عنوان تھا: "تیسرا تخم"۔ اس تخم کا دوسرا پوست تھا: "جداگانہ انتخاب"۔

یہ اگرچہ مسلمانوں کے اپنے جذبات کا مطالبہ نہیں تھا، مگر طرح طرح کے الہامات اور اشارات نے اس پر اس طرح قندپاشی کی کہ یہ ان کا محبوب مدعا بن گیا۔ خفیہ اشارے اور تلقین پر عمل کرنے کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ سر آغا خاں کی زیرِ قیادت مسلمانوں کا ایک ڈیپوٹیشن شملہ پہنچا اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے اس ڈیپوٹیشن کی تاریخ کو پورے نوے دن نہیں گزرے تھے کہ مسلمانوں کے لیے "مسلم لیگ" اور ہندوؤں کے لیے "ہندو مہاسبھا" قائم کر دی گئی۔

مولانا شبلی نعمانی جو سر سیدؒ کے زمانے میں پندرہ سال علی گڑھ کالج میں رہ کر اس زمانے کی اینگلو محمڈن سیاست سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے، آپ نے مسلم لیگ کے حق میں گویا "افتتاحی مقالہ" یہ لکھا تھا:

> "لیگ کا سنگِ اولین شملہ کا ڈیپوٹیشن تھا اور اب یا آیندہ جو کچھ اس کا نظام ترکیبی قرار پائے، ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود رہے گی۔ ڈیپوٹیشن کا مقصد سرتاپا یہ تھا اور یہی ظاہر بھی

کیا گیا تھا کہ جو ملکی حقوق ہندوؤں نے (اپنی سی (۳۰) سالہ جدوجہد سے) حاصل کیے ہیں، ان میں مسلمانوں کا حصہ متعین کر دیا جائے۔ آج مسلم لیگ کو اپنی شرم مٹانے کے لیے کبھی کبھی عام ملکی مقاصد میں سے بھی کسی چیز کو اپنی کارروائی میں داخل کر لیتی ہے، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ اس کے چہرے کا مستعار غازہ ہے۔ دن رات جو شور مچایا جاتا ہے، روزمرہ جس عقیدے کی تعلیم دی جاتی ہے، جو جذبہ ہمیشہ ابھارا جاتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ہندو ہم کو دبائے لیتے ہیں، اس لیے ہم کو اپنا تحفظ کرنا چاہیے۔

مسلم لیگ کا اصلی عنصر یہ ہے باقی جو کچھ ہے موقع اور محل کی خصوصیات کے لحاظ سے تصویر میں کوئی خاص رنگ بھر دیا جاتا ہے۔ ہم شملہ ڈیپوٹیشن کی عظمت اور اہمیت کے منکر نہیں۔ یہ سب سے بڑا تماشہ تھا جو قومی اسٹیج پر کیا گیا، لیکن گفتگو یہ ہے کہ کیا رعایا میں سے دو قوموں کی باہمی نزاع اور چارہ جوئی کا نام پالیٹکس ہے۔ اگر یہ پالیٹکس ہے تو سرکاری عدالتوں میں ہر روز جو کچھ ہوتا ہے وہ سب پالیٹکس ہے اور ہائی کورٹ کو ہائی کورٹ نہیں، بلکہ سیاست گاہِ اعظم کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ جیسا کہ ہم اس مضمون کے پہلے حصے میں لکھ آئے ہیں، پالیٹکس کا خط ٹھیک وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ انتظامِ حکومت میں رعایا کی شرکت کس حد تک ہونی چاہیے۔ یعنی پالیٹکس گورنمنٹ اور رعایا کے باہمی مطالبہ جات کا نام ہے، نہ کہ رعایا کے باہمی تنازعات اور حقوق طلبی کا۔"

(روحِ روشن مستقبل، صفحہ ۶۴ و ۶۵)

مختصر یہ کہ حضرات علما نے نہ لیگ کے قیام کو پسند کیا، نہ جداگانہ انتخاب کو اپنا نصب العین بنایا، نہ ان انجمنوں اور ان کارروائیوں کی تائید و حمایت کی جن کے نتیجے میں مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا قائم کی گئی، لیکن یہ ان کے کردار کا منفی رخ ہے۔ مثبت رخ کیا تھا؟

(۱) انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت کو مثبت رخ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ وہ کانگریس میں باضابطہ شامل نہیں ہوئے، لیکن صرف اس حمایت کی بنا پر طعن و تشنیع، غلط الزامات اور ان کی بنا پر غلط فتاویٰ کے اتنے طومار ان پر لاد دیے گئے اور وہ پریشانیاں اور مشکلات ان کو برداشت کرنی پڑیں کہ کانگریس میں باضابطہ شامل ہونے والوں کو ان کا عشر عشیر بھی برداشت کرنا نہیں پڑا۔

واقعہ یہ ہے کہ برطانوی سامراج کے کارپردازوں اور ایجنٹوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ علما کے اقتدار اور ان کے اثر ورسوخ کو ختم کیا جائے، جو روزِ اول سے غیر ملکی اقتدار کے شدید ترین مخالف رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اس اقتدار کے ختم کرنے کی جدوجہد کو جہاد قرار دیتے رہے ہیں۔ اس وقت جب ان علما نے ایک ترقی پذیر جماعت (کانگریس) کی حمایت کی، تو برطانوی سامراج کے ہواخواہ چراغ پا ہو گئے۔ یہی زمانہ ہے جب ''وہابیت'' کا خطاب ایجاد کیا گیا، دیوبندیت اور بریلویت کے نقطہائے نظر ایجاد کر کے مناظروں اور مباحثوں کا بازار گرم کیا گیا اور مجالسِ میلاد کے جائز و ناجائز ہونے کے مسائل کھڑے کر کے عوام کو ان علما سے متنفر کیا گیا، جن کو وہابی کا خطاب دیا گیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام شورشوں کی بجلیاں اگرچہ علمائے کرام پر گریں، مگر کانگریس کو اس کا یہ فائدہ پہنچا کہ اس کا وجود مسلم اور مستقل ہو گیا اور وہ باحیثیت سیاسی جماعت مانی جانے لگی۔ مخالفت کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ جماعت یا تحریک اگر مخالفتوں کو جھیل جاتی ہے تو اس کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔

(۲) تحریر بالا (۱) کے بموجب کانگریس کی حمایت کو بھی مثبت بلکہ صبر آزما مثبت رخ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے کردار کا مثبت رخ وہ منصوبہ تھا جس کا کچھ ظہور ۱۹۰۹ء میں ہوا۔

جمعیت الانصار کا قیام :

مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ نے اپنے ایک بیان میں فرمایا تھا :

''۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء میں حضرت شیخ الہند (مولانا محمود حسن) رحمہ اللہ نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ چار سال تک جمعیت الانصار میں کام کرتا رہا''۔

پھر مولانا سندھی اسی بیان میں فرماتے ہیں :

"۱۳۳۳ھ ر ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا۔
کہ حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ جس جماعت کے نمایندہ تھے، اس کی پچاس سال کی
محنتوں کا حاصل میرے سامنے نیز منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار رہے۔ اس کو
میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی"۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: علماے حق، جلد اول، صفحہ ۱۳۶-۱۳۵)

مولانا سندھیؒ کے اس ارشاد کے علاوہ ایک اور شہادت ہمارے سامنے ہے۔

جمعیت الانصار کا پہلا اجلاس شوال ۱۳۲۸ھ (اپریل ۱۹۱۱ء) میں مراد آباد میں ہوا۔
حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی (خلیفہ حضرت مولانا محمد قاسم مرحوم) اس کے
صدر تھے۔ آپ نے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

بعض نئی روشنی کے شیدائی کہتے ہیں کہ جمعیت الانصار، اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی
نقل ہے۔ لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں۔ جمعیت الانصار کی تحریک غالباً اب سے تیس
(۳۰) سال پہلے شروع ہو گئی تھی۔

(روئیداد اجلاس اول مؤتمر الانصار بمقام مراد آباد، صفحہ ۲۴ الف)

۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کے ایام تھے۔ ولی اللٰہی قافلے کے امیر حضرت مولانا محمود
حسن رحمہ اللہ نے انتہائی نامساعد حالات میں مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیج دیا۔ ان کو وہاں
مختلف ممالک کے سیاسی رہنماؤں سے مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ ان میں جرمنی، فرانسیسی
اور جاپانی سیاست داں چند ایسے بھی تھے جو آج اپنے ملک میں برسر اقتدار ہیں۔

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس دور میں حضرات علما کے کردار کا
مثبت پہلو وہ منصوبہ تھا جس پر:

(الف) ہندوستان میں بقول مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ تیس سال پہلے سے کام ہو رہا
تھا۔ یعنی جب ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں مدرسہ عربی دیوبند کے فضلا نے اپنے مربی
حضرت مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ اور حضرات اراکین مجلس شوریٰ کی خدمت میں درخواست
پیش کر کے ثمرۃ التربیت کے نام سے جماعت کی بنیاد رکھی تھی۔

اس سلسلے میں چندہ دینے والوں کی فہرست بھی تیار کی گئی اور اس چندہ کا نام ثمرۃ التربیت رکھا گیا۔ (روئیداد اجلاس اول مؤتمر الانصار، صفحہ ۴۴ تا ۶۴)

یہاں یہ انکشاف بہت دل چسپ ہوگا کہ اس سے تقریباً دو سال بعد ۱۸۷۰ء میں سر سید مرحوم نے انگلستان سے واپسی پر دو کمیٹیاں قائم کیں۔

ایک کا نام تھا: ''کمیٹی خواستگار ترقیِ تعلیم مسلمانان'' اور

دوسرے کا نام تھا: خزنۃ البضاعت۔ (روشن مستقبل، صفحہ ۲۰۰، طبع پنجم)

خزنۃ البضاعت ۲۶ر ستمبر ۱۸۷۰ء کو قائم کی اور اس کے ذریعے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ (روشن مستقبل، صفحہ ۲۱۴، طبع پنجم)

(ب) مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیرون ہند کوئی جماعت قائم تھی جو ۱۹۱۴ء سے پچاس برس پہلے (یعنی تقریباً ۱۸۶۴ء) سے کام کر رہی تھی اور اس جماعت کے تعلقات فرانس، جرمنی اور جاپان سے بھی تھے۔

(ج) ان اقتباسات سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ حضرات علما نے حمایت کرنے اور اس حمایت کی پاداش میں صبر آزما مشکلات برداشت کرنے کے باوجود کانگریس میں شرکت کیوں نہیں کی۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان حضرات کا پروگرام انقلابی تھا، جس کے لیے وہ طاقت فراہم کر رہے تھے اور کانگریس کی تجاویز میں شوخی ضرور تھی، مگر آئین اور قانون کی حدود کا احترام کرتے ہوئے اور انقلاب تو درکنار ابھی تک حکومت خود اختیاری یا ''ہوم رول'' بھی اس کا نصب العین نہ تھا۔ ان حضرات نے شوخی کی حد تک اس کی حمایت اور تائید کی، مگر مکمل آزادی کے ذہنی نصب العین کو کسی درجے پر بھی نظر انداز کرنا گوارا نہیں کیا۔ ایسی صورت میں نہ کانگریس میں ان کی گنجایش تھی کہ ان کو دامن میں لے سکے، نہ ان حضرات کے قدم نساں خانۂ کانگریس کی طرف بڑھ سکتے تھے۔

باب ششم:

تحریکِ شیخ الہند کی ایک جھلک

ستائیس سالہ خفیہ تحریک کا زمانۂ ظہور

مؤتمر الانصار کا اجلاسِ اول منعقدہ شوال ۱۳۲۸ھ، اپریل ۱۹۱۱ء، جس کے خطبۂ صدارت میں فرمایا گیا تھا کہ جمعیت الانصار کی تحریک غالباً اب سے تیس (۳۰) برس پہلے شروع ہو چکی تھی، اس اجلاس کا نقشہ تقریباً دو (۲) سال پہلے دماغوں میں آیا تھا۔ جیسا کہ جمعیت الانصار کے ناظم حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ نے اس اجلاس کی روئیداد میں تحریر فرمایا تھا:

"رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ کی ستائیسویں شب بھی عجیب زندگی بخش اور متبرک شب تھی، جب کہ ہم چند ضعیف الاثر طالب علموں نے اپنے حقیقی مربیوں سے جمعیت الانصار کے انعقاد کی درخواست کی"۔

(رسالہ القاسم بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ، صفحہ ۵)

یعنی جس جماعت کی تمہید خفیہ طور پر ستائیس سال پہلے ہو چکی تھی، رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں اس کو منظر عام پر لانے کا تہیہ کیا گیا۔

(علمائے حق، جلد ۱، صفحہ ۱۳۰)

اس موقع پر تحقیق طلب یہ ہے کہ ۱۹۰۹ء میں کیا خصوصیت تھی کہ اس وقت اس کو منظر عام پر لانے کا تہیہ کیا گیا۔ اس کے جواب کے لیے ہمیں اس دور کے سیاسی حالات پر نظر

ڈالنی ہو گی۔

بیسویں صدی کی پہلی دھائی

جہاں تک حکومت اور پبلک (یعنی ہندو مسلمانوں) کا تعلق تھا تو جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے، یہ زمانہ اظہارِ وفاداری اور تقسیم خطابات کا موسم بہار تھا، لیکن دوسری طرف یہی زمانہ تھا جس میں زندگی کی نئی لہر پیدا ہو رہی تھی اور خود دار طبیعتوں نے انقلاب کے لیے مچلنا شروع کر دیا تھا۔ چناں چہ باغیانہ تحریکات کی تحقیق کے متعلق جو کمیٹی بنائی گئی تھی جس کو "رولٹ کمیٹی" کہا جاتا ہے، اس کی رپورٹ یہ ہے کہ :

> (الف) (۱۹۰۵ء میں) "ہندوستان کے انقلاب پسندوں نے "برلن" میں "انجمن انقلاب ہند" بنائی۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم ہو۔ اس کے مسلسل جلسے ہوتے رہتے تھے، جن میں ترک، روسی اور جرمن افسر شریک ہوتے تھے"۔
>
> (رولٹ کمیٹی کی رپورٹ، صفہ ۲۲۶، مطبوعہ کاشی رام پریس، لاہور۔ دسمبر ۱۹۱۸ء)

(ب) اتفاق سے دفتری حکومت کو پھر ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کی کوئی سیاسی جماعت بنائی جائے اور علی گڑھ کو اس کا مرکز بنایا جائے۔ اس زمانے میں لاڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ ان کے مزاج میں تیزی تھی، جس کی وجہ سے ان کا بگاڑ فوج سے ہوا۔ اسی طرح ان کا اختلاف بنگالیوں سے ہوا، جن کا قدم سیاسیات میں سب سے آگے تھا۔ بنگالیوں کی قوت توڑنے کے لیے لارڈ کرزن نے دسمبر ۱۹۰۳ء میں اعلان کیا کہ ان کا ارادہ یہ ہے کہ کمشنری چٹاگانگ، ڈھاکہ اور میمن سنگھ کو صوبہ بنگال سے نکال کر آسام میں شامل کر دیا جائے۔ اس کے خلاف بنگالیوں نے ہزارہا جلسے کر ڈالے اور لاکھوں دستخط کرا کے عرض داشتیں بھیجیں اور تمام ملک میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ لاڈ کرزن اسی مخالفت کو برداشت نہ کر سکے اور فروری ۱۹۰۵ء میں کلکتہ یونی ورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ہندوستانیوں کے متعلق کہا کہ وہ سچے نہیں ہوتے اور سچ بولنا ہندوستان کا کبھی نصب العین نہیں رہا۔ اس پر بنگالیوں نے ایک طوفان

برپا کر دیا اور ایک عظیم الشان جلسے میں لاڈر کرزن اور ان کی پالیسی پر ملامت کی۔ یہ جلسہ ۱۱؍ مارچ ۱۹۰۵ء کو منعقد ہوا تھا۔ لاڈ کرزن اس سے اس قدر مشتعل ہوئے کہ وہ بذاتِ خود ڈھاکہ پہنچے اور وہاں ایک جلسۂ عام میں مسلمانوں کو یہ کہہ کر بھڑکایا اور بنگالیوں کی تحریک کے خلاف مسلمانوں میں اشتعال پیدا کیا کہ :

"تقسیم بنگال سے ان کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ بنگال کی گورنمنٹ کے انتظامی بار کو ہلکا کیا جائے، بلکہ ایک اسلامی صوبہ بنانا تھا، جس میں مسلمانوں کا غلبہ ہو"۔

۵؍ جولائی کو اس فیصلے کا اعلان کیا گیا اور اکتوبر ۱۹۰۵ء سے اس پر عمل درآمد بھی شروع کر دیا گیا۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل، اشاعت پنجم، ص ۳۴۵ تا ۳۴۶)

اب بنگالیوں نے احتجاج کی تین صورتیں تجویز کیں :

۱۔ ولایتی سامان کا بائیکاٹ۔

۲۔ سودیشی مال کو رواج دینا۔

۳۔ دہشت پھیلانا۔

(رپورٹ رولٹ کمیٹی)

بنگال کی اس شورش کا اثر لامحالہ صوبہ بہار اور اڑیسہ پر ہونا چاہیے تھا۔ چناں چہ اپریل ۱۹۰۸ء کو مسٹر کنگفورڈ جج مظفر پور کی گاڑی پر بم سے حملہ کر دیا گیا۔

سی۔ پی میں بنگالیوں کی حمایت میں شورش یہاں تک بڑھی کہ ۱۹۰۷ء میں کانگریس کے اجلاس کے لیے ناگپور تجویز کیا گیا، مگر کانگریس کی نرم پالیسی نے ناگپور کے گرم جوش نوجوانوں کو اس قدر مشتعل کر دیا کہ وہاں کانگریس کا اجلاس ناممکن ہو گیا۔ چناں چہ ناگپور کے بجائے اجلاس بمبئی میں کیا گیا۔

تقسیم بنگال کے خلاف تحریک تقریباً پانچ سال تک شد و مد سے جاری رہی۔ حتیٰ کہ دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کو منسوخ کرنا پڑا۔ (روشن مستقبل، صفحہ ۳۷۲)

(ج) ایک شخص مسمی ہردیال جو کبھی دہلی کا باشندہ اور پنجاب یونی ورسٹی کا طالبِ علم تھا،

۱۹۰۵ء میں سرکاری وظیفہ حاصل کر کے آکسفورڈ میں داخلے کی غرض سے انگلستان پہنچا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ واپس آیا اور اس نے ایک انقلابی پارٹی تیار کرنی شروع کر دی۔ اس کا مرکز سان فرانسسکو (امریکہ) تھا۔ وہاں سے "غدر" کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا، جس میں باغیانہ اشتعال انگیز مضامین ہوتے تھے اور خفیہ انجمنوں کے بنانے کی تلقین ہوتی تھی۔ اخبار کے علاوہ موقع بموقع پمفلٹ بھی شائع کیے جاتے تھے۔ اس پارٹی میں ہندو، مسلمان، سکھ تینوں قومیں شریک تھیں۔ رام چندر اور برکت اللہ اس پارٹی میں خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ترکی اور جرمنی اس کی پشت پر تھے۔

ہم نے یہاں صرف تین پارٹیوں کا ذکر کیا ہے، مگر اس طرح کی دوسری پارٹیاں بھی تھیں، جن سے ہندوستان کا تقریباً ہر ایک صوبہ متاثر تھا۔ "رولٹ کمیٹی کی رپورٹ" اور "علماے حق......، جلد اول" میں ان پارٹیوں اور ان کے اثر و رسوخ کی تفصیل دی گئی ہے۔ یہاں ان کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جس طرح یہ زمانہ اظہارِ وفاداری اور تقسیم خطابات کا موسم بہار تھا، جس کا ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کو کامیاب کرنے کے لیے جداگانہ انتخاب کے مطالبے کا اشارہ کیا گیا تو بہت سے ممتاز افراد اس کی تعمیل کے لیے حاضر اور حسبِ ہدایت عمل پیرا ہو گئے۔ پھر مطالبۂ جداگانہ انتخاب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی فرقہ واریت کی عمر دراز کرنے کے لیے دو پارٹیوں کے قائم کرنے کا اشارہ ہوا، تو ایک ہی سال میں بلکہ تقریباً ایک ہی ماہ میں دو جماعتیں "مسلم لیگ" اور "ہندو مہاسبھا" قائم کر دی گئیں اور تیر اندازی کی مشق ہونے لگی۔ اسی طرح انقلاب آفریں سیاسی سرگرمیوں کے لیے یہ زمانہ وہ تھا کہ پنجاب کے لیفٹنٹ گورنر "سر ڈینزل ابٹسن" نے فرمایا تھا:

> "ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے متوقع تھے اور ان کے دماغوں میں ہوا بھری ہوئی تھی"۔ (رپورٹ رولٹ کمیٹی، صفحہ ۱۹۴)

شیخ الہند مولانا محمود حسن :

اس وقت حضرات علما کا کردار یہ تھا کہ انھوں نے جداگانہ انتخاب وغیرہ کی سیاسی تکنیکوں کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ ان کی نظر غلامی کی زنجیروں پر تھی، جن میں ہندوستان کا ہر ایک فرقہ جکڑا ہوا تھا اور ان کے سامنے دو پارٹیاں تھیں جو انقلاب برپا کر کے ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

لہٰذا انھوں نے اپنی اور اپنے بزرگوں کی تیس سالہ یا بقول مولانا سندھی رحمہ اللہ پچاس سالہ تخم پاشیوں کو بار آور کرنے کے لیے وہ خفیہ تحریک شروع کر دی جو ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کے سلسلے میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک بیان کا ایک فقرہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس بیان کے کچھ اور فقرے ملاحظہ فرمائیے۔ ان سے اس تحریک کی حیثیت اور اس کے وسیع اثرات پر روشنی پڑے گی اور چند مشہور و معروف شخصیتوں کے متعلق بھی قابلِ قدر انکشاف ہوگا۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کا بیان ہے :

" ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں حضرت شیخ الہند (مولانا محمود حسن رحمہ اللہ) نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کا حکم دیا۔..... چار سال تک جمعیت الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس جمعیت کی تحریکِ تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی، مولانا ابو محمد احمد لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔ پھر حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۳ء) میں "نظارۃ المعارف" قائم ہوئی۔ اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا، اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابو الکلام آزاد اور محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) میں حضرت شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا، اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی، لیکن

تعمیلِ حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا۔ اور میں افغانستان پہنچ گیا۔

دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انھوں نے بھی مجھے اپنا نمایندہ بنادیا۔ مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتا سکے۔ کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ جس جماعت کے نمایندہ تھے، اس کی پچاس برس کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیلِ حکم کے لیے تیار ہے۔ اس میں میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا"۔ (کابل میں سات سال، صفحہ ۵۵۔۱۵۴)

اس تحریک کی تفصیل اور اس کے نتائج کا بیان ہمارے کلام کا موضوع نہیں ہے۔ علمائے حق، جلد اول میں تفصیل ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہے اور اس تحریک سے متعلق سرکاری فائل جو انڈیا آفس لندن میں محفوظ تھا، چند مخلص حضرات کی کوشش سے اس کا مکمل عکس بھی حاصل کر لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی اشاعت کی توفیق بخشے، تو تحریک کے متعلق مزید تفصیلات سامنے آجائیں گی (۱)۔

بیسویں صدی کی پہلی دھائی میں جب مسلم لیگ وفادارانِ سرکار کی آغوش میں پرورش پا رہی تھی اور انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسی ایسی نرم تھی کہ اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ ناگپور میں وہاں کے پرجوش نوجوانوں کے مقابلے میں اجلاس کر سکے، اس کو بمبئی جاکر اجلاس کرنا پڑا تھا۔

اس وقت حضرات علما کا کردار کیا تھا؟

پہلے گزر چکا ہے کہ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں طے کیا گیا کہ جس نظام کی بنیاد عرصہ پہلے قائم ہو چکی ہے، اس کو منظر عام پر لایا جائے۔ چناں چہ ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) کو دیوبند میں ایک عظیم الشان جلسہ کیا گیا، جس میں اطراف واکناف کے مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع ہوا کہ اس زمانے میں اتنا اجتماعِ عظیم کسی جماعت کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس اجتماع کو تعلیمی اجتماع کا رنگ دیا گیا اور فضلا دارالعلوم کی دستار بندی کے عنوان سے یہ اجتماع کیا گیا۔ اگلے سال شوال ۱۳۲۸ھ / اکتوبر ۱۹۱۱ء میں جمعیت الانصار کا اجلاس مراد آباد

باب ہفتم:

مولانا ابوالکلام آزاد

وہ جاگنے والے جنھوں نے دوسروں کو جگایا، ان کو شمار کرایا جائے تو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا اسم گرامی سرفہرست ہوگا۔ یہ آپ کی فطری بیداری تھی کہ صرف سولہ سال کی عمر میں آپ کی انگلیوں نے زمام قیادت کو چھونا شروع کر دیا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور جو اس دور کی سب سے زیادہ بارسوخ جماعت تھی، اس کے اجلاس (۱۹۰۴ء، لاہور) میں آپ کی تقریر ہوئی جو ہر لحاظ سے حیرت انگیز تھی، جس نے آپ کی اعلیٰ قابلیت کے سامنے ہر ایک کی گردن خم کر دی۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً سولہ سال تھی۔ ۱۹۰۳ء میں آپ نے کلکتہ سے رسالہ ''لسان الصدق'' جاری کیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں الندوہ (لکھنؤ) کے ایڈیٹر ہوئے۔ ۱۹۰٦ء تا ۱۹۰۸ء میں وکیل (امرتسر) کے دوبارہ ایڈیٹر بنے۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں آپ نے ہفتہ وار ''الہلال'' جاری کیا۔ ملک میں سیاسی بیداری کا یہی زمانہ ہے۔ اسی دوران میں (۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۲ء) جمعیت الانصار کا قیام عمل میں آیا اور مراد آباد اور میرٹھ میں اس کے دو شاندار اجلاس ہوئے۔ ان جلسوں نے مسلمانوں میں عموماً اور دیوبند سے تعلق رکھنے والے علما میں خصوصاً سیاسی شعور بیدار کر دیا تھا۔

مولانا آزاد کے الہلال کا ہر مضمون مسلمان کے لیے جامِ حیات ہوتا تھا۔ جو آج بھی خزانۂ علم وادب میں جوہری شان رکھتا ہے۔ یہی زمانہ (۱۲۔۱۹۱۱ء) تھا، جس میں مولانا محمد علی جوہر رحمہ اللہ کے مشہور اخبار ''کامریڈ'' نے نہ صرف انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں

بیداری پیدا کی بلکہ انگریزوں کو بھی ہوش سنبھالنے پر مجبور کر دیا۔

۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان چھڑی تو اس نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمتہ اللہ علیہ کو یہاں تک متاثر کیا کہ آپ نے مدرسے کو بند کرایا، طلبہ کے وفود بھجوائے، فتوے چھپوائے، چندے کرائے، عام مسلمانوں میں احساس پیدا کیا۔ پھر آپ کے مخصوص ارادت مند ڈاکٹر مختار احمد انصاری نومبر ۱۹۱۲ء میں اپنا مشہور طبی مشن ترکی لے گئے۔ چھ ماہ بعد تقریباً مئی ۱۹۱۳ء میں یہ وفد واپس آیا تو ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء کو کان پور کی مسجد مچھلی بازار کا واقعہ پیش آ گیا، جس میں ایک سڑک نکالنے کے لیے مسجد کا ایک حصہ گرایا گیا تھا۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا تو بندوقوں اور رائفلوں کی گولیوں سے ان کی آواز بند کرانے کی کوشش کی گئی۔ علما میں سے بالخصوص مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی (لکھنو) نے اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ ان واقعات و حوالات کی تفصیلات سے تاریخ و سوانح کی کتابیں اور رسائل و اخبارات بھرے ہوئے ہیں اور سرکاری دستاویزات شائع ہو چکی ہیں۔

ایک سال بعد اگست ۱۹۱۴ء آیا تو یورپ میں جنگ عظیم چھڑ گئی، جس میں ایک طرف جرمنی اور ترک تھے اور دوسری جانب برطانیہ، فرانس اور روس۔ کچھ عرصے بعد گورنمنٹ نے ضروری سمجھا کہ سیاسی لیڈروں کو نظربند کر دیا جائے۔ اس وقت مسلمانوں میں سیاسی لیڈر وہی تھے جو شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علی، مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی وغیرہ۔ یہ وہ حضرات تھے جو ریشمی رومال کی تحریک میں بھی خاص حیثیت رکھتے تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ریشمی رومال کے متعلق خفیہ پولیس کی رپورٹ جو "تحریک شیخ الہندؒ" کے نام سے شائع کی گئی ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذائقہ بدلنے کے لیے رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کا بھی ایک اقتباس نقل کر دیا جائے:

"اگست ۱۹۱۶ء میں اس سازش کا انکشاف ہوا جو گورنمنٹ کے کاغذات میں "ریشمی خطوط کی سازش" کہلاتی ہے۔ یہ ایک تجویز تھی جو ہندوستان میں تیار کی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو، ادھر ہندوستان کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوں اور سلطنت برطانیہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس تجویز پر عمل کرنے اور اس کو تقویت دینے کے لیے ایک شخص مولوی عبیداللہ نے اپنے تین رفقا عبداللہ، فتح محمد اور محمد علی کو ساتھ لے کر اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو عبور کیا۔ عبیداللہ سکھ سے مسلمان ہوا ہے اور صوبہ جات متحدہ کے ضلع سہارن پور میں مسلمانوں کے مذہبی مدرسہ دیوبند میں اس نے مولوی کی تعلیم پائی ہے۔ وہاں اس نے اپنے جنگی اور خلاف برطانیہ خیالات سے عملۂ مدرسہ کے بعض لوگوں اور کچھ طلبہ کو متاثر کیا۔ اور سب سے بڑا شخص جس پر اس نے اپنا اثر ڈالا، وہ مولانا محمود حسن تھا، جو اسکول (مدرسہ دیوبند) میں بہت دیر تک ہیڈ مولوی (صدر مدرس) رہ چکا ہے۔ عبیداللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسے کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے ہندوستان بھر میں ایک اسلامی جوش اور برطانیہ کے خلاف تحریک پھیلائے، لیکن اس کی تجاویز کے راستے میں مدرسے کے مہتمم اور انجمن کے لوگ سدراہ ہوئے۔ انھوں نے اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو مدرسے کی ملازمت سے برخاست کر دیا۔ اس امر کا بھی ثبوت مل چکا ہے کہ وہ بعض حالات میں مصیبت میں گرفتار رہا۔ پھر بھی وہ مولانا محمود حسن کے پاس عام طور پر آتا رہا۔ مولانا کے مکان پر خفیہ جلسے ہوتے رہے اور اس بات کی اطلاع ملی ہے کہ سرحد سے کچھ آدمی بھی وہاں آتے تھے۔

۱۸ر ستمبر ۱۹۱۵ء کو محمود حسن نے بھی ایک شخص محمد میاں اور دوستوں کے ساتھ عبیداللہ کی مثال کی پیروی کی اور شمال کی طرف جانے کے لیے نہیں بلکہ عرب کے صوبے حجاز میں مقیم ہونے کی غرض سے ہندوستان چھوڑ دیا۔

روانہ ہونے سے پہلے عبیداللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ (نظارۃ المعارف القرآنیہ) قائم کیا اور دو ایسی کتابیں معرض اشاعت میں لایا، جن میں ہندوستانی مسلمانوں کو جنگی اور مذہبی جوش کی ترغیب دی گئی اور ان کو جہاد کے فرض اولی کے ادا کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا۔ اس شخص کا اور اس کے دوستوں کا، جن میں مولانا محمود حسن بھی شامل ہیں، عام مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک بہت زبردست حملہ ہندوستان پر ہو اور مسلمانوں کی بغاوت

سے اس کو تقویت پہنچے۔ اب ہم ذیل میں ان کوشش کا ذکر کریں گے، جو ان لوگوں نے اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لیے کیں۔

عبید اللہ اور اس کے دوست پہلے ہندوستانی مجنونانِ مذہبی کے پاس گئے اور اس کے بعد کابل پہنچے۔ وہاں وہ ترکی جرمن مشن کے ممبروں سے ملے اور ان سے تبادلۂ خیالات کیا اور تھوڑے عرصے کے بعد ان کا دیوبندی دوست مولوی محمد میاں انصاری بھی آن ملا۔ یہ آدمی مولانا محمود حسن کے ساتھ عرب گیا تھا اور ۱۹۱۶ء میں وہ اعلان جہاد ساتھ لے کر آیا، جو حجاز کے ترکی فوجی حاکم غالب پاشا نے مولانا محمود حسن کو دیا تھا۔ اثنائے راہ میں محمد میاں اس تحریر (جو غالب نامے کے نام سے مشہور ہے) کی نقلیں ہندوستان اور سرحدی قوموں میں تقسیم کرتا ہوا آیا۔ عبید اللہ اور اس کے ساتھی سازشی لوگوں نے ایک تجویز تیار کی تھی کہ جب سلطنت برطانیہ کو مٹا دیا جائے تو ہندوستان میں ایک عارضی حکومت قائم کی جائے۔ ایک شخص مہندر پرتاب اس کا پریزیڈنٹ ہونے والا تھا۔ یہ شخص ایک اچھے خاندان کا ہندو اور خودرائے اور وہمی سیرت کا آدمی ہے اور ۱۹۱۴ء میں اسے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں سفر کرنے کا پروانہ راہداری دیا گیا تھا۔ وہ سیدھا جنیوا کو گیا۔ وہاں ہردیال سے ملا اور ہردیال نے اس کا جرمن قونصل سے تعارف کرا دیا۔ اس کے بعد برلن چلا گیا۔

ایک شخص جو عبید اللہ کو اچھی طرح جانتا ہے، اس کی نسبت وہ لکھتا ہے کہ وہ شخص تجویزیں تیار کرنے میں بہت عجیب اور غیر معمولی آدمی تھا"۔ (باغیانہ تحریک کے متعلق رولٹ کمیٹی کی تحقیقات کی رپورٹ ۱۹۱۸ء، لاہور، صفحہ ۵۳۔۲۵۲)

مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے سلسلے میں تقسیم بنگالہ کی منسوخی کا واقعہ بھی آتا ہے۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کی منسوخی کا اعلان کیا گیا۔ یہ بنگالیوں کی فتح اور ہندوستان میں برطانوی عمال اور ان کے ہم نواؤں کی کھلی ہوئی شکست تھی اور یہ اس بات کا اعلان تھا کہ عوامی طاقت کے مقابلے میں وفاداری کی قیمت کچھ نہیں ہے۔ مسلم لیگ کے اربابِ قیادت نے بھی اس سے سبق لیا۔ صرف وفاداری ہی نہیں رہی، بلکہ حرفِ شکایت بھی زبان پر آنے لگا۔ مسلم لیگ کے مقاصد میں تبدیلی کی، ہندو مسلم اتحاد کی باتیں بھی ہونے لگیں اور کانگریس کی

طرف قدم بڑھنے لگے۔ یہاں تک ۱۹۱۶ء میں وہ تجویزیں منظور ہوئیں جو "میثاق لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہوئیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: روشن مستقبل، از صفحہ ۷۰ تا ۳۹۰)

پھر دسمبر ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس وقت لیگ میں یہ تبدیلی آگئی تھی کہ حریت پسند مسلم رہنماؤں اور حضرات علما نے اس اجلاس کو کامیاب بنایا۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری صدر استقبالیہ تھے اور مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب وغیرہما متعدد اکابر علما نے اس میں شرکت کی۔

مسلم اقلیت کے احساسِ کمتری کا مداوا:

بلحاظ اعداد و شمار مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ اس سے انکار کی گنجایش نہیں، مگر کیا یہ اقلیت درماندہ اور بے وزن ہے۔ اکثریت کی دستِ نگر اور اس کے رحم و کرم کی محتاج برطانوی سامراج کی سیاست نے جب اس لفظ کا استعمال کیا تھا، اس نے اقلیت کا یہی مطلب بیان کر کے مسلمانوں میں کمتری کا احساس کا بیج بویا تھا اور اس کو ہندو اکثریت سے خائف اور وحشت زدہ کیا تھا۔

مگر حضرات علما مسلم اقلیت کے لیے اس طرح کے توہمات کو مسلمانوں کی توہین سمجھتے تھے۔ یہ حضرات جب دوسروں کی مدد کے بغیر خود مسلمانوں اور مسلمانوں میں سے بھی ایک خاص جماعت کے اعتماد پر انگریزی سامراج کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنا چکے تھے اور اس پر بڑی حد تک عمل پیرا ہو چکے تھے تو وہ کب اس یاس انگیز تصور کو دل و دماغ کے کسی بھی گوشہ میں جگہ دے سکتے تھے!

۱۹۴۰ء میں رام گڑھ میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی زیرِ صدارت ہوا تھا۔ آپ کے خطبۂ صدارت کے اقتباسات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں، جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس اقلیت کو اقلیت قرار دے کر خوف زدہ کیا جاتا تھا، اس پر اور خود اپنے اوپر حضرات علما کو کتنا اعتماد تھا اور جس ہندوستان میں یہ بحث چل رہی تھی، اس کے

نقشے میں حقیقت اور واقعے کے لحاظ سے مسلم اقلیت کی حیثیت کیا تھی اور اس کے لیے خوف زدگی اور سراسیمگی مناسب تھی یا حضرات علما کے ارشاد کے بموجب خود اعتمادی اور حوصلہ مندی ذریعۂ عزت و عظمت تھی، جس سے برصغیر کی عظمت و عزت کو بھی چار چاند لگ سکتے ہیں۔

مولانا نے اپنے خطبے میں فرمایا:

"ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے، جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اور اس لیے انھیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی، دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورتِ حال میں نہیں دیکھ سکتی......"۔

"......معاملے کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیوں کر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ کی پیداوار ہے، جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس نقشے میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں:

۱۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لیے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم ہے، اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی......"۔

"برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے، ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کیے اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں، مگر ابھی

تک اس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی!"

"سیاسی بول چال میں جب اقلیت کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے، بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے، جو تعداد اور صلاحیت، دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس تعداد (Quantity) کے ساتھ نوعیت (Kind) کا سوال بھی کام کرتا ہے...... اقلیت ہونے کے لیے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (Factors) کی موجودگی بھی ضروری ہے"۔

"اب ذرا غور کیجیے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے"۔

"اس کی مجموعی تعداد ملک میں ...... نو کروڑ کے اندر ہے، وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی، لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے، خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی تعداد کی اتنی عظیم مقدار کے لیے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کر سکے گی؟"

"یہ تعداد کسی ایک ہی رقبے میں سمٹی ہوئی نہیں ہے، بلکہ خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائیں گے۔ اگر ہم اب بھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بنا پر "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصور کرتے رہیں، تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انھیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کو ایک اقلیتی گروہ ہونے کا احساس مضطرب کر سکے"۔

"ہندوستان کا آیندہ دستور (Constitution) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو، مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنی میں ایک آل انڈیا وفاق (Federation) کا جمہوری دستور ہوگا، جس کے کل حلقے (Units) اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے اور فیڈرل مرکز کے حصے میں صرف وہی معاملات رہیں گے، جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع، کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے سامنے لا سکتا ہے، وہ ان اندیشوں کے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے، جنھیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُر فریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحے کے لیے یہ باور نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کے مستقبل کے نقشے میں ان اندیشوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لیے پیدا ہو رہے ہیں کہ ایک برطانوی مدبر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے: "ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں اور گو تیرنا جانتے ہیں، مگر دریا میں اترتے نہیں۔ ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے، ہمیں دریا میں بے خوف و خطر کود جانا چاہیے۔ جوں ہی ہم نے ایسا کیا، ہم معلوم کر لیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے!"

ایک بنیادی سوال:

"تقریباً تیس برس ہوئے جب میں نے بہ حیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے اس مسئلے پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی، اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی، جو ۱۸۸۸ء میں کانگریس سے علاحدگی اور مخالفت کی اختیار کرلی گئی تھی۔ وقت کی یہ آب وہوا میرے غور وفکر کی راہ نہ روک سکی۔ میں بہت جلد ایک آخری نتیجے تک پہنچ گیا اور اس نے میرے سامنے یقین و عمل کی راہ کھول دی۔ میں نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں اور اس کی رفتار سے بے پروا نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے طرز عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کرلیں۔ یہ فیصلہ ہم کیوں کر کرسکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملے کی سطح پر نہ رہیں، اس کی بنیادوں تک اتریں اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے۔ ہم ہندوستانی مسلمان، ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں، یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے، تو بلاشبہ ہماری راہ دوسری ہوجاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان، آیندہ کا کوئی وعدہ، دستور اساسی کا کوئی تحفظ ہمارے شک اور خوف کا اصل علاج نہیں ہوسکتا۔ ہم مجبور ہوجاتے ہیں کہ تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کرلیں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اور ہمیں بھی خواہش رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے، لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں، ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیے، تو پھر ہماری راہ بالکل صاف ہوجاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک، تذبذب، بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیاں بھی نہیں پڑسکتیں۔ یقین، جہاد، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا کوئی الجھاؤ، حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن ہمارے قدموں کا رخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہوجاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے

بڑھے چلے جائیں!"

"مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ اس کا تصور بھی کر سکوں۔ میں کسی مسلمان کے لیے بشرطے کہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈھ کر نکال نہ پھینکی ہو، یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے آپ کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے!"

"میں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپ کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانانِ ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اوائل میں جب چار برس کی نظربندی کے بعد میں رہا ہوا، تو میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے اور نیا سانچا ڈھل رہا ہے۔ اس واقعے پر بیس برس گزر چکے۔ اس عرصے میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ حالات کے نئے نئے سیلاب بہے، خیالات کی نئی نئی لہریں اٹھیں، تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے۔ مسلمانوں کی عام رائے پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں"۔

"ہاں، وہ اب پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن آگے بڑھنے کی راہ اس پر پھر مشتبہ ہو رہی ہے۔ میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اثرات دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انھیں مخاطب کیا تھا، آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں...... میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں ان سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی ان سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی راہِ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی"۔

"میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا، مگر آج انھیں مجھ سے اختلاف ہے، میں انھیں اس اختلاف کے لیے ملامت نہیں کروں گا، مگر میں ان سے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا۔ یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے، ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہہ کر طے نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس

حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرتی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جا سکتیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بد قسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے، مگر انھیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملے پر غور کرلیں، وہ اس کے سوا کوئی راہ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے"۔

(خطبۂ صدارت اجلاس آل انڈیا کانگریس ۱۹۴۰ء، منعقدہ رام گڑھ، خطبات ابوالکلام آزاد، مطبوعہ لاہور)

ان اوراق کا مطالعہ کرنے والے حضرات اس اقتباس کی طوالت سے خاطر برداشتہ نہ ہوں، کیوں کہ اس اقتباس میں اگرچہ الفاظ صرف مولانا آزاد کے ہیں، مگر در حقیقت وہ ان ہزاروں علما اور قوم پرور مسلم رہنماؤں کے ترجمان ہیں جو اس وقت قربان گاہ حریت میں متاع زندگی کے نذرانے پیش کر رہے تھے۔

کتنی سچی بات ہے جو مولانا نے اس خطبے کے شروع میں فرمائی ہے :

"ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے، مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی۔ دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں، مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا"۔

۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا آزاد رحمہ اللہ نے متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کا یہ نقشہ پیش کیا تھا۔ اس کے بعد فرقہ وارانہ سیاست کا زلزلہ خیز بحران پورے ہندوستان پر اتنی شدت سے چھایا کہ اچھے اچھے دماغوں کی کایا پلٹ گئی۔ لیکن حضرات علما کے استقلال و استقامت میں کوئی لغزش تو کیا آتی، انھوں نے متحدہ ہندوستان کے نقشے پر دوبارہ نظر ڈالی تو ان کے حوصلے اور بلند ہو گئے، کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبوں کے علاوہ دو صوبے ایسے بھی ہیں جن میں مسلمانوں کو اگرچہ اکثریت حاصل نہیں ہے، لیکن ان کی حیثیت ایسی مؤثر ہے کہ عددی اقلیت کے باوجود وہ اکثریت کے ہم پلہ ہو سکتے ہیں۔ یہ دہلی اور آسام کے دو صوبے تھے، جہاں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی سے زیادہ ۳۴ یا ۳۵ فی صد تھی۔ اس تعداد میں رنگ و نسل وغیرہ کا کوئی اختلاف نہیں تھا، جس کا ثمرہ یہ تھا

کہ وہاں وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر سر سعد اللہ فائز تھے اور دہلی کے کارپوریشن میں بھی مسلمانوں کی طوطی بولا کرتی تھی۔ اس وقت حیدر آبا اسٹیٹ اپنی حیثیت میں قائم تھا جو ممکن ہے بہت تھوڑی تبدیلی کے ساتھ اپنی حالت پر قائم رہتا۔ کشمیر اور جموں وغیرہ پر مسلمانوں کی حکومت نہیں تھی، مگر ان کی اکثریت وہاں کی حکومت پر غالب رہتی۔

خلاصۂ بحث :

اس وقت اس داستان کا دہرانا اگرچہ ماتم سرائی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، مگر جب حضرات علما اور قوم پرور مسلمانوں کا موقف زیرِ بحث ہے تو خاتمۂ بحث پر اس نقشے کو ملاحظہ فرمالیجیے جو بطور خلاصۂ بحث پیش ہے۔ یہ نقشہ خود آپ سے فیصلہ کرانا چاہے گا کہ اگر آپ مسلمانوں کو اقلیت قرار دیں تو کیا اس کے لیے خوف وہراس اور مایوسی کو بھی جائز قرار دے سکیں گے۔

(۱) صوبہ پنجاب بشمول جالندھر، امرت سر، انبالہ اور رہتک وغیرہ، موجودہ ہریانہ بشمول شملہ وغیرہ وہماچل پردیش تا حدود ضلع سہارن پور و دہلی۔

(۲) صوبہ سرحد۔

(۳) صوبہ سندھ بشمول کراچی۔

(۴) صوبہ بلوچستان۔

(۵) صوبہ بنگال بشمول کلکتہ تا آسام۔

متحدہ ہندوستان میں یہ صوبے اس طول وعرض اور ان حدود کے ساتھ جو بیان کی گئیں، مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے تھے۔ وہاں حکومتیں بنتیں تو مسلمان وزیر اعظم ہوتے، جیسے پورے پنجاب میں سکندر حیات خاں اور پورے بنگال میں فضل حق وسہروردی وغیرہ وزیر اعظم رہے تھے۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل چار علاقوں میں مسلمانوں کی مؤثر حیثیت تھی

دہلی، آسام، کشمیر اور حیدر آباد (یعنی موجودہ آندھرا پردیش بشمول علاقہ تامل و مرہٹواڑہ)

حاشیہ:

(۱) الحمد للہ یہ کام تاریخی اور نہایت اہم سیاسی دستاویزات توفیق ایزدی سے "تحریک شیخ الہند" کے نام سے مرتب ہو کر شائع ہو گئی ہیں۔ (ا۔ س۔ ش)

باب دوم:

پہلی جنگِ عظیم کا خاتمہ اور سیاسی حالات میں تبدیلی

حضرات علما کا موقف

۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو دن کے گیارہ بجے اس جنگ کو ملتوی کیا گیا۔ جس کا آغاز ۱۴ر اگست ۱۹۱۴ء کو ہوا تھا۔

اس جنگ نے پوری دنیا کے سیاسی نقشے کو بدل ڈالا اور نقشے کی تبدیلی کے ساتھ مسائل بھی بہت سے کھڑے کر دیے، مگر ان کی تفصیل ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ البتہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے سیاسی مسائل اور ان میں علمائے کرام کا کردار ہماری بحث کا موضوع ہے۔

وہی ہندوستان جس میں سیاسی پارٹیوں کی سرگرمیوں کی بنا پر لیفٹننٹ گورنر پنجاب نے تقریباً ۱۹۰۹ء میں کہا تھا:

> "ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے متوقع تھے۔ ان کے دماغوں میں نئی ہوا بھری ہوئی تھی" (رپورٹ رولٹ کمیٹی)۔

۱۹۱۴ء یعنی آغازِ جنگ کے زمانے تک ان سرگرمیوں میں اور اضافہ ہو گیا تھا، لیکن

مدبرینِ برطانیہ نے جو وعدے آغاز جنگ یا زمانۂ جنگ میں کیے تھے، انھوں نے ان سرگرمیوں کا رخ مخالفت کے بجائے حمایت کی طرف پھیر دیا۔ چناں چہ زمانۂ جنگ میں ہندوستان نے ہر طرح برطانیہ کی مدد کی، لیکن خاتمۂ جنگ پر جب محسوس ہوا کہ تمام وعدے ایک فریب تھے، تو قدرتی طور پر غم و غصے کی لہر پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ مسلمانوں کے اشتعال کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ سلطنت ترکی کے تحفظ کے متعلق جو وعدے زمانۂ جنگ میں بار بار کیے گئے تھے وہ سب فراموش کر دیے گئے اور سلطنت ترکی کے حصے بخرے کر کے ہر ایک حصہ کسی محارب یورپین طاقت کے حوالے کر دیا گیا۔ اس وقت کانگریس نے بھی قدم بڑھایا۔ مسلمانوں نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور ایک متحدہ کوشش شروع ہو گئی۔ اس متحدہ کوشش کے لیے ستیہ گرہ بنیادی اصول بنا۔ جس کا علمِ قیادت گاندھی جی کے ہاتھ میں تھا۔

یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو بمبئی میں "ستیہ گرہ سبھا" قائم ہوئی اور اعلان کیا گیا کہ جو لوگ ستیہ گرہ کا حلف اٹھائیں وہ سول طور پر رولٹ ایکٹ کی مخالفت کریں گے۔ ابھی ڈیڑھ ماہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ۱۳ر اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا مشہور واقعہ پیش آگیا، جس میں انگریزی فوج نہتے عوام پر اس وقت تک فائر کرتی رہی جب تک اس کے پاس کارتوس ختم نہ ہو گئے۔

تحریکِ ترکِ موالات:

ستیہ گرہ کے علاوہ دوسرا حربہ عدم تعاون اور بائیکاٹ تھا۔ علما اس میدان میں پیش پیش تھے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ نے کراچی کی خلافت کانفرنس میں پولیس اور فوج میں بھرتی اور ان کی ملازمت کی حرمت کا فتویٰ صادر کیا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا نثار احمد صاحب (کان پوری)، پیر مجدد (سرہندی) اور گرد شنکر آچاریہ نے اس کی تائید کی، جس پر کراچی کا مشہور مقدمہ چلا اور ان حضرات کو دو دو سال قید بامشقت کی سزائیں ہوئیں۔ علما نے صرف تقریروں کو کافی نہیں قرار دیا بلکہ سرکاری

ملازمتوں بالخصوص پولیس اور فوج کی ملازمتوں کے حرام ہونے کا فتویٰ مرتب کیا گیا، جس پر سیکڑوں علما کے دستخط تھے۔

حکومت نے یہ فتویٰ ضبط کیا اور اس کے شائع کرنے والوں کو گرفتار کیا تو اب اس فتویٰ کی اشاعت تحریک کا ایک پروگرام ہو گیا۔ چناں چہ بار بار یہ خلافِ قانون فتویٰ طبع کرایا گیا اور تقسیم کیا گیا۔

اس موقع پر چوں کہ ہندو مسلمان خود متحد تھے، للٰذا متحدہ قومیت کا مسئلہ آزمایشی سوال بن کر سامنے نہیں آیا۔ ہندو مسلمانوں کا یہ اتحاد ملک اور قوم کے لیے خواہ کتنا ہی مفید ہو، مگر یہ اتحاد ان سفید فام پردیسیوں کو ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں تھا، جو اپنی بقا ہندو مسلم تفریق میں سمجھتے تھے۔

ترکِ موالات کی تحریک نے چورا چوری میں بھیانک شکل اختیار کر لی۔ ۵ر فروری ۱۹۲۲ء کو بلوائیوں نے پولیس اسٹیشن جلا دیا، کچھ سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ گاندھی جی نے اس کو ایسا اہنسا قرار دیا، جس کا نتیجہ ان کی نظر میں بہت ہولناک تھا۔ گاندھی جی کی نظر میں اس کی ہولناکی سے بچنے کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں تھی کہ تحریک ملتوی کر دیں۔

چناں چہ گاندھی جی کی تجویز کے مطابق کانگریس کی مجلسِ عاملہ نے باردولی میں ایک ریزولیوشن پاس کر کے اس سول نافرمانی کو معطل کر دیا، جس کی بدولت تیس ہزار آدمی جیل میں گئے تھے، جن میں زیادہ تعداد علما اور مسلم محبانِ حریت کی تھی۔ تحریک ختم ہوئی تو برطانوی وائسرائے کی حکومت نے صرف ایک ماہ بعد ۲۳ر مارچ ۱۹۲۲ء کو بہت اطمینان سے مہاتما گاندھی کو گرفتار کر کے چھ (۶) سال کے لیے جیل بھیج دیا (جو تقریباً ایک سال بعد رہا کر دیے گئے)۔ (روشن مستقبل، ۴۰۵)

آزادی کی تحریک کو پاش پاش کرنے کے لیے حکومت نے ایک سرنگ بچھائی جس میں اتحادِ قومی کو بھسم کرنے کے لیے آتش گیر مادہ بھرا ہوا تھا۔ کچھ نامور ہندو اور مسلمانوں کے ہاتھ میں فلیتے دے دیے جو سرنگ کو اُڑا سکیں۔ اس ابہام کی تشریح یہ ہے کہ کچھ ہندو لیڈروں

سے شدھی اور سنگھٹن، دوسری طرف مسلمانوں کے ایک لیڈر کی طرف سے اچھوت اقوام میں اشاعتِ اسلام کی تحریکیں چلوائیں۔ ان تحریکوں سے کسی مذہب کی ترقی تو کیا ہوتی البتہ ہندو مسلم بلوؤں کا سلسلہ شروع ہو گیا، جس نے چند ماہ کے اندر اتحاد کی عام فضا کو ڈائنامیٹ کر دیا۔

جمعیت علما کی آزادیٔ کامل کی تجویز :

ہندو مسلم بلوؤں سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے ۲۱ روز کا برت رکھا، جو ۲۷ر ستمبر ۱۹۲۴ء سے شروع ہوا تھا اور اس کا نتیجہ بھی خاطر خواہ رہا کہ بلوے رک گئے، لیکن جمعیت علمائے ہند کا اقدام بہت ہی عجیب تھا۔ اس نے کلکتہ کے اجلاس میں جو ۱۴ر مارچ ۱۹۲۶ء کو حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی زیرِ صدارت ہوا تھا یہ طے کیا کہ فرقہ پرستوں کی اشتعال انگیزیوں اور ان کے نفرت انگیز طرزِ عمل سے بالا ہو کر مسلمان اپنے ذرائع فراہم کریں اور آزادیٔ وطن کی جدو جہد میں آگے بڑھیں۔ یہ ان کا مذہبی فرض ہے۔ اس کی ادائیگی کے لیے دوسروں پر نظر نہ رکھیں خود اپنے اعتماد پر اس فرض کو انجام دیں۔

پوری تجویز یہ ہے :

"تجویز نمبر ۱۱ تا ۱۳ : جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس اس لحاظ سے کہ ہندوستان کو غیر ملکی حکومت سے آزاد کرانا اور اس کے حصول میں تمام مناسب اور جائز ذرائع کو استعمال کرنا، تمام باشندگان ہند کا قومی اور وطنی فریضہ ہے اور بالخصوص مسلمانوں کا تو مذہبی نصب العین بھی ہے، جیسا کہ جمعیت علمائے ہند متعدد بار اپنی سابقہ تجویزوں میں اس پر کافی روشنی ڈال چکی ہے۔ طے کرتا ہے کہ :

(الف) اگرچہ ہندوستان کی آزادی کے لیے جملہ باشندگان ہند کا اتحاد عمل اور باہمی رواداری اور اعتماد ضروری ہے، مگر بد قسمتی سے برادرانِ وطن کے بعض ممتاز لیڈروں نے دانستہ یا نادانستہ غلط رویے کی وجہ سے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا ہے، جس سے نہ صرف باہمی شقاق و منافرت کی خلیج بہت زیادہ وسیع ہو گئی اور ہوتی جاری ہے، بلکہ آزادیٔ وطن میں بھی

روزانہ مشکلات کی کڑیوں کا اضافہ ہو رہا ہے اور غیر ملکی حکومت کی قوت میں استحکام اور باشندگان ہند کی طاقت میں ضعف اور اضمحلال بڑھتا جا رہا ہے۔

اس لیے مسلمانوں پر لازم اور واجب ہو گیا ہے کہ وہ مسلم قوم کی منتشر قوتوں کو مجتمع کریں اور خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور آزادئ وطن کی مساعی میں دوسروں کا منہ تکے بغیر سرگرم عمل ہو جائیں اور بالخصوص اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ صدیوں تک ہندوستان اسلامی ممالک میں داخل رہا ہے اور غیر ملکی حکومت نے اس کو مسلمانوں ہی سے چھینا ہے۔ اس لیے اس آزادی کا فریضہ بھی براہ راست مسلمانوں پر اولاً بالذات عائد ہوتا ہے۔

(ب) سعئ آزادی میں اس امر کا لحاظ رکھنا بھی لازم ہے کہ غیر ملکی حکومت کے رحم و کرم پر بھروسا رکھنے اور اس کی آستانہ بوسی کرتے رہنے سے کبھی بھی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔

(ج) اس مقصد میں جو غیر مسلم حضرات مسلمانوں سے اتحاد عمل کی خواہش کریں، ان سے نہایت فراغ دلی کے ساتھ اسلامی اصول کے ماتحت متحد اور متفقہ کوشش کرتے ہوئے افتراق انگیز اور اشتعال آمیز کارروائیوں سے احتراز کرنا چاہیے، لیکن اگر ہندوستان کی بعض خود غرض جماعتیں اس نیک مقصد میں مسلمانوں کے ساتھ متحد نہ ہوں تو مسلمانوں کو کسی دوسرے کا منہ تکنے اور سہارا ڈھونڈھنے کی بجائے محض خدائے عزوجل کے بھروسے پر آزادئ وطن کے لیے کامل جد و جہد کرنی چاہیے۔

عملی کارروائیاں:

(۱) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ مسلم قوم عموماً اور علمائے کرام خصوصاً سیاسی امور میں غور و خوض کیا کریں، کیوں کہ سیاست، مذہب سے اسلام میں علاحدہ کوئی چیز نہیں ہے اور تمام قوم میں سیاسی امور کی تبلیغ کرتے ہوئے قوم کو بیدار اور اپنے حقوق کے پہچاننے کا طالب و ساعی بنائیں۔

(۲) آزادئ ہند کے فریضہ ہونے کی مذہبی، مالی، ملکی، انسانی وجوہ و اسباب کو نہایت غور و خوض سے دریافت کریں اور لوگوں کو سمجھائیں۔ دیگر مذہبی امور کی اشاعت کی طرح اس کو بھی ضروری سمجھیں، غلامی اور حقوق کے مسلوب ہونے کے مضار اور مفاسد کی

اشاعت نہایت پرامن طریقے سے کر کے ہر مسلمان کو زندہ کر دیں۔

(۳) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ قومی اخبارات و رسائل جن میں باشندگان ہند کے حقوق اور آزادی پر روشنی ڈالی جاتی ہے، ہمیشہ مطالعہ کیا کریں اور ایسے رسائل و مضامین لکھ کر عام پبلک میں شائع کرائیں اور مواعظ میں قوم کو ان امور پر خاص طور پر متوجہ کیا کریں۔

(۴) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ چوں کہ اہلِ ہند کے بے انتہا افلاس کے دور کرنے کا ایک اہم بالشان طریقہ یہ ہے کہ چرخوں کے سوت اور کھدر کو رواج دیا جائے اور عام طور پر غیر ملکی چیزیں نہ خریدی جائیں۔ اس لیے تمام مسلمانانِ ہند اس کے برخلاف اپنی جیب کے روپوں سے دشمنانِ اسلام کی مدد اور پرورش نہ کریں"۔

(جمعیت علما کیا ہے، جلد ۲، صفحہ ۲۰۔۱۱۹)

جمعیت علماے ہند اپنے طور پر تو جنگِ آزادی شروع نہیں کر سکی لیکن تقریباً تین سال بعد جب تک تحریکِ آزادی شروع کرتے ہوئے گاندھی جی نے نمک بنانے کے لیے مارچ کیا، جس کو "ڈانڈی مارچ" کہا جاتا ہے، تو مجاہدِ ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب اور ان کے رفقاء اس مارچ میں شریک تھے۔

پھر مارچ ۱۹۲۹ء میں جمعیت علماے ہند کا اجلاس عام ہوا، جس میں مسلمانوں کو دعوت دی گئی کہ جنگِ آزادی میں آگے قدم بڑھا کر حصہ لیں۔

جنگِ آزادی کا یہ دور قوم پرور مسلمانوں کے لیے بہت صبر آزما رہا۔ انگریزی حکومت کی پوری کوشش تھی اور اس کوشش میں اس نے تمام ذرائع جھونک دیے تھے کہ مسلمان تحریکِ آزادی کی مخالفت کریں، ورنہ کم از کم الگ رہیں۔

مسلمانوں کو تحریکِ آزادی کے مقابلے پر کھڑا کرنے میں تو انگریزی سرکار کامیاب نہ ہو سکی، چناں چہ جلوسوں، جلسوں یا پکٹنگ وغیرہ کے جو پروگرام کانگریس کے ہوتے تھے، مسلمان ان میں مزاحمت نہیں کرتے تھے، بلکہ عموماً ان میں شرکت کرتے اور ان کی رونق بڑھاتے تھے۔ لیکن وہ ان علما اور ان قوم پرور مسلمانوں کو پسند کرتے تھے جن کا نظریہ یہ تھا کہ

غیر ملکی اقتدار کی زنجیروں کو توڑنا ایسا فریضہ ہے جس کی ذمہ داری مسلم اقلیت پر بھی اتنی ہی ہے، جتنی اکثریت پر ہے، بلکہ مسلمان اس فرض کی ادائیگی کے زیادہ ذمہ دار ہیں، کیوں کہ زمامِ اقتدار جس کو انگریزوں نے غصب کیا اس کے امانت دار ہندو نہیں تھے، بلکہ اس کے امین مسلمان تھے۔ خود اپنے فرض کو ادا کرنے کے لیے اکثریت سے حقوق کا مطالبہ کوئی معنی نہیں رکھتا اور اس بنا پر یہ بھی صحیح نہیں کہ پہلے ہندو مسلم مفاہمت اس کے بعد جنگِ آزادی !......

ان حضرات کو یاد تھا کہ گذشتہ سو سال میں (۱۸۱۰ء تا ۱۹۱۰ء) جو تین تحریکیں انگریزوں کے خلاف اٹھیں (۱) ان کے محرک، بانی، مجاہد یا ورکر (کارکن) صرف مسلمان تھے، کیوں کہ وہ استخلاصِ وطن کو ایسا مذہبی فرض سمجھتے تھے، جو اکثریت کی شرکت کے بغیر ہی ان پر عائد تھا۔ چناں چہ ریشمی رومال کی تحریک کے بانی حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ نے ۱۹۲۰ء میں اسارتِ مالٹا سے واپس آکر مسلمانوں کو یہ ہدایت نہیں کی کہ برادرانِ وطن نے تحریکِ آزادی شروع کی ہے، مسلمان اس میں شریک ہو جائیں، بلکہ آپ نے اس پر مسرت ظاہر فرمائی کہ وہ مقصد جس کے لیے مسلمان جدوجہد کر رہے تھے، برادرانِ وطن اس پاک مقصد میں ان کے موید بن گئے۔

جمعیت علمائے ہند کا دوسرا اجلاس جو ربیع الاول ۱۳۳۹ء مطابق نومبر ۱۹۲۰ء میں دہلی میں ہوا تھا، شیخ الہند رحمہ اللہ اس کے صدر تھے۔ اس اجلاس کے اختتام پر آپ کا ایک تحریری بیان پڑھا گیا تھا۔ اس پیغام میں آپ نے فرمایا:

> "کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہندو) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتحاد و اتفاق کو بہت مفید اور منتج سمجھتا ہوں (۲)"۔

لیکن بد قسمتی یہ تھی کہ عام مسلمانوں کے ذہنوں کو اس پر مجبور کیا جا رہا تھا کہ پہلے

مفاہمت اور میثاق، اس کے بعد جنگِ آزادی۔ اس بنا پر وہ ان مسلمانوں کو غدار کہتے تھے جو بلاشرط جنگِ آزادی میں شریک ہو گئے تھے اور قربانیاں پیش کر رہے تھے اور ان کے خلاف پروپیگنڈہ اتنی سختی سے کیا جارہا تھا کہ اس زمانے میں ایک مسلمان کے لیے "کانگریسی ہونا" نہایت معیوب، انتہا یہ کہ گالی سمجھا جاتا تھا۔ ہندو دوست جیل جاتے تو ان کو بڑی شان سے جیل تک پہنچایا جاتا اور جب وہ سزا کاٹ کر رہا ہوتے تو بڑی شان سے ان کا استقبال کیا جاتا، مگر مسلمان علما اور قوم پرور جیل خانے میں حکومت کے معتوب رہتے اور باہر نکلتے تو جن سے احترام و اعزاز کی توقع کی جاسکتی تھی وہی ان کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

۱۹۲۹ء سے جو تحریک چلی تھی اس کے پروگرام بدلتے رہے، مگر اس کا سلسلہ ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء یعنی "آزادی کی تاریخ" تک جاری رہا۔ اسی عرصے میں دو قومی نظریہ اور اس کی بنیادوں پہ تقسیم ہند کی تحریک چلی، جس کو آگے بیان کیا جائے گا۔

حضرات علما کا موقف اس باسٹھ (۶۲) سالہ دور میں (۱۸۸۵ء تا ۱۹۴۷ء) یہ رہا:

(۱) شرکت کانگریس کے جواز کا فتویٰ دیا۔

(۲) انگریزی حکومت سے ترکِ موالات کی تحریک چلائی۔

(۳) پولیس اور فوج کی ملازمت حرام قرار دی۔

(۴) آزادیٔ کامل کی تجویز منظور کی اور

(۵) جب کانگریس نے تحریک شروع کی تو بلاشرائط جنگِ آزادی میں شریک ہو گئے۔

متحدہ قومیت اور دو قومی نظریہ

۱۹۳۸ء کے بالکل شروع کی بات ہے کہ دہلی کے ایک جلسے میں جو تحریک کے سلسلے میں بارہ ہندو راؤ میں ہوا تھا، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ یہ فقرہ ابھی پوری طرح فضا میں گونجا بھی نہیں

تھا کہ اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ وائسرائے بہادر کے گرمائی قیام گاہ یعنی شملہ سے لے کر دہلی و لاہور تک اور دہلی سے لے کر وزارتِ ہند کے مرکز "لندن" تک گویا بھونچال آ گیا۔ کوتاہ بین حامیانِ اسلام اور سرکار پرست طبقوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے سے مخالفت شروع کر دی۔ اخبارات کے اداریے، رسالوں کے مقالات اور شعرا کے ترانے، اس کی مخالفت کے لیے وقف ہو گئے۔ ایک فلسفے کو بہت اچھالا گیا کہ "اسلام قومیت" ہے اور مسلمان علاحدہ قوم ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ

(۱) "اسلام" قوم نہیں۔ کلام اللہ نے اس کو دین کہا ہے۔ "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ"۔ (آل عمران)

(۲) اسلام کا موضوع کردار اور عمل ہے۔ قومیت کا نہ عمل سے واسطہ ہوتا ہے نہ کردار سے۔ برما کا ہر ایک باشندہ برمی ہے، اس کی قومیت برمی، جرمن کا رہنے والا جرمن قومیت رکھتا ہے۔ اس کا عمل، عقیدہ، مذہب یا کردار کچھ بھی ہو۔

(۳) ان سے کہا گیا کہ اسلام اگر قوم ہے تو چند سال ہوئے عربوں نے ترکوں سے بغاوت کر کے عربی قومیت کا الگ جھنڈا کیوں نصب کیا، اور سلطنت ترکی کی دھجیاں کیوں بکھیریں۔ اسلام اگر قومیت ہے تو افغانستان، ایران، یمن اور مصر کے خانے الگ الگ کیوں ہیں۔

(۴) قرآن شریف اور احادیث میں کہیں بھی قوم کے لیے اتحادِ مذہب ضروری نہیں قرار دیا گیا۔ انبیاء علیہم السلام اپنے مخالفوں اور منکروں کو خطاب کرتے ہیں تو یہی فرماتے ہیں: "یاقوم" اے میری قوم کے لوگو!

(۵) پلوڈن جج کا ایک نجی خط تھا جو کسی طرح پریس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس میں تفصیل سے بیان کیا گیا تھا کہ انگریزی مفاد کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان دو حصوں پر تقسیم ہو "ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان" ہندو ہندوستان پر ہمارا قابو نہیں ہو گا، لیکن مسلم ہندوستان جس کا مرکز کراچی ہو گا، وہ ایک عرصے تک ہمارے تجارتی اور سیاسی مفادات کا مرکز بن سکتا ہے۔

اس طرح کے مضامین دوسرے انگریزوں کے بھی شائع ہوئے تھے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے ان مضامین کو اپنے رسالے "پاکستان کیا ہے؟" حصہ اول اور دوم میں جمع کر دیا ہے۔ اسی طرح مجاہدِ ملت مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری اور خود یہ راقم حروف اور دوسرے قوم پرور اہل قلم نے بھی اس طرح کے اقتباسات شائع کیے، جن کا واضح مفہوم یہ تھا کہ تقسیم ہند سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ ان کا سراسر نقصان ہوگا۔ اس لیے مسلمان یہ مطالبہ کر کے اپنے لیے بھلا نہیں کر رہے ہیں، بلکہ دوسروں کے آلۂ کار بن رہے ہیں۔

بہر حال حضرات علما اور قوم پرور مسلمانوں نے نہ دو قومی نظریے کی حمایت کی اور نہ اس کی بنا پر تقسیم ہند کے مطالبے کو جائز قرار دیا۔ انتہا یہ کہ آخر میں کانگریس اس مطالبے کے سامنے سپر انداز ہو گئی، لیکن جمعیت علمائے ہند نے تقسیم کے اس فلسفے کو تسلیم کرنے سے اس وقت بھی انکار کیا (اور گذشتہ ستائیس برس کے حالات اور تجربات و مشاہدات نے ثابت کیا ہے کہ جمعیت علمائے ہند کا فیصلہ درست اور اس کے رہنماؤں کی رائے صائب تھی)۔

تقسیم سے تین ماہ پہلے مئی ۱۹۴۷ء میں جمعیت علمائے ہند کا خصوصی اجلاس لکھنو میں کیا گیا، جس میں مطالبۂ تقسیم کا پس منظر بیان کرتے ہوئے شدت سے اس کی مخالفت کی گئی اور اس کو انگریزی ڈپلومیسی کی کامیابی قرار دیا گیا اور یہ کہ جب وہ ہندوستان چھوڑ رہا ہے تو مطالبۂ تقسیم کو منظور کر کے سب کچھ تباہ کر دینے کی جنگی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔

جمعیت علمائے ہند کا فارمولا:

بظاہر تقسیم ہند کی مخالفت منفی پہلو تھا۔ یہ منفی رخ جمعیت علمائے ہند یا قوم پرور مسلمانوں کا نصب العین نہیں بن سکتا تھا، بلکہ تقسیم ہند کے مقابلے میں جمعیت علمائے ہند اور قوم پرور مسلمانوں کا اپنا نظریہ اور اس کے مطابق ایک خاص فارمولا تھا۔ یہ فارمولا صرف تجویز کی حد تک نہیں رہا، بلکہ کانگریس کے اجلاسوں میں بھی اس پر بحثیں ہوئیں۔ پھر

۱۹۴۲ء میں "کرپس مشن" کے سامنے بھی یہ فارمولا پیش ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ کرپس مشن نے جو فارمولا پیش کیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ ۔ چھوٹا پاکستان بن سکتا ہے نہ بڑا پاکستان، وہ اسی فارمولے کا چربہ تھا۔ یہاں صرف یہ فارمولا پیش کیا جارہا ہے۔ باقی کرپس مشن کی تجاویز، ان کی منظوری، پھر ان کی تردید کی پوری داستان "علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے"، حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

جمعیت علمائے ہند نے یہ فارمولا ۳، اگست ۱۹۳۱ء کو مجلس عاملہ کے اجلاس سہارن پور میں منظور کیا تھا، یعنی تقسیم ہند سے سولہ سال پہلے۔ فارمولے کا متن یہ ہے:

فارمولا:

(۱) ہندوستان کی مختلف ملتوں کے کلچر، زبان، رسم الخط، پیشہ، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی ادارے، مذہبی عقائد، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف آزاد ہوں گے۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

(۲) دستور اساسی میں اسلامی پرسنل لا کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی، جس میں تصریح ہوگی کہ مقننہ اور حکومت کی جانب سے اس میں مداخلت نہ کی جائے گی اور پرسنل لا کی مثال کے طور پر یہ چیزیں فٹ نوٹ میں درج کی جائیں گی۔ (مثلاً احکام نکاح، طلاق، رجعت، عدت، خیار بلوغ، تفریق زوجین، خلع، عنین و مفقود، نفقہ زوجیت، حق حضانت، ولایت، نکاح و مال، وصیت، وقف، وراثت، تکفین و تدفین، قربانی وغیرہ)۔

(۳) مسلمانوں کے ایسے مقدمات فیصل کرنے کے لیے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے، مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا اور ان کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے۔

(۴) صوبوں اور فیڈرل اسمبلی میں اقلیتوں کے سیاسی اور دیگر حقوق کی حفاظت کے متعلق شکایات سننے اور فیصلہ کرنے کے لیے سپریم کورٹ قائم کیا جائے گا، جو مختلف ملتوں کے ارکان پر مشتمل ہوگا۔ اس کے فیصلوں کی تنفیذ فیڈرل حکومت کرے گی۔

(۵) صوبہ سرحد اور بلوچستان اور ان صوبوں میں جو نئے قائم کیے جائیں، طرز حکومت

وہی ہوگا جو دیگر صوبوں میں قرار دیا جائے گا۔

(۶) سندھ کو علاحدہ مستقل صوبہ بنا دیا جائے گا اور اس کا نظم اس طرح قائم کیا جائے گا کہ اس کی آمدنی اس کے مصارف کو کافی ہو جائے۔

(۷) حق رائے دہی تمام بالغوں کو دیا جائے گا اور کسی صورت میں کوئی ایسا طریقہ قبول نہ کیا جائے گا جس سے کوئی ملت اپنی تناسب آبادی کے مطابق رائے دہندگی کے حق سے محروم رہ جائے۔

(۸) طریقہ انتخاب مخلوط ہوگا۔

(۹) پنجاب و بنگال میں کسی ملت کے لیے ریزرویشن نہیں کیا جائے گا اور اگر کوئی اقلیت ریزرویشن کے لیے اصرار کرے تو تمام ملتوں کی نشستیں تناسب آبادی کے اعتبار سے ریزرو کر دی جائیں گی۔ باقی صوبوں کی انتخابی مجالس اور فیڈرل اسمبلی میں اقلیتوں کی نشستیں تناسب آبادی کے مطابق ریزرو کر دی جائیں گی اور مزید نشستوں کے لیے مقابلہ کرنے کا حق بھی حاصل ہوگا۔

(۱۰) طرز حکومت وفاقی ہوگا۔ تمام صوبے کامل خود مختار ہوں گے۔ فیڈرل اسمبلی کو صرف وہی اختیارات دیے جائیں گے جن کا تعلق تمام ہندوستان کے ساتھ یکساں ہوگا۔ غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں گے۔ الا یہ کہ تمام صوبے بالاتفاق تسلیم کر لیں کہ غیر مصرحہ اختیارات فیڈرل اسمبلی کو دیے جائیں گے۔

(۱۱) ملازمتوں پر تقرر ایک غیر جانبدار پبلک سروسز کمیشن کی طرف سے کیا جائے گا، جو لیاقت کا کم از کم معیار مقرر کر کے اس امر کا لحاظ رکھے گا کہ اس معیار کے ماتحت ہر ملت اپنی تناسب آبادی کے موافق حصہ پانے سے محروم نہ رہے۔ نیز ماتحت ملازمتوں میں بھی کسی خاص فرقے کی اجارہ داری نہ ہوگی۔ تمام فرقوں کو ان کا واجبی حصہ ملے گا۔

(۱۲) وفاقی اور صوبجاتی حکومتوں کی وزارتوں میں اقلیتوں کی نمائندگی باہمی تفاہم کے ذریعے قائم کر دی جائے گی۔

(۱۳) دستور اساسی کی بنیادی دفعات میں کوئی تغیر، ترمیم، اضافہ، اس وقت تک نہ ہو سکے گا، جب تک تمام وفاقی اجزا اسے منظور نہ کریں۔

(۱۴) یہ تمام دفعات ایک دوسرے کے ساتھ مرتبط ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک دفعہ

بھی منظور نہ ہوئی تو تمام فارمولا کالعدم ہو جائے گا (۳)۔ (جمعیت العلماء کیا ہے ؟، حصہ دوم، صفحہ ۸۱۔۱۷۸)

حواشی:

۱۔ حضرت مولانا سید محمد میاں کا اشارہ ان تحریکات کی طرف ہے:

۱۔ تحریک اصلاح و جہاد یا تحریک شہیدین (۱۸۱۰ء تا ۱۸۳۱ء)۔

۲۔ جہاد ۱۸۵۷ء (اس کے اثرات بعد کے کئی برسوں پر پھیلے ہوئے ہیں)۔

۳۔ تحریک ریشمی رومال (اس کا آغاز ۱۹۱۰ء میں جمعیت الانصار کے قیام سے ہوتا ہے اور اس کا زمانہ ۱۹۱۹ء میں جمعیت علمائے ہند کے قیام تک پھیلا ہوا ہے (ا۔س۔ش))۔

۲۔ حضرت کا یہ بیان جو جمعیت علمائے ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی ۲۷، ۲۸، ۲۹ ربیع الاول ۱۳۳۹ء مطابق ۱۹ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کے اختتامی اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا تھا، ضمیمے میں مکمل درج کر دیا گیا ہے (ا۔س۔ش)۔

۳۔ ناظم جمعیت علمائے ہند مولانا احمد سعید دہلوی نے اس فارمولے اور اس کے انگریزی ترجمے کو کتابچوں کی شکل میں چھپوا کر ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں اور اصحاب نظر و تدبر کو بھیجا تھا۔ یہ ہندوستان کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے کا بہترین حل اور مسلمانوں کے اطمینان کے لیے کافی تھا (ا۔س۔ش)۔

باب سوم:

ہنگامۂ تقسیم اور تبادلۂ آبادی کی قیامت خیزیاں

جمعیت علماے ہند کے اجلاس لکھنؤ کی تجویز کا یہ فقرہ ملاحظہ فرمائیے:

"برطانیہ ہندوستانی عوام سے بڑھتے ہوئے شعور آزادی کے مقابلے میں پسپا ہوتے ہوئے سب کچھ تباہ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے"۔

۱۰ ر مئی ۱۹۴۷ء کو یہ اجلاس ہوا تھا، جس کی تجویز کا یہ ایک فقرہ ہے۔ صرف تین ماہ بعد یہ فقرہ حرف بحرف کس طرح صادق ہوا، اس کا جواب پنڈت سندر لال جی سے معلوم کیجیے، جنھوں نے مغربی اور مشرقی پنجاب کے دورے کے بعد تفصیلی بیان پریس کو دیا تھا، جو ماہ نومبر کے اخبارات میں شائع ہوا۔ یہ فقرہ اس پورے بیان کی روح ہے:

"انتقال آبادی کی کارروائی انسانیت کے ساتھ گناہِ عظیم ہے۔ شاید اس سے تاریک تر گناہ انسانی تاریخ میں نہ ہوا ہوگا"۔

(بحوالہ مختصر تذکرہ خدمات جمعیت علماے ہند، حصہ دوم، صفحہ ۳)

اب ایک فقرہ اور ملاحظہ فرمالیجیے:

"جب فرقہ واریت کا ہولناک دیو ہندوؤں اور مسلمانوں کو --- مغربی پنجاب یعنی پاکستانی علاقے میں ہندوؤں کو اور باقی سب جگہ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا، تو گورنر جنرل ہندلارڈ ماؤنٹ بیٹن، گورنمنٹ ہاؤس دلی کی آرام گاہ میں اطمینان کی نیند سو رہے

تھے اور جب مشرقی اور مغربی پنجاب اور دہلی کے گلی کوچوں میں خون کے فوارے ابل رہے
تھے تو برطانوی سامراج کا یہ ناخدا بڑے اطمینان سے مسکراتا ہوا غیر ملکی فرقہ (یورپین) کی
کشتی ساحلِ مراد پر لگارہا تھا۔

ہندوستانی خود آپس میں ایک دوسرے کا خون پی کر وحشت اور درندگی کی پیاس بجھا
رہے تھے، مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ بہیمیت اور بربریت کے اس معلم اور ماسٹر کو عقیدت
کے ہار پہنارہے تھے(۱)"۔ (مختصر تذکرۂ خدمات جمعیت علمائے ہند، حصہ اول، صفحہ ٦)

تبادلۂ آبادی کے لیے اس وسیع پیمانے پر خوں ریزی اور تباہی و بربادی جس سے مشرقی و
مغربی پنجاب، دہلی، راجستھان اور یو۔پی کے مغربی اضلاع کے کروڑوں ہندو مسلمان متاثر
ہوئے، ضروری نہیں تھی۔ آبادی کا تبادلہ خون ریزی اور سفاکی کے بغیر بھی ہو سکتا تھا۔ اگر
پہلے سے عوام کو آمادہ ورنہ کم از کم ان کو خبردار کر دیا گیا ہوتا۔ مگر دردناک واقعہ یہ ہے کہ
تبادلے کے اس خوں ریز اور تباہ کن منصوبے کا اعلان تو ہوا ہی نہیں، اس کی خبر بھی اس وقت
ہوئی جب مسلح ہندو عوام کے مشتعل ہجوم مسلمانوں کے محلوں اور آبادیوں پر حملے کر رہے
تھے اور پولیس اور بعض جگہ فوج یا پولیس اور فوج کی وردی پہنے ہوئے بے درد نوجوان ان کی
پشت پر ہوتے تھے۔ اس طرح تقریباً ایک کروڑ ستم رسیدہ جو مغربی پنجاب سے نکالے گئے
تھے ان کا تباہ کن سیلاب مشرقی پنجاب سے گزر کر دہلی، مغربی یو۔پی اور راجستھان کے
اضلاع الور اور بھرت پور کی ریاستوں تک پہنچا، جس کے رگ و پے میں انتقام کے جذبات
بھڑک رہے تھے۔

اب کیا حال ہوگا ان مسلمانوں کا جن کو تقریباً ساٹھ (٦٠) سال پہلے سے ڈرایا اور سہمایا
جارہا تھا اور جنھوں نے اس خوف سے نجات پانے کے لیے تقسیم کا مطالبہ کیا تھا اور وہ اب ہر
طرف ہلاکت و بربادی اور تباہی دیکھ رہے تھے۔

علما اور قوم پرور مسلمانوں کا موقف:

لیکن ہر ایک مسلمان وہ تقسیم کا حامی رہا ہو یا مخالف، اگر اس کو دل کی مضبوطی اور دماغ

کی سنجیدگی میسر تھی تو اس کے سامنے یہ سوالات تھے :

۱۔ کیا ہمارے لیے اس وطن کو چھوڑنا جائز ہے، جس میں ہماری املاک اور جائیدادیں ہیں؟ جہاں معابد و مساجد، علمی ادارے اور تہذیبی و ثقافتی مراکز ہیں؟ جو سالہا سال بلکہ صدہا سال کا اندوختہ ہیں؟ جہاں بزرگوں کے آثار اور تقریباً ہزار سالہ زندگی کی روایات ہیں؟

۲۔ اگر اپنی یا دوسروں کی غلطیوں اور نادانیوں کی وجہ سے وطن کے حالات پرآشوب ہو گئے ہیں تو کیا اس کا چارۂ کار ترکِ وطن ہے یا جد و جہدِ اصلاح؟ گاؤں میں آگ لگ جانے کا علاج فرار نہیں ہوتا، بلکہ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ آگ بجھانا اس کا فرض ہے، خواہ اس میں اس کی جان جاتی رہے۔

(۳) حضرات علما کے سامنے قرآن پاک کی یہ آیت بھی تھی جو اس وقت بطورِ عقیدہ پڑھی جاتی تھی اور اسی درجے میں اس سے استدلال کیا جاتا تھا۔ مگر پچیس (۲۵) سال کے واقعات نے جن کے نتیجے میں اسلامی قومیت کا تخیل بے جان ثابت ہو چکا ہے اور قومیت کی نئی بنیادیں ابھر آئی ہیں، آیت کے ایک ایک حرف کی تصدیق کر دی ہے۔ یہ آیت اور اس کا ترجمہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں یہ ہے :

> قل من ینفعکم الضرار ان فررتم من الموت او القتل واذا لا تمتعون الا قلیلا ۵
>
> "(اے نبی) کہہ دو! کام نہ آوے گا تم کو بھاگنا۔ اگر بھاگو گے مرنے سے یا مارے جانے سے اور پھر بھی پھل نہ پاؤ گے مگر تھوڑے دنوں"۔
>
> (سورۂ احزاب (۳۳)، آیت ۱۶)

(۴) ایک اہم سوال یہ بھی تھا کہ اگر کچھ افراد کے لیے ترکِ وطن کامیابی اور بالفرض ترقی کا ذریعہ بن سکتا ہے تو کیا ہندیونین کے کروڑوں مسلمان یہ راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟ اور نہ صرف نومولود پاکستان جو خود اپنی مشکلات میں مبتلا ہے، بلکہ دنیا کا کوئی بھی ملک ان کروڑوں مسلمانوں کے لیے گنجائش نکال سکتا ہے؟ خود غرضانہ فیصلہ کچھ بھی ہو، مگر ہمدردیٔ ملت بلکہ

ہمدردئ نوع انسان کروڑوں انسانوں کے مفاد کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

(۵) دہلی اور مغربی یو۔پی کے حضرات یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ ان کی لغزش صرف ان کے لیے نہیں، بلکہ ہندوستان کے دور دراز گوشوں کے مسلمانوں کے لیے بھی تباہ کن ہو گی۔ ان کو خوف تھا کہ یہ سیلاب اگر دہلی، دہرہ دون، سہارن پور، مظفر نگر، میرٹھ، بجنور وغیرہ اور یو۔پی کے مغربی اضلاع سے آگے بڑھتا ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ جنوبی ہند کے پر امن علاقوں تک پہنچے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کرے۔

ان سوالات کا اور اس طرح کے بہت سے سوالات کا جواب ایک ہی تھا۔ اسی کو حضرات علما اور قوم پرور مسلمانوں نے مسئلے کا حل قرار دیا۔ یعنی خدا پر بھروسا کرتے ہوئے وطنِ عزیز میں قیام کرنا، استقلال و استقامت اور ہمتِ مردانہ سے حالات کو انگیز کرنا، کمزوروں کو سہارا دینا، خیر اندیش غیر مسلموں سے تعاون کرنا اور ان کا تعاون حاصل کرنا۔

اب ایک اقتباس ملاحظہ فرمالیجیے:

"چناں چہ خطرات کے انتہائی نازک وقت میں جب کہ پولیس اور فوج کی تمام طاقتیں بے کار ہو رہی تھیں، یہاں تک کہ ٹاؤن ہال جیسے مرکزی مقام میں جو امن کمیٹی کا ہیڈ کوارٹر بنایا گیا تھا، جس کے ماتحت پولیس اور فوج کام کر رہی تھی۔ ارکان امن کمیٹی کی موجودگی میں بلوائیوں کے ہجوم اپنے کام میں سرگرم تھے۔ ٹاؤن ہال کے آس پاس کشتگان خنجر بیداد کے لاشے اس کی شہادت دے رہے تھے کہ امن کی تمام کوششیں ناکام ہیں۔ اس وقت ہندو دوستوں نے مسلمان ساتھیوں سے کہا:

"آپ کا بڑا احسان ہو گا، اگر آپ قوم پرور مسلمانوں کے ساتھ اوکھلہ تشریف لے جائیں۔ وہاں فوجی دستے آپ کی حفاظت کریں گے۔ کیوں کہ آپ صاحبان جو ہمیشہ وطن پرور رہے ہیں، اگر اس تباہی اور ابتری کی بھینٹ چڑھ گئے تو ہماری ندامت اور بدنامی کی کوئی انتہا نہ رہے گی اور ہم اس قابل رہیں گے کہ دنیا میں کسی کو منہ دکھا سکیں"۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن کو یہ ہمت عطا فرمائی کہ چیں بہ جبیں ہو کر ہندو ساتھیوں کو جواب دیا کہ

"ہماری غیرت برداشت نہیں کر سکتی کہ ہم اپنے وطن میں پناہ گزیں بنیں۔ ہم نے وطن عزیز کو انگریز سے نجات دلانے کے لیے پچیس سال تک مصیبتیں جھیلی ہیں۔ آج شرارت پسندوں کے مقابلے میں ہم پشت نہیں دکھا سکتے۔ اگر میرے ہندو ساتھی اس دہلی میں فوج اور پولیس کی حفاظت عار سمجھتے ہیں تو یہ عار ہمارے لیے بھی قابل برداشت نہیں۔ ہم اپنی جگہ ثابت قدم رہیں گے یا ہماری کوششیں کامیاب ہوں گی۔ ورنہ ہم انھیں کوششوں میں جان دے دیں گے"۔

عام مسلمانوں کی حوصلہ افزائی :

مولانا حفظ الرحمن صاحب، ان کے بزرگوں اور ان کے رفقا کا یہ حوصلہ اور یہ ظرف خواہ کتنا ہی قابلِ قدر اور تاریخِ انسانیت کا عجیب و غریب شاہکار ہو لیکن وہ مسلمانوں کے لیے سہارا نہیں بن سکتا تھا، جب تک عام مسلمانوں میں بھی یہی حوصلہ نہ پیدا کیا جاتا، اور ان کے دلوں سے خوف وہراس دور کر کے ان کے اندر قوتِ مقاومت نہ پیدا کی جاتی۔ چناں چہ ان حضرات نے اپنے عزم و حوصلے کو صرف اپنے جذبات واحساسات تک محدود نہیں رکھا، بلکہ سہمے ہوئے اور خوف زدہ مسلمانوں کے گھروں اور محلوں تک پہنچ کر ان میں یہ عزم و حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کی، جس میں خدا کے فضل و کرم سے وہ کامیاب رہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو لوگوں نے دہلی کی گلیوں اور کوچوں میں گھومتے دیکھا۔ جہاں پہنچ کر وہ سراسیمہ اور حواس باختہ انسانوں کے مجروح دلوں پر تسلی و تشفی کا مرہم رکھتے تھے اور حفاظتی انتظامات کی تکمیل کراتے تھے۔

مولانا آزاد کا تاریخی خطاب :

۲۴؍ اکتوبر کو جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے جو تقریر کی اس کا ایک ایک فقرہ پیغامِ حیات ہے۔ چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

"میں نے تمھیں ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ ہٹالو اور بد عملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے، جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔ یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اس پر بھی غور کر لو۔ تمھیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ، اپنے دماغ کو سمجھنے سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں تم نے اپنی تاریخ کی صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف ہوتا ہے، حالاں کہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کر لو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمھارا جوش و خروش بیجا تھا، اسی طرح آج تمھارا یہ خوف و ہراس بیجا ہے، مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ کوئی طمع ہلا سکتی ہے، نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں، انھوں نے تمھیں جانے ہی کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمھارے ہاتھ میں سے اپنے ہاتھ کھینچ لیا تو یہ عجیب بات نہیں۔ یہ دیکھو تمھارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے رسول امی (ﷺ) کی معرفت فرمایا تھا:

"انّ الّذین قالوا ربّنا اللّٰہ ثمّ استقاموا فلا خوفٌ علیہم ولا ھم یحزنون

(احقاف)

"جنھوں نے کہہ دیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر جم گئے تو ان کو نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں"۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو! یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تمھیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو یا کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمھارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انھیں بھلاؤ نہیں، انھیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔

آؤ! عہد کرو کہ یہ ملک تمھارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔ آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود زلزلہ تھے۔ یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبانوں کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمھارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ چودہ سو برس پہلے کا نسخہ ہے، وہ نسخہ جس کو کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ اور وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان۔

"لاتَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ"۔

ترجمہ: "نہ بزدل بنو اور نہ غمگین ہو۔ تم ہی سربلند ہو گے اگر تم مومن ہو"۔ (۲)

(رسالہ "پیغام آزاد مدنی"۔ شائع شدہ ۱۹۴۷ء۔ مطبوعہ شکلا پریس، لکھنؤ)

حضرت شیخ الاسلام کے ایمان افروز ارشادات:

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ناقابلِ شکست شخصیت وہ تھی جس کو اس دور کا مجدد کہا جا سکتا ہے۔ جو ربع صدی سے زائد سے حریتِ وطن کے لیے ہر طرح کی قربانیاں پیش کر رہا تھا۔ آپ کا مستقل قیام دیوبند میں تھا۔ آپ نے صحیح محسوس کیا کہ اگر مغربی یو۔ پی کے سرحدی اضلاع دہرہ دون، سہارن پور، مظفر نگر وغیرہ سے مسلمانوں کا تخلیہ ہو گیا تو پھر پرشارتھیوں کا سیلاب ہندو یونین کے آخری کناروں تک پہنچے گا۔

آپ نے درسگاہ چھوڑی اور غم و غصے اور اشتعال کی دہکتی ہوئی فضا میں جس کے قدم قدم پر ہر طرح کا خطرہ تھا، آپ نے چند مخلص رفقا کے ساتھ ان اضلاع کے قصبات و دیہات تک کا دورہ کیا، مسلمانوں کو صبر و استقامت کا درس دیا، افسران حکومت کو بیدار کیا اور ان شکوک و شبہات کو دور کیا جو نہ صرف شرارت پسند فرقہ پرستوں بلکہ غیر مسلم قوم پروروں اور کانگریسی کارکنوں کے دماغوں کو مسموم کر چکے تھے۔

اس دور میں آپ نے کیا درس دیا اور آپ کا پیغام کیا تھا، افسوس یہ ہے کہ کوئی نامہ نگار ان کو قلم بند نہ کر سکا۔ صرف ایک تقریر قلم بند ہو کر شائع ہوئی ہے، جو آپ نے دیوبند کی جامع مسجد میں فرمائی تھی۔ اس کے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

"۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد بہت بڑی حد تک ہم غیر ملکی حکومت کے جوے سے آزاد ہو چکے ہیں، مگر انگریزی سیاست اب تک ہمارے اندر کام کر رہی ہے۔ حکومت کی پرانی مشین اسی طرح موجود ہے۔ پرانی حکومت کے کارندوں، راجاؤں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی ریشہ دوانیوں نے ہمارے وطن کو فساد اور قتل و غارت گری کے جہنم میں جھونک دیا۔ ان کی سازشوں کے سامنے حکومتیں مفلوج اور ملک کے خیر خواہ بے بس ہو گئے ہیں۔ اب یہ تمھاری طاقت ہے جو ان پر فتح پا سکتی ہے۔ اگر تم حالات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لو اور اللہ پر بھروسا کر کے فسادیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ تو اپنے وطن اور عوام کے امن کو تباہی کے اس جہنم سے نکال سکتے ہو۔ عوام کی طاقت ان سازشوں کو ملیامیٹ کر سکتی ہے"۔

مسلمانوں کو رحم و کرم کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

"اسلام محبت، رحمت، امن اور سلامتی کا پیغام ہے۔ اسلام ایک لمحے کے لیے بھی اس درندگی کو نہیں برداشت کر سکتا۔ جو لوگ مذہب کے نام پر یہ درندگی پھیلا رہے ہیں وہ اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔ اسلام اور قساوت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے"۔

آپ نے قرآن پاک اور احادیث سے اس مضمون کے متعلق بہت سے شواہد پیش کیے، پھر استقامت کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

"آج خوف اور بزدلی کا جو عالم ہے اس کے تصور سے بھی شرم آتی ہے۔ گھروں میں

بیٹھے ڈرتے ہو، راستہ چلتے ڈرتے ہو، اپنی بستیوں میں رہتے ہوئے ڈرتے ہو۔ کیا تم انھیں بزرگوں کے جانشین ہو جو اس ملک میں گنی چنی تعداد میں آتے تھے، جب یہ ملک دشمنوں سے بھرا ہوا تھا۔ آج تم چار کروڑ کی تعداد میں اس ملک میں موجود ہو، یو۔پی میں تمھاری تعداد ۸۵ لاکھ سے زیادہ ہے، پھر بھی تمھارے خوف کا یہ عالم کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے ہو۔ آخر کہاں جا رہے ہو؟ کیا تم نے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈھ لی ہے جہاں خدا کی گرفت سے بچ جاؤ گے، جہاں تم کو موت نہیں پا سکے گی؟ موت سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟"

میرے بھائیو اور عزیزو! موت ڈرنے کی چیز نہیں۔ ایک سچا مسلمان موت سے کبھی نہیں ڈرتا۔ موت کی تمنا کو اسلام نے صداقت کا معیار قرار دیا ہے۔ کفار کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن حکیم نے کہا ہے:

"فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ"۔ "موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو"۔

اگر تمھیں اسلام کی سچائی پر یقین ہے تو موت سے تمھارا یہ خوف بے معنی ہے۔ لموت جسر یوصل الحبیب الی حبیبہ (موت ایک پل ہے جو محبوب کو محبوب تک پہنچا دیتا ہے)، پھر اسلام کے نام پر جان دے دینا موت نہیں زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ، بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ"

"جو اللہ کے راستہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کو مردہ مت سمجھو، بلکہ یہ لوگ زندہ ہیں، تمھیں ان کی زندگی محسوس نہیں ہوتی"۔

قرآن شریف اور احادیث سے شہادت کے مراتب اور فضائل بیان کرنے کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:

"اس لیے جبن اور خوف اپنے دل سے نکال دو۔ اسلام اور جبن ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ صبر و استقلال کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرو۔ کبھی فساد کی ابتدا نہ کرو۔ اگر فسادی تم پر چڑھ آئیں تو ان کو سمجھاؤ، لیکن اگر وہ نہ مانیں اور کسی طرح باز نہ آئیں تو پھر تم معذور ہو، بہادری کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرو اور اس طرح مقابلہ کرو کہ فسادیوں کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ تمھاری تعداد خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو، مگر قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور اپنی عزت و حرمت کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دو۔ یہ عزت اور شہادت کی موت ہوگی"۔

الزامِ غداری :

وفاداری اور بے وفائی کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا :

"اس ملک کو تم نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ آیندہ بھی اس کو اپنے خون سے سینچنے کا عزم رکھو۔ یہی ملک کی حقیقی وفاداری ہے۔ اس ملک پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا کسی دوسرے باشندہ کا، اور اس کی خدمت کی ذمہ داری تم پر بھی اسی طرح ضروری ہے، جس طرح کسی دوسرے شخص پر عائد ہو سکتی ہے۔ وفاداری کے اظہار کا جو ڈھنگ تم نے اختیار کیا ہے، وہ نہ مفید ہے اور نہ ضروری۔ آج اس ملک کے ساتھ اظہار وفاداری یہ ہے کہ ترقی پسند جماعتوں کا ساتھ دو، فرقہ پرستی کے جراثیم کا خاتمہ کرو۔ وفاداری کے پرانے طور طریقے اب بدل چکے ہیں۔ اب افسرانِ حکومت یا حکومت کے ساتھ وفاداری کے کوئی معنی نہیں۔ جب تک اس ملک میں جمہوریت کا نام و نشان باقی ہے، حکومت ہم خود ہیں۔ وزراے حکومت کو ہم نے اپنے ووٹوں سے منتخب کر کے بھیجا ہے تاکہ وفاداری کے ساتھ ملک اور اہلِ ملک کی خدمت کریں۔ یہ ثابت کرنا ان کا فرض ہے کہ وہ عوام کے وفادار اور ملک کے سچے خیر خواہ اور خادم ہیں۔ ہم کو ان سے باز پرس کا حق ہے۔ پھر اس غلامانہ اظہار وفاداری کا کیا مطلب ؟"۔

مختلف سمتوں سے مسلمانوں کی وفاداری کا سوال اٹھایا جا رہا ہے اور یہ سوال کچھ اس طرح سامنے لایا جاتا ہے کہ گویا انڈین یونین میں مسلمانوں کو جو مصیبتیں پیش آتی ہیں وہ کسی غیر وفاداری کا نتیجہ ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا غیر وفاداری ہے جو انڈین یونین کے مسلمانوں نے کی ہے۔ ملک کی تقسیم سے پہلے بمبئی، بہار، گڈھ مکتیسر اور یو۔پی کے مختلف مقامات کے لوگوں نے جو دکھ اٹھائے ہیں وہ کس غیر وفاداری کا نتیجہ تھے اور تقسیم کے بعد دہلی اور مشرقی پنجاب کی تباہی عوام کی کس بے وفاداری کا نتیجہ تھی؟ کیا غداری تھی، جس کی سزا میں ان کو خانہ ویرانی اور تبادلہ آبادی کا تحفہ دیا گیا اور اگر یہ سب کچھ مسلمانوں کی غیر وفاداری کا صلہ تھا تو کلکتہ، نواکھالی، نپرا، مغربی پنجاب اور سرحد میں ہندوؤں اور سکھوں نے جو مصائب برداشت کیے ہیں وہ کس جرم کی سزا تھے؟ ملک کی تقسیم یقیناً زبردست نقصانات کا باعث ہوئی، لیکن اس کو غیر وفاداری کا معیار نہیں بتایا جا سکتا۔ اگر یہ غیر وفاداری کا معیار ہے تو منظور کرنے والوں پر بھی اس کی اتنی ہی ذمہ داری

ہے جتنی مطالبہ کرنے والوں پر عائد ہوتی ہے۔ قوم پرور مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی وہ کون سی فرقہ دار یا غیر فرقہ دار جماعت تھی، جس نے برطانوی حکومت کے اس تحفے کو قبول نہیں کیا۔ جمعیت علمائے ہند کے رہنما آخری لمحے تک چیختے رہے کہ تقسیم منظور کر کے ملک کو تباہی کے جہنم میں نہ جھونکو۔ ہندوستان کا وہ کون سا وفادار تھا جس نے جمعیت علما کی آواز کو سنا؟

تقسیم کے حق میں ووٹ دینا اگر غیر وفاداری کا معیار سمجھا گیا ہے تب بھی میں پوچھتا ہوں کہ ریاستی عوام (الور، بھرت پور وغیرہ کے باشندوں) کا جرم کیا تھا، جس کی پاداش میں ان کو خانماں بربادی نصیب ہوئی۔ یہ غریب تو ووٹ دینے کے بھی تصور وار نہ تھے۔ پھر ہندوستان کے چالیس کروڑ عوام میں کتنے لوگوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا، زیادہ سے زیادہ آبادی کے دس فیصد حصے کو مالی اور تعلیمی معیار کی بنا پر رائے دینے کا حق دیا گیا تھا۔ یعنی دس کروڑ مسلمانوں میں سے صرف ایک کروڑ کو رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ اگر یہ تعداد متفقہ طور پر تقسیم کے حق میں فیصلہ کرتی تب بھی مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ نہ ہوتا۔ یہ فیصلہ تو صرف رائے دہی بالغان کے اصول پر ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انتخابات میں ان تمام دفتری سازشوں اور مداخلتوں کے باوجود جو پچھلی حکومت اور اس کے کارندوں کی طرف سے حامیان تقسیم کے حق میں کی گئی تھیں۔ تقسیم کی حمایت میں (۴۵۱۱۵۶) ووٹ حاصل کیے گئے، جس کے معنی یہ ہیں کہ دس (۱۰) کروڑ مسلم عوام میں سے صرف ۴۔۲/۱ (ساڑھے چار) فی صد نے تقسیم کے حق میں اپنی رائے ظاہر کی۔ ۴۔۲/۱ فی صد کی رائے کو کس طرح پوری قوم کے سر تھوپا جا سکتا ہے اور کس طرح اس کی وفاداری یا غیر وفاداری کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟

بلاشبہ ملک کے ساتھ وفاداری ملک کے ہر بسنے والے کا قومی فریضہ ہے، لیکن اس وفاداری کا معیار کسی خاص مذہب کی پیروی نہیں ہے۔ کیا ہندوستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں نے اپنا خون نہیں بہایا؟ کیا مسلمانوں کے سوا سب ہی لوگ ہندوستان کے وفادار ہیں؟ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی پالیسی کے خلاف آج جو کچھ کیا جا رہا ہے کیا وہ ملک اور حکومت کے ساتھ وفاداری ہے؟ مذہبی بنیادوں پر ملک اور حکومت کے ساتھ وفاداری یا غیر وفاداری کا فیصلہ کرنا تاریخ کو جھٹلانا ہے۔ اس موقع پر کسی مذہبی فرقے کی وفاداری کے

سوال کو زیرِ بحث لانے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ تباہی کے بنیادی اسباب کی طرف سے چشم پوشی کی جائے۔ اور ملک کی رجعت پسند طاقتوں کے مقابلے میں اپنی شکست اور بے بسی کے لیے اس سوال کو آڑ بنایا جائے۔ عوام کی موجودہ تباہی اور ملک کی پر امن ترقی کو روکنے کی ذمہ داری صرف انھیں رجعت پسند طاقتوں پر ہے، جنھوں نے فرقہ وارانہ بنیاد پر عوام میں منافرت پیدا کی اور اس نفرت کو اپنے مقاصد کا ذریعہ بنایا۔ یہ عناصر کسی ایک فرقے تک محدود نہیں تھے، اس لیے کسی خاص مذہبی گروہ کی وفاداری پر شک و شبہ کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے"۔ (رسالہ "پیغامِ آزاد زندگی"۔ شکلا پریس، لکھنؤ، مئی ۱۹۴۸ء)

حواشی:

۱۔ پنڈت سندر لال کی یہ رپورٹ ضمیمے میں ملاحظہ کیجیے۔

۲۔ حضرت مولانا آزاد کی مکمل تقریر ضمیمے میں ملاحظہ فرمائیں۔

باب چہارم:

ہندوستان کا سیکولر نظامِ حکومت

اور ۱۹۴۷ء کے بعد جمعیت علمائے ہند کی خدمات

مولانا ابوالکلام آزاد یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے کہ دستور ساز اسمبلی نے بنیادی طور پر منظور کرلیا ہے کہ "ہندوستان سیکولر جمہوریہ" ہوگا۔

مولانا آزاد کے نزدیک یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ وہ اس کو کرشمۂ قدرت کہا کرتے تھے۔ مولانا کا یہ فخر صحیح تھا، کیوں کہ سیکولر جمہوریہ اگرچہ سیاسی دنیا میں سب سے زیادہ مقبول اور قابلِ قدر نظامِ حکومت ہے۔ مگر ہندوستان کا (طبقاتی اور مذہبی تعصبات پر مبنی) جو مزاج نامعلوم مدت سے بنا ہوا تھا اور دو قومی نظریے اور اس کی بنا پر مطالبۂ تقسیم کی کامیابی نے اس میں جو غضب آلود تلخی پیدا کردی تھی، اس کے لیے اس طرح کا نظام نہ دلکش تھا نہ قابلِ قبول، بلکہ ایک طرح کا چیلنج تھا؛

۱۔ شہری حقوق میں یکسانیت کو وہ کب برداشت کرسکتے ہیں جو طبقاتی تفاوت اور اونچ نیچ کو مذہبی اصول کی حیثیت دیتے ہوں۔

۲۔ کہا جاسکتا ہے کہ انگریزی دور اور اس سے پہلے مسلمانوں کے زمانۂ حکومت میں ہندوستان کو چین اور امن حاصل رہا۔ لیکن کیا ہندوستانیوں کو نظامِ حکومت کے بارے میں رائے کی آزادی بھی حاصل تھی؟ کیا ان کو یہ حق تھا کہ وہ اپنی آزادانہ رائے سے صوبائی اور

مرکزی حکومتوں کی تشکیل کر سکیں یا اس کے بر خلاف ان کو اقتدار کے تابع فرمان رہنا پڑتا تھا اور اقتدار کا مدار فوجی طاقت پر تھا۔

۳۔ یہ صورت جس کو آپ شاہنشاہیت یا سامراجی طرزِ حکومت کہہ سکتے ہیں، آج آپ کے نزدیک قابلِ نفرت بلکہ قابلِ لعنت ہے۔ لیکن جہاں صدہا سال بلکہ ہمیشہ سے یہی رواج رہا ہو، وہاں قوم کا یہی مزاج بن جاتا ہے۔ ایک طبقہ صاحبِ اقتدار ہوتا ہے دوسرا اقتدار پرست اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی عوام کا مزاج یہی بن چکا تھا۔

۴۔ اس مصنوعی یا حقیقی مزاج کے ساتھ جب مذہبی رنگ کا جذبہ یہ بھی ہو کہ حکومت ایک مخصوص نسلی گروہ کا حصہ ہے، فوجی خدمات بھی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ دوسرے نسلی گروہ خاص تقسیم کے بموجب ملک کے کاروبار میں حصہ لیں گے، لیکن اقتدارِ اعلیٰ کی باگ ڈور وہ نہیں سنبھال سکتے اور کچھ گروہ ایسے بھی ہوں گے جو خدمت گذاری کے علاوہ ملک کی دوسری خدمات میں حصہ بھی نہیں لے سکتے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ مزاج اور یہ جذبہ ''جمہوریت'' کو برداشت نہیں کر سکتا۔

۵۔ اب تک عام غلط فہمی یہ ہے کہ ہر ایک بالغ کو رائے دینے کا حق حاصل ہو۔ جمہوریت صرف یہی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جمہوریت نہیں ہے۔ یہ صرف تشکیلِ جمہوریت کی صورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت یعنی حقیقی جمہوریت کا تعلق ووٹر سے نہیں، بلکہ اس کے ذہن، جذبے اور طرزِ عمل سے ہے۔

۶۔ رنگ و نسل کا کوئی تفاوت اونچ نیچ نہ پیدا کرے، شہری حقوق سب کے لیے یکساں ہوں، ہر ایک فرد کو ترقی کا موقع ہو، مدارِ ترقی قابلیت ہو، ہر ایک فرد کو رائے اور ضمیر کی آزادی حاصل ہو، ہر ایک فرقہ اپنے رسم و رواج میں آزاد ہو، کسی فرقے کو دوسرے پر بالادستی حاصل نہ ہو، حکومت صرف منصف اور محافظ ہو، نہ کسی فرقے کی معاون اور مددگار ہو، نہ کسی مخالف۔ یہ ہے جمہوریت اور اسی کو جامۂ عمل پہنانے کا نام ہے سیکولرازم۔ مگر کیا فسطائی مزاج اس کو برداشت کر سکتا ہے؟ کیا جمہوریت، فسطائیت کی حریف اور اس کے لیے

چیلنج نہیں ہوتی ؟

۷۔ یہ چیلنج کس کی طرف سے ہو سکتا ہے ؟ اس کی ذمہ داری کس پر ہوتی ہے ؟ بلاشبہ یہ چیلنج قوم پرور نیشنلسٹ ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے تھا، جس کی قیادت مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کر رہے تھے۔ اور اسی وجہ سے سب سے پہلے مہاتما گاندھی کو اس قربان گاہ پر قربان ہونا پڑا۔ لیکن سیاسی جدوجہد میں اس چیلنج کی ذمے دار مذہبی اقلیتیں ہیں، جن میں سب سے زیادہ باوزن مسلم اقلیت ہے۔ جس کے لیے حوصلے کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اقلیت نہ سمجھے، بلکہ ایک ایسی طاقت سمجھے جس کے دامن میں تمام اقلیتیں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ جس کا یقین یہ ہے کہ ہندوستان صرف اکثریت کا نہیں بلکہ ہندوستان سب کا مشترک وطن ہے۔ اس کے مفادات سب کے لیے، اس کی ذمہ داریاں سب پر مشترک ہیں۔

اب خلاصۂ کلام یہ نکلتا ہے کہ مسلمان جمہوریۂ ہند کی ایک ایسی طاقت ہیں، جو جمہوریت اور سیکولرزم کے علم بردار اور تمام اقلیتوں کو اپنی پناہ میں لیے ہوئے ہیں۔ جمہوریت اور سیکولرزم کے اصول پر ملک کی تعمیر ان کا نصب العین ہے۔ یہ تعمیر انھیں کے ذریعے ہو سکتی ہے اور وہی اس کے معمار بن سکتے ہیں۔

مہاتما گاندھی کی قربانی اپنی جگہ پر بہت زیادہ قابلِ قدر بلکہ مشعلِ راہ ہے، مگر کیا اس میں شک ہے کہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان اپنی قربانیاں پیش کر چکے ہیں اور پیش کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ گذشتہ پچیس سال میں ہندوستان کے طول و عرض میں کتنے بلوے ہوئے، ان کی محتاط شمار پانچ ہزار سے کم نہیں۔ ان میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد اس سے کئی گناہ زیادہ اور تباہ ہونے والی املاک کی قیمت ارب کے ہندسے سے بھی آگے ہو گی۔

وجہِ نزاع اور بنائے مخاصمت کیا ہے ؟ صرف یہ کہ ایک بہت بڑے گروہ کا جس کو بہت سے ذرائع اور وسائل حاصل ہیں، عقیدہ یہ ہے کہ ہندوستان صرف ایک فرقے کا ملک ہے۔

صرف اسی فرقے کو یہاں حکومت کرنے کا حق ہے۔ یہ گروہ صرف مسلمانوں اور عیسائیوں جیسی اقلیتوں کو دیس نکالا دینا نہیں چاہتا، بلکہ وہ کانگریس جیسی سیکولر جماعتوں کو بھی غاصب سمجھتا ہے کہ جہاں صرف ایک فرقے کی حکومت ہونی چاہیے، وہاں کانگریس جیسی جماعتیں سیکولرزم اور سوشلزم وغیرہ لا رہی ہیں، جو سراسر غاصبانہ تصرف ہے۔

یہ گروہ صرف مسلمانوں کا دشمن نہیں، بلکہ ان سب کا دشمن ہے جو ہندوستان میں متحدہ قومیت کو ترقی دینا اور سوشلزم کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔ اس گروہ کا مقابلہ کرنا صرف مسلمانوں کا فرض نہیں ہے، بلکہ ان سب کا فرض ہے جو فرقہ پرستانہ تنگ نظری کو ملک کے لیے تباہ کن سمجھتے ہیں۔ اگرچہ صورتِ حال یہ ہے کہ اب تک اس گروہ کی تمام تخریب کاریوں اور فساد انگیزیوں کا نشانہ صرف مسلمان ہیں۔ مسلمان قربانیاں پیش کرنے سے نہیں گھبراتے، بالخصوص ایسی صورت میں کہ ان کی قربانیاں صرف ان کے لیے نہیں ہیں، بلکہ ملک کی تمام اقلیتوں کے لیے ہیں اور ان تمام پارٹیوں کے لیے ہیں، جو انسانی بھائی چارے، مساوات اور ترقی پذیر نظریات کی حامی ہیں، ملک کو سدا بہار سرسبز گلدستہ دیکھنا چاہتی ہیں اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کے گڑھے میں ڈالنا نہیں چاہتیں۔

مہاتما گاندھی کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کا وجود ہندوؤں کے بقا اور برتری کی ضمانت ہے، کیوں کہ ہندوؤں میں بہت سے فرقے ہیں جن کے عقائد اور رجحانات ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ مسلمان نہ رہیں تو یہ اندرونی فرقے ایک دوسرے کے مقابل جنگجو فرقے بن جائیں۔ نہ ان میں ظاہری یکجہتی باقی رہے اور نہ وہ اکثریت قائم رہے، جس کی وجہ سے ان کو تمام ملک میں برتری حاصل ہے۔

مسلمانوں کے جذبۂ ایثار میں امنگ پیدا ہو جاتی ہے، جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ عاقبت نااندیش فرقہ پرستوں کی طرف سے جو مصیبتیں ان کو اٹھانی پڑ رہی ہیں اور جو قربانیاں وہ پیش کر رہے ہیں وہ خود ان کے لیے بھی ہیں جو ان کو بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں۔

سیکولر جمہوریہ کا نقشہ :

جب مسلمان سیکولر جمہوریہ کے معمار ہیں تو تعمیر ملک کا وہی نقشہ کامیاب ہوگا جو یہ معمار تیار کریں گے۔ انھوں نے ایک نقشہ تیار کر لیا ہے۔ اس نقشے کی خوبی یہ ہے کہ اس گلدستے میں ملک کا ہر ایک پھول سدا بہار ہے۔ اس میں سیکولر کا رنگ سیاہ نہیں ہے، جو لامذہبیت کی تصویر ہو یا صرف اکثریت کے رنگ کو قومی دھارا بتاتا ہو۔ اس نقشے میں جمہوریت کی صورت ایسی زیبا دکھائی گئی ہے جس میں ہر فرد کو رائے کی آزادی حاصل ہے اور ہر فرقے کو بھی آزادی ہے کہ وہ اپنے مذہب، اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کو باقی رکھ سکتا ہے اور جہاں تک اس کے امکان میں ہو ترقی دے سکتا ہے۔ اس میں مسلمانوں یا کسی بھی فرقے کے پرسنل لا کو ختم نہیں کیا گیا۔ گلدستے کی رنگا رنگی کو اس شکل میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ہر فرقہ اپنے امتیازات اور خصوصیات کے ساتھ جلوہ افروز ہو رہا ہے۔ ان خصوصیات کو ختم کر دینے اور ان کی صورت بگاڑ دینے کو سیکولرزم نہیں بتایا گیا۔ اس میں سیکولرزم کو مذہب کا نہیں، بلکہ فرقہ واریت کا مخالف دکھایا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ نظام حکومت ہر ایک فرقہ واریت سے آزاد ہو۔ وہ نہ کسی فرقے کے مذہبی رجحانات میں مداخلت کرے اور نہ کسی فرقے کو یہ حق دے کہ وہ دوسرے کو مرعوب اور مغلوب کر سکے۔

یہ ہے وہ نقشہ جو حضرات علما اور قوم پرور مسلمانوں کا نصب العین ہے۔ منزل کٹھن، راستہ دشوار، فضا مخالف، موسم خراب، ہر طرف سے آندھیاں اٹھ رہی ہیں، طوفان آرہے ہیں، مگر قوم پرور ہندو مسلمانوں کا کارواں چل رہا ہے اور چلتا رہے گا، یہاں تک کہ منزل مقصود پر جا پہنچے۔

اختتامیہ

اُمید کی کرن :

گذشتہ چند سال میں دو انقلاب آئے۔ ایک انقلاب یہ تھا کہ کانگریس کے دو ٹکڑے ہو گئے، دوسرا انقلاب یہ تھا کہ پارلیمنٹ توڑی گئی۔ پارلیمنٹ کا انتخاب از سر نو ہوا۔

دونوں انقلابوں کی سربراہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی تھیں۔ کامیابی انھیں کو حاصل ہوئی۔ مگر اس سربراہ کے برابر اس کی مدد کے لیے کون کھڑے تھے : فخر الدین علی احمد اور جگ جیون رام۔ اس طرح کے انقلاب اور بھی آئیں گے۔ مسلمانوں کا اصول کار وہی رہنا چاہیے، جو گزشتہ پچیس سال سے رہا۔ یعنی جمہوریت پسند ترقی پذیر عنصر کی امداد۔ اسی صورت سے ملک ترقی کر سکتا ہے اور خود ان کی ترقی کا راستہ بھی یہی ہے۔

بیرونِ ہند

غالباً ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی کا وہ بیان اخبارات میں شائع ہوا تھا، جس میں لارڈ ارون وائسرائے ہند کو جواب دیتے ہوئے مہاتما گاندھی نے کہا تھا :

> "ہماری جدو جہد صرف ہندوستان کی آزادی کے لیے نہیں ہے، بلکہ ہماری جدو جہد دنیا کی تمام کمزور اور پس ماندہ قوموں کے لیے ہے۔ ہم ہندوستان کی آزادی اس لیے چاہتے ہیں کہ دنیا کی پس ماندہ اور کمزور قوموں کی امداد کر سکیں"۔

ریشمی رومال والی تحریک جس کا کچھ ذکر پہلے گزر چکا ہے، ہندوستان اس تحریک سے کوئی بڑا فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ البتہ اس تحریک کا فائدہ افغانستان کو پہنچا کہ اس تحریک کے سلسلے میں جو ولولہ اور نظم افغانوں میں پیدا ہو گیا تھا، اس نے میدانِ جنگ میں برطانیہ کو شکست دے کر اپنا استقلال تسلیم کرالیا۔ یہ اسی بلند نصب العین کی تمہید تھی کہ ہندوستان آزادی صرف اپنے لیے نہیں چاہتا، بلکہ اس لیے چاہتا ہے کہ دنیا کی پس ماندہ اور کمزور قوموں کو سہارا دے سکے۔

محمد میاں عفی عنہ

۱۹ر شوال ۱۳۹۴ھ، نومبر ۱۹۷۴ء

ضمیمہ نمبر ۱:

تقسیمِ ملک اور جمعیت علماے ہند کا موقف

۲۴، ۲۵/ جون ۱۹۴۷ء

جمعیت علماے ہند کی مجلسِ عاملہ کا ایک اجلاس دہلی میں ۲۴، ۲۵/ جون ۱۹۴۷ء کو منعقد ہوا۔ یہ اجلاس چوں کہ ۳/ جون کے ماؤنٹ بیٹن پلان کے اعلان کے بعد ہوا تھا اور آیندہ ملک کی جغرافیائی حالت کا واضح اندازہ ہو گیا تھا، اس پس منظر میں اس اجلاس اور اس میں منظور کی جانے والی تجاویز کی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ان تجاویز کی روشنی میں آج نصف صدی کی مدت گزرنے کے بعد ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اکابرِ جمعیت کی سیاسی فکر کتنی پختہ اور ان کا پیمانۂ بصیرت کتنا بلند تھا۔ اس اجلاس کی تفصیل اور تجاویز یہ ہیں:

الف: شرکاے اکابرِ جمعیت:

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ، مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مدظلہ، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی، مولانا سید محمد شاہد صاحب فاخری، مولانا نور الدین صاحب بہاری، مولانا بشیر احمد صاحب، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، محمد میاں ناظم جمعیت علماے ہند۔

ب : جمعیت کی خصوصی دعوت پر شریک ہونے والے زعمائے ملت :

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، جناب قاضی محمد احمد صاحب کاظمی، نور الرحمٰن صاحب قدوائی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، محمد جعفری صاحب، مولانا محمد میاں صاحب فاروقی (الٰہ آباد)، مولانا ابو الوفاء صاحب شاہجہان پوری، جناب قاضی بدر الحسن صاحب جلالی، خواجہ اظہر حسن صاحب سہارن پور، مولانا محمد قاسم صاحب شاہجہان پوری، مولانا حامد الانصاری غازی ایڈیٹر مدینہ، مولانا محمد کامل صاحب کلکتہ۔

اجلاس نے اپنی تین نشستوں میں کامل بحث و تمحیص اور غور و خوض کے بعد حسب ذیل تجاویز منظور کی ہیں :

۱۔ متعلق تقسیم ہند : جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتا ہے کہ جمعیت علمائے ہند نے ہمیشہ اس امر کا اعلان کیا ہے کہ جمعیت علما کا نصب العین ہندوستان کے لیے مکمل آزادی حاصل کرنا ہے۔

اور نیز یہ کہ ہندوستان کو تقسیم کرنا باشندگان ہندوستان کے لیے عموماً اور مسلمانان ہند کے لیے خصوصاً سخت مضرت رساں اور نقصان دہ ہے۔

چوں کہ جمعیت علما کی یہ پختہ رائے ہے، اس لیے یہ جلسہ ایک دفعہ پھر مسلمانان ہند کو متنبہ کرتا ہے کہ اس ملک کی تقسیم مسلمانوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور مہلک ثابت ہوگی۔

اس جلسے کی رائے میں مسلم حقوق کے تحفظ اور مسلمانوں کے سیاسی اور اقتصادی بچاؤ کی صحیح شکل وہی ہو سکتی تھی جو جمعیت علما نے اپنے فارمولے میں پیش کی تھی۔

یہ جلسہ اپنے اس پختہ عقیدے اور مضبوط رائے کا اظہار کرتے ہوئے گورنمنٹ برطانیہ کے اس بیان سے اپنی دلی بیزاری کا اظہار کرتا ہے جو گورنمنٹ برطانیہ نے ۳ر جون کو ہندوستانی لیڈروں کے حوالہ کیا ہے۔

اس پلان میں نہ تو مکمل آزادی کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہندوستان کی وحدت قائم رکھی گئی ہے۔ اس پلان میں نہ صرف یہ کہ ملک کو تقسیم کیا گیا ہے، بلکہ پنجاب و بنگال کے بھی ٹکڑے کر دیے گئے ہیں اور ہندوستانیوں میں باہمی منافرت بڑھا کر حکومتِ برطانیہ یا کسی اور اجنبی طاقت کو ہندوستان اور پاکستان میں مداخلت کے لیے آسانی پیدا کرتا ہے۔

اس پلان کی وجہ سے ہندوستان کی وحدت ہی پارہ پارہ نہیں ہوتی، بلکہ اس کی وجہ سے مسلمانانِ ہندوستان بھی تین حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور تقریباً پانچ کروڑ مسلمان ایک ایسی اکثریت کے حوالے کر دیے گئے ہیں جس کی تعداد ۲۵ کروڑ ہے۔

مسلمانوں کی یہ تباہی اور بیکسی اس غلط اور مستبدانہ رہنمائی کا نتیجہ ہے جس میں ایک عرصے سے وہ گمراہانہ طور پر مبتلا ہیں۔ اگر اس قسم کی نقصان دہ تقسیم ہی کو قبول کرنا تھا تو اس کا بہترین موقع وہ تھا جبکہ مسٹر گاندھی اور مسٹر راجگوپال آچاریہ اس تقسیم کی پیشکش کر رہے تھے یا اس کے لیے وہ وقت مناسب تھا جب کہ کیبنٹ مشن سے گفتگو ہو رہی تھی، لیکن اس وقت اس پاکستان کو چھلکا اور سایہ کہہ کر مسٹر جناح نے رد کر دیا تھا۔

اگر یہ چھوٹا اور بے حقیقت پاکستان اس وقت قبول کر لیا جاتا تو یقیناً ملک وحشیانہ قتل و غارت گری میں مبتلا نہ ہوتا اور ہزاروں بے گناہ مسلمان تباہ و برباد ہونے سے محفوظ رہتے۔

اس جلسے کی یہ قطعی رائے ہے کہ تقریباً پانچ کروڑ مسلمانوں کو ایک خطرناک حالت میں مبتلا کرانے کی تمام تر ذمہ داری مسلم لیگ کی اس غیر جمہوری اور مستبدانہ پالیسی پر عائد ہوتی ہے جو اس کا عام طرزِ عمل ہے، جمعیت علما کے نزدیک یہ ایک حقیقت ہے کہ کانگریس نے اس تقسیم کو منظور کر کے ملک کے مفاد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اور اپنے اصول سے کھلا انحراف کیا ہے۔

جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ اس امر کو واضح کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ جمعیت علما اپنے نصب العین مکمل آزادی کو حاصل کرنے کی جدوجہد اس وقت تک جاری رکھے گی جب تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتی، تاہم چوں کہ اب ملک کی

تقسیم ہو چکی ہے اور متعلقہ پارٹیوں نے اس کو منظور کر لیا ہے اس لیے مجلسِ عاملہ کا یہ جلسہ اپنی تمام جماعتوں اور ماتحت شاخوں کو خواہ وہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہوں یا مسلم اقلیت کے صوبوں میں، یہ ہدایت کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی غرض سے اصلاحی اور تعمیری کاموں پر توجہ کریں اور اس سلسلے میں حسب ضرورت مرکزی دفتر سے ہدایات حاصل کرتے رہیں۔

۲۔ مجلسِ عاملہ کا یہ اجلاس بلوچستان کے استصواب رائے کے متعلق جمعیت علما صوبہ بلوچستان کو اختیار دیتا ہے کہ وہ مسلم مفاد کے پیش نظر اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرے۔

۳۔ جمعیت علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کا یہ اجلاس ایسی حالت میں جب کہ صوبہ سرحد کے تمام رائے دہندوں کی اکثریت نے ابھی گذشتہ انتخابات کے موقع پر پاکستان کے خلاف اپنی آخری اور فیصلہ کن رائے کا اظہار کر دیا تھا اور اس وقت حکومت نے ان ہی انتخابات کے نتائج کی بنیاد پر ملک کی آزادی کی تعمیر کا وعدہ کیا تھا۔ اب گورنمنٹ برطانیہ کے پنجاب و بنگال کے طریقے کے برعکس اس صوبے میں استصوابِ رائے عامہ کے جدید شاخسانہ کو خلافِ قانون اور کھلی بے انصافی و جنبہ داری خیال کرتا ہے۔

مجلسِ عاملہ کی رائے میں حکومتِ برطانیہ کا یہ اقدام اور متعلقہ جماعتوں کا اس کو قبول کرنا باشندگانِ سرحد کی آزادیٔ رائے پر ناقابلِ تلافی ظلم ہے۔

اس کے باوجود بھی حکومتِ برطانیہ کو اگر بہ حالتِ موجودہ سرحد میں رائے عامہ معلوم کرنے پر اصرار ہے تو باشندگانِ سرحد کو صرف پاکستان اور ہندوستان میں محدود کرنے کی بجائے آیندہ طرزِ حکومت سے متعلق رائے کی پوری آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے لیے جس قسم کی حکومت پسند کریں اختیار کریں۔

۴۔ جمعیت علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کے اس اجلاس نے سلہٹ کے بارے میں کافی غور و خوض کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ سلہٹ کے مشرقی بنگال میں شامل ہو جانے سے مشرقی بنگال کی مسلم اکثریت کو تو محض ایک جزوی نفع پہنچتا ہے، جب کہ سلہٹ کے آسام سے نکل

جانے کے باعث آسام کی مسلم آبادی اس قدر قلیل اقلیت میں رہ جائے گی کہ صوبۂ مذکورہ میں اس کی آواز بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔ اس لیے اس مجلس کی رائے میں مسلم مفاد کے پیشِ نظر سلہٹ کا آسام میں شامل رہنا مشرقی بنگال میں شامل ہونے کے مقابلے میں زیادہ نفع بخش ہے۔

۵۔ جمعیت علماے ہند کی مجلسِ عاملہ کا یہ جلسہ مسلم اقلیت کے تقریباً پانچ کروڑ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے مذہبی تحفظ کے پیشِ نظر اس امر کو ضروری سمجھتا ہے کہ جلد از جلد مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کی ایک عام کانفرنس بلائی جائے اور اس میں مسلمانوں کے مذکورہ بالا اُمور پر غور کیا جائے۔ یہ جلسہ دفتر کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں ضروری اور مناسب کارروائی کرے۔

۲۵ر جون کو دوپہر کے قریب یہ اجلاس خیر و خوبی ختم ہوا۔

محمد میاں

ناظم جمعیت علماے ہند۔ دہلی

ضمیمہ نمبر ۲:

خطبۂ صدارت

افتتاحِ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ

علی گڑھ میں جامعۂ ملیۂ اسلامیہ (مسلم نیشنل یونی ورسٹی) کا افتتاح فرماتے ہوئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے ایک فکر انگیز اور ایمان افروز تاریخی خطبۂ افتتاحیہ پیش فرمایا۔ چوں کہ حضرت شیخ الہند اس موقع پر علیل اور نہایت کمزور تھے، آپ کو جلسہ گاہ میں چارپائی پر ڈال کر لایا گیا تھا، اس لیے خطبہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔ افتتاح کی رسم علی گڑھ میں ۲۹؍ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مسلم یونی ورسٹی کی مسجد میں ادا کی گئی۔ ۱۹۲۴ء میں جامعہ دہلی منتقل کر دی گئی۔ مولانا سید محمد میاں نے حضرت شیخ الہند کا یہ خطبہ اس رسالے کے آخر میں شامل کیا ہے۔ حضرت نے فرمایا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ——————— حامداً و مُصلّیاً و مُسلّماً

امّا بعد: جلسوں کی عام روش کا اقتضا یہ ہے کہ میں سب سے پہلے اس عزتِ صدارت پر جو کہ ایک نہایت ہی سر فروشانہ ایثار اور شجاعانہ جد و جہد کرنے والی جماعت کی طرف سے مجھ کو مرحمت ہوئی ہے۔ شکر گذاری اور منت پذیری کا اظہار کروں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ شکریہ چند وقیع اور شاندار الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا اور نہ مجھ کو محض رسمی اور مصنوعی ممنونیت کی نمایش اس بھاری ذمہ داری کے بوجھ سے سبکدوش کر سکتی ہے، جو فی الحقیقت آپ نے اس عزت افزائی کے ضمن میں مجھ پر عائد کی ہے۔ دو، چار پھڑکتے ہوئے جملے بلاشبہ

عارضی طور پر مجلس کو محظوظ کر سکتے ہیں، مگر میں خیال کرتا ہوں کہ میری قوم اس وقت فصاحت وبلاغت کی بھوکی نہیں ہے اور نہ اس قسم کی عارضی مسرتوں سے اس کے درد کا اصلی درماں ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے ایک قائم و دائم جوش کی نہایت ہی صابرانہ ثباتِ قدم کی، دلیرانہ مگر عاقلانہ طریقِ عمل کی، اپنے نفس پر پورا قابو پانے کی، غرض ایک پختہ کار، بلند خیال اور ذی ہوش محمدیؐ بننے کی۔

میں ہرگز آپ کے لکچراروں اور فصیح اللسان تقریر کرنے والوں کی تحقیر نہیں کرتا، کیوں کہ میں خوب جانتا ہوں کہ جو چیز سوئے ہوئے دلوں کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور زمانے کی ہوا میں اول تموّج پیدا کرتی ہے، وہ یہی دعوتِ حق کا غلغلہ ڈالنے والی زبان ہے۔ ہاں اس قدر گذارش کرتا ہوں کہ تاوقتیکہ متکلم اور مخاطب کے دل میں سعیٔ جمیل کا سچا جذبہ، اس کے اخلاق میں شجاعانہ استقامت و ایثار، اس کے جوارح میں قوتِ عمل اور اس کے ارادون میں پختگی اور چستی نہ ہو، محض گرم جوش تقریریں کسی ایسے کٹھن اور بلند پایہ مقصد میں آپ کو کامیاب نہیں کر سکتی:

کیف الوصول الی سعادَ و دونها
قلل الجبال و دونهن حتوف

اے حضرات! آپ خوب جانتے ہیں کہ جس وادیٔ پرخار کو آپ برہنہ پا ہو کر قطع کرنا چاہتے ہیں، وہ مشکلات اور تکالیف کا جنگل ہے۔ قدم قدم پر وہاں صعوبتوں کا سامنا ہے۔ طرح طرح کی بدنی، مالی اور جاہی مکروہات آپ کے دامنِ استقلال کو الجھانا چاہتی ہیں۔ لیکن حُفَّتِ الجنّۃُ بالمَکَارِہِ کے قائل کو اگر آپ خدا کا سچا رسولؐ مانتے ہیں (اور ضرور مانتے ہیں) یقین رکھیے کہ جس صحرائے پُرخار میں آپ گامزن ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس کے راستے سے جنت کا دروازہ بہت ہی قریب ہے۔ کامیابی کا آفتاب ہمیشہ مصائب و آلام کی گھٹاؤں کو پھاڑ کر نکلا ہے اور اعلیٰ تمناؤں کا چہرہ سخت سے سخت صعوبتوں کے جھرمٹوں میں سے دکھائی دیا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔

"کیا تم کو یہ خیال ہے کہ تم جنت میں جا گھسو گے اور تمھیں اس طرح کے حالات پیش نہ آئیں گے جو تم سے پہلے لوگوں کو پیش آئے ان کو سختیاں اور مضرتیں پہنچیں اور وہ اس قدر جھڑ جھڑائے گئے کہ پیغمبر اور اس کے ساتھ کے مومنین بول اٹھے کہ خدا کی مدد کہاں ہے؟ یاد رکھو کہ خدا کی مدد نزدیک ہے"۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ۔

"کیا تم نے یہ خیال کیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، بدون اس کے کہ اللہ جانچ کرے تم میں سے مجاہدین کی اور صابرین کی"۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ. وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۔

"کیا لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ محض آمنا کہنے پر وہ چھوڑ دیے جائیں گے، حالاں کہ ہم نے ان سے پہلے لوگوں کی آزمائش کی ہے۔ تو ضرور ہے کہ اللہ پرکھے گا، سچے اور جھوٹے لوگوں کو"۔

یہ حق تعالیٰ شانہ کی سنت مستمرہ ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی و تغیر کو راہ نہیں۔ کوئی قوم اللہ جل شانہٗ کی محبت اور اس کے راستے پر چلنے کی مدعی نہیں ہوئی، جس کو امتحان و آزمائش کی کسوٹی پر نہ کسا گیا ہو۔ خدا کے برگزیدہ اور اولوالعزم پیغمبرؑ جن سے زیادہ خدا کا پیار کسی پر نہیں ہو سکتا وہ بھی مستثنیٰ نہیں رہے۔ بے شک ان کو مظفر و منصور کیا گیا، مگر کب؟ سخت ابتلا اور زلزال شدید کے بعد۔

خود فرماتے ہیں: حَتّٰى إِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاءُ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ۔

پس اے فرزندانِ توحید! میں چاہتا ہوں کہ آپ انبیاء و مرسلین اور ان کے وارثوں کے راستے پر چلیں اور جو لڑائی اس وقت شیطان کی ذریت اور خدائے قدوس کے لشکروں میں ہو رہی ہے، اس میں ہمت نہ ہاریں اور یاد رکھیں کہ شیطان کے مضبوط سے مضبوط آہنی قلعے خداوندِ قدیر کی امداد کے سامنے تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطٰنِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا۔

"ایماندار تو خدا کے راستے میں لڑتے ہیں اور کافر شیطان کے راستے میں۔ پس تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔ بلاشبہ شیطان کی فریب کاری محض لچر پوچ ہے"۔

میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں (جس کو آپ خود مشاہدہ فرما رہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ، تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب و ضرب کا، حالاں کہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے اور دنیا کی متاعِ قلیل، خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ چناں چہ اسی قسم کے مضمون کی طرف حق تعالیٰ شانہ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ

اللّٰہِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَۃً۔ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ۔ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا۔ اَیْنَمَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ

"کیا تم نے ان لوگوں کی طرف نظر نہیں کی، جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ کو روکو اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو یکایک ان میں کا ایک فریق ڈرنے لگا، آدمیوں سے، خدا کی برابر یا اس سے بھی زیادہ! اور کہنے لگا کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا اور کیوں تھوڑی مدت ہم کو اور مہلت نہ دی؟ کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا سا ہے اور آخرت اس شخص کے لیے بہتر ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا اور تم پر ایک تاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ جہاں کہیں بھی ہو موت تم کو آ دبائے گی، اگر چہ تم نہایت مستحکم قلعے میں ہو۔"

اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں، تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔

کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں۔ لیکن اہلِ نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔

دوش دیدم کہ ملائکہ در میخانہ زدند ۔۔۔ گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند
ساکنانِ حرم سرِّ عفافِ ملکوت ۔۔۔ با منِ راہ نشین بادۂ مستانہ زدند
شکرِ ایزد کہ میانِ من واو صلح فتاد ۔۔۔ حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند
جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ ۔۔۔ چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر

کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں! یہ بے شک کہا گیا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومتِ وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔

اب ازراہِ نوازش آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ تعلیم سے روکنا تھا یا اس کے اثرِ بد سے؟ اور کیا یہ وہی بات نہیں۔ جس کو آج مسٹر گاندھی اس طرح ادا کر رہے ہیں کہ:

"ان کالجوں کی اعلیٰ تعلیم بہت اچھے صاف اور شفاف دودھ کی طرح ہے، جس میں تھوڑا سا زہر ملا دیا گیا ہو"۔

بارے خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری قوم کے نوجوانوں کو توفیق دی کہ وہ اپنے نفع و ضرر کا موازنہ کریں اور دودھ میں جو زہر ملا ہوا ہے اس کو کسی بھپکے کے ذریعے سے علاحدہ کر لیں۔ آج ہم وہی بھپکا نصب کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں اور آپ نے مجھ سے پہلے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ بھپکا "مسلم نیشنل یونی ورسٹی" ہے۔

مطلق تعلیم کے فضائل بیان کرنے کی ضرورت اب میری قوم کو نہیں رہی کیوں کہ زمانے نے خوب بتلا دیا ہے کہ تعلیم سے ہی بلند خیالی، تدبر اور ہوشمندی کے پودے نشوونما پاتے ہیں اور اسی کی روشنی میں آدمی نجاح و فلاح کے راستہ پر چل سکتا ہے۔

ہاں ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو اور اغیار کے اثر سے کلیۃً آزاد ہو۔ کیا باعتبارِ عقائد و خیالات کے اور کیا باعتبارِ اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبارِ اوضاع و اطوار کے ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔

ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں۔ بغداد اور قرطبہ کی یونی ورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے، جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا، اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ بغداد میں جب مدرسہ نظامیہ کی بنیاد اسلامی حکومت کے ہاتھوں سے رکھی گئی تو اس دن علما نے جمع ہو کر علم کا ماتم کیا کہ افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے پڑھا جائے گا! تو کیا آپ ایک ایسے کالج سے فلاح قومی کی امید رکھتے ہیں، جس کی امداد اور نظام میں بڑا قوی ہاتھ ایک غیر اسلامی حکومت کا ہو؟

ہماری قوم کے سربر آوردہ لیڈروں نے، سچ تو یہ ہے کہ امتِ اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درس گاہوں میں جہاں علومِ عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو، اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنے ہم قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجے پر رہ جائے، تو یوں سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایک ”آزاد یونی ورسٹی“ کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علاحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظامِ عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

مجھے لیڈروں سے زیادہ ان ”نونہالانِ وطن“ کی ہمت بلند پر آفرین اور شاباش کہنا چاہیے جنھوں نے اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لیے اپنی ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیا اور باوجود ہر قسم کی طمع اور خوف کے وہ ”موالاتِ نصاریٰ“ کے ترک پر نہایت مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے اور اپنی عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے نام پر وقف کر دیا۔

اب میری یہ التجا ہے کہ آپ سب حضرات بارگاہِ رب العزت میں نہایت صدقِ دل سے دعا کریں کہ وہ ہماری قوم کو رسوا نہ کرے اور ہم کو کافروں کا تختۂ مشق نہ بنائے اور ہمارے اچھے کاموں میں ہماری مدد فرمائے۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ و اصحابہ اجمعین۔

آپ کا خیر اندیش

بندہ محمود عفی عنہٗ

۱۶ر صفر ۱۳۳۹ھ۔ مطابق ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء

ضمیمہ نمبر ۳:

آخری بیان

حضرت شیخ الہند کا یہ آخری تحریری بیان ہے جو جمعیت علماے ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس مورخہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۲۰ء منعقدہ دہلی کے افتتاحی اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ اس کے بعد حیاتِ مستعار کے بقیہ چند دنوں میں جو دہلی میں بسر ہوئے تھے، ان میں حضرت نے کسی قسم کا کوئی سیاسی یا غیر سیاسی بیان نہیں دیا (ا۔ س۔ ش)۔

الحمد لِلّٰہ و سلام علیٰ عِبادِہِ الَّذِینَ اصطَفیٰ۔ امابعد!

حضرات علماے کرام، حضارِ جلسہ! میں اولاً جمعیت کی تمام کارروائیوں کے باحسنِ اسلوب انجام پانے پر خداے قادر و توانا کا شکر ادا کرتا ہوں اور ثانیاً یہ عرض ہے اگرچہ میں ناقابلِ انکار عذر کی وجہ سے آپ کے جلسوں کی شرکت سے بظاہر محروم رہا، لیکن آپ یقین کیجیے کہ میرا دل آپ کے مجمع سے بہت کم غائب ہوا ہے اور مجھے یہ معلوم ہو کر نہایت مسرت ہوئی کہ جس قوم کی روح (جماعت علما) نے بعض ان شعب سیاسیہ میں پھر ایک مرتبہ اپنی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہے، جن میں وہ بالکل مردہ سمجھی جاتی تھی اور جن میں اگر وہ مردہ ثابت رہتی تو اسلامی عزت و وقار کا بالکل ہی خاتمہ تھا۔ آپ رنجیدہ نہ ہوں تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا علم و تدین اگر اب بھی عالمِ اسلامی کے خوفناک مصائب سے آنکھ بند رکھنے کی اجازت دیتا تو آج دنیا ہماری غیرتِ ایمانی اور شرافتِ انسانی دونوں کے بیک وقت دفن کیے جانے پر ماتم کناں ہوتی۔

اور اب بھی اگر ہم تجاویز پاس کر کے اور صرف چند ساعت کی گرمیٔ محفل کو اپنی تمام تقریروں اور خطبوں کا ماحصل سمجھ کر منتشر ہو گئے تو ہماری مثال ٹھیک اس مریض کی سی ہو گی جو اکسیر شفا کی تکرار زبان سے بار بار کرتا ہے، لیکن اس کا استعمال ایک دفعہ بھی نہ کرے۔

میں اس وقت آپ سے رخصت ہو رہا ہوں اور جو کچھ مجھے کہنا تھا خطبۂ صدارت میں کہہ چکا ہوں اور مبسوط، مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی نے آپ کو آج ہی کے اجلاس میں سنایا ہے، اس کے ضمن میں بھی میرے مقاصد اور محسوسات نہایت خوبی سے ادا ہو گئے ہیں اور حضرات علمائے متدینین نے بحث و تمحیص کے بعد جو امور طے کیے ہیں، ان سے یہ بندۂ ضعیف عملاً علاحدہ نہیں ہے۔ اس لیے اب مجھ کو اس سے زائد کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم سب مل کر متوکلاً علی اللہ ان طے شدہ تجاویز پر عمل کرنا اور عمل کرانا شروع کر دیں، جن سے ہمارے ایمان، ہمارے کعبہ، ہماری خلافت، ہماری عزت و آبرو اور ہمارے مقاماتِ مقدسہ اور ہمارے وطنی اور قومی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ اگر اس وقت بھی ہم نے غفلت اور تن آسانی اختیار کی تو شاید عافیت حاصل کرنے کا یہ آخری موقعہ ہو گا جس کو جان بوجھ کر ہم ہاتھ سے کھوئیں گے۔ جو صراطِ مستقیم آپ نے معلوم کر لیا ہے، قرآن و سنت کی روشنی میں اس پر سیدھے چلے جائیے اور یمین و شمال کی طرف مطلق التفات نہ کیجیے۔

اِنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِه۔

"میرے اس سیدھے راستے کی اتباع کرو اور راستہ سے نہ ہٹو تاکہ تم سیدھی راہ سے نہ بھٹک جاؤ"۔

جو لوگ اس وقت آپ سے علاحدہ ہیں ان کو بھی حکمت اور موعظتِ حسنہ سے اپنی جماعت کے اندر جذب کیجیے اگر اس میں مجادلہ کی نوبت آئے تو "بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" ہونا چاہیے۔

کچھ شبہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے

زیادہ کثیر تعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں کے اتفاق و اجتماع کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں، اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حال اگر اس کے خلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ناممکن بنا دے گی اور دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ ہماری بداعمالیوں سے حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست کر سکے گی۔

ہاں! میں پہلے یہ کہہ چکا ہوں آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت و آشتی کو اگر آپ خوشگوار اور پائیدار رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دل نشین کر لیجیے اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی حدود میں اس سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں کسی دینی امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی ایک فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں، لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔

میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں، بلکہ یہ میری گذارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کے جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور

رزولیوشنوں کی زبانی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے۔ ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔

اگر فرض کرو ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو ان دونوں کے لیے مہلک نہیں، البتہ ان دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائیاں اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں، اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورے کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔

اب آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہ ہم کو اور آپ کو نیکی اور سمجھ دے اور ہمارے دلوں کو سیدھا کرنے کے بعد کج نہ کرے اور ہماری وجہ سے ہمارے مذہب پر دوسروں کو تضحیک کا موقع نہ دے اور ہم کو ہر ایک آسان اور کٹھن منزل میں صبر و استقلال کے ساتھ ثابت قدم رکھے اور اس وقت کے حالات سے بہتر حالات میں پھر ہم کو جمع کرے۔ آمین یارب العٰلمین (۱)۔

حاشیہ:

(۱) مدینہ ۱۳؍ دسمبر ۱۹۲۰ء بہ حوالہ ''تذکرۂ شیخ الہند'' از مولانا مفتی عزیز الرحمن مطبوعہ بجنور۔

ضمیمه نمبر ٤:

رپورٹ پنڈت سندر لال جی

گاندھی جی نے پنڈت سندر لال کو پنجاب بھیجا، تاکہ وہ حالات کا جائزہ لیں اور رپورٹ پیش کریں پنڈت جی نے مشرقی اور مغربی پنجاب کا دورہ کرنے کے بعد ایک مفصل بیان دیا جس سے پنجاب کے دونوں حصوں میں پیش آنے والے اندوہ ناک مظالم کا اندازہ ہوتا ہے، جو مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر اور ان دونوں قوموں نے مسلمانوں پر ڈھائے تھے۔ رپورٹ یہ ہے:

تمہید:

پنجاب کے فرقہ وارانہ فسادات و مظالم کے حالات جن کی بدولت لاکھوں انسانوں کی آبادیاں اپنے جدی مکانوں کو چھوڑنے پر مجبور ہوئیں اور جو مصائب و تکالیف ان کو برداشت کرنا پڑی ہیں، ان کے قصے تمام ملک میں پھیل چکے ہیں۔ فریقین کے اخبارات ان کو بڑے پیمانے پر شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان قصوں کے فطری اثرات اچھے اور برے، ملک پر پڑ چکے ہیں۔ لیکن زیادہ اثرات خراب ہی پڑے ہیں۔ بعض اوقات یہ قصے نہایت مبالغے کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ بالعموم یہ قصے یک طرفہ پہلو لیے ہوئے ہوتے ہیں، تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو قصے بیان کیے گئے ہیں، اصل واقعات ان سے بھی زیادہ تاریک ہیں۔ یہ تمام معاملہ اس درجہ غیر معمولی ہے کہ فی الواقع کوئی شخص بھی آنکھ سے دیکھے بغیر ان چیزوں کا تصور نہیں کر سکتا۔

نقصانات کا تخمینہ :

گذشتہ اکتوبر میں مشرقی اور مغربی پنجاب میں، میں نے دو ہزار میل سے زیادہ کا سفر کیا، میں حدود صوبۂ سرحد، کشمیر اور بہت سی ریاستوں کی سرحد تک گیا۔ کچھ سفر ریل سے، کچھ ہوائی جہاز سے، کچھ موٹر سے اور کچھ ملٹری گاڑیوں سے کیا۔ مجھے تیس تیس اور چالیس چالیس ہزار کے قافلوں میں گزرنے کا اتفاق ہوا۔ کچھ ان میں مسلمانوں کے قافلے تھے جو جانب غرب جارہے تھے اور دوسرے ہندو اور سکھوں کے تھے جو مشرق کی جانب جارہے تھے۔ ان پناہ گزینوں میں سے میں نے بہت سے لوگوں سے بات چیت کی۔ میں نے پناہ گزینوں کے کیمپوں میں قیام کر کے بھی دیکھا۔ مجھے ان لوگوں کو جمع کرنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کرنے کا بھی اتفاق ہوا، جو اب تک اپنے مواضعات میں رکے ہوئے تھے۔ اس موقع پر ایسے انفرادی قصوں کا بیان کرنا بیکار ہوگا جن سے کتابیں بھری جاسکتی ہیں۔ یہاں پر صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ سب چیزوں کو اپنی آنکھ سے دیکھنے اور حکام ضلع دہر ڈومینین کے افسران جو ایک دوسری ڈومینین میں کام کر رہے ہیں۔ شرقی اور غربی پنجاب کے اور سنٹرل پاکستان کے وزراء سے گفتگو کرنے کے بعد میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ ہر دو جانب مقتولین کی تعداد پانچ لاکھ ہوگی۔ مال و متاع کا نقصان چند ارب روپیوں کا ہوگا۔ اغوا شدہ لوگوں کی تعداد پچیس ہزار کے قریب ہوگی اور جن لوگوں کو زبردستی تبدیلیٔ مذہب پر مجبور کیا گیا ان کی تعداد اس سے زیادہ ہوگی۔

لاہور کی حالت :

اقتصادی تباہی اور نقصاناتِ عظیم کا اندازہ کرنے کے لیے میں لاہور کے شہر گیا، جس کے چاروں طرف فصیل ہے اور جو ابھی کچھ دنوں پہلے نہایت خوشحال خطہ تھا اور جہاں کی آبادی بہت گھنی تھی۔ اس خطے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی قریب قریب برابر تھی۔

مسلمانوں کی اکثریت بمشکل قدرے ایک فیصد کے ہو گی۔ شہر کا کاروبار زیادہ تر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ آج کم از کم دو تہائی لاہور محض ایک کھنڈر ہے۔ جب میں لاہور کے تباہ شدہ علاقے سے گزرا تو میری آنکھوں کے سامنے مظفر پور اور مونگیر کا وہ منظر آگیا جو ۱۹۳۴ء کے زلزلے کے بعد ہوا تھا۔ لاہور میں ہندوؤں نے مسلمانوں اور مسلمانوں نے ہندوؤں کے مکانوں کو آگ لگائی اور گرایا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پنجاب کا صدیوں کا دارالخلافہ تباہ و برباد ہے۔

امرتسر کی حالت :

میں امرتسر کی گلیوں اور بازاروں میں بھی گھوما۔ امرتسر کی حالت لاہور سے بھی زیادہ خراب ہے۔ لاہور میں تو ان ہندوؤں کے وزیر پناہ گزینوں کے کیمپ میں تھے۔ چند سو ہندو اپنے مکانوں میں بھی رہتے تھے۔ اگرچہ وہ زیادہ تر وہاں بھی مثلِ قیدی تھے اور ان کے لیے گلیوں میں نکلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کسی کسی ہندو کی دکان بھی کھلی دکھائی دیتی تھی اور کچھ مغربی پنجاب کے حکام کھلوا رہے تھے، لیکن امرتسر میں تو کوئی مسلمان نام کو بھی نہ تھا۔ مغربی پنجاب کا افسر جو وہاں تعینات تھا اور اس کے چند ملازم جو قریب قریب اپنے مکان کے احاطے میں مثلِ قیدی کے تھے۔ امرتسر میونسپلٹی کے ایک بڑے افسر نے مجھے بتلایا کہ چونگی کی آمدنی قریب ساڑھے چار لاکھ روپے کے ہوتی تھی اور امسال کل آمدنی کا تخمینہ پچیس تیس ہزار کا ہے۔ امرتسر کو قریب قریب تمام ہندو کاروباری لوگ بھی چھوڑ چکے ہیں اور جو ہیں وہ چھوڑ رہے ہیں اور دہلی اور بمبئی جا کر آباد ہو رہے ہیں، اس لیے کہ وہ امرتسر کو کچھ اس وجہ سے غیر محفوظ سمجھتے ہیں کہ وہ سرحد پر ہے اور کچھ اس وجہ سے کہ بدقسمتی سے ہندوؤں اور سکھوں میں بھی کشمکش بڑھ رہی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ایک نسل کے زمانے تک تو لاہور اور امرتسر کا پرانی خوشحالی تک پہنچنا مشکل ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ لاہور تو پھر بھی کاروبار اور تعلیمی مرکز بن جاوے گا، لیکن اگر صورتِ حال بالکل ہی نہ بدل جاوے تو امرتسر تو ہمیشہ کے لیے ایک

سرحدی سکھوں کی چھاؤنی بن کر رہ جاوے گا۔ مغربی اور مشرقی پنجاب کے بہت سے دیگر مقامات اور مواضعات کی کم و بیش یہی حالت ہے۔ جہاں دیکھیے گاؤں کے گاؤں غیر آباد پڑے ہیں، مکانات جلے پڑے ہیں، مویشیوں کے گلے جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں اور کوئی دیکھنے والا نہیں، فصلیں تیار کھڑی ہیں اور کوئی کاٹنے والا نہیں، زمینیں خالی پڑی ہیں اور کوئی جوتنے والا نہیں، تمام کاروبار، تمام تجارت قریب قریب تباہ ہو چکی ہے۔ اس لیے کہ اگر تجارت کا ایک شعبہ ایک قوم کے ہاتھ میں تھا تو دوسرا شعبہ دوسرے کے ہاتھ میں تھا۔ زندگی اس طرح پر گھلی ملی تھی کہ ایک کی تباہی کے بعد دوسرے کا تباہی سے بچنا مشکل تھا۔ لاہور کے ایک بازار میں مسلمان درزیوں نے مجھ سے کہا کہ ان کے بچے بھوکے مر رہے ہیں اس لیے کہ ہندو بازار اور ہندو خریدار دونوں ختم ہو چکے ہیں۔

پناہ گزینوں کے قافلے:

جو لوگ، بچے، عورتیں لمبی لمبی قطاروں میں قافلوں کی شکل میں سفر کرتے ہیں، ان کے مصائب کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ انتقال آبادی اور انخلاے کاروبار کی بعینہ یہی صورت ہے کہ بڑے بڑے درختوں کو اس زمین سے جہاں انھوں نے پرورش پائی ہے جڑ سے اکھاڑ کر سیکڑوں میل کے فاصلے پر لے جا کر دوبارہ لگایا جاوے اور وہ بھی نہایت بھدے قسم کے طریقے سے۔ یہی نہیں کہ اس سفر میں بہت سے درخت مر جاویں گے بلکہ وہ بھی جو اپنے جاے مقصود پر پہنچ جاویں گے۔ ان میں سے بھی بہت سے نئی آب و ہوا میں زندہ نہ رہ سکیں گے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ جو درخت اکھاڑے جاتے ہیں وہ ہی خراب نہیں ہوتے، بلکہ جو درخت باقی رہ جاتے ہیں ان کی بھی جڑیں ہل جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر دو جانب مکمل تباہی اور بربادی ہی نظر آوے گی۔ آج کل مشرقی اور مغربی پنجاب کی یہی کیفیت ہے۔ امرتسر اور لاہور کے درمیان بھی ہزاروں مٹی کے ڈھیر سڑک کے دونوں جانب دیکھنے میں آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ان پناہ گزینوں کی قبریں تھیں جو سفر میں انتقال کر گئے۔

غالباً یہ مٹی کے ڈھیر کسی شخص کی قبر کے نہ تھے، بلکہ ہر ایک ڈھیر میں کثیر تعداد میں مردے دفن تھے۔ جب ایک چھوٹا سا قافلہ جو مغرب کی جانب سے دس گیارہ موٹر ٹھیلوں میں آتا ہوا لاہور پہنچا تو ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان موٹر ٹھیلوں میں جن میں ان گنت آدمی بھرے ہوئے تھے پانچ عورتوں کے راستے میں بچے پیدا ہوئے۔ ان میں چار ماؤں نے تو اپنے چھوٹے بچوں کو کسی طرح بچالیا، لیکن پانچویں کے متعلق یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ راستہ میں گر گیا یا ٹھیلے میں ہی کچل گیا۔ خوش قسمتی سے گنگارام ہاسپٹل لاہور میں تھوڑے بہت مختصر پیمانے پر کام ہو رہا ہے۔ یہ مائیں اور بچے فوراً اسپتال بھیج دیے گئے۔

جب ہم لوگ امرتسر اور جالندھر کے درمیان دریائے بیاس کے بائیں کنارے موٹر سے سفر کر رہے تھے تو ہم کو راستے میں ایک بڑا قطعۂ آراضی کا ایسا ملا کہ جن پر بستر ے، ٹرنک اور دیگر قسم کا سامان بکثرت بکھرا ہوا پڑا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ تین چالیس ہزار آدمیوں کا ایک قافلہ مشرق کی جانب سے آرہا تھا۔ اس قافلے نے اس جگہ پر قیام کیا۔ ان بدنصیبوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس رقبے میں بیاس اور دوسری چھوٹی ندی کا پانی آجاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طوفان کے پانی نے ہر فرد بشر کو ختم کر دیا۔

انتقالِ آبادی کا فیصلہ ایک بڑا گناہ ہے:

انتقال آبادی کی کارروائی انسانیت کے ساتھ ایک بڑا گناہ عظیم ہے۔ شاید اس سے تاریک تر گناہ انسانی تاریخ میں نہ ہوا ہوگا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ مجھے تو اکثر خیال آتا ہے کہ کم از کم ہمارے ایک درجن چوٹی کے لیڈر جن میں سب پارٹیوں کے لیڈر شامل ہونے چاہئیں اور نیز برطانوی قوم کے سیاسی لیڈروں پر اس جرم کا مقدمہ انھیں پناہ گزینوں کے سیدھے اور غیر جانبدار نمایندوں کی عدالت میں چلایا جانا چاہیے جن پر ان مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا ہے۔

فسادات کی ابتدا :

اب ذرا سوچئے کہ جرائم کا سلسلہ کیسے شروع ہوا۔ ہر غیر جانبدار شخص یہ تسلیم کر چکا ہے کہ موجودہ مصائب کی ابتدا مسلم لیگ کے ڈائریکٹ ایکشن کے دن یعنی ۱۶؍ اگست ۱۹۴۶ء سے شروع ہوئی۔ معاملے میں الجھن ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں، واقعات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہر شخص کو اپنے گناہ کا اقرار کرنا چاہیے۔ عام خیال ہے کہ کلکتہ میں جانی نقصان مسلمانوں کا زیادہ ہوا اور فطرتاً مالی نقصان ہندوؤں کا زیادہ ہوا۔ مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ وہ مات کھا گئے اور شروع اکتوبر میں نواکھالی کے واقعات شروع ہو گئے۔ نواکھالی کے واقعات کی ہندو پریس نے بہت مبالغے کے ساتھ اشاعت کی۔

ان واقعات کا فطرتاً ہندوؤں پر بہت اثر ہوا۔ نتیجے میں بہار کے واقعات اور پھر گڈھ مکتیسر کے واقعات ظہور پذیر ہوئے۔

خضر حیات کی وزارت اور اس کا استعفیٰ :

لیکن ان سب چیزوں کا اثر پنجاب پر زیادہ نہ پڑا۔ یونینسٹ گورنمنٹ اس کے نقائص خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں، اس نے راشٹریہ سیوک سنگھ اور مسلم نیشنل گارڈ دونوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی اور کسی نہ کسی طرح اپنے صوبے کو فرقہ وارانہ فساد سے بچائے رکھا۔

شروع مارچ ۱۹۴۷ء میں خضر حیات وزارت کو مستعفی ہونا پڑا۔ برطانوی سلطنت کے لوگوں کو اپنے مقاصد کے حصول میں پنجاب کی پارٹی پالیٹکس سے بہت مدد ملی۔ خضر حیات کے استعفیٰ سے اگلے دن ہی ماسٹر تارا سنگھ نے وہ مشہور تقریر لاہور میں کی، جس میں انھوں نے عہد کیا کہ مسلم لیگ کو وزارت نہ بنانے دیں گے۔ اسی دن لاہور میں ہندو طالب علموں نے ایک بڑا جلوس نکالا جس میں لیگ کے اور پاکستان کے خلاف نعرے بلند کیے گئے۔ ۴؍ مارچ کی شام کو لاہور میں کچھ فساد ہوا اور چند مسلمان مقتول ہوئے۔ یہ فساد تین چار دن تک

چلتا رہا۔ اس کے بعد ایسا ہی فساد امرتسر میں ہوا۔ اس کے بعد راولپنڈی، میانوالی، ملتان، ڈیرہ غازی خاں اور سرحد کے دوسرے اضلاع میں سخت فسادات ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ صوبۂ سرحد کے کچھ مسلم رضاکار بہار گئے تھے اور وہاں سے کچھ مسلم مقتولین کی ہڈیاں لائے تھے، جن کے جلوس انھوں نے صوبۂ سرحد کے قصبوں اور مواضعات میں نکالے۔ اگرچہ راولپنڈی اور صوبۂ سرحد کے اضلاع میں سخت فسادات ہوئے، تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ لاہور میں نسبتاً سکون رہا۔ وہاں پر نہ بہار کا اور نہ راولپنڈی کا کچھ زیادہ اثر پڑا۔ وسط مئی کے قریب تقسیم پنجاب کے مباحث نے انتہائی زور پکڑا اور امرتسر اور لاہور کے حالات دگرگوں ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ ان دونوں شہروں میں ہر فرقہ ان شہروں کے حصول کا حد درجہ خواہش مند تھا۔ اس بات کی تحقیق کرنا کہ کس فریق کا جرم زیادہ سنگین تھا، بے نتیجہ ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ امرتسر کے ایک فرقہ کے لوگ جب زیادہ پریشان ہوئے تو انھوں نے لاہور میں اپنے ہم مذہبوں کے پاس چوڑیاں اور مہندی بھیجی۔ اس کے معنی صاف تھے، فسادات بڑھنے لگے۔ ۳ر جون کے اعلان نے آگ میں ایندھن کا اضافہ کر دیا۔ لاہور میں فسادات ۲۱ر جون کو درجۂ انتہائی پر پہنچ گئے، جبکہ شاہ عالمی دروازے کے اندر کی محل نما تعمیرات سپرد آتش ہو گئے اور مقامی حکام کھلم کھلا فرقہ وارانہ فسادات میں حصہ لینے لگے۔ لاہور اور امرتسر میں فسادات بیک وقت ہوئے۔ ۲۱ر جون کو شاہ عالمی دروازہ کی آگ کے بعد سے ہندو لاہور سے بھاگنا شروع ہو گئے، لیکن عام انتقال ۱۵ر اگست کے بعد سے شروع ہوا۔ ۱۷ر اگست کے باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کے بعد سے لاہور تیزی کے ساتھ مسلمانوں کا اور امرتسر ہندوؤں کا شہر بننے شروع ہو گئے۔ ہر دو شہروں میں اقلیت حد درجہ خوف زدہ ہو گئی۔

جرائم کی نوعیت:

خون کھولا دینے والے مظالم کی داستانیں جن کے مرتکب ہر فرقے کے افراد دوسرے فرقے کے افراد پر ہوئے، ہزارہا خبریں سننے میں آتی ہیں۔ ان کے دہرانے سے

کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بہر حال ان سب کا ایک نتیجہ بالکل صریح ہے، کوئی جرم ایسا نہ ہوگا جس کا مرتکب مسلمان نہ ہوا ہو، کوئی جرم ایسا نہ ہوگا جس کا ہندو مرتکب نہ ہوا ہو، کوئی جرم ایسا نہ ہوگا جس کا مرتکب سکھ نہ ہوا ہو۔ جب کبھی کوئی جھوٹی یا سچی خبر کسی فریق کو کسی کریہہ ظلم کی دوسرے فریق کی طرف سے پہنچی تو اس فریق نے اس کا بدلہ دوسرے فریق کے افراد سے اپنے علاقے میں بدتر طریق پر نکالنا شروع کیا اور یہ چکر در چکر نہایت زور سے چلنے لگا اور یہ ظاہر ہونے لگا کہ فطرتِ انسانی کس حد تک گر سکتی ہے اور یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اصل فطرتِ انسانی پر ظاہری مذہب کے لیبل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تصویر کا دوسرا رخ:

لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ جب ہم لاہور کی گلیوں میں ہو کر گزر رہے تھے، قریب قریب ہر گلی میں بیسیوں آدمی ہمارے اردگرد جمع ہو جاتے تھے۔ بظاہر وہ سب مسلمان تھے۔ ان میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے ہر طبقے کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ وہ ہم سب سے دل کھول کر لاہور میں جو کچھ ہوا، اس کے متعلق بات چیت کرتے تھے۔ کچھ دن پہلے لاہور یونی ورسٹی کے ایک نیک نہاد مسلم پروفیسر نے کہا تھا کہ شہر کے قریب چالیس فیصد اشخاص واقعاتِ گذشتہ پر متأسف ہیں اور وہ ایک دفعہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ ہم نے جو شہر میں چکر کیا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ اس قسم کے خیال کے لوگوں کی نسبت بہت زیادہ تھی۔ یہ ہی حالت ہم کو شرقی اور غربی پنجاب کے دوسرے حصوں میں بھی معلوم ہوئی۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ پاکستان میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد ان فرقہ وارانہ جھگڑے کو پسند نہیں کرتی ہے اور دوسرے فرقے کے اپنے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ اس کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے، مجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ جن لوگوں نے اس قتل و غارت اور آتشزدگی میں حصہ لیا ہے، کسی طرح پر آبادی کا ایک فیصد سے زیادہ نہ ہوں گے۔ یعنی ایک لاکھ میں ایک ہزار سے زیادہ نہ ہوں گے، لیکن یہ تعداد تمام لوگوں کے امن کو ختم

کرنے اور پوری آبادی کو لاشوں اور کھنڈروں میں منتقل کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ یہ ہی حالت مواضعات کی تھی۔ لاہور میں خنجر زنی کے واقعات کرنے والوں کی تعداد میرے اندازے میں زیادہ سے زیادہ سو اور دو سو کے درمیان ہو گی۔ یہ ہی بات امرتسر کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دس بیس فیصد آبادی کے وہ لوگ بھی تھے جو دوسرے فرقے کے اپنے فرقے کے افراد پر مظالم کی داستانیں سنتے سنتے اپنے فرقے کے مجرموں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ لیکن جیسا کہ ایسے مواقع پر عام طور سے ہوتا ہے، زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو نہ منظم تھے اور نہ ان چیزوں میں حصہ لیتے تھے اور نہ چیخ و پکار کرتے تھے۔

بہادری کے کارنامے:

ایک دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب یہ چند ہزار اشخاص ان مجرمانہ افعال میں مشغول تھے تو اس وقت بھی مشرقی اور مغربی پنجاب میں قریب قریب ہر مقام پر ہزارہا اشخاص ساتھ ہی ساتھ بھلائی اور بہادری کے کاموں میں بھی لگے ہوئے تھے۔ ایسے واقعات جن میں مسلمانوں نے ہندو اور سکھ بھائیوں اور بہنوں کی جان، عزت اور آبرو کو خود مسلمانوں کی دستبرد سے بچایا، سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں شمار کرائے جا سکتے ہیں۔ یہ قصے ہم نے خود ان لوگوں کی زبان سے سنے جو خود اس طرح پر بچے تھے۔ مثلاً چکوال میں بہت سے پناہ گزیں آس پاس کے مواضعات سے ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ ان کے مواضعات میں جو کچھ ہوا ہے اس کو ضبط تحریر میں لایا جاوے۔ میں نے اس کی تعمیل کی۔ خلاصہ ہر ایک کے بیان کا یہی تھا کہ کچھ آدمی قتل کیے گئے، کچھ مکانات جلائے گئے، سامان لوٹا گیا، کچھ عورتیں بھگائی گئیں اور باقی ماندہ اقلیت کے افراد گاؤں سے بھاگ گئے۔ لیکن قریب قریب ہر گاؤں کے لوگوں سے یہ بھی سننے میں آیا کہ کسی نیک دل مسلمان نے اپنے ہندو یا سکھ ہمسائے کی جان و مال، عزت اور آبرو خود مسلمان عوام کا مقابلہ کر کے ان کی دستبرد سے بچایا۔ یہ قصہ ہمارے سوالات اور جرح کا نتیجہ نہ تھے، بلکہ لوگوں نے خود بخود بیان کیے۔ اسی قسم کے

نیک کاموں کی داستانیں مسلم پناہ گزینوں نے ہندو اور سکھوں کے بارے میں مشرقی پنجاب میں ہم سے بیان کیں۔

اغواشدہ عورتوں کا سراغ:

لاہور میں ہمارا ایک نہایت شریف دل دوست ڈاکٹر گوربخش رائے ہندو بھگائی ہوئی عورتوں کو شہر اور مواضعات میں مسلمانوں کے گھروں سے نکالنے کا کام کر رہا تھا۔ انھوں نے ہم سے بتایا اور ہم نے خود بھی دیکھا کہ بھگائی ہوئی عورتوں کا پتہ زیادہ تر مسلمان مرد اور عورتوں ہی سے چلتا تھا جو بتلاتے تھے کہ ایک بد نصیب عورت فلاں مسلمان کے گھر میں مقید ہے۔ یہ اطلاع محض انسانی ہمدردی کی بنا پر لوگ ان کو دیتے تھے۔ بعض دفعہ تو اطلاع دینے والے کثیر مسافت طے کر کے اطلاع دینے آتے تھے اور وجہ یہ ہوتی تھی کہ وہ بد نصیب عورتوں کے مصائب کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس سے متاثر ہوتے تھے اور ان کا پیچھا چھڑانے کا ان کو فکر ہوتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ عورت ایسے مقامات سے زیادہ تر کسی مسلم مرد یا عورت ہی کی امداد سے نکالی جاتی تھی۔ بھگائی ہوئی عورتوں کو گھروں سے نکالنے میں ہم کو ایسی عورتیں بھی ملیں جو اس لیے مسلم گھرانے کو چھوڑنے کو تیار نہ تھیں، اس قسم کی دو عورتیں لاہور پناہ گزینوں کے کیمپ میں لائی گئیں، لیکن انھوں نے واپس جانے پر اصرار کیا۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتی ہیں تو انھوں نے بتلایا کہ ان کو اندیشہ ہے کہ ان کے ساتھ ہندو عزیز و اقارب ان کو واپس نہ لیں گے اور اگر وہ واپس لینے پر رضامند ہو بھی گئے تو بعد میں ان کو قتل کر دیں گے۔ عورتوں کے اس بیان نے ہمارے بہت سے ہندو دوستوں کی آنکھیں کھول دیں۔

ڈاکٹر گوربخش سنگھ اپنی ذات سے فرقہ وارانہ جذبات سے بالاتر ہیں۔ جب ان کو ایک افسر نے ایک بڑی فہرست اغوا کردہ مسلم عورتوں کی دی جن کو ہندو اور سکھ امرتسر اور مضافات میں بھگالے گئے تھے تو وہ فوراً وہاں جانے پر اور عورتوں کو نکالنے اور ان کے عزیزوں

کو واپس کرنے پر تیار ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کو اس کام کا بہت فکر تھا۔ مجھے وہ بلند پایہ الفاظ جو اس وقت ان کی زبان سے نکلے تھے، یاد ہیں۔ وہ کہنے لگے "کہ ہندو عورتوں سے مسلمانوں کو بھگانے کے واقعات سن کر مجھے سخت تکلیف ہے اور وہ حد درجہ کی شرم بھی دامن گیر ہوتی ہے"۔ مجھے ایسے بہت سے بے نفس اور بہادر مردوں اور بعض عورتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو پنجاب میں نہایت عمدہ کام کر رہے ہیں۔

برطانیہ کا فسادات میں حصہ:

اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی قابلِ توجہ ہے۔ ان فسادات میں برطانیہ کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ میرا یقین ہے کہ کسی غیر جانبدار عدالت کے سامنے یہ ثابت کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی کہ اسلحہ اور گولہ بارود کا زیادہ تر ذخیرہ جو دہلی میں مسلمانوں نے استعمال کیا، یا جو مشرقی پنجاب میں یا اور ریاستوں میں ہندوؤں، سکھوں نے استعمال کیا یا جو مغربی پنجاب اور سرحد میں مسلمانوں نے استعمال کیا یا جو ذخیرہ ان اغراض میں استعمال کیا جانے والا تھا وہ ذمہ دار برطانوی افسروں کی معرفت آیا۔ لائل پور کے مسلم ڈپٹی کمشنر نے وہاں کے ہندو چیرمین مونسپل بورڈ سے کہا کہ اگر اس ضلع سے کرنل فنچ (Col. Finch) کو ہٹا دیا جائے تو پھر ہر ایک ہندو یا سکھ بھی نہ لٹے گا۔ راولپنڈی کے نمایاں ہندو اور مسلمانوں کی قریب قریب سب کی یہ رائے تھی کہ وہاں کے مارچ کے فسادات کے مسٹر سی، ایل کوٹس (C.L. Coatas) ڈپٹی کمشنر اور ہوم سکریٹری مسٹر میکڈانلڈ (Macdonald) براہِ راست ذمہ دار تھے۔ مشرقی پنجاب کے ایک ضلع میں جب ہندوؤں نے یہ طے کر لیا کہ اقلیت کے لوگوں کو نہ ستایا جائے گا تو ایک برطانوی فوجی افسر نے آگ کو دوبارہ سلگانے کی غرض سے طویل سفر کار میں کیا، راستے میں لوگوں پر گولیاں چلائیں اور ان کو ہلاک کیا ایک دوسرے ضلع میں جب ایک فرقے کے لوگ پاس کی چھاؤنی میں فوجی امداد حاصل کرنے کے لیے کمانڈر کے پاس گئے تو اس برطانوی کمانڈر نے ان لوگوں سے کہا کہ ان کو برطانوی گورنمنٹ سے درخواست کرنی

چاہیے کہ وہ ملک کے انتظامات کا پھر چارج لے لے اور اس درخواست پر زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کے دستخط کرائے جائیں۔ چناں چہ اس غرض کے لیے ایک فہرست کھول دی گئی اور دستخط بھی کرائے گئے، لیکن بعد میں اس خیال کو ترک کر دیا گیا۔ خود الٰہ پور میں جولائی ۱۹۴۷ء کے آخر میں ایک برطانوی فوجی افسر نے ایک مسلم پولیس افسر سے کہا "کیا تمھارا خیال ہے کہ ہم ہندوستان سے جا رہے ہیں، نہیں ہم ملایا میں چھپ جائیں گے اور جب یہاں کے حالات خراب ہو جاویں گے تو واپس آجاویں گے"۔ اس قسم کی مثالیں بکثرت دی جا سکتی ہیں اور اس سے بھی خراب قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ با اختیار برطانوی افسران نے اپنے ذرائع اور سامان کو فسادات کی آگ لگانے اور جگہ جگہ پہنچانے ہی میں نہیں بلکہ اس کو مسلسل جلتا رکھنے میں استعمال کیا۔ ہم کو شرم کے ساتھ اس امر کا اقبال کرنا پڑتا ہے کہ ہم بُرے ہی سہی، لیکن یقیناً ہندو نہ مسلمان اور نہ سکھ اتنا بُرا ہے، جتنا کہ وہ اپنے فریقِ مخالف کو دکھلائی دیتا ہے۔

میو اور جاٹوں کی لڑائی کے انوکھے واقعات :

ضلع گڑگاؤں میں میو اور جاٹوں کی لڑائی بھی ایک انوکھا واقعہ ہے۔ میو لوگ ہندو راجپوت سے مسلمان ہوئے ہیں۔ ان کے رسم و رواج ہندو راجپوتوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ نسلاً بعد نسل سے مسلم میو اور ہندو جاٹ بطور اچھے پڑوسیوں کے رہتے آئے ہیں۔ موجودہ فسادات کے دوران میں ہندو فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے جاٹوں کے پاس اور اسی قسم کے مسلمان میو کے پاس پہنچے ان دونوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ بالآخر لڑائی شروع ہو گئی۔ میو کے مواضعات اگرچہ یکجا واقع ہوئے ہیں، لیکن قریب قریب میو کے ہر گاؤں میں اگرچہ میو کھلی اکثریت میں ہوتے ہیں، لیکن بالعموم کچھ ہندوؤں کے مکانات بھی ضرور ہوتے ہیں۔ اسی طرح جاٹوں کے ہر ایک موضع میں مسلمانوں کی اقلیت ہوتی ہے جو نسل سے جاٹ ہی ہوتے ہیں۔ میو اور جاٹوں کی لڑائی کئی دن تک چلتی رہی۔ میو کے

مواضعات کے ہندو میو کی شرکت میں ہندو جاٹوں کے اور مسلم جاٹ ہندو جاٹوں کی شرکت میں میو سے لڑتے رہے۔ ہر شخص اپنے گاؤں کا وفادار تھا۔ فریقین کی تعداد ہر جانب دسیوں ہزار تھی۔ یہ لوگ دن بھر تو لڑتے تھے اور پھر شام کو وہ سب پال (چوپال) میں جمع ہو جاتے تھے۔ یعنی میو اور جاٹ سب اکٹھا جمع ہو جاتے تھے اور ایک دوسرے کو الزام دیتے تھے کہ باہر کے آدمیوں کے ہاتھ میں کھیل کر وہ اپنے یہاں کے امن و امان کو تباہ کر رہے ہیں۔ یہ قصہ بہت دنوں تک چلتا رہا، لیکن اس تمام لڑائی کے دوران میں کسی میو نے کسی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ جاٹوں نے بھی اس بہادری کے قاعدے پر عمل کیا۔ بالآخر ایک شام کو ہر دو فریق کو محسوس ہوا کہ ان کو آپس کی لڑائی ختم کر دینی چاہیے۔ اگلی صبح کو مجسٹریٹ ضلع کو بلایا گیا۔ مجسٹریٹ ضلع اور فوج والوں کی موجودگی میں میو اور جاٹوں نے عہد و پیماں کیا کہ وہ آیندہ نہ لڑیں گے۔ ہر دو فریق نے باہر کے لوگوں پر جنھوں نے ان کو ایک دوسرے سے لڑایا تھا لعنت بھیجی اور اس بات کا ارادہ کر لیا کہ آیندہ نہ لڑیں گے اور بہ طریقِ قدیم امن و امان سے رہتے رہیں گے۔ جب ۵ر نومبر کو میں گوڑگاؤں کے ان مواضعات میں گیا تو میو اور جاٹوں کو پہلے ہمسایوں کی طرح رہتا ہوا پایا، فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ کسی باہر کے فرقہ وارانہ فساد بڑھانے والے کو خواہ وہ ایک فرقے کا ہو یا دوسرے کا اپنے مواضعات میں نہیں آنے دیتے۔

علاج :

تو اب اس کا علاج کیا ہے؟ اس وقت یہ سمجھ لینا چاہیے کہ انتقال سکونت کا تصفیہ نہایت زبردست غلطی تھی۔ خوش قسمتی سے پاکستان گورنمنٹ اور ہندوستان کی گورنمنٹ دونوں اس امر کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ نواب زادہ لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان اور راجہ غضنفر علی خاں وزیر اعظم پناہ گزینان دونوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ ان کی گورنمنٹ کی اب یہ طے شدہ پالیسی ہے کہ وہ ان تمام ہندوؤں کو جو پاکستان میں رہنے کے لیے رضامند ہوں گے، ان کو ان کے گھروں میں رکھیں گے اور اس بات کی ضمانت دیں گے کہ ان کی پوری

حفاظت کی جاوے گی اور ان کے ساتھ اور مسلمانوں کے ساتھ بالکل برابر کا برتاؤ کیا جائے گا۔
اسی طرح پر وہ ان ہندوؤں کی حفاظت اور امداد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جو واپس ہوں اس
معاملے میں ان کی نیک نیتی پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ تجربے سے اور
خود اپنے مفاد کے خیال سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اس بارے میں راجہ غضنفر علی خاں کی
کوششیں قابلِ تعریف ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے اپنے ہندو دوست اور شریک کار لالہ
اوتار نرائن ن امداد سے (جو جہلم میں مشرقی پنجاب کی حکومت کی طرف سے پناہ گزینوں کی
امداد کے لیے تعینات ہیں) نو ہزار ہندوؤں کو جنھوں نے جہلم چھوڑنے کا تصفیہ کر لیا تھا اس
امر پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے جدی مکانوں ہی میں رہیں گے۔ تین اسپشل ٹرینیں جن میں وہ
ہندوستان جانے والے تھے ان کی رضامندی سے منسوخ کر دی گئی ہیں۔ مسٹر قربان علی
انسپکٹر جنرل پولیس مغربی پنجاب امن وامان قائم کرنے کے لیے ہر امکانی کوشش کر رہے
ہیں۔ انھوں نے دو بڑے سیاسی اثر رکھنے والے مسلمان ممبران اسمبلی اور ایک مسلم سیشن جج
کو، جن کے قبضے سے لوٹا ہوا ہندوؤں کا مال برآمد ہوا تھا، گرفتار کرنے میں تامل نہیں کیا۔ اس
بقر عید سے کچھ دن قبل میں نے انسپکٹر جنرل پولیس سے شکایت کی کہ ہزارہا ہندو جن کو جبرا
مسلمان کر لیا گیا ہے، ان سب کو یہ اندیشہ ہے کہ بقر عید کے دن ان کے مسلم ہمسائے ان کو
گائے کی قربانی کرنے کے لیے مجبور کریں گے۔ انسپکٹر جنرل موصوف نے مجھے یقین دلایا کہ
پاکستان گورنمنٹ کی یہ طے شدہ پالیسی ہے کہ وہ جبریہ تبدیلی مذہب کو تسلیم نہیں کر سکتی۔
اس وقت صاحب موصوف نے اپنے اسسٹنٹ کو حکم لکھوا دیا جو صوبے کے تمام سپرنٹنڈنٹ
ہائے پولیس کے نام تھا اور جس کا مفہوم یہ تھا کہ تمام ہندوؤں اور ان تمام نام نہاد مسلمانوں کی جو
دراصل ہندو ہیں، اس معاملے میں پوری امکانی حفاظت کی جاوے۔ حکم پورے طور پر میری
منشا کے مطابق تھا اور بذریعہ وائرلیس تمام افسران کے پاس بھیج دیا گیا۔ مجھے بعد میں یہ معلوم ہوا
کہ اس حکم کی پورے طور پر تعمیل ہوئی اور بقر عید تمام صوبے میں خیریت سے گزر گئی۔ لیکن
ابھی تک گورنمنٹ کو مغربی پنجاب میں پورا اقتدار حاصل نہیں ہے اور معاملات پورے طور

پر ان کے قابو میں نہیں ہیں۔ ان کو ان طاقتوں کا مقابلہ کرنے میں بڑی مشکلوں کا سامنا تھا جو غالباً ابتدا ایں خود انہیں کی پیدا کردہ تھیں۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے مجھے بتایا کہ چند ہفتے قبل جب انھوں نے اس عہدے کا چارج لیا تو بہ مشکل ۲ فیصد لوگ ان کے احکام کی پوری تعمیل کرتے تھے۔ اب قریب ۳۵ فیصد ان کے احکام کی پوری تعمیل کرتے ہیں۔ تعمیل کرنے والوں کی نسبت بڑھتی جاتی ہے۔ مغربی پنجاب کی گورنمنٹ نہ تو پورے طور پر مضبوط ہی ہے اور نہ پورے پیمانے کے ہی قابل ہے، لیکن بالخصوص امن وامان قائم کرنے میں ان کی نیت نیک ہے اور ان کی قوت اور قابلیت رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے۔

مشرقی پنجاب کی گورنمنٹ :

مشرقی پنجاب کی گورنمنٹ اور بھی کمزور اور نا قابل ہے۔ ان کے بعض صیغہ جات کی حالت قابلِ افسوس ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی پنجاب کو تو ایک بنی بنائی گورنمنٹ ملی ہے، لیکن مشرقی پنجاب میں کل گورنمنٹ کی مشین از سر نو بنائی جارہی ہے اور اس فسادات کے زمانے میں انھوں نے اسلامیہ کالج امرتسر کی عمارت میں نئی سکریٹریٹ قائم کی ہے۔ اس کو سکریٹریٹ کا نام بھی دینا مشکل ہے۔ امید ہے کہ صورتِ حال اب وہاں پر بہتر ہو جائے گی۔

مستقل علاج :

اب ہم کو مستقل علاج پر غور کرنا ہے۔ اس کے لیے ہم کو پہلے اس امر کو سمجھنا چاہیے کہ ہمارا اصل مرض کیا ہے۔ ہم کو ان اسباب کو سمجھنا چاہیے جن کی بدولت حالت اس قدر نازک ہو گئی ہے کہ موجودہ حالات پیدا کرنے میں دو چیزوں کا خاص ہاتھ ہے: پہلا تو یہ کہ ہم لوگوں کی ذہنیت ابتدا ہی سے فرقہ واری ذہنیت اور جرگہ واری ذہنیت ہے۔ زندگی کے ہر شعبے کو ہم اسی نظریے سے دیکھتے ہیں۔ دوسری چیز بیرونی سیاسیین کی ترکیبیں ہیں، جن کو ہم بیچ سے

تعبیر کرتے ہیں اور فرقہ وارانہ ذہنیت مثلِ زمین کے ہے کہ جس میں یہ بیج پھولتا پھلتا ہے۔
جہاں ایک مرتبہ یہ بڑھنا شروع ہوا تو پھر چکر در چکر (جن میں سے ہر دوسرا چکر پہلے سے بدتر
ہوتا ہے) شروع ہو جاتے ہیں۔ فرقہ واری کی ذہنیت سے فساد کی ابتدا ہوتی ہے اور فسادات
سے فرقہ وارانہ جذبات اور بڑھتے ہیں اور یہ سلسلہ لامتناہی ہو جاتا ہے۔ بیرونی حکومت نے
ہمیں اس حال کو پہنچا دیا ہے اور جو حالت اب ہماری ہو گئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا
دارومدار بیرونی حکومتوں پر اور زیادہ ہو گیا ہے۔ موجودہ حالات کی بدولت جو سیاسی پیچیدگیاں
پیدا ہو گئیں ہیں، میں ان کے متعلق اس وقت زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ
ابھی سے سکھستان، جالستان اور نہ معلوم کس کس استان کے خیالات شروع ہو گئے ہیں۔ اب
تو یہ اندیشہ ہے کہ اگر خدانخواستہ ان دونوں حکومتوں کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ہے تو
ہر دو حکومتوں کو دنیا کی دو زبردست طاقتوں سے، جن کا شیوہ ہمیشہ دوسروں سے ناجائز مفاد
حاصل کرنے کا رہا ہے، کسی نہ کسی طرح سے امداد کا طلب گار ہونا پڑے گا۔ یعنی خواہ انگلستان
سے خواہ امریکہ سے، تاکہ ان سے ہوائی جہاز اور نئی قسم کا سامانِ جنگ حاصل کیا جا سکے۔ تو
اب ہم کو کیا کرنا چاہیے؟

ہم کو اب کیا کرنا چاہیے؟

ا۔ سب سے پہلے ہم کو ہر چیز کو فرقہ واری، مذہبی اور جرگہ داری کی نظر سے دیکھنے کے
نظریے کو تبدیل کرنے کی انتہائی کوشش کرنی چاہئے۔ ہماری پیچھے دیکھنے کی عادت اور ہماری
رجعت پسندی ہماری سب سے بڑی مصیبت ہے۔ یہ فرقہ واری کی ذہنیت توہمات کو بڑھاتی
ہے اور عقلی اور اخلاقی پستی پیدا کرتی ہے۔ دو قوموں کی تھیوری بالکل غلط تھی۔ اس اصول کی
بنیاد ہندوؤں کی چھوت چھات اور عناد حد گی پر تھی۔ ملک کی تقسیم کا مطالبہ خراب تھا، لیکن
پنجاب اور بنگال کے دو ٹکڑے کرنے کا مطالبہ اس سے بھی بدتر تھا۔ اگر پنجاب کے فسادات
میں کوئی چیز بیّن طور پر چمک رہی ہے تو وہ یہ ہے کہ ہمارا نام نہاد مذہبی اور فرقہ واری کے

ناموں کا کوئی اثر ہمارے کیرکٹر پر نہیں ہے وہ بالکل ایک ہے۔ ہم کو اس تنگ نظری سے بالاتر ہونے کی ضرورت ہے، جہاں عوام کے لیے مذہبی عقیدوں اور مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لیے پوری پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ جو لوگ فرقہ واری کی تنگ ذہنیت سے بالاتر ہو سکتے ہیں وہ اپنے طرزِ زندگی سے انسانیت کے اس مشترکہ مذہب کو ترقی دیں جس کا مقصد محبت اور خلقِ خدا کی خدمت ہے۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ اشخاص محض سیاسی مسلم، سیاسی ہندو اور سیاسی سکھ ہیں۔ ہم کو اس مکاری اور دھوکے بازی کو جلد از جلد ختم کر دینا چاہیے، اس لیے کہ ملک کے عوام کے لیے اس سے زیادہ مہلک کوئی اور چیز نہیں ہے۔

۲۔ دوسری چیز یہ ہے کہ سیدھے سادے عوام کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ میں یہ بات بھی بتا چکا ہوں کہ قوم کا مغز (جس میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور پارسیوں وغیرہ سب کو شامل کرتا ہوں) اب تک درست حالت میں ہے۔ یہ سمجھنا غلطی ہے کہ عوام میں فرقہ واری کا جذبہ خواص سے کچھ زیادہ ہے۔ یہ تعلیم یافتہ خواص ہی تو ہیں کہ جو توہمات کو ابھارتے ہیں اور فرقہ واری کو قائم رکھتے ہیں۔ ہم کو عوام کو اس طرح منظم کرنا چاہیے کہ وہ نقصان پہنچانے والوں پر قابو پا سکیں۔

۳۔ تیسری بات جو اہمیت میں کچھ کم نہیں ہے یہ ہے کہ ہم کو اپنی سیاست میں سے بیرونی عنصر کو جلد از جلد نکال دینا چاہیے۔ اس غرض کے لیے ہم کو اپنے سیاسی اور اقتصادی طریقہ کار کو بدلنا پڑے گا۔ اس میں زیادہ سمجھ، زیادہ اخلاق، زیادہ جمہوریت پسندی اور خود اپنے پر بھروسا کرنے کی عادت پیدا کرنا ہوگی۔

آخر میں ہم کو ہندو اور مسلم راجوں اور نوابوں کے پرانے نظام کو اس ملک سے ختم کرنا ہے۔ اس میں خود ان کا بھی فائدہ ہے اور تمام ملک کا فائدہ ہے۔ اب عین وقت ہے کہ ہمارے راجہ اور نواب اس بات کو سمجھ لیں کہ ریاستوں کے لیے بہترین چیز یہ ہے کہ وہ اپنی قبر خود کھود لیں۔ مجھے یہاں ان بدنما، ناپاک اور قوم کو ستانے والی کارروائیوں کا ذکر کرنے کی

ضرورت نہیں ہے جو اس مصیبت کے زمانے میں پٹیالہ، فرید کوٹ، الور، بھرت پور، کپور تھلہ اور بہاول پور نے کی ہیں۔

انسانی عوام کا ترقی یافتہ طبقہ سیاسی جمہوریت سے گزر کر اقتصادی جمہوریت کے درجے میں پہنچ چکا ہے۔ شاید یہ ہندوستان ہی کی قسمت میں ہے کہ وہ انسانیت کو اقتصادی جمہوریت سے روحانی جمہوریت کے طبقے میں پہنچانے میں رہبری کرے۔ فی الحال ہمارا نصب العین یہ ہی ہے کہ مغربی سوشلزم کو اور تمام عالم کے مشترکہ مذہب یعنی انسانی خدمت کے نصب العین کو ملا کر ایک کر دیں۔ ہماری موجودہ عام تکالیف، مصیبتیں، پریشانیاں اس سفر کی تیاری ہیں، جس میں خدا کو منظور ہے تو ہم کامیاب ہوں گے۔

(اتحاد، الٰہ آباد، ۲۹/ نومبر ۱۹۴۷ء بہ حوالہ علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، حصہ دوم، از مولانا سید محمد میاں، اشاعت کراچی، صفحہ ۳۰-۵۱۱)

ضمیمہ نمبر ۵:

مولانا ابوالکلام آزاد کی تاریخی تقریر

جیسا کہ مولانا سید محمد میاںؒ نے فرمایا ہے کہ مولانا آزاد نے یہ تقریر ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء بروز جمعہ جامع مسجد دہلی میں فرمائی تھی اسے انھوں نے "پیغامِ حیات" سے تشبیہ دی ہے۔ بلاشبہ یہ پیغامِ حیات تھا جو مسلمانوں کو دیا گیا، انھوں نے اسے سنا اور ان کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے۔ مولانا آزاد نے فرمایا:

میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے، جو مجھے یہاں لے آئی ہے؟ میرے لیے شاہ جہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے اس زمانے میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمھیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔ جب تمھارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمھارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد! آج تمھارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمھیں یاد ہے، میں نے تمھیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کردیے، میں نے چلنا چاہا، تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے، میں نے کروٹ لینی چاہی، تم نے میری کمر توڑ دی، حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمھیں آج داغِ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا، بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں

نے تمھیں گھیر لیا ہے، جن کا اندیشہ تمھیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ دیے گئے ہیں یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی، تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ کیا تمھارے حواس میں اختلال نہیں آگیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمھارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسا کیا ہے، نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن تم نے سنی اَن سنی برابر کر دی، اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمھارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں، تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمھیں بھروسا تھا، وہ تمھیں لاوارث سمجھ کر، تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمھارے دماغی لغت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے، یعنی تمھارے نزدیک فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف اُلٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کیے تھے، وہ بھی دغا دے گئے، حالاں کہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمھاری زندگی ہے۔ میں تمھارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمھارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں، لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ، تو تمھارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا، میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمھیں پکارا تھا اور کہا تھا:

"جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے ساتھ ساتھ قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا، تو مستقبل کا مؤرخ لکھے گا کہ تمھارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا، جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اُڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزاد قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے"۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمھاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی، بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی اور یہی وہ انقلاب ہے، جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی ہے اور اس کی جگہ بری شے آگئی ہے۔ ہاں تمھاری بے قراری اسی لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا اور بُری شے کو ملجا و ماویٰ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے، جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا کہ جب ہماری قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمھاری اس عجلت پر کیا کہوں؟ کہ اِدھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور اُدھر گمراہی کا خطرہ بھی پیش آگیا۔

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس پُر خار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں۔ لیکن مجھے آج جو کچھ کہنا ہے، اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔ متحدہ ہندوستان کا بٹوارا بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی، اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کے روئیداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں، اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے، البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقینا مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں ہی کا نتیجہ ہے۔ لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پچھلے دنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے اندازِ فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی لیے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دیے گئے ہیں۔ ہراس کا موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھالو اور بد عملی کو ترک کر دو۔

یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے، جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہے۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اس پر غور کرو، اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ، اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلہ کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو! مسجد کے بلند مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے، حالاں کہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح سے کچھ عرصے پہلے تمھارا جوش و خروش بیجا تھا، اسی طرح آج یہ تمھارا خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے

سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمھیں جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمھارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے، تو یہ تعجب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو تمھارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں، تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ، جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمیّ کی معرفت فرمایا تھا: ''جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم''۔ ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی، لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ، جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں ہوں، لیکن مجھے تمھاری تغافل کیشی کے پیشِ نظر بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنی گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچا ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمھارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے، لیکن اگر واقعی تمھارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اس طرح بدلو، جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی کہ ہم ایک دورِ انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیبِ عنوان بن سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہوں!

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو، اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو، جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اُجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں، وہ تمھارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انھیں بھلاؤ نہیں، انھیں چھوڑو نہیں، ان کے

وارث بن کر رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں، تو پھر تمھیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے، آج اندھیرے سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں کہ تمھارا وجود ایک اُجالا تھا! یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے، تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لیے ہیں۔ وہ تمھارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اٹھی، تو اس کا رخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمھارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمھارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ وہی پرانا نسخہ ہے، جو برسوں پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان کہ لَاتَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ۔

آج کی صحبت ختم ہو گئی مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا ہوں، پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں: اپنے حواس پر قابو رکھو، اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمھیں خرید کر لا دوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی سے اعمالِ صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۴

ہندوستانی سیاست اور اس کا تقابلی مطالعہ

جمعیت العلماء، کانگریس اور مسلم لیگ کے نصب العین اور تجاویز کی روشنی میں

تحقیق

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیو بندیؒ

تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

ہندستانی سیاست اور اس کا تقابلی مطالعہ

صفحہ	فہرست

پیش لفظ:

(۱)

جمعیت علماے ہند، انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ -- ہندوستان کی تین بڑی جماعتیں تھیں۔ حضرت مولانا سیّد محمد میاں رحمہ اللہ نے قومی اور ملی مسایل کے بارے میں ان کی منظور شدہ قراردادوں اور ان کی توضیح وتشریح میں ایک رسالہ اواخر ۱۹۴۵ء میں دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی سے شایع کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اہلِ ہند میں خصوصاً مسلمانوں میں سیاسی شعور اور ایک خاص سیاسی بصیرت پیدا ہو اور آنے والے انتخابات میں ان کے دعاوی، فیصلوں، عزایم اور منشورات میں ملک کی آزادی، عوام کے مفادات اور خوش حالیوں کی تصاویر دیکھ کر اپنی راے کا استعمال کریں۔

اس رسالے کے مطالعے سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ

۱۔ جمعیت علماے ہند کی تجاویز ملی اور قومی مسایل پر حاوی اور تدبر و بصیرت پر مبنی تھیں۔

۲۔ کانگریس کی تجاویز ملک کے عوام کے مفاد اور ان کی خوش حالی کی ضامن تھیں۔

۳۔ جب کہ مسلم لیگ کی تجاویز نہ ملی نقطۂ نظر سے کافی تھیں اور نہ قومی عزایم و مقاصد اور مفادات کی جامع تھیں۔ وہ نہ تو ایک خالص اسلامی اور ملی جماعت تھی اور نہ ایک قومی جماعت کے معیار پر پورا اترتی تھی۔ اس میں نہ عزایم کی پختگی تھی۔ نہ تدبر کی بنیاد اور بصیرت کی روشنی! حقیقت کی روح سے خالی، محض نعرے، اخلاص وصداقت سے نا آشنا صرف بلند آوازیں، مذبذب پالیسی اور پوچ فیصلے! علامہ شبلی مرحوم نے کہا تھا:

> ''لیگ کا سنگ اولین شملہ ڈیپوٹیشن تھا اور اب یا آیندہ جو کچھ اس کا نظام ترکیبی قرار پائے گا ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود ہوگی۔''

یہ حضرت علامہ کی مطالعے اور مشاہدے پر مبنی راے بھی تھی اور پیشین گوئی بھی! تاریخ سیاسی کا کوئی طالب علم بھی ادنا غور و فکر سے اس بیان کی فراست کی تائید کرے

گا۔

سب سے زیادہ توجہ طلب اور خاص بات اس رسالے کی یہ ہے کہ جمعیت علماے ہند کے عزائم کا پیمانہ سب سے بلند اور بصیرت وفراست کی روشنی زیادہ، اس کے فیصلوں میں ملی وقومی مفاد کی جامعیت، افکار واعمال میں اعتدال وتوازن اور فیصلے ملک اور قوم وملت کی خوش حالی اور مفادات کے تحفظ کے ضامن تھے۔

پہلے یہ رسالہ

''ہندوستان کی تین بڑی جماعتوں

جمعیت علماے ہند، کانگریس اور مسلم لیگ

کی

تجاویز اور ان کی تشریح

عرف

توضیح تجاویز''

کے نام سے شایع ہوتھا۔ اس کا یہ نام اس کے موضوع اور اس کے تمام مطالب پر حاوی تھا۔ لیکن یہ عبارت کسی رسالے کا نام نہیں ہوسکتا تھا۔ اب اس کا نام

''ہندوستانی سیاست اور اس کا تقابلی مطالعہ''

ہے۔ اس کی بحث کو تین ابواب میں مرتب کر کے تعارف مقصد کی عبارت کو ''تمہید'' اور نتیجۂ بحث کو ''حرف آخر'' کے عنوان سے الگ کر دیا ہے۔ نیز کئی اصلاحات کے ساتھ اس میں چند اہم حواشی کا اضافہ بھی آپ کو نظر آئے گا۔ اس کے علاوہ عبارت میں پیراگرافنگ کردی ہے اور اصولِ تدوین کے مطابق حوالے کی تمام عبارتوں کا پوائنٹ قدرے باریک اور صفحے کے حوض میں سطروں کی لمبائی کچھ کم کردی ہے، جن قارئین کرام کی نظر سے اس کا پہلا ایڈیشن گزرا ہوگا۔ وہ بہ یک نظر اندازہ کرلیں گے کہ تدوین کے اس اہتمام سے اس کے حسن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے۔

(۲)

اسی رسالے کے موضوع سے متعلق مولانا سیّد محمد میاں مرحوم کا ایک مقالہ اواخر ۱۹۴۵ء کے زم زم لاہور سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی ایک تقابلی مطالعہ ہے۔ اس میں کانگریس کو ترک کر دینے کے بعد صرف جمعیت اور لیگ کا موازنہ رہ گیا ہے۔ اگر چہ جس سیاسی دور، جن حالات اور جن مسایل کے ہجوم میں یہ مقالہ لکھا گیا ہے، اس میں ناممکن تھا کہ کانگریس کا ذکر نہ آ جاتا۔ اس مقالے کی تحریر کا محرک ابو علی اعظمی کا ایک مضمون مطبوعہ منشور لکھنؤ ہوا تھا۔ ابو علی اعظمی صاحب دار المصنفین شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ) میں پروف ریڈر تھے اور ''منشور'' کے کالم نگار، لیگی سیاست کے ہم نوا خان بہادر مولوی مظہر علی (ریٹائرڈ سی آئی ڈی آفیسر) کے ''شاباش یافتہ'' تھے۔ لیگی نقطۂ نظر کے مطابق اپنے آپ کو غیر جانب دار ظاہر کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا تھا اور بعض چبھتے ہوئے سوالات کیے تھے۔ مولانا سیّد محمد میاں مرحوم چوں کہ جمعیت علماے ہند سے وابستہ تھے اس لیے ضروری تھا کہ وہ اس سلسلے میں مسلم لیگ کی سیاست کا صحیح رخ واضح کریں اور جمعیت علماے ہند کو ان کے افکار کی زد سے بچائیں۔

پہلے رسالے میں بحث کا انداز علمی ہے۔ جب کہ اس رسالے مین اندازِ فکر تجزیاتی اور تنقیدی ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود یہ رسالہ مختلف مسایل کے تجزیے اور لیگ کے فکر و عمل پر تنقید کے ساتھ نہایت فکر انگیز بھی ہے۔

اس پر زیادہ لکھنے اور تحریر و مباحث کی خوبی اور اہمیت پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس کے مطالعے سے لطف اندوز ہوں گے۔ نیز امید ہے کہ اس پورے مجموعے کا مطالعہ ہماری سیاسی تاریخ کے باب میں ایک نئی سیاسی بصیرت اور شعور میں اضافے کے باعث ہوگا۔

ابو سلمان شاہ جہان پوری

۱۱ر جون ۲۰۰۲ء

ہندوستان کی تین بڑی جماعتیں

اور

ان کی تجاویز

ایک تقابلی مطالعہ

از

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

تمہید

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الْکَرِیْمْ

چند ماہ گزرے دنیا کی دوسری جنگِ عظیم ختم ہوئی ہے، جو پانچ سال تک جاری رہی۔ اس جنگ کے واقعات ابھی تک ذہنوں سے فراموش نہیں ہوئے۔ روس، امریکہ اور برطانیہ دنیا کی سب سے بڑی حکومتیں مانی جاتی ہیں۔ حدودِ سلطنت کی وسعت، دولت، پیداوار، سائنس، تمدن، غرض ہر اعتبار سے یہ حکومتیں اعلیٰ درجے کی ترقی یافتہ مضبوط اور مستحکم ہیں۔ لیکن اس حقیقت کے اعتراف سے بھی کوئی قلب انکار نہیں کر سکتا کہ اگر ان تینوں حکومتوں کا اتفاق نہ ہوتا تو جرمنی اور جاپان کی شکست ناممکن اور محال تھی۔ اس جنگ نے دنیا کے اس تجربے کو اور پختہ کر دیا کہ جو اس کو عرصہ پہلے ہو چکا تھا کہ سائنس اور سامانِ جنگ کے موجودہ دورِ ترقی میں بڑی سے بڑی آزاد اور مستقل حکومت کے لیے بھی یہ لازم ہے کہ دوسری حکومتوں سے اتحاد و اتفاق کرے ورنہ وہ اپنی آزادی اور استقلال باقی نہیں رکھ سکتی۔

حکومتوں کے باہمی اشتراک و اتحاد کی چند صورتیں ہیں:

ایک وہ صورت جو برطانیہ، روس، امریکہ کے اتحاد کی دنیا نے دیکھی۔ یہ اتحاد معاہدوں کے ذریعے سے ہوا۔ ان حکومتوں کے مرکز علاحدہ علاحدہ ہیں اور پھر آپس میں معاہدوں نے ان کو مشترک کر دیا ہے۔

اشتراک کی دوسری صورت وہ ہے جو امریکہ میں ہے، جس کو وفاق سے تعبیر کیا جاتا

ہے۔ یعنی چند مستقل آزاد ریاستوں نے اپنے باہمی مصالح اور اپنی آزادی کے برقرار رکھنے کی خاطر آپس کے سمجھوتے سے ایک مرکز بنالیا ہے۔ اور وہ امور جو تمام ریاستوں سے مساوی تعلق رکھتے ہیں، مثلاً ریلوے، تار، سڑکیں وغیرہ وہ اس مرکزی حکومت کے سپرد کر دیے ہیں۔ باقی جملہ مصرحہ اور غیر مصرحہ اختیارات ان حکومتوں کے ہاتھوں میں ہیں، جو اس وفاق کے اجزا یا ممبر ہیں۔

اشتراکِ عمل کی تیسری صورت وہ ہے جس کو وحدانی نظام حکومت کہا جاتا ہے کہ طاقت اور آزادی کے بارے میں مرکز کو اصل مان کر صوبجات یا ماتحت ریاستوں کو مخصوص اختیارات دے دیے جائیں۔ باقی جملہ اختیارات مرکز کے سپرد رہیں۔ اس وقت ہندوستان میں وحدانی نظامِ حکومت جاری ہے، اگرچہ وہ مرکز واحد، اپنا نہیں لندن کی پارلیمنٹ کے ہاتھ کھلونا اور وزیر ہند کے اشاروں پر ناچنے والا ہے۔

اس وقت ہندوستان کے سامنے دو اہم مسئلے در پیش ہیں، جن میں سے کسی ایک کی طرف سے بے التفاتی، ہندوستان کی دوامی غلامی کی دستاویز ہے۔

(۱) مکمل آزادی کس طرح حاصل کی جائے؟

(۲) مکمل آزادی کو باقی اور محفوظ رکھنے کی کیا صورت ہو؟

(۳) تیسرا مسئلہ جو جمعیت علمائے ہند کے نزدیک سب سے اہم اور سب سے مقدم ہے، یہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں مذہب کا تحفظ اور مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کی ترقی کی کیا صورت ہو؟ اسی مفہوم کے لیے وسیع الفاظ یہ ہیں کہ آزاد ہندوستان میں اقلیتوں کے کلچر، تہذیب و ثقافت اور ان کی طبعی نشو و نما کی بقا کی کیا صورت ہو؟ کشت زار سیاست نے ایک نیا لفظ پیدا کیا، یعنی "سیلف ڈیٹر می نیشن"۔ اس کا ترجمہ اگرچہ "خود ارادیت" کیا جاتا ہے، مگر انگریزی الفاظ کے ساتھ زیادہ مطابق اور چسپاں اور عام فہم ترجمہ یہ ہے کہ "اپنا فیصلہ" یعنی اپنی خواہش اور ارادے کے بموجب اپنے متعلق فیصلہ کرنے اور اس کو نافذ کرنے کا حق۔ بہر حال حق خود ارادیت بھی آزادی کی لازمی شرط ہے۔ اگر کسی علاقے کو یہ حق حاصل نہیں

کہ وہ اپنی صوابدید کے موجب اپنے متعلق کوئی فیصلہ کر سکے تو اس علاقے کو خود مختار ماننا جمع بین الضدین ہے۔ ان تینوں امور کو سامنے رکھ کر ہندوستان کی تین بڑی جماعتوں یعنی کانگریس، جمعیت علما اور لیگ کی تجاویز پر غور فرمایئے۔

چوں کہ پوری حقیقت سامنے رکھنی مقصود ہے، للہٰذا ہم اس طوالت کو ضرور برداشت کریں گے، جو ان جماعتوں کی تجاویز کے نقل کرنے سے پیدا ہوگی۔ تاہم تجاویز کے فاضل حصے کو حذف کر دیں گے، جس کا تعلق موضوع سے نہیں ہوگا۔ ہم سب سے پہلے جمعیت علمائے ہند کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد کانگریس کی تجاویز پیش کریں گے تاکہ آسانی سے اس امر کا موازنہ ہو سکے کہ کانگریس، جمعیت علما کی تجویز کو کس حد تک قبول کر چکی ہے۔

(مولانا سید) محمد میاں

باب اول:

جمعیت علماے ہند کی تجاویز

جمعیت علماے ہند کے اجلاسِ عام منعقدہ ۴ تا ۵ مئی ۱۹۴۵ء بمقام سہارن پور کا فیصلہ:

"جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاسِ عام اس جمود و تعطل کی حالت کو ملک و قوم کے لیے نہایت مضر اور ملی حیات و ترقی کے لیے مہلک سمجھتا ہے۔ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ ملک کی تمام معتدبہ جماعتیں اور عام پبلک حصولِ آزادی کے لیے بے چین و مضطرب ہیں اور ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اور تمام افراد مختلف خیالات اور فارمولے تجویز اور شایع کر رہے ہیں۔ مجلس عاملہ اپنی رائے اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۴۲ء کی تجویز ۴ میں ظاہر کر چکی ہے۔ آج پھر اس کی تجدید کرتی ہے اور اس کے آخری حصے کی رفع اجمال کی غرض سے قدرے توضیح کر دینی مناسب سمجھتی ہے۔ یہ بات بدیہی اور مسلمات میں سے ہے کہ ہندوستان آزادی کی نعمت سے اس وقت تک متمتع نہیں ہو سکتا جب تک ہندوستان کی طرف سے متفقہ مطالبہ اور متحدہ محاذ قائم نہ کیا جائے اور ہندوستان کسی متفقہ مطالبے کی تشکیل اور متحدہ محاذ قائم کرنے میں جتنی دیر لگائے گا اسی قدر غلامی کی مدت طویل ہوتی جائے گی۔ جمعیت علماے ہند کے نزدیک تمام ہندوستانیوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً یہ صورت مفید ہے کہ وہ حسب ذیل نکات پر اتفاق کر لیں اور اسی بنیاد پر حکومت برطانیہ کے سامنے متفقہ مطالبہ پیش کر دیں:

(الف) ہمارا نصب العین کامل آزادی ہے۔

(ب) وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا، مسلم کلچر اور

تہذیب و ثقافت آزاد ہو گی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

(ج) ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خود مختاری اور آزادی کے حامی ہیں۔ غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے، جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کر دیں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

(د) ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے۔ مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہ ہو گی۔ یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

تشریح:

اگرچہ اس تجویز میں بیان کردہ اصول اور ان کا مقصد واضح ہے کہ جمعیت علما مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی اور تہذیبی آزادی کو کسی حال میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ وہ بے شک ہندوستان کی وفاقی حکومت اور ایک مرکز پسند کرتی ہے کیوں کہ اس کے خیال میں مجموعہ ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کے لیے مفید ہے، مگر وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کے لیے حقِ خود ارادیت تسلیم کر لیا جائے اور وفاق کی تشکیل اس طرح ہو کہ مرکز کی غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی حقوق پر اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر تعدی نہ کر سکے۔ مرکز کی ایسی تشکیل جس میں اکثریت کی تعدی کا خوف نہ رہے باہمی افہام و تفہیم سے مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کسی صورت پر یا ان کے علاوہ کسی اور ایسی تجویز پر جو مسلم اور غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے ہو جائے، ممکن ہے۔

(۱) مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو:

ہندو ۴۵ مسلم ۴۵ دیگر اقلیتیں ۱۰

(۲) مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ۲/۳، اکثریت اپنے مذہب، اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخالفانہ اثر انداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکے گی۔

(۳) ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم اور غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم و غیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے۔ یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے تنازعات کے آخری فیصلے کرے گا۔ نیز تجویز نمبر ۲ کے ماتحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کے خلاف ہونے نہ ہونے میں مرکزی اکثریت مسلم ارکان کی ۲/۳ اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا۔

(۴) یا اور کوئی تجویز جسے فریقین باہمی اتفاق سے طے کریں۔

نوٹ:

(۱) مندرجہ بالا تجویز 'الف' سے بشمول 'د' تک اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۴۲ء میں پاس ہو چکی تھی۔ اس پر مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند نے اپنے اجلاس منعقدہ ۳۱/ جنوری و یکم و دوم فروری ۱۹۴۵ء میں تشریح کا اضافہ کیا، اس کے بعد یہ پوری تجویز مع تشریح جمعیت علمائے ہند کے چودھویں اجلاس عام سہارن پور منعقدہ ۱۹۴۵ء ۵، ۶، ۷/ مئی میں منظور کی گئی۔

(۲) اس تجویز کے ساتھ اگر مجلسِ عاملہ جمعیت علمائے ہند کے اجلاس سہارن پور منعقدہ ۳۰/ اگست ۱۹۳۱ء کے فارمولے کی مندرجہ ذیل دفعات بھی پیشِ نظر رہیں تو آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کا نقشہ ہر مسلمان کے سامنے آسکتا ہے۔ وہ بہ آسانی یقین کر سکتا ہے کہ جمعیت علمائے ہند کی تائید و حمایت سے نہ صرف یہ کہ پاکستان ہندوستان کے چند گوشوں میں سمٹ کر رہ جائے، بلکہ پورا ہندوستان ایسا پاکستان بن سکتا ہے، جس میں شرعی محکمے اور دار القضاء قائم

ہوں اور پرسنل لا شرعی احکام کا نفاذ مسلمانوں کے کابل اور آزاد اختیارات کے ذریعے سے پورے ہندوستان میں نافذ ہو۔

مجلسِ عاملہ اجلاس سہارن پور کے منظور کردہ فارمولے کی چند دفعات:

(۱) "ہندوستان کی مختلف ملتوں کے کلچر، زبان، رسم الخط، پیشہ، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی ادارے، مذہبی عقاید، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف آزاد ہوں گے۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

(۲) دستور اساسی میں اسلامی پرسنل لا کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی، جس میں تصریح ہوگی کہ مجالس مقننہ اور حکومت کی جانب سے اس میں مداخلت نہ کی جائے گی اور پرسنل لا کی مثال کے طور پر یہ چیزیں فٹ نوٹ میں درج کی جائیں گی۔ مثلاً احکام نکاح، طلاق، رجعت، عدت، خیار بلوغ، تفریق زوجین، خلع، عنین و مفقود، نفقہ زوجیت، حضانت، ولایت نکاح و مال، وصیت، وقف، وراثت، تکفین و تدفین، قربانی وغیرہ۔

(۳) مسلمانوں کے ایسے مقدمات فیصلہ کرنے کے لیے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا اور ان کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے"۔

(مطبوعہ فارمولا اجلاس سہارن پور ۱۹۳۱ء۔ ۱۹۴۵ء)

مذکورۂ بالا تجویز حصولِ آزادی اور پھر تحفظِ آزادی کے لیے ہندوستان کے اتحاد و اتفاق کو ضروری قرار دیتی ہے اور صوبجات ہند کا وفاق بھی تمام اجزاے وطن اور جملہ اقوام ہند اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے مفید اور ضروری گردانتی ہے۔ فرقہ وارانہ مسائل اور مسلم حقوق کے سلسلے میں تجویز کی دفعات (ب تا د) دو نظریوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور بظاہر یہی دو نظریے ان دفعات کے لیے اساس اور بنیاد ہیں۔

اول یہ کہ مجموعی حیثیت سے اگرچہ مسلمان اقلیت میں ہیں مگر وہ ایسی اقلیت نہیں جس کو جماعت تحت القوم یا قوم اندر قوم کہا جائے اور جو اکثریت کی تابع ہو کر رہے، بلکہ وہ ایسی اقلیت ہے کہ مستقل قوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ موجودہ تقسیم کے بموجب چار صوبوں میں اور بشمول بلوچستان و کشمیر و آسام سات صوبوں میں وہ خود اکثریت میں ہیں۔

دوم یہ کہ مذہبی امور فنڈامنڈل رائٹس اور بنیادی حقوق قرار دیے جائیں جو قانون کی دست برد سے قطعاً محفوظ ہوں اور وہ مخصوص طور پر اس قوم کے محفوظ حق ہوں، جس سے ان کا تعلق ہے۔ تجویز میں ہندو مسلمانوں کے ایک قوم یا دو قوم ہونے کی بحث سے پوری احتیاط کے ساتھ دامن بچایا گیا ہے، البتہ ایک لطیف پیرایے میں اس طرف اشارہ ضرور ہے کہ دو قوم ماننے کی بنا پر مطالبہ تقسیم کے بجائے معقول، مفید اور زیادہ سنجیدہ مطالبہ یہ ہے کہ مرکز میں ہندو مسلم مساوات کا مطالبہ کیا جائے۔

باب دوم:

تجاویزِ کانگریس

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کرپس مشن کی ناکامی پر نئی دہلی کے اجلاس منعقدہ ۱۰ر اپریل ۱۹۴۲ء میں ایک مفصل ریزولیوشن منظور کیا تھا، جس کے مخصوص فقرے حسب ذیل ہیں:

"کانگریس ہندوستان کی آزادی اور اتحاد کی حامی رہی ہے اور اس اتحاد میں کوئی رخنہ بالخصوص جدید دنیا میں جب کہ لوگوں کے دماغوں میں وسعت پذیر فیڈریشنوں کا تصور بندھا ہوا ہے، سب متعلقہ فریقوں کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ اس کا خیال کرنا بھی نہایت تکلیف دہ ہے، پھر بھی کانگریس کسی علاقہ وارانہ واحدے کے لوگوں کو ان کی علانیہ اور مسلم مرضی کے خلاف انڈین یونین میں رہنے پر مجبور کرنے کا خیال دل میں نہیں لاسکتی۔ ہر علاقہ وارانہ واحدے کو انڈین یونین میں پوری خود اختیاری حاصل ہونی چاہیے۔ اس اصول کو تسلیم کرتے ہوئے کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ ایسی حالت پیدا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ جس سے مختلف فرد (صوبے) ایک مشترک اور مجموعی قومی زندگی کو مدد دے سکیں۔

اس اصول کو مان لینے سے لازمی طور پر یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی ایسی تبدیلی نہ ہو جس سے نئے مسئلے پیدا ہو جائیں اور دوسرے نحوس گروہوں پر جو اس علاقے میں ہوں دباؤ ڈالا جائے۔ ہر منفرد علاقے کو یونین کے اندر پوری پوری خود مختاری حاصل ہوگی، لیکن ایک مضبوط قومی حکومت بھی لازمی شرط ہے"۔ (تیج، مورخہ ۱۳ر اپریل ۱۹۴۲ء نمبر ۹۹، ج۔ ۲۰ و تیج، مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۳ء۔ نمبر ۲۶۵، ج۔ ۲۳)

اس تجویز کا حاصل یہ ہے :

(۱) ہندوستان کی تقسیم ہندوستان کے ہر جزو کے لیے تباہ کن ہے۔

(۲) لہٰذا کانگریس ہندوستان کے اتحاد کی حامی ہے۔

(۳) کانگریس کی کوشش یہی رہے گی کہ تمام صوبے بلا کسی جبر کے محض خوشی سے ایک مشترک مرکز بنائیں۔

(۴) اگر کسی صوبے کی علانیہ مرضی اس اتحاد واشتراک کے مخالف ہو اور وہ اس مشترک مرکز میں شریک نہ ہونا چاہے تو کانگریس اس کو شرکت پر مجبور نہیں کر سکتی۔

(۵) جس قدر علاقے اس مشترک مرکز میں شریک ہوں گے وہ پورے پورے خود مختار ہوں گے۔

ورکنگ کمیٹی کے اس اجلاس کے بعد مئی ۱۹۴۲ء میں الٰہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں بابو جگت نرائن نے تجویز پیش کی :

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ کسی مرتب ریاست یا علاقہ وارانہ واحدے کو انڈین یونین یا فیڈریشن سے الگ ہونے کا حق دے کر ہندوستان کے ٹکڑے کرنے کی ہر تجویز مختلف ریاستوں اور صوبے کے لوگوں اور بحیثیت مجموعی ملک کے مفاد کے لیے سخت مضر ہوگی۔

اس لیے کانگریس ایسی کسی تجویز پر رضامند نہیں ہو سکتی"۔ (تیج، مورخہ ۶/ مئی ۱۹۴۲ء، ج۔ ۲۰، نمبر ۱۲۲ و تیج، مورخہ ۲/ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

جگت نرائن کے ریزولیوشن کے متعلق عام طور پر مخالف پریس نے یہی پروپیگنڈا کیا کہ کانگریس کی مجلسِ عاملہ نے اجلاس دہلی میں صوبجات کے لیے جو علاحدگی کا حق تسلیم کیا تھا، اس کو آل انڈیا کانگریس کے اجلاس الٰہ آباد نے مسترد کر دیا۔ مگر در حقیقت یہ پروپیگنڈا غلط تھا۔ آپ جگت نرائن کے ریزولیوشن کو پھر پڑھیے اور غور فرمائیے کہ وہ صرف دوسرے مفہوم کی تائید کرتا ہے، جس کو ہم نے نمبر ۲ و نمبر ۳ میں بیان کیا ہے، یعنی کانگریس کی خواہش یہی ہے کہ صوبجات مرکز سے علاحدہ نہ ہوں۔

جگت نرائن کے ریزولیوشن میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے علاحدگی کے حق کی نفی ہوتی ہو۔ چناں چہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی اجلاس میں بحیثیت صدر اجلاس توضیح کردی کہ

"سر کرپس کی تجویز پر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے جو ریزولیوشن دہلی میں پاس کیا تھا اس میں مسلم لیگ کے مطالبۂ تقسیم ہند کے متعلق جو نظریہ اختیار کیا گیا ہے، موجودہ ریزولیوشن سے اس کی کسی طرح تردید نہیں ہوتی"۔ (تیج، مورخہ ۲/اکتوبر ۱۹۴۲ء)

پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنی تقریر میں اعلان کردیا کہ میرا خیال ہے کہ بابو جگت نرائن کا ریزولیوشن ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن کے خلاف نہیں جاتا"۔

(تیج، مورخہ ۶/مئی ۱۹۴۲ء، نمبر ۱۲۲ج۔ ۲۰)

صوبائی خود مختاری:

اس کے بعد ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۶/اگست ۱۹۴۲ء میں جو بمبئی میں ہوا تھا، ذیل کا طویل ریزولیوشن پاس کیا، جس میں صوبجاتی خود مختاری کو زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا گیا۔ نیز ان صورتوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا جن کے ذریعے سے آزاد ہندوستان اپنی آزادی باقی رکھ سکتا ہے اور دنیا میں امن ایک پائدار نعمت کی حیثیت سے حاصل کر سکتا ہے۔

ریزولیوشن یہ ہے:

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی انتہائی زور کے ساتھ ہندوستان سے برطانوی طاقت کی واپسی کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہو جانے پر ایک عارضی حکومت بنے گی اور آزاد ہندوستان اتحادی قوموں کا ساتھی ہوگا۔ ان کی ان سختیوں اور مصیبتوں میں شریک ہوگا جو آزادی کی جدوجہد میں اٹھانی پڑیں گی۔ ایسی عارضی حکومت ملک کی خاص خاص پارٹیوں اور گروہوں کے تعاون سے ہی بن سکتی ہے۔ اس طرح وہ ایک ملی جلی حکومت ہوگی، جس میں اہل ہند کے تمام طبقوں کی نمایندگی ہوگی۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہو

گا کہ وہ اتحادی طاقتوں کے ساتھ ساتھ اپنی تمام مسلح اور انتھک قوت کے ساتھ ہندوستان کا بچاؤ کرے اور استبداد کی مدافعت کرے اور کھیتوں اور کارخانوں وغیرہ میں کام کرنے والوں کی بہبودی اور ترقی کو اجاگر کرے، کیوں کہ بنیادی طور پر تمام طاقت اور اقتدار اسی طبقے کا ہونا چاہیے۔ یہ عارضی حکومت نمایندہ اسمبلی کی اسکیم تیار کرے گی اور اس میں حکومتِ ہند کا ایسا آئین مرتب کرے گی جو تمام اہلِ ملک کے لیے قابلِ قبول ہو۔

کانگریس کے نظریے کے مطابق یہ آئین فیڈرل (وفاقی) ہونا چاہیے اور اس فیڈریشن میں شریک ہونے والی یونٹوں کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہیے اور اختیارات باقی انھی یونٹوں کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں"۔

(اس کے بعد ہندوستان اور اتحادی قوموں کے تعلقات وغیرہ پر بحث کرنے کے بعد ریزولیوشن کا دوسرا حصہ یہ ہے)۔

آزاد قوموں کا فیڈریشن:

"اگرچہ ابتدائی طور پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا تعلق اس خطرے کے وقت ہندوستان کی آزادی اور بچاؤ سے ہے، کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ دنیا کی آیندہ صلح، استحکام اور باقاعدہ ترقی کا تقاضا ہے کہ آزاد قوموں کا عالمگیر فیڈریشن ہو۔ کسی اور بنیاد پر موجودہ دنیا کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ ایسا آزاد عالمگیر فیڈریشن اپنی ترتیب دینے والی قوموں کی آزادی کا ضامن ہوگا، استبداد کی روک تھام کرے گا اور ایک قوم کو دوسری قوم کی لوٹ کھسوٹ نہ کرنے دے گا۔ قومی اقلیتوں کو بچائے گا، پس ماندہ علاقوں اور قوموں کی ترقی دے گا اور دنیا کے وسایل کو سب کے مشترک فائدے کے لیے بروے کار لائے گا۔ ایسا عالمگیر فیڈریشن قایم ہو جانے پر ہر ملک کے لیے ترکِ اسلحہ قابلِ عمل ہوگا۔ پھر بحری، ہوائی اور بری فوجوں کی ضرورت نہ رہے گی اور ایک عالمگیر فیڈرل فوج دنیا میں امن رکھے گی اور استبداد روکے گی۔ آزاد ہندوستان خوشی سے ایسے عالمگیر فیڈریشن میں شریک ہوگا اور داخلی مسئلوں کو طے کرنے میں دوسرے ملکوں کے ساتھ برابر کی حیثیت سے شریک ہوگا۔ ایسا فیڈریشن ان تمام قوموں کے لیے کھلا ہوگا جو اس کے بنیادی اصول سے متفق ہوں"۔

(تیج، مورخہ ۸ راگست ۱۹۴۲ء، نمبر ۲۱۶ ج۔ ۲۱)

یہ تجویز پاس ہو کر شائع ہوئی تھی کہ اگلے روز کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبر گرفتار کر لیے گئے اور ملک میں گرفتاریوں اور بلووں کا تانتا بندھ گیا۔

۱۹۴۵ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اجلاس کا موقع ملا۔ اس اجلاس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے مندرجہ ذیل تجویز پاس کی:

"چوں کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے چند ریزولیشنوں کے بارے میں جو ۱۹۴۲ء میں ہندوستان کے آئندہ آئین کے بارے میں منظور کیے گئے تھے کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے، اس لیے ورکنگ کمیٹی ان کے بارے میں مندرجہ ذیل پوزیشن پھر سے واضح کر دینا چاہتی ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اگست ۱۹۴۲ء والے ریزولیشن کے مطابق جمہوری طریقے پر منتخب شدہ کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی (نمایندہ اسمبلی) ہندوستان کی حکومت کے لیے ایک آئین تیار کرے گی، جو قوم کے تمام طبقوں کے لیے قابل قبول ہونا چاہیے۔ کانگریس کے نظریے کے مطابق یہ آئین ایک وفاقی نوعیت کا ہونا چاہیے، جس میں ریزی ڈیوری پاورس (غیر مصرحہ اختیارات) فیڈریشن میں شامل ہونے والی یونینوں کو حاصل ہونے چاہئیں۔ بنیادی حقوق جو کراچی کانگریس نے بیان کیے تھے اور اس کے بعد ان میں جو اضافہ ہوا ہے، وہ اس آئین کا لازمی جزو ہونا چاہئیں۔ مزید برآں جیسا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے اجلاس میں جو کہ مئی ۱۹۴۲ء میں الٰہ آباد میں ہوا تھا، بیان کیا تھا کہ کانگریس اس قسم کی تجویز سے اتفاق نہیں کر سکتی، جس کے ذریعے کسی ریاست یا علاقے کی یونٹ کو ہندوستان کی یونین یا فیڈریشن سے علاحدگی کا حق دے کر ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تجویز کی گئی ہو۔ کانگریس جیسا کہ اپریل ۱۹۴۲ء میں ورکنگ کمیٹی نے واضح کر دیا تھا، ہندوستان کی مکمل آزادی اور اتحاد کی پابند ہے اور اس اتحاد میں خاص کر موجودہ دنیا میں، جب کہ دنیا کے لوگ بڑے بڑے فیڈریشن بنانے کی فکر کر رہے ہیں، کسی قسم کی رخنہ اندازی تمام متعلقہ جماعتوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی اور اس کا خیال بھی انتہا درجہ تکلیف دہ ہوگا۔ اس کے باوجود کانگریس نے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ کسی یونٹ کو اس کی علانیہ اور طے شدہ مرضی کے خلاف ہندوستانی یونین میں شامل رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اس اصول کو مانتے ہوئے ایسی کوشش کرنی چاہیے جس سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مختلف باشندوں کو ایک مشترکہ اور تعاونی قومی زندگی کو ترقی دینے میں امداد ملے۔

اس اصول کو ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسی کوئی تبدیلی نہ کی جائے جس سے نئے نئے مسئلے کھڑے ہو جائیں اور جس کی وجہ سے اس علاقے کے اہم طبقے میں کسی قسم کا جبر کیے جانے کا اندیشہ ہو۔ ہر علاقہ وارانہ یونٹ کو اپنے یونین کے اندر زیادہ سے زیادہ مکمل خود اختیاری حاصل ہو اور ایک مضبوط قومی حکومت سے مطابقت رکھتا ہو"۔

(تیج، مورخہ ۹/ستمبر ۱۹۴۵ء)

کانگریس کے ان ریزولیوشنوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ چار سوال جن کو ہم نے تمہید میں پیش کیا تھا کانگریس ان کے جوابات اس طرح دیتی ہے :

(۱) ہندوستان کی تمام ملتوں اور ہندوستان کے تمام صوبوں کے اتحاد و اتفاق کے ذریعے مشترکہ جدوجہد کر کے آزادی حاصل کی جائے۔

(۲) مکمل آزادی کے حصول کے بعد ہندوستان ایک عالمگیر فیڈریشن میں شریک ہو کر نہ صرف یہ کہ اپنے خلاف جنگ کے امکانات کو ختم کرے، بلکہ تمام دنیا کو جنگ کی جہنم نواز ہولناکیوں سے نجات دلادے اور اگر عالمگیر فیڈریشن نہ ہو تو کم از کم ایک ایشیائی فیڈریشن بنا کر ایشیا کو یورپ کے پنجۂ استبداد سے نجات دلادے۔

نوٹ : یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایشیائی فیڈریشن نہ صرف ہندوستان کے لیے مفید ہو سکتا ہے، بلکہ یورپ کے پنجۂ قہر سے دنیائے اسلام کو نجات دلانے کی واحد شکل صرف یہی فیڈریشن ہے، جس میں قدرتی طور پر مسلمانوں کی حیثیت بہت ممتاز ہوگی۔

سوال سوم کا جواب کانگریس اس طرح پر دیتی ہے کہ وہ مرکز کی شکل وحدانی نہیں قرار دیتی۔ حالاں کہ ہندو کا فایدہ اسی میں ہے، بلکہ اس نے طے کر دیا ہے کہ مرکز وفاقی ہوگا، جس کے اپنے اختیارات کچھ نہ ہوں گے، بلکہ اس کو وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو صاف طور پر تصریح کر کے تمام صوبے اس کے حوالے کریں۔ ان اختیارات کے ماسوا تمام مصرحہ اور غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے۔

سوال نمبر ۴ یعنی حقِ خود ارادیت کے متعلق کانگریس نے تسلیم کر لیا ہے کہ کسی

واحدہ (یونٹ) یعنی فیڈریشن کے کسی جزو کا اگر مطالبہ یہی ہے کہ وہ مرکز سے علاحدہ ہو اور اپنے باشندوں کے اتفاقِ رائے یا کثرتِ آرا سے وہ یہی طے کر چکا ہے تو کانگریس اس کو اس کی علانیہ مرضی کے خلاف فیڈریشن اور مرکز کا جز بنا رہنے پر مجبور نہیں کرے گی۔

مگر چوں کہ اس قسم کا افتراق اور انقسام جدوجہدِ آزادی پر کاری ضرب اور ایک تباہ کن حملہ ہے، تقسیم کا اصول مان لینے سے علاقہ جاتی تقسیم ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ منحصر نہیں رہے گی، بلکہ ہندوؤں میں سکھ، ستاتن، شودر وغیرہ اور مسلمانوں میں شیعہ، سنی، مرزائی وغیرہ مختلف فرقوں اور مختلف برادریوں کے سوالات بھی پیدا ہو کر بہت زیادہ الجھن پیدا کر سکتے ہیں۔ جن سے آرزوے آزادی کبھی بھی شرمندہ وجود نہ ہو گی اور اگر بفرضِ محال آزادی حاصل ہو بھی جائے تو حصہ بخرہ شدہ ہندوستان اپنی آزادی باقی نہیں رکھ سکتا۔

لہٰذا کانگریس نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ اس علاحدگی پر راضی نہیں ہو سکتی اور اس بنا پر کانگریس نے اپنا یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ ایسی صورتیں اختیار کرے کہ کسی قوم یا کسی حصے کو ایسی شکایات ہی پیدا نہ ہوں کہ وہ علاحدگی پر اصرار کرے اور پوری جدوجہد کرے کہ باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل سے متحدہ ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور قوی بنایا جائے۔

ایسی شکایات کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اختیارات صوبوں کے ہوں۔ غیر مصرحہ اختیارات بھی صوبوں ہی کے حوالے ہوں گے اور مرکز کی ایسی شکل رکھی جائے جو تمام اہلِ ملک کے لیے قابلِ قبول ہو۔

مذہبی و ثقافتی آزادی:

باقی رہا مذہبی اور ثقافتی آزادی کا سوال۔ اس کے متعلق ورکنگ کمیٹی کے اجلاس پونا (ستمبر ۱۹۴۵ء) نے ان بنیادی حقوق کا حوالہ دیا ہے جو کراچی کانگریس نے بیان کیے تھے اور جو اس کے بعد بڑھائے گئے اور اعلان کیا ہے کہ یہ بنیادی حقوق آئین کا لازمی جز ہوں گے۔

(دیکھو تجویز مجلس عاملہ پونا، تیج، ۱۹؍ ستمبر ۱۹۴۵ء)

لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس موقع پر کراچی کانگریس کے بنیادی حقوق، نیز ان اضافوں کو جو اس کے بعد ہوئے، درج کردیں، تاکہ واقعات کی صحیح تصویر سامنے آسکے اور یہ غور کیا جاسکے کہ آیا کانگریس سے علاحدگی یا تقسیم ہند کے مطالبے کی کوئی معقول دلیل اور کوئی منصفانہ عذر موجود ہے یا محض عناد اور ضد ہے، جس کو زعمائے لیگ تو اختیار کرسکتے ہیں، مگر وہ علمائے کرام جو اسلامی اخلاق و خصائل کے صحیح آئینہ دار ہونے چاہئیں کسی طرح برداشت نہیں کرسکتے۔

قرآن حکیم کی تعلیم ہے:

"کسی قوم سے بغض و عداوت ہرگز ہرگز تمھیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم انصاف نہ کرو (ہر حالت میں) عدل و انصاف سے کام لو۔ یہی طرزِ عمل تقوے سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ کو خبر ہے ان تمام باتوں کی جو تم کرتے ہو"۔
(سورۂ مائدہ، آیت ۸)

کراچی رزولیوشن اور بنیادی حقوق:

کراچی رزولیوشن میں بنیادی حقوق کی وہ دفعات جن کا تعلق ہندوستان کی مختلف ملتوں سے ہے، یہ ہیں:

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۱ء میں طے کیا ہے کہ کوئی کانسٹی ٹیوشن (ملکی قانون و آئین) جو اس کی طرف سے طے پائے یا جو اس کے وسیلے سے سوراج گورنمنٹ تیار کرے، اس میں امورِ ذیل کا ہونا بہت ضروری اور لازمی ہے:

(۱) ہر باشندۂ ہندوستان کو حقوقِ ذیل حاصل ہوں گے، یعنی اپنی رائے آزادی سے ظاہر کرنا اور اشتراکِ عمل اور باہمی اختلاط میں مکمل آزادی اور اس کے ساتھ بغیر اسلحہ کے ایسی اغراض کے واسطے مجتمع ہونا جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہ ہوں۔

(۲) ہر باشندۂ ہندوستان کو ضمیر کی آزادی ہوگی اور وہ اپنے مذہب کا اعلان آزادی سے کرسکے گا اور اپنے مذہب کے فرائض و رسوم آزادی سے برت سکے گا۔ بشرطے کہ اس سے انتظامِ عامہ اور اخلاق میں کوئی نقص نہ واقع ہو۔

(۳) ملک کی اقلیتوں کے تمدن اور ان کی زبان اور رسم تحریر محفوظ ہوں گے۔ نیز ملک کے وہ مختلف رقبے جو باعتبارِ زبان قائم ہیں، ان کا تحفظ ہو گا۔

(۴) تمام باشندگانِ ہندوستان بلا امتیاز مذہب و مسلک یا ذات و قوم یا جنسیت کے، قانون کی نظر میں برابر ہوں گے۔

(۵) کوئی باشندۂ ہندوستان خواہ مرد ہو یا عورت بوجہ اپنے مذہب یا ذات یا جنسیت کے کسی پبلک ملازمت یا عہدے یا اعزاز سے یا کسی تجارت یا پیشے سے ممنوع نہیں سمجھا جائے گا۔

(۶) تمام باشندگانِ ہندوستان کو متعلق استعمال آب، چاہ اور تالابوں کے نیز تعلیم گاہوں اور مقاماتِ تفریحِ عامہ کے استعمال کے متعلق کہ جن کی برقراری اور انتظام اسٹیٹ (حکومتِ وقت) کی طرف سے یا لوکل فنڈ (ڈسٹرکٹ و میونسپل بورڈ) سے ہوتا ہو یا جن کو پرائیویٹ اشخاص نے پبلک فایدے کے واسطے مخصوص کر دیا ہو مساوی حقوق حاصل ہوں گے"۔

اس کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۶ / اکتوبر ۱۹۳۷ء بمقام کلکتہ میں ایک تجویز کے ذریعے سے ان اصول کو زیادہ واضح الفاظ میں دہرایا۔ اس تجویز کی تمہید میں کہا گیا ہے کہ کانگریس کا مقصد ہے ملک کو آزاد کرانا اور اسے اتحاد کے دھاگے میں باندھنا، جہاں کوئی بھی اقلیت یا اکثریت والا فرقہ کسی دوسرے فرقہ کو اپنے فایدے کے لیے نقصان نہ پہنچا سکے اور جہاں سارے ہندوستان کے فایدے کے لیے ملک کے سب فرقے مل کر کام کریں۔ آزادی اور تعاون کے اس مقصد کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستان کی مختلف تہذیبوں میں سے کسی پر دباؤ ڈالا جائے، بلکہ ان سب کو محفوظ رکھا جائے، تاکہ سب لوگوں کو اور ہر فرقے کو اپنے اپنے رجحان کے مطابق بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی ترقی کرنے کا موقع مل سکے۔

اس تجویز کا آخری فقرہ یہ ہے:

"ایسے تمام کاموں میں جن کا اقلیت سے تعلق ہے، کانگریس اقلیت کو ساتھ لے کر ہی اپنے مقصود تک پہنچنا چاہتی ہے۔ وہ مقصد ہے ملک کو آزاد کرانا اور ہندوستان کے

سب لوگوں کی حالت کو سدھارنا"۔

(کانگریس بلیٹن، شائع کردہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی الہ آباد۔
۲ر دسمبر ۱۹۳۷ء، صفحہ ۹ تا ۱۲)

پھر ہری پور، ضلع سورت کے اجلاسِ عام منعقدہ ۱۹، ۲۰، ۲۱ر فروری ۱۹۳۸ء میں اس تحفظ کی تجویز کو مندرجہ ذیل الفاظ میں پاس کیا گیا:

اقلیتوں کے حقوق:

"کانگریس ہندوستان کے مسلمانوں اور اقلیتوں کے بڑھتے ہوئے مخالف سامراج جذبے اور جوش کا خیر مقدم کرتی ہے اور ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں جو سب کے لیے ایک اور یکساں ہے اور جو متحدہ قومی بنیاد پر ہی لڑی جاسکتی ہے، اس میں ان تمام فرقوں اور طبقوں کی متحدہ شرکت کا بھی خیر مقدم کرتی ہے۔ کانگریس خاص طور پر ان اقلیتوں کی اس کثیر تعداد کا جو پچھلے سال کانگریس میں شریک ہوئی ہے اور آزادی واستحصال سے نجات کی جدوجہد اور کشمکش میں اس نے جو اجتماعی طاقت بہم پہنچائی ہے اس کا بھی خیر مقدم کرتی ہے"۔

"ورکنگ کمیٹی نے اکتوبر ۱۹۳۷ء میں اپنے کلکتہ کے اجلاس میں اقلیتوں کے حقوق پر جو تجویز پاس کی تھی اسے کانگریس منظور کرتی ہے اور نئے سرے سے یہ اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کی اقلیتوں کے تمدنی، مذہبی اور لسانی حقوق کی حفاظت کرنا کانگریس کا پہلا فرض اور بنیادی پالیسی ہے، تاکہ حکومت کی کسی بھی ایسی اسکیم میں جس میں کانگریس شریک ہو (اقلیتوں کو) ترقی اور نشو ونما کا زیادہ سے زیادہ موقعہ مل سکے اور وہ قوم کی سیاسی، اقتصادی اور کلچرل زندگی میں پورا پورا حصہ لے سکیں"۔

مسلمانوں کے مذہبی و ثقافتی حقوق کے تحفظ کی مزید یقین دہانی:

بنابریں مسلمانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ آزاد ہندوستان اور سوراج کی حکومت میں ان کا مذہب اور مذہبی فرائض اذان، نماز جمعہ، عید، روزہ، حج، زکوٰۃ، مذہبی تبلیغ، مساجد، مقابر، قربانی، مذہبی جلوس، مذہبی جلسے وغیرہ جملہ مذہبی رسوم اور مذہبی ادارے،

خانقاہیں، امام باڑے، عیدگاہیں، تکیے، کربلائیں، آثارِ قدیمہ، اوقاف وغیرہ سب محفوظ ہوں گے اور اسی طرح ان کی زبان، شاعری، رسم الخط وغیرہ سب کے سب آزاد اور محفوظ ہوں گے۔ کسی پر کوئی رکاوٹ اور قید نہ ہوگی۔ ہاں اس کا ضرور لحاظ کیا جائے کہ کوئی ایسا طریقہ اور عمل اختیار نہ کیا جائے جس سے انتظامِ عامہ اور امن و سکون یا اخلاقِ عامہ میں نقص واقع ہو۔

مسلمانوں کو دھوکا دینے والے خود غرض اور خود غرضوں کے آلۂ کار لوگوں کے دام فریب میں ہرگز نہ آنا چاہیے اور پورے اعتماد و اطمینان کے ساتھ کانگریس میں داخل ہو کر جنگِ آزادی میں جدوجہد کرنی چاہیے"۔

(کانگریس بلیٹن، شائع کردہ جے۔ بی کرپلانی جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی، سوراج بھون الٰہ آباد، اسٹار پریس، الٰہ آباد)

کانگریس کا الیکشن مینی فیسٹو:

ان تجاویز کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مقاصد کو بھی پیش کر دیا جائے جن کے لیے وہ انتخاب لڑ رہی ہے۔

(۱) کانگریس ہندوستان کے ہر شہری کے مساویانہ حقوق اور ذرائع کی علمبردار ہے۔

(۲) کانگریس تمام مذاہب اور فرقوں میں اتحاد اور ان سب کے مابین خوش اعتقادی کی حامی ہے۔

(۳) کانگریس چاہتی ہے کہ ملک کے تمام لوگ مجموعی طور پر اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مطابق ترقی کرنے اور پھلنے پھولنے کا موقعہ حاصل کر سکیں۔

(۴) کانگریس کی پالیسی یہ ہے کہ وسیع قومی اتحاد کے ماتحت ہر علاقے کے لوگ اپنی تہذیب و تمدن کے مطابق اپنی زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالیں۔

(۵) کانگریس ایک زبانی اور تمدنی بنیاد پر تمام صوبوں کو وجود میں لانے کے حق میں ہے۔

(۶) کانگریس ان تمام لوگوں کے حقوق کے لیے لڑے گی جو گھریلو مشکلات میں مبتلا ہیں

اور ناانصافی سے روندے جا رہے ہیں اور تمام رکاوٹیں دور کر کے ان کے لیے دوسروں کے برابر درجے حاصل کرے گی۔

(۷) کانگریس مرکز کے ماتحت صوبہ جات و دیگر علاقہ جات کے لیے پوری آزادی کی حمایت کرتی ہے۔

(۸) کانگریس ایک ایسی جمہوری حکومت قایم کرنا چاہتی ہے، جو شہریوں کے جایز حقوق اور شہری آبادی کے بنیادی اصولوں پر مبنی آئین پر قایم ہوگی۔

(۹) کانگریس ہندوستان کی سب سے بڑی لعنت یعنی غربت کو دور کر کے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے اہم ترین کام کے لیے ہر ممکن جدو جہد کرے گی۔

(۱۰) کانگریس ہندوستان کی زراعت اور صنعت کو جدید ترین طریقے پر ترقی دے گی اور دولت کی پیداوار اور تقسیم کے تمام سوشل ذرائع پر کنٹرول رکھے گی، تاکہ ہندوستان ایک خوش حال اور باہمی دولتِ مشترکہ کا قابلِ مثال نمونہ بن سکے۔

(۱۱) بین الاقوامی معاملات میں کانگریس آزاد ممالک کی ایک فیڈریشن قائم کرنے کے حق میں ہے۔

(۱۲) کانگریس تمام غلام ممالک کی آزادی کے کاز کو بلند کرے گی اور ہر جگہ امپریلزم کو جڑ سے اکھاڑنے کی جدو جہد کرے گی(۱)۔

(مدینہ بجنور، مورخہ یکم نومبر ۱۹۴۵ء)

حاشیہ:

(۱) یہ کانگریس کے اس مینی فیسٹو کا خلاصہ ہے، جو اس نے آنے والے انتخابات کے موقع پر شائع کیا تھا۔
(ا۔ س۔ ش)

باب سوم:

تجاویزِ لیگ

ہماری پوری خواہش ہے کہ کانگریس، جمعیت علما اور مسلم لیگ کی تجاویز اور ان کے نظریات کو اس طرح پیش کریں کہ کسی طرح جماعت کی توہین یا تنقیص یا کسی جماعت کے متعلق جنبہ داری اور حمایت کے اعتراض سے ہمارا دامن پاک رہے۔

یقین ہے کہ انصاف پسند حضرات ہمیں اس جدوجہد میں کامیاب قرار دیں گے۔ اگرچہ مسلم لیگ کے جذباتی حامیوں کے سامنے جب مطالبۂ پاکستان کی اصل پوزیشن آئے گی تو غلط اور بیجا حمایت کا الزام اپنے بجائے ہمارے اوپر عاید کریں گے۔

بہر حال ہم اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ لیگی صاحبان کی تصانیف یا لیگی اخبارات کے اقتباس سے سند پیش کرتے رہیں۔ اس کے بعد بھی اگر جنبہ داری اور حمایت کا الزام ہم پر لگایا جائے تو بلاشبہ یہ حق و انصاف کا خون ہوگا، جس کا قصاص لیگ کو اپنی مستقل ناکامی اور ابدی شکست و خاموشی سے ادا کرنا پڑے گا۔ قانونِ انقلاب کا یہی فیصلہ ہے۔ باطل کا فروغ چند روزہ ہوتا ہے، پھر اس کا ٹمٹماتا چراغ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتا ہے۔

۱۹۱۶ء میں مسٹر جینا کی زیرِ قیادت لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک میثاق مرتب ہوا، جو "میثاقِ لکھنؤ" کہا جاتا ہے۔ اس میثاق میں طے کیا گیا:

> "مسلمانوں کے لیے نمایندگی خاص نشستوں کے ذریعے ہو، جس کی صوبہ وار تفصیل یہ تھی:

پنجاب میں انتخاب شدہ ہندوستانی ممبروں کا نصف (یعنی پچاس (۵۰) فی صد، بنگال میں چالیس (۴۰) فی صد، یوپی میں تیس (۳۰) فی صد، بہار میں پچیس (۲۵) فی صد، سی پی میں پندرہ (۱۵) فی صد، مدراس میں پندرہ (۱۵) فی صد، بمبئی و سندھ ایک تہائی (۱)۔
اور یہ بھی شرط تھی کہ اس کے علاوہ مسلمان کسی دوسرے انتخاب کونسل میں حصہ نہ لے سکیں گے۔ یہ بھی منظور ہوا کہ کوئی مسودۂ قانون یا مسودے کا کوئی حصہ اس وقت تک کونسل میں پیش نہ ہو سکے گا جب تک متعلقہ فرقے کے ۴/۳ ممبران اس سے متفق نہ ہوں"۔

نیز طے ہوا کہ:

"مرکزی کونسل میں ایک تہائی تعداد مسلمان ممبروں کی ہوگی اور صوبہ وار تعداد ممبروں کی اسی تناسب سے ہوگی جیسے صوبائی کونسلوں میں تعداد منظور ہوئی ہے"۔ (تاریخ مسلم لیگ، صفحہ ۲۸۔۱۲۷، از مرزا اختر حسن بی اے، ایل ایل بی، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ)

اس میثاق کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی مرحوم اور قوم پرور حضرات نظر بند تھے۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۹)

سیدی شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب اپنے شیخ محترم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ العزیز کے ہمراہ جنگی قیدی کی حیثیت سے مالٹا میں اسیر تھے۔ مسٹر جینا نے اپنی ذمہ داری پر یہ میثاق کیا جس پر قوم پرور طبقے کو افسوس ہوا، کیوں کہ اس میثاق میں اقلیت والے صوبوں کو چند زاید نشستیں دے کر اکثریت والے صوبوں کا گلا گھونٹا گیا۔

کون نہیں جانتا! کہ مسلمانوں کی تعداد (صوبہ پنجاب میں ۵۶ فی صد اور بنگال میں ۵۳ فی صد ہے) اگر اس وقت آبادی کی نسبت سے ممبریاں لی جاتیں تو آج سے تیس سال پیشتر پاکستان بن گیا ہوتا، مگر اقلیت والے صوبوں میں ممبری کے حریص لوگوں کے جزوی نفع کی خاطر اکثریت والے صوبوں کو بھی ہندوؤں کا دستِ نگر کر دیا! اور اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقل حیثیت ختم کر کے ان کو صرف پاسنگ کی حیثیت میں کر دیا۔

مسٹر جینا کا اس وقت کا نظریہ اُن کے مدرجہ ذیل فقرے سے واضح ہوتا ہے جو آل پارٹیز کے اجلاس منعقدہ ۲۴/ جنوری ۱۹۲۵ء بمقام دہلی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"اگر مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے حکومت میں حصہ دیا گیا تو ایسا ہی ہے جیسے کسی کو اس کی جہالت اور نااہلیت پر انعام دیا جائے۔"

پھر ۱۹۲۹ء میں بھی میثاق لکھنؤ سے بارہ برس بعد آل پارٹیز کنونشن کے اجلاس کے موقعے پر ایسی صورت پیش آگئی تھی کہ باہمی سمجھوتے سے پنجاب اور بنگال میں کوشش کی جاتی تو مسلمان (اٹھاون اور ساٹھ فی صد) تک حکومت میں حصے دار ہو جاتے، مگر اس صورت سے بھی گریز کیا گیا اور مسٹر جینا نے فرمایا کہ ہم پنجاب و بنگال کو زیادہ نشستیں دے کر انھیں زیادہ امیر بنانا نہیں چاہتے۔

بہر حال میثاقِ لکھنؤ ناقص تھا۔ قوم پرور طبقہ جو ہندو مسلم اتحاد کا حامی تھا اس کو یہ میثاق اس لیے ناپسند تھا کہ اس میں مسلمانوں کی حق تلفی تھی اور فرقہ پرست افراد جو ہندو مسلم اختلاف و منافرت کے ذریعے ہی سے سیاسی برتری حاصل کیا کرتے ہیں، ان کے لیے بھی پروپیگنڈے کا کافی موقع تھا۔

چناں چہ تھوڑے عرصے ہی کے بعد دوبارہ مطالبات کی ترتیب شروع ہوئی اور ہندو مسلمانوں کی بڑی بڑی کانفرنسوں کے بعد مسٹر جینا کے ۱۴ نکات ظہور پذیر ہوئے۔

مسٹر جینا کی مکمل تجویز جو ۱۴ نکات پر مشتمل ہے درج ذیل ہے:

"انڈین نیشنل کانگریس نے نہرو رپورٹ کو قطعی طور سے ٹھکرا دیا ہے اور ہندو مہاسبھا نے بھی یہ اعلان کر دیا ہے کہ اگر فرقہ وارانہ تصفیوں میں سے ایک لفظ بھی رد کر دیا گیا تو وہ رپورٹ کی حمایت سے پرہیز کریں گے۔ سکھ لیگ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ غیر برہمن اور اچھوت قوم والے بھی اس کے مخالف ہیں۔ چوں کہ نہرو رپورٹ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے مندوبین کے مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لہٰذا مسلم لیگ بھی نہرو رپورٹ کو قبول کرنے سے قاصر ہے۔

لیگ بہت غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہندوستانی حکومت کے لیے

کسی قسم کی آئینی اسکیم کو مسلمان اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک کہ حسبِ ذیل اساسی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ان شرائط کو شامل نہ کیا جائے:

(۱) ہندوستان کے آیندہ آئین کی شکل فیڈرل ہونی چاہیے۔

(۲) ہر صوبے کو کچھ نہ کچھ آزادی کے حقوق عطا کیے جائیں۔

(۳) ملک کی ہر مجلسِ واضعانِ قوانین و دیگر منتخب باڈیز (جماعتوں) میں اقلیت کی کافی نمایندگی کا سامان ہونا چاہیے اور کسی صوبے کی اکثریت کو اقلیت یا مساوات میں تبدیل نہ کیا جائے۔

(۴) مرکزی واضعانِ قوانین میں مسلمانوں کی نمایندگی کم از کم تہائی ہونی چاہیے۔

(۵) نمایندگی کے انتخابات کے لیے جداگانہ انتخابات قرار دیے جائیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حق بھی حاصل ہونا چاہیے کہ کسی خاص موقع پر مشترکہ انتخابات بھی زیرِ عمل لائے جاسکتے ہیں۔

(۶) اگر کسی وقت میں علاقوں کو دوبارہ تقسیم کرنے کی نوبت آئے تو اس وقت پنجاب، بنگال و سرحد کی مسلم اکثریت کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

(۷) ہر جماعت کے لیے مکمل آزادی ہونی چاہیے تاکہ وہ بغیر خوف و خطر عبادت و پوجا پاٹ و مذہبی پروپیگنڈا کر سکے۔ نیز مذہبی تعلیم کے ادارے اور انجمنیں قائم کرنے کے حقوق حاصل ہونے چاہییں۔

(۸) مرکزی واضعانِ قوانین کے آئین میں کسی قسم کا رد و بدل کرنے کا کوئی حق نہ ہونا چاہیے۔

(۹) کم از کم بغیر ایک تہائی مسلم وزیروں کے، کوئی کیبنٹ خواہ مرکزی ہو یا صوبائی، جائز نہ قرار دیا جائے۔

(۱۰) دیگر صوبوں کے مانند سرحد و بلوچستان میں بھی اصلاحات کیے جائیں۔

(۱۱) قابلیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اسٹیٹ و لوکل سیلف گورنمنٹ باڈیز میں مسلمانوں کو بھی دیگر ہندوستانیوں کے مانند ملازمت میں کافی دخل حاصل کرنے کے لیے آئین میں کچھ شرائطیں شامل کیے جائیں۔

(۱۲) سندھ کو صوبہ بمبئی سے علاحدہ قرار دیا جائے۔

(۱۳) اگر کسی فرقے کے ۳/۴، اراکین کسی بل یا تجویز کی اس بنا پر مخالفت کریں کہ یہ ان کے حق میں مضر ثابت ہوگی یا اگر اس مقصد کی تکمیل کے لیے جب تک کہ کوئی دوسری ترکیب و تدبیر نہ نکالیں، اس وقت تک مجلسِ واضعانِ قوانین یا کسی منتخب جماعت کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی بل یا تجویز کی منظوری قرار دے۔

(۱۴) مسلمانوں کے تمدن، تہذیب، تعلیم، زبان، مذہب اور خیراتی اداروں کے تحفظ و ترقی کے لیے آئین میں کافی سامان کیا جائے۔ حکومت و لوکل سیلف گورنمنٹ باڈیز کی جانب سے وظائف بھی کافی رقم میں ملنے چاہئیں۔

مسلمان اس وقت تک مشترکہ انتخابات کو تسلیم نہ کریں گے، جب تک کہ سندھ کو ایک علاحدہ صوبہ نہ قرار دیا جائے گا اور دیگر صوبوں کی طرح سرحد و بلوچستان میں اصلاحات جاری نہ کیے جائیں گے۔ نیز مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے نشستیں مخصوص کر دی جائیں اور جہاں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، وہاں وہ آبادی کے لحاظ سے زیادہ نشستوں پر قابض نہ ہوں گے۔

نیز یہ خیال کیا جائے کہ جہاں جہاں مسلمانوں کی اقلیت ہے، وہاں انھیں ان کے حقوق کے لحاظ سے کچھ زائد نمایندگی کا حق عطا ہونا چاہیے"۔

(تاریخ مسلم لیگ، مصنفہ اختر حسن، بی۔اے، صفحہ ۷۷۔۳۷۵)

یہ ہیں چودہ نکات! آپ کانگریس کے بنیادی حقوق سے ان کا موازنہ کیجیے اور غور فرمائیے کہ ان میں کتنے حقوق تسلیم کیے جا چکے ہیں اور جو حقوق تسلیم نہیں ہوئے، مثلاً بلوچستان کو آئینی صوبہ اب تک قرار نہیں دیا گیا تو اس میں کانگریس کا قصور ہے یا انگریز کی سامراجی پالیسی کا۔ نیز یہ کہ صوبہ سرحد کو کانگریس کی جدوجہد نے دوسرے صوبوں کی مساوی حیثیت تک پہنچایا یا لیگ کی کسی کوشش نے؟

تجویزیں پاس کر دینے اور راہِ آزادی میں قربان ہونے والے کی موت کو حرام قرار دینے کے علاوہ کیا مسلم لیگ کا کوئی کارنامہ ہے؟

بہرحال چودہ نکات کی پہلی جڑ ہی ابھی آتشین گل افشانی کر رہی تھی کہ راؤنڈ ٹیبل

کانفرنس کی دعوت نے مسٹر جینا اور دیگر زعمائے لیگ کو لندن کے ہوٹلوں میں پہنچادیا۔ پھر وہاں جو کچھ ہوا اس کا ذکر طویل ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے اپنے ایک مضمون میں اس کی وضاحت کردی ہے، جو "زعمائے لیگ اور مسٹر جینا کی سیاسی غلطیاں" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے اور دوسری مرتبہ اس کو "مسلم لیگ کی آٹھ مسلم کش سیاسی غلطیاں" کے عنوان سے شائع کیا جارہا ہے (۲)۔

ہم صرف ڈاکٹر محمود صاحب کے بیان کا ایک فقرہ یہاں درج کرتے ہیں:

"گاندھی جی نے لندن میں مسلمانوں کے چودہ نکات بلاکم وکاست منظور کر لیے تھے، لیکن ہمارے نمایندوں نے گاندھی جی کی کچھ پروا نہیں کی۔ انھوں نے ناممکن مطالبات پیش کیے جن کا مسلمانوں کے مطالبات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ نمایندے لندن میں یورپین ایسوسی ایشن کے حامی اور پشت پناہ بن گئے"۔ (۳)

(مدینہ بجنور، یکم اگست ۱۹۳۲ء، جلد ۲۱، نمبر ۵۴، صفحہ ۳)

تخیلِ پاکستان

(۲)

۲۹؍ دسمبر ۱۹۳۰ء کو مسلم لیگ کے اجلاس بست و یکم منعقدہ الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت میں ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب مرحوم نے فرمایا:

"جہاں تک میں نے مسلم افکار کا مطالعہ کیا ہے، میں اس بنا پر بلا تامل اعلان کرتا ہوں کہ اگر یہ اصول فرقہ داری کے مستقل فیصلہ کی اساس قرار دیا جائے کہ ہندی مسلمان کو پورا پورا حق ہے کہ وہ اپنے ہندی علاقوں میں اپنی ثقافت و روایات کو برقرار رکھتے ہوئے پورے طور پر آزادانہ ترقی کرنے کا مستحق ہے تو مسلمان ہندوستان کی آزادی کی خاطر اپنی عزیز ترین متاع بھی قربان کرنے کے لیے بے قرار ہے"۔ (تاریخ مسلم لیگ، صفحہ ۳۹۰)

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"نہرو رپورٹ کے مصنفین نے بھی فرقہ داری کے اس اعلیٰ پہلو کے فواید کو تسلیم کیا ہے۔ سندھ کی علاحدگی پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ وسیع قومی نقطۂ نگاہ سے یہ کہنا کہ فرقہ وارانہ صوبے نہیں بنانے چاہییں، ایک لحاظ سے یہ کہنے کے مترادف ہے کہ وسیع بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے الگ الگ قومیں بھی نہیں ہونی چاہییں"۔

"ان دونوں بیانات میں کچھ صداقت تو ہے، لیکن بین الاقوامیت کے بڑے سے بڑے داعی کو بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ کامل قومی خود اختیاری کے بغیر ایک بین الاقوامی ریاست کی تشکیل امر محال ہے۔ اسی طرح کامل ثقافتی خود اختیاری اور اعلیٰ قسم کی فرقہ داری کے بغیر ایک متحدہ قومیت کی تعمیر مشکل ہو گی۔ (ایضاً، صفحہ ۳۹۱)

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"ہندوستان کی مناسب تقسیم نو سے جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا سوال خود بخود ناپید ہو جائے گا۔ صوبہ جات کی موجودہ تقسیم ہی دراصل زیادہ تر اس مباحثے کی ذمہ دار ہے۔ ہندی مسلمانوں کو خالصتہً جغرافیائی حلقہ ہائے انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، بشرطیکہ صوبوں کو اس طریق پر تقسیم کیا جائے کہ مقابلتہً موافق تر قومی وحدت بلحاظ زبان، نسل، ثقافت اور مذہب میسر آسکے"۔ (تاریخ مسلم لیگ، صفحہ ۳۹۳)

سر اقبال مرحوم کا خطبۂ صدارت انگریزی میں تھا۔ اختر حسن صاحب نے اس کا مفہوم مندرجہ بالا الفاظ میں پیش فرمایا ہے اور اس سے پہلے عبدالقدوس صاحب ہاشمی نے اس کا ترجمہ ذیل کے الفاظ میں کیا تھا:

"جہاں تک وحدانی نظامِ حکومت کا تعلق ہے وہ تو میرے نزدیک آزاد ہندوستان میں قابلِ التفات ہی نہیں۔ باقی رہی فیڈریشن تو وہ اس قسم کی ہونی چاہیے کہ اس میں باقی ماندہ اختیارات کلیتہً خود مختار ریاستوں کے ہاتھ میں رہیں اور مرکزی فیڈرل حکومت صرف اُنھیں اختیارات کے استعمال کی اہل ہو، جو مختلف آزاد ریاستیں اپنی رضامندی سے اس کی تحویل میں دے دیں، میں مسلمانانِ ہند کو کبھی ایسے نظام کے منظور کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا، جس میں حقیقی فیڈریشن کا اصول ناپید ہو یا جس میں مسلمانوں کی انفرادی ملی ہستی کو تسلیم نہ کیا جائے۔ خواہ وہ نظام برطانوی الاصل ہو یا ہندی الاصل"۔ (پاکستان اور ہندوستان، صفحہ ۱۲۷، مرتبہ عبدالقدوس صاحب ہاشمی، مطبوعہ حیدر آباد دکن)

بہر حال سر اقبال صاحب کے پیش کردہ تخیل میں وحدانی نظامِ حکومت کی مخالفت ہے، یعنی ایسا نظامِ حکومت جس میں جملہ اختیارات مرکز کے قبضے میں ہوں اور صوبجات کو کچھ مخصوص اختیارات دے دیے جائیں، باقی جملہ اختیارات مرکز کے حوالے رہیں۔ اس نظامِ حکومت کی تمام جماعتوں نے مخالفت کی ہے۔ نہ کانگریس وحدانی نظامِ حکومت کا مطالبہ کررہی ہے نہ جمعیت علما۔

ڈاکٹر صاحب فیڈریشن کے حامی ہیں، البتہ ثقافتی، لسانی یا تہذیبی اصول پر صوبجات کی جدید تقسیم چاہتے ہیں۔ جملہ اختیارات صوبجات کے حوالے کررہے ہیں اور ان کو ایک نظام

میں منسلک ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے فارمولے میں تقسیم ہند یا دو فیڈریشنوں کا کوئی وجود نہیں۔ مگر تعجب ہے کہ سر اقبال کے اس مضمون کو تخیلِ پاکستان کی بنیاد قرار دیا گیا، لیکن مدینہ مورخہ ۲۱/ اگست ۱۹۳۱ء، جلد ۲۰، نمبر ۵۹، صفحہ ۴ کالم ایک کا شذرہ جس میں پلوڈن جج کے خط کا مفہوم پیش کیا گیا ہے، واضح کرتا ہے کہ تخیلِ پاکستان کا سرچشمہ اقبال مرحوم کا دماغ نہیں، بلکہ لندن یا شملہ کا کوئی الہام اس کا سرچشمہ ہے۔ مدینہ بجنور کا شذرہ نگار لکھتا ہے :

گزشتہ اخبار میں ہم نے یہ خبر لکھی تھی کہ ہز ہائینس سر آغا خاں ایک کروڑ روپے کے سرمایے سے بدیشی پارچہ کو فروغ دینے کی غرض سے ایک کمپنی قائم کرنے والے ہیں۔ اخبار "الامان" سے اب معلوم ہوا ہے کہ نہ صرف سر آغا خاں نے، بلکہ ملا یوسف الدین طاہر صاحب بوہرہ قوم کے مقتدا اور اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے اکثر ممبروں نے دس کروڑ روپے کے سرمایے سے ایک کمپنی قائم کی ہے، جس کا صدر دفتر دہلی ہوگا، اس کمپنی کے قیام کا اصل محرک کون ہے اور اس کے اصلی مقاصد کیا ہیں؟ اس کے صحیح حالات اب تک صینۂ راز میں ہیں۔ تاہم اس کے قیام پر اس خط سے کسی قدر روشنی پڑتی ہے جو مسٹر پلوڈن جج ممالک متحدہ نے کسی مستفسر کے جواب میں لندن بھیجا تھا اور اتفاقاً سنڈے گرافک کے ہاتھ پڑ جانے سے شائع ہو گیا تھا اور اسی غرض سے ہم اس خط کا متن ذیل میں درج کرتے ہیں :

"مدت سے ہندوستان کی صورتِ حالات قابو سے باہر ہو رہی ہے۔ ہم نیم پارلیمنٹری حکومت کا حتمی وعدہ کر چکے ہیں، جو برطانوی افسروں کے بغیر نہیں چل سکتی۔ برطانوی افسر زیادہ عرصے تک نہیں رہیں گے۔ سول سروس کے تمام شعبے یہاں تک ہندوستانیوں سے بھر دیئے گئے ہیں یا بھرے جا رہے ہیں کہ آیندہ چند سال میں ان میں ڈھونڈنے سے بھی انگریز کا نام نہیں ملے گا۔ میں ان حالات میں ہندوستان کے مسئلے کا ایک ہی حل دیکھتا ہوں کہ اسے ہندو اور مسلمان دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا تنازعہ ختم کرنے کے لیے ۳۵ سال کی مسلسل پارلیمنٹری جنگ کے بعد ایسا ہی کرنا پڑا تھا۔ ہندوؤں نے ہمیں ہندوستان کے ساتھ کاروبار کرنے سے روک

دیا ہے۔ اب ہمیں مالیہ معاف کرنا پڑا ہے تاکہ کاشت کار زندہ رہ سکیں۔ یہ ایک نہایت ہی یاس انگیز صورتِ حالات ہے اور اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اس تعفن کو پھیلنے سے روکا جائے اور قدرتی تقسیم کے مطابق ملک کے حصے کر دیے جائیں۔ اگر ہندو کاروبارِ تجارت نہیں کرنے دیں گے تو بمبئی کی جگہ کراچی شہر بندرگاہ کا کام دے سکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مزید ۲۵ یا ۳۰ سال کے لیے ہندوستان پر ہمارا اثر و اقتدار قائم رہے۔ اب برطانوی حکومت کے پرانے طریقۂ کار کی طرف عود کرنا ناممکن ہے۔ ہمارے پاس اب کارکن اصحاب موجود نہیں۔ اب دورِ ماضی کو قائم نہیں کر سکتے۔ نیز ہم نے اپنا کام بھی کر لیا ہے، کیوں کہ ہندوستان میں ریلیں اور نہریں قائم کر دی ہیں۔ اب اسے ایسا طرزِ حکومت دے دو جو اس کے لیے قدرتی اور موزوں ہو۔ لیکن جب تک ہندوستان میں ہمارا اثر و اقتدار قائم ہے ہمیں تحریکِ مقاطعہ کو پورے زور سے روکنا چاہیے"۔

(مدینہ بجنور، جلد ۲۰، نمبر ۵۹، مورخہ ۲۱ر اگست ۱۹۳۱ء، صفحہ ۴، کالم ۱)

اجلاسِ لاہور کی تجویز:

بہر حال اس تخیل کی پرورش کی جاتی رہی، حتیٰ کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں مندرجۂ ذیل تجویز پاس کی گئی، جس کو "قرار دادِ پاکستان" کہا جاتا ہے:

"مسلم لیگ کی یہ پختہ رائے ہے کہ کوئی دستور حکومت بغیر اس کے کہ وہ ذیل کے اصول پر مبنی نہ ہو، نہ قابلِ عمل ہو سکتا ہے اور نہ مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول۔

۱۔ یہ کہ جغرافیائی حیثیتوں سے متصل وحدتوں کی ایسے علاقوں میں حد بندی کر دی جائے جو اس طرح بنائے جائیں اور ان میں ضرورت کے مطابق ایسی سرحدی تبدیلیاں کی جائیں کہ وہ رقبے جہاں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے، مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی منطقے ایک مستقل ریاست بن جائیں اور اس ریاست کے اجزائے ترکیبی اندرونی طور پر خود مختار اور مطلق العنان ہوں۔

۲۔ یہ کہ ان علاقوں اور منطقوں کے اجزائے ترکیبی میں اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، اسلامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لیے آئین میں معقول اور موثر اور واجب التعمیل تحفظات درج کیے جائیں۔ نیز ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں

جہاں مسلمانوں کی تعداد کم ہے مسلمانوں کے لیے نیز دوسری اقلیتوں کے لیے ایسے معقول اور مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات معین طور دستور میں شامل کر دیے جائیں جن سے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور دوسرے حقوق و مفاد کی حفاظت ہو جائے۔

۳۔ یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ دستور کی ایک اسکیم مرتب کرے جو ان بنیادی اصولوں پر مبنی ہو اور وہ اس قسم کی ہو کہ اس میں یہ گنجائش ہو کہ ان علاقوں کو اس قسم کے اختیارات مل جائیں جیسے دفاع، امور خارجہ، رسل و رسائل، گزوار گیری اور نیز ایسے ہی دوسرے امور جو ضروری ہوں۔ (اجلاس بمبئی، ۳۰ مئی ۱۹۴۴ء)

اس اسکیم میں پاکستان کا لفظ نہیں آیا۔ دو قوم یا ایک قوم کی بحث سے بھی تجویز کے الفاظ خاموش ہیں۔ تجویز سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے لیے صوبوں کی پرانی حدود نہ ہوں گی، بلکہ نئی حدود جو مذکورہ بالا اصول کے مطابق ہوں، مقرر کی جائیں گی۔ پنجاب، بنگال اور آسام کے وہ اضلاع جن میں مسلمان غیر مسلموں سے اقلیت میں ہیں وہ خارج کر دیے جائیں گے۔ نیز لیگ کی ورکنگ کمیٹی دستور کی کوئی مفصل اسکیم بنائے گی۔

لیکن ۱۹۴۴ء میں مسٹر جینا اور گاندھی جی کی گفتگو ہوئی تو مسٹر جینا نے اس تجویز کی تشریح میں مندرجہ ذیل شرائط کا مزید اضافہ کر دیا۔

۱۔ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔

۲۔ ان دو قوموں کے دو مرکز علاحدہ علاحدہ ہوں۔

۳۔ یہ دو مرکز اسی وقت تسلیم کر لیے جائیں۔

۴۔ علاحدہ مرکز کے قیام کے متعلق باشندگانِ ملک کی رائے نہ لی جائے۔

۵۔ رائے لی جائے تو صرف مسلمانوں کی۔

۶۔ بنگال، آسام اور پنجاب اپنی موجودہ حدود کے ساتھ مسلم اکثریت کے صوبے قرار دیے جائیں۔ ان میں کوئی ردوبدل نہ ہو۔

چند اہم سوالات :

پاکستان کی مذکورہ بالا تفصیل پر یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں :

۱۔ نظامِ حکومت جمہوری ہوگا یا غیر جمہوری ؟

اگر جمہوری ہو تو اس میں غیر مسلم اقلیت پنجاب میں ۴۴ فی صد، بنگال میں ۴۷ فی صد، آسام میں ۶۴ فی صد اور مجموعۂ پاکستان میں تقریباً چالیس فی صد ہو گی۔ جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۱۴ فی صد تک ہو گی اور مجموعی طور پر ہندوستان میں کم ۱۰ فی صد ہو گی۔

۲۔ ہندو ہندوستان میں مسلم حقوق کا تحفظ کس طرح ہو سکے گا ؟ اور اس کا کیا اطمینان کہ پاکستان کی چالیس فی صدی اقلیت مسلمانوں کے نظام کو اپنے تابع بنانے کی کوشش نہ کرے گی اور باہمی اختلافات کی شکل میں جمود پیدا کر کے نظامِ حکومت کو معطل نہ کرے گی۔

۳۔ شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں مضبوط و بالادست ریاستیں آس پاس کی حکومتوں سے معاہدہ کیے بغیر کیسے باقی رہ سکیں گی اور عمل کر سکیں گی ؟

جب کہ معاہدہ ضروری ہوا تو کیا ضروری ہے کہ ہندو ہندوستان پاکستان کی مرضی کے مطابق معاہدہ کرے ؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ ایسی شرطیں لگائے جو پاکستان کی حیثیت کو وفاق کی خود مختار ریاست سے ناقص و کمزور کر دیں ؟

۴۔ جو کثیر تعداد مسلمان ملازم اس تقسیم کے بعد آل انڈیا ملازمتوں سے علاحدہ کیے جائیں گے، ان کو پاکستان اپنے اندر کیسے کھپائے گا ؟

۵۔ یہ بالادست ریاستیں جن کے ایک ایک جانب میں ہندو ریاستیں ہوں گی اور دوسری جانب ان کی سرحدیں برما، چین، نیپال یا افغانستان اور اس کے حدود سے متصل ہوں گی۔ انھیں اپنے تحفظ کے لیے جو کثیر تعداد فوج رکھنی پڑے گی کیا پاکستان اس کے مصارف برداشت کرتے ہوئے اندرون ملک کی اقتصادی مشکلات پر قابو پا سکے گا ؟

۶۔ بنگال ایک نہایت گنجان آباد صوبہ ہے اور تھوڑے عرصے میں اس کی آبادی کے لیے وسعت کی ضرورت ہوگی۔ پاکستان کی حمایت کرنے والوں کے پاس ایسی کون سی اسکیم ہے جس کی رو سے وہ اس بنگالی ضرورت کا انتظام کر سکیں گے؟

اس قسم کے سنجیدہ سوالات کے جواب میں مسٹر جینا اور زعمائے لیگ کے جو جوابات وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں، ان کو ملاحظہ فرمایئے اور فیصلہ کیجیے کہ پاکستان، کیا کسی سوچی سمجھی ہوئی تجویز کا نام ہے؟ یا ایک نعرہ ہے جو مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کے لیے کسی مخصوص غرض کی بنا پر ایجاد کر دیا گیا اور کسی مخفی مقصد کے لیے یہ تمام کھیل کھیلا جا رہا ہے؟

پاکستان کا نظامِ حکومت

(۳)

۱۔ شریعت کی حکومت کا پاکستان:

احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر جناح نے فرمایا:

"اقلیت کے صوبے والوں (مسلمانوں) پر جو گزرتی ہے گزر جانے دو لیکن آؤ ہم اپنے ان بھائیوں کو آزاد کرا دیں جو اکثریت کے صوبوں میں ہیں تاکہ وہ شریعتِ اسلامی کے مطابق وہاں آزاد حکومت قائم کر سکیں"۔

(پاکستان نمبر "ایمان" لاہور، ۲۸؍ فروری ۱۹۴۱ء، صفحہ ۲۲، کالم ۳)

۲۔ حکومتِ الٰہیہ کے خلاف خالص دنیوی پاکستان:

لیگ کا ذمہ دار سرکاری ترجمان "ڈان" لکھتا ہے:

"مسٹر جناح نے ہمیشہ کہا ہے کہ پاکستان کوئی دینی و مذہبی حکومت ہرگز نہ ہوگی، بلکہ خالصاً ایک دنیوی حکومت ہوگی اور مسلمانوں کے حکومتِ الٰہیہ کے نظریے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کو عالمگیر اسلامی قومیت (پین اسلام ازم) سے کوئی دور کا واسطہ بھی ہے، ان سے مسٹر جناح کو ہرگز اتفاق نہیں"۔

(ڈان بہ حوالہ شہباز، لاہور ۲۷؍ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

۳۔ مغربی طرز کی جمہوریت کا پاکستان :

نمایندہ نیوز کرانیکل کو بیان دیتے ہوئے مسٹر جینا نے فرمایا :

"پاکستان کی حکومت (یورپین) جمہوریت کے طریقے پر ہو گی۔ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی آبادی اور مردم شاری کی حیثیت سے رائے شاری کر کے فیصلہ صادر کریں گے اور وزارتوں (لیجیسلیچر) میں سب حصہ دار ہوں گے"۔

۴۔ ہندو مسلم مشترکہ پاکستان :

۲۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ کو دوسری مسلم جماعتوں سے نبرد آزمائی پر آمادہ کرتے ہوئے لیگ کے جنرل سکریٹری اور مسٹر جینا کے نفسِ ناطقہ نواب زادہ لیاقت علی خان صاحب نے فرمایا :

"پاکستان ایک جمہوری ریاست ہو گی۔ اس کا دستور اساسی اس کے باشندے (ہندو، مسلمان، سکھ وغیرہ) خود اپنے اپنے دستور ساز اداروں کے ذریعے بنائیں گے۔ ان اداروں کی تشکیل وہ خود کریں گے"۔

(لیگ کا سرکاری ترجمان "منشور" ۲۶ر ستمبر ۱۹۴۵ء)

۵۔ السٹر کے نمونے کا پاکستان :

سر ناظم الدین صدر مسلم لیگ بنگال ورکن آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی وسابق وزیر اعظم بنگال نے جب ہندوستان کی حکومت کا نقشہ پیش کیا تو انھوں نے بھید کی بات صاف طور پر ارشاد فرمادی کہ :

"پاکستان ہندوستان کا السٹر ہو گا، یعنی جس طرح آئرلینڈ میں السٹر کا صوبہ آئرلینڈ سے جدا ہو کر وہاں انگریزی اقتدار کو قایم رکھنے کا ذریعہ بنا ہوا ہے، اسی طرح پاکستان ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کا وسیلہ بنا رہے گا"۔

۶۔ خلافتِ راشدہ کے نمونے کا پاکستان:

میاں بشیر احمد ممبر ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے دسمبر ۱۹۴۲ء میں اعلان کیا کہ:

"پاکستانی طرزِ حکومت خلفاے راشدین کی حکومت کے مطابق ہوگا"۔

(مدینہ، یکم جنوری ۱۹۴۳ء)

۷۔ کانگریس اور لیگ کی مشترکہ حکومت کا پاکستان:

لیگ کے ممتاز لیڈر میاں ممتاز رئیس اعظم دولتانہ نے پاکستان کے دار السلطنت لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"انتخابات میں کامیاب ہو کر مسلم لیگ اور کانگریس کو مشترکہ وزراتیں بنانی چاہئیں۔

مجھے امید ہے کہ الیکشن کے بعد ہر جگہ کانگریس اور لیگ کی ملی جلی وزارتیں بنیں گی۔" (قومی جنگ، مورخہ ۱۳ راگست ۱۹۴۵ء)

۸۔ غیر مذہبی پاکستان:

۲ر نومبر ۱۹۴۵ء کو لاہور کے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے میاں بشیر احمد رکن ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے فرمایا:

"ہمارے قائد اعظم بار بار کہہ چکے ہیں کہ پاکستان میں بلالحاظِ مذہب عوام کی حکومت ہوگی۔ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو برابری اور آزادی دی جائے گی"۔

(منشور ۱۱ر نومبر ۱۹۴۵ء)

۹۔ تازہ سوشلسٹ پاکستان:

۸ر نومبر ۱۹۴۵ء کو بمبئی میں ایسوسی ایٹیڈ پریس آف امریکہ کے نمائندے کو بیان

دیتے ہوئے مسٹر جینا نے فرمایا:۔

"پاکستان ایک جمہوری حکومت ہوگی، اور مجھے امید ہے کہ پاکستان کی بڑی بڑی صنعتیں اور کارخانے سوشلسٹ اصول پر قوم کے قبضے میں دے دیے جائیں گے"۔

(منشور ۱۱ر نومبر ۱۹۴۵ء، صفحہ ۳، کالم ۲ و انجام ۱۲ر نومبر ۱۹۴۵ء، صفحہ ۱، کالم ۴)

۱۰۔ شریعتِ مطہرہ کی حکومت کا پاکستان:

۹ر نومبر ۱۹۴۵ء کو الٰہ آباد سے علمائے کرام و ربانیین سے دستگیری کی استدعا کرتے ہوئے، یوپی مسلم لیگ کے صدر اور آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے مقتدر رکن نواب اسماعیل خان صاحب نے ارشاد فرمایا ہے:

"مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان ہے اور لیگ اس پر تُلی ہوئی ہے کہ اس سرزمین میں اسلام کی سیاسی بنیادوں پر شریعتِ مطہرہ کی حکومت قائم کر دے"۔

(منشور ۱۱ر نومبر ۱۹۴۵ء، صفحہ ۶، کالم ۱)

حرفِ آخر

جمعیت علما اور کانگریس کے واضح اور مستحکم لائحۂ عمل پر غور کرنے کے بعد جب لیگ کی مذبذب پالیسی اور مبہم نعروں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہمیں علامہ شبلی مرحوم کی فراست کی داد دینی پڑتی ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگرچہ لیل و نہار کی چالیس سالہ گردشوں نے ہزاروں تبدیلیاں پیدا کر دیں، مگر علامہ موصوف کے ارشاد اور لیگ کی حقیقت و ماہیت میں سر مو فرق نہیں آیا۔ علامہ موصوف کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے:

> "لیگ کا سنگِ اولین شملہ ڈیپوٹیشن تھا اور اب یا آیندہ جو کچھ اس کا نظام ترکیبی قرار پائے گا ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود رہے گی"۔

"لیگ کی بنیاد کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی گئی ہے۔ اس پر جو عمارت بنائی جائے گی ٹیڑھی ہو گی، لیگ کی پالیٹکس صرف یہ ہے کہ جو ملکی حقوق اور عہدے ہندوؤں نے حاصل کیے ہیں، ان میں مسلمانوں کا حصہ متعین کر دیا جائے۔ یہ حقیقی پالیٹکس نہیں ہے۔ حقیقی پالیٹکس گورنمنٹ سے رعایا کے مطالبہ جات کا نام ہے۔ پالیٹکس دنیا کا سب سے بڑا جذبہ ہے، وہ مذہب کے برابر طاقت رکھتا ہے۔ اسی طاقت کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کا ممبر کسی قسم کا نقصان اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا اور اپنے میں کوئی عزم اور دلیری نہیں پاتا"۔

(ملخصاً، روشن مستقبل، صفحہ ۸۰۔ ۴۷۹)

یہ ہے ہندوستان کی تین بڑی سیاسی جماعتوں کی تجاویز پر مختصر تبصرہ جو غور و فکر کے لیے مسلمانان، ہند کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(مولانا سید) محمد میاں عفی عنہ

حواشی:

(۱) سندھ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، لیکن وہ اس وقت چوں کہ بمبئی پریسیڈنسی میں شامل تھا، اس لیے اس کی اکثریت مقلوب ہو کر ایک تہائی رہ گئی تھی، اس لیے اس کا نقصان پنجاب اور بنگال سے کہیں زیادہ تھا (ا۔ س۔ ش)

(۲) یہ مضمون شائع ہو گیا تھا (ا۔ س۔ ش)

(۳) پہلی گول میز کانفرنس (۱۹۳۰ء) میں مولانا محمد علی بہ ذات خود شریک تھے۔ انھوں نے ہندو اور مسلمان رہنماؤں دونوں کی بد لیاقتی اور عدم تدبر کا شکوہ کیا ہے۔ مولوی محمد عرفان کے نام خطوط میں لندن سے لکھتے ہیں:

"سب سے زیادہ اہم کمیٹی وہ ہے جو ترکیبی حکومت کا ڈھانچا تیار کر رہی ہے اور اس میں اس قدر وقت ان کی بد لیاقتی اور عدم تدبر سے ضائع ہو رہا ہے کہ خدا کی پناہ! مگر باوجود میرے پہلے سے کہلانے کے آغا، شفیع اور جناح نے اس میں میرا نام نہیں رکھا...... اور اس پر آغا خاں کے ذریعے سے مجھے کہلوایا گیا کہ تمھاری صحت اس کی متحمل نہ ہو سکے گی..... میں نے آغا خاں کو صاف صاف ٹیلیفون پر سنائیں...... شوکت صاحب نے میری غیر حاضری میں حسبِ معمول ڈھیل کی اور سب بد معاشوں پر اعتماد کیا اور...... تدبر سے کام نہ کیا۔ ہر ایک ان کو آلۂ کار بنانا چاہتا ہے"۔

(مکتوبات رئیس الاحرار (سیاسی)، مرتبہ ابو سلمان شاہ جہان پوری، صفحہ ۱۴۲)

اس کانفرنس میں مسلمانوں کے سولہ نمایندے شریک ہوئے تھے، جن کے نام یہ ہیں:
سر آغا خاں، مسٹر محمد علی جناح، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، نواب صاحب بھوپال، بیگم شاہ نواز، سر مرزا اسماعیل، سر عبد القیوم، صاحبزادہ سلطان احمد، مسٹر فضل الحق، سر اکبر حیدری، راجہ شیر محمد خاں ذو میل، سر محمد شفیع، مسٹر داؤد غزنوی، خان بہادر حافظ ہدایت حسین، سر غلام حسین

ہدایت اللہ۔

مولانا محمد علی سب کے شاکی تھے اور وزیر اعظم برطانیہ ریمزے میکڈنلڈ کے نام اپنے خط میں ان کی غیر نمایندہ حیثیت کا ذکر کیا ہے۔

(مکتوبات رئیس الاحرار (سیاسی)، مرتبہ ابو سلمان شاہ جہان پوری، ۱۹۷۸ء، کراچی)

(ا۔ س۔ ش)

جمعیت علمائے ہند اور لیگ کا نصب العین

حقایق اور واقعات کی روشنی میں

از

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان
کراچی

جمعیت علماے ہند اور لیگ کا نصب العین حقائق اور واقعات کی روشنی میں

(از جناب مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیت علماے ہند)

"منشور" مورخہ ۲۹ر جولائی ۱۹۴۵ء ہمارے سامنے ہے۔ اس میں جناب ابو علی صاحب اعظمی کا ایک طویل مضمون ہماری اس مختصر تحریر کا محرک ہے۔

یوں تو نہ صرف "منشور" بلکہ اس کے تمام ہم نوا اخبارات کا محبوب مشغلہ یہی ہے کہ جمعیت علماے ہند پر بے بنیاد اعتراضات کیے جائیں گے اور علماے کرام کے اقتدار کو (معاذ اللہ) خاک میں ملایا جائے۔ افسوس اس محبوب مشغلے کی بدمستی نے نہ صرف صداقت اور راست گوئی سے ان کو بے نیاز کر دیا ہے، بلکہ تہذیب و متانت بھی سب و شتم کی نذر ہو گئی۔ اس ننگِ صحافت تہذیب معکوس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے جو خود بھی اخلاق و تہذیب کے متاع سے تہی داماں ہو، مگر جن کو قرآن پاک کی یہ تنبیہ یاد ہو کہ "بئس الاسم الفسوق بعد الایمان"، وہ تو لا محالہ "اذا خاطبہم الجاھلون قالوا سلاما" پر عمل کرنے کو اپنی سعادت تصور کریں گے۔

مگر جناب ابو علی صاحب کا مضمون اس اسلوب سے مستثنیٰ ہے۔ لہٰذا اس کے جواب کے لیے طبیعت آمادہ ہوئی ہے۔ مگر تنگیٔ وقت کے ساتھ اخبارات کے صفحات کی کمی ہمیں اختصار پر مجبور کر رہی ہے اور مختصر طور پر مندرجۂ ذیل چند فقروں میں جوابات کے وسیع

دامنوں کو سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۱) بے شک جمعیت علمائے ہند کا مقصد یہی ہے کہ پیش آنے والے سیاسی امور کے تمام پہلوؤں پر قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں غور و خوض کر کے شریعت غراء کے بموجب مسلمانوں کی رہنمائی کی جائے اور الحمد للہ جمعیت علما کا ہر رکن اس منشا اور مقصد سے آگاہ ہے اور اس کی تکمیل کے بعد ہی اس کو اطمینان نصیب ہوتا ہے اور جب تعلیمات اسلام کے بموجب وہ صحیح فیصلہ اور غیر مبہم حکم حاصل کر لیتا ہے تو پھر نہ وہ کسی قوت و شوکت سے مرعوب ہوتا ہے اور نہ اپنوں یا بیگانوں کا اچھا یا برا سلوک اس کے قدم استقلال کو ڈگمگا سکتا ہے۔ وہ صرف دوسروں کو مشورہ نہیں دیتا، بلکہ ابتلا و امتحان کے میدان میں خود سینہ سپر ہوتا ہے اور دوسروں کے چلنے کے لیے اپنے قدم کے نشانات چھوڑ دیتا ہے۔

(۲) اغیار کے غلبے سے وطن عزیز کو نجات دلانا اور وہ طاقت جو نہ صرف ہندوستان، بلکہ تمام دنیائے اسلام کو مغلوب اور مقہور کیے ہوئے ہے، اس کو آخری امکانی حد تک کمزور کرنا ہر ایک مسلمان کا مذہبی اور شرعی فرض ہے۔

ہندوستان کی دوسری قوموں کے سامنے صرف ان کا وطن ہے، لیکن مسلمانوں کے پیش نظر وطن عزیز کے علاوہ تمام اسلامی ممالک بھی ہیں، جو مغرب اور بالخصوص برطانیہ کے پنجۂ جبر و استبداد میں کسے ہوئے ہیں اور جن کی بے کسی، مجبوری اور غلامی کا بار ہندوستانی مسلمانوں کی گردن پر ہے، کیوں کہ انھیں کی غلامی نے ان تمام ممالک کو غلام بنا رکھا ہے۔

شاہ عالم اور علمائے کرام

علمانے اس حقیقت کو اسی وقت سمجھ لیا تھا جب ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم بادشاہ دہلی ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنجۂ استعمار کا شکار ہوا اور اسی وقت سے وہ ہندوستان کو دار الحرب قرار دے کر مدافعانہ جد و جہد کی فرضیت کا فتویٰ صادر فرما دیا تھا۔ چناں چہ علمائے مجاہدین کی جماعتوں نے بار بار اس فتوے پر عمل کر کے اپنا فرض انجام دیا اور جام شہادت نوش کیا۔ ڈبلو ڈبلو ہنٹر کی

کتاب جس کا ترجمہ اردو میں "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے۔ پھر جب کانگریس نے بلا تفریق مذہب و ملت ملکی بنیاد پر ہندوستانیوں کے لیے اختیارات کا مطلبہ کیا، تو علمائے کرام کے لیے از روے اجتہاد شرعی اس مطالبے کی مخالفت قطعاً ناجائز تھی۔ غلط فہمی یہ ہے کہ علمائے کرام نے کانگریس کی ہم نوائی کی، حال آں کہ واقعہ یہ ہے کہ علمائے کرام کے نصب العین کی کانگریس نے موافقت کی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ شرکت یا تائید کانگریس کا فتویٰ آج دیا جارہا ہے۔ حال آں کہ تقریباً پچیس سال پیشتر علماء ربانی شرکت کانگریس کا فتویٰ دے چکے ہیں، آج اس کی صرف اتباع ہے۔ (ملاحظہ ہو 'نصرۃ الابرار')

(۳) حقوق کی رٹ لگانے والوں سے اگر حقوق کی تفصیل دریافت کی جائے تو وہ تفصیل نہ بتا سکیں گے۔ حتیٰ کہ لفظ پاکستان کی بھی آج تک واضح تفسیر نہ کی جا سکی۔ مگر الحمد للہ علمائے کرام خوب پہچانتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی حقوق کیا ہیں اور مسلم حقوق کیا اور ان کے حاصل کرنے کی قابلِ عمل صورت کیا۔

مگر علما اس کو دناءت، پست ہمتی، بزدلی اور درحقیقت مسلمانوں کے لیے موت کے مرادف سمجھتے ہیں کہ جب انگریز سے مطالبۂ اختیارات کی جنگ ہو تو فقط ہندو اس میدان کا مردِ مجاہد بنے اور جب کچھ اختیارات ہندوستان کو ملنے لگیں تو کاسۂ گدائی لے کر حقوق کی بھیک مانگنے لگیں اور دوسری طاقت کو موقع دیں کہ وہ مسلم اقلیت کی حفاظت کے نام پر ہندو مسلم اختلاف کو بہانہ بنا کر تفویضِ اختیارات میں خاطر خواہ خلل کر سکے۔

علما اور مسٹر جناح

آج علما پر حقوقِ مسلم سے بے اعتنائی کا الزام لگایا جاتا ہے، حالاں کہ مسٹر جناح اور ان کے یارانِ طریقت ہی وہ مجرم ہیں جنھوں نے اسلامی حقوق اور مسلم حقوق کا آج تک گلا گھونٹا

ہے اور اب بھی پاکستان کا مبہم لفظ بول کر اسلامی حقوق اور مسلم حقوق کو ہمیشہ کے لیے پامال کر رہے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ۱۹۱۶ء میں مسٹر جناح کی سرکردگی میں صوبۂ پنجاب کے لیے بچاس فیصد اور صوبۂ بنگال کے لیے چالیس فیصد نشستوں پر سمجھوتا کر کے ان صوبوں کی اکثریت کو اقلیت کے عشوہ ناز کی نذر کر دیا گیا؟

کون نہیں جانتا کہ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی آبادی چھپن فی صد اور چون فی صد تھی۔ اگر ۱۹۱۶ء میں آبادی کی نسبت سے ممبریاں لے لی جاتیں تو اس وقت پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے غلبے کو تیس سال ہو چکے ہوتے۔ علمائے کرام نے اسی وقت اس غلطی پر تنبیہ کی تھی، مگر جو مسٹر جناح اگست ۱۹۳۶ء تک لکھنؤ میں طلبہ کی فیڈریشن کی صدارت کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو کے متعلق فرما رہے تھے کہ:

"ان کی صداقت، ایمان داری اور ملکی ہمدردی لاجواب ہے اور نہرو سے زیادہ سچا اور وفادار دوست کوئی نہیں"۔ (مسلم ووٹروں کی فریاد، ص ۳۲)

وہ ۱۹۱۶ء میں علما کی تنبیہ پر کب توجہ فرما سکتے تھے۔

مسئلۂ امارتِ شرعیہ کو ایک مذاق سمجھ کر یونینی بورڈ الٰہ آباد کے موقعے پر مطالبۂ تنفا کی مخالفت کر کے خداوندانِ لیگ نے یہ ظاہر کر دیا کہ کلچر اسلام اور تمدن و تہذیبِ اسلام کا نعرہ ان کی زبانوں پر صرف اس لیے ہے کہ اسمبلی کی چند نشستوں کے لیے ووٹ حاصل ہو جائیں۔

کاش مسٹر جناح مرکزی اسمبلی میں شریعت بل کی مخالفت نہ کرتے، قاضی ایکٹ کو ناکام نہ کرتے تو اسلامی حقوق کا بڑا حصہ ہندوستان میں محفوظ ہی نہیں بلکہ نفاذ پذیر ہو چکا ہوتا۔

کس قدر ستم ظریفی ہے کہ مسٹر جناح اسمبلی میں سول میرج ایکٹ کی موافقت کریں، ساردا ایکٹ کی موافقت میں بیان دیں، علما کے اقتدار کے ختم ہونے پر مسرت ظاہر کریں، مسلمانوں کو عورتوں کی آزادی کا مشورہ دیں اور پھر بھی محافظِ ملت امام المسلمین اور

قائداعظم۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

علما اور کانگریس

یاد رکھو! مسلم کلچر کا تحفظ صرف مسلم کر سکتا ہے۔ یہ عمل کی چیز ہے، خیال اور فکر نہیں، پاکستان کی بھول بھلیاں میں پڑ کر مسلمان رہا سہا کلچر بھی تباہ کر دے گا۔

کانگریس یا انگریز مسجدوں میں اذانیں دلوانے اور نمازیں پڑھوانے کے لیے اپنے والنٹیر یا سپاہی نہیں بھیجیں گے۔ یہ عملی فرض آپ ہی کو ادا کرنا ہوگا۔ کانگریس صرف آزادی کا وعدہ کر سکتی ہے۔ چناں چہ اس کے بنیادی حقوق میں یہ ایک مسلمہ حق ہے۔

(۴) کانگریس نام نہاد آزادی چاہتی ہے یا حقیقی آزادی چاہتی ہے، اس کا فیصلہ بالکل واضح ہے۔ دنیا کی سیاست اور اقتصاد سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی تردد نہیں کر سکتا کہ جو سوالات کانگریس نے ملک کے سامنے رکھے ہیں اور جو عوام کے ذہن میں اس درجہ پیوست ہو چکے ہیں کہ اگر کانگریس ان کو فراموش کرانا چاہے تو خود ختم ہو جائے گی اور سوالات فراموش نہ ہوں گے اور جن کی ہمہ گیری اور عام مقبولیت نے آج رجعت پسند اور استعمار پرست جماعتوں کو بھی مجبور کر دیا ہے کہ آزادی کامل کو اپنے مقاصد میں داخل کریں۔

وہ سوالات مکمل آزادی کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ برطانوی شہنشاہیت اور دورِ حاضر کے اقتصادی سوالات، دن اور رات، آگ اور پانی کی نسبت رکھتے ہیں۔

ہاں نوزائیدہ جمعیت علمائے اسلام کلکتہ .... کی تہی دستی تدبر قابلِ افسوس........................ ... کے لیے لیگ جیسی رجعت پسند........................ تلاش کر رہی ہے اور........................ ... کے تصور کو پناہ گاہ بنانا چاہتی ہے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

کیا انھوں نے کبھی روس اور ترکی کے انقلاب کی تاریخ نہیں پڑھی؟ ان ممالک میں

انقلاب کے سیلاب نے مذہب اور مذہبی جماعتوں کو اسی لیے فنا کیا کہ وہ تقاضاے انقلاب کے بر خلاف رجعت پسند طاقتوں کے ساتھ پیوست ہو گئے تھے۔

یاد رکھو رجعت پسند طاقتیں فنا کے کنارے پر ہیں۔ تم اگر بچنا چاہتے ہو تو انقلاب کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لو۔

ہندوستان کی تقسیم

مولانا ابو علی صاحب نے "منشور" میں کئی کالم صرف اس بات کے سمجھانے کے لیے رنگے ہیں کہ تقسیم کوئی نئی چیز نہیں۔

بے شک تقسیم کوئی نئی چیز نہیں مگر مولانا کو یہ خیال نہ رہا کہ تقسیم کی ایک صورت وہ بھی ہے جو دول یورپ نے ترکی ممالک کے ساتھ کی۔ فلسطین علاحدہ ملک ہے، شام علاحدہ، لبنان علاحدہ، مصر علاحدہ، حجاز علاحدہ وغیرہ وغیرہ۔ افسوس تقسیم کی درجنوں مثالیں تحریر کرتے وقت مولانا کو حال کی تقسیم کا خیال نہ آیا کہ جب ہندوستان کو کچھ اختیارات دیے جا رہے تھے تو برما کو علاحدہ کر دیا گیا۔ آج برما اور ہندوستان کے متعلق برٹش امپائر کے طرزِ عمل سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

بلوچستان اب بھی علاحدہ ہے۔ معلوم نہیں مولانا اس کی علاحدگی پسند کرتے ہیں یا ہندوستان کے ساتھ الحاق اور اُس میں صوبہ سرحد کی طرح آئینی حکومت کا قیام......!

آج یورپ کی سیاست جس اسلوب کو اختیار کیے ہوئے ہے کہ بڑے بڑے ملکوں کے چھوٹے چھوٹے حصے کر کے ان پر اپنے اقتدار کا پرچم لہرایا جائے، اس کے پیشِ نظر ہر ہمدردِ ملت کے سامنے تقسیم کی یہ مثالیں رہنی چاہئیں جو دورِ حاضر کی مثالیں ہیں۔

مسٹر راج گوپال آچاریہ نے ایک آواز اٹھائی ہے کہ جو صوبے ویول پلان کے بموجب اختیارات لینا چاہئیں ان کا فیڈریشن بنا دیا جائے، باقی صوبے بعد میں شامل ہوتے رہیں گے۔

اگر وہائٹ ہاؤس یہ آواز سن کر ہندوستان سے کوئی سمجھوتا کر لے تو یہ مسلم صوبوں

کے لیے غلامی کی طرف رجعت قہقہری ہوگی یا آزادی کی جانب اقدام..... !

کاش مسلمانوں کی تاریخ پیش فرماتے ہوئے مولانا یہ بھی بتادیتے کہ مسلمان فاتحین نے ہندوستان کو تقسیم کیا یا اس کو متحد کیا۔ یہ بات تو تاریخ کے مبتدی کو بھی معلوم ہے کہ کابل ہندوستان کا ایک صوبہ تھا۔ لیکن یہ بات جناب کے لیے یقیناً اجنبی ہوگی کہ سلطان عالمگیرؒ نے پورے ہندوستان کو دولتِ مغلیہ کے زیرِ نگیں کر کے دارالاسلام بنادیا تھا۔

اگر دارالاسلام، دارالحرب بنا دیا جائے تو مسلمانوں کا فرض کیا ہے اور آیا تمام دارالاسلام کو کسی نہ کسی نوع سے پھر دارالاسلام بنانا ضروری ہے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک حصے کے لیے جدوجہد کو مخصوص کر کے باقی حصہ دارالحرب یا دارالکفر کے لیے ہمیشہ کے واسطے وقف کردیں۔ یہ ایک فقہی نظر کی چیز ہے۔

اس کا فتویٰ مسٹر جناح نہیں دے سکتے، جو بہ آسانی تین کروڑ مسلمانوں کو قربان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا فتویٰ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب اور حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب دے سکتے ہیں یا ان مقدس مشاہد و مزارات کی زبانِ حال جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں موجود ہیں اور جو ہر بہی خواہ ملت دردِ جگر رکھنے والے کو اپنی بیش بہا قربانیاں یاد دلا رہے ہیں۔

پاکستان یا دارالاسلام ؟

کاش پاکستان اور اسلامی حکومت ہم معنے ہوتے تو صبر کی جگہ تھی۔ مگر افسوس اس دل فریب لفظ کی تعریف مسٹر جناح تو بار بار یہ فرما رہے ہیں :

"پاکستان کی حکومت جمہوری ہوگی اور سارا نظم و نسق عوام کے نمائندوں کے ہاتھوں میں ہوگا"۔ ("انجام" مورخہ ۲۷ راگست ۱۹۴۵ء، مسٹر جناح کی احمد آباد کی تقریر)

یعنی اس اسمبلی کے ہاتھ میں جس میں کم و بیش ۴۵ فی صدی غیر مسلم ہوں گے جو، قانون بنانے میں شریک ہوں گے اور جس کی وزارت میں غیر مسلموں کا حصہ بھی شایان

شان ہو گا۔ ان الحکم الا للہ کی پاکستانی تفسیر ملاحظہ ہو۔ کیا یہی دارالاسلام اور یہی اسلامی حکومت ہے؟ اگر اس کا نام اسلامی حکومت ہے تو پھر ہندو اکثریت کے صوبوں کو بھی دارالاسلام کیوں نہ کہا جائے۔ حکومت میں فی الجملہ مسلمانوں کا حصہ تو ان صوبوں میں بھی ہو گا؟

پھر اگر کچھ اور غور و فکر سے کام لے کر پنجاب و بنگال کی ۴۵ فی صد والی خوش حال اقلیت اور ہندوستان کی اوسطاً آٹھ فی صد والی مفلوک الحال اقلیت کا مقابلہ کریں اور ان دونوں حصوں کے معدنی، تجارتی اور اقتصادی تفاوت کا موازنہ نہ کریں تو آپ کی دیانت اور آپ کے انصاف کا فیصلہ یقیناً حضرات علمائے کرام کی موافقت اور تائید کرے گا۔

ایک وہ حصہ ہے جس کے صوبجات ایک دوسرے سے متصل، جس کے پاس درآمد و برآمد کے ذرائع بہت کافی، جس کے معدن کھلے ہوئے سونا اگل رہے ہیں، جس کے باشندے خوشحال، جس میں بے شمار کارخانوں کا جال بچھا ہوا۔ دوسرا حصہ اس کے مقابل ان تمام باتوں میں نسبت سے بہت زیادہ پست۔ تو کیا ان دونوں حصوں میں مقابلے کا چیلنج مسلمانوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے؟

(٦) مولانا ابو علی صاحب کی خواہش یہ ہے کہ:

"جس خطۂ زمین میں جس قوم کی اکثریت ہو اسی کی حکومت ہو، وہی آئین و قانون بنائے، وہی نافذ کرے"۔ (منشور ۱۹ر جولائی ۱۹۴۵ء)

ہمیں تعجب ہے! اگر واقعی مولانا کی یہ خواہش ہے تو پھر جمعیت علمائے ہند یا انڈین نیشنل کانگریس پر وہ اعتراض کیوں کر رہے ہیں اور اس قسم کے طویل مضامین لکھ کر عام مسلمانوں کے دماغوں کو کیوں منتشر کرتے ہیں۔ مولانا کو معلوم ہونا چاہیے کہ جمعیت علمائے ہند اس سے بہت آگے تک جا چکی ہے اور انڈین نیشنل کانگریس اس کو منظور کر چکی ہے۔

ملاحظہ ہو جمعیت علمائے ہند کے اجلاس لاہور کے الفاظ یہ ہیں:

(الف) ہمارا نصب العین آزادی کامل ہے۔

(ب) وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا، مسلم کلچر اور تہذیب وثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

(ج) ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خودمختاری اور آزادی کے حامی ہیں۔ غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

آزاد صوبوں کا وفاق

(د) ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے۔ مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب وثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی۔ یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصولوں پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں"۔

یہ ہے اجلاس لاہور ۱۹۴۲ء کا تاریخی ریزولیوشن جو ہندوستان کی عظیم الشان وحدت کو برقرار رکھتے ہوئے ان تمام خطرات کو ختم کر دیتا ہے جو مسلمانوں کو بحیثیت ثانوی اکثریت کے پیش آسکتے ہیں۔

پھر مجلس عاملہ کے اجلاس مورخہ ۳۱ر جنوری تا ۲ر فروری ۱۹۴۵ء نے اس کی مزید تشریح کر دی جس کو جمعیت علمائے ہند کے اجلاس سہارنپور نے تقریباً ۷ گھنٹے کی گرما گرم بحث وتمحیص کے بعد لفظ بلفظ منظور کر لیا۔ اس تشریح میں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ

"وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کے لیے حق خود ارادیت تسلیم کر لیا جائے"۔ (ملاحظہ ہو رپورٹ اجلاس سہارنپور)

اجلاس لاہور جمعیت علمائے ہند سے چند روز بعد انڈین نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس مورخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۴۲ء بمقام دہلی میں ایک طویل تجویز کے ضمن میں یہ اعلان کیا:

"کمیٹی کسی علاقہ کے لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی علانیہ اور قائم کی ہوئی مرضی کے خلاف کسی یونین میں شامل ہوں"۔ ("تیج" مورخہ ۱۳؍اپریل ۱۹۴۲ء)

پھر چند ماہ بعد اسی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۶؍اگست ۱۹۴۲ء بمقام بمبئی میں آئین ہندوستان سے متعلق ایک طویل ریزولیوشن میں یہ طے کیا کہ:

"کانگریس کے نظریے کے مطابق یہ آئین فیڈرل (وفاقی) ہونا چاہیے اور اس فیڈریشن میں شریک ہونے والے یونٹوں کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہیے اور اختیارات ماتحتی بھی انھیں یونٹوں کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں"۔

(تیج، مورخہ ۸؍اگست ۱۹۴۲ء، کالم ۴، صفحہ ۲)

ان تمام تصریحات کے بعد کیا مولانا ابو علی صاحب کے اس مضمون کو یا اس جیسے اور مضامین کو جن میں حریت پرور طبقہ اور بالخصوص علمائے اسلام پر زیادہ سے زیادہ بہتانوں کی بارش کی جاتی ہے، شرمناک پروپیگنڈا نہیں کیا جائے گا، جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مذہب اور مذہبی علما کے اقتدار کو ختم کیا جائے، مسلم عوام کو راہِ آزادی سے گمراہ کر کے ہندوستان کی غلامی کی عمر کو دراز کیا جائے اور ہندوستان کی آئینی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکا کر اس یورپین گروپ کو خوش کیا جائے، جو ہندوستان کی سربلندی کو ایک لمحے کے لیے برداشت نہیں کر سکتا اور جس کی موافقت کر کے مسٹر جناح نے شملہ کانفرنس میں فہرست پیش کرنے سے انکار کیا اور اس طرح شملہ کانفرنس کو ناکام کیا۔ یالیت قومی یعلمون۔

حاشیہ:

(۱) افسوس کہ اس مقام پر اخبار کا صفحہ پھٹ جانے کی وجہ سے مضمون ناقص ہو گیا، لیکن مضمون کو سمجھ لیا جا سکتا ہے جو اس طرح ہو گا:

"ہاں! نوزائیدہ جمعیت علمائے اسلام کلکتہ کے بانیوں کی تہی دستی تدبر قابل افسوس ہے کہ قومی و ملی خدمت کے میدان میں آنے کے لیے لیگ جیسی رجعت پسند جماعت کی حمایت تلاش کر رہی ہے اور اس کے تصور کو پناہ گاہ بنانا چاہتی ہے"۔

(حوالہ: سہ روزہ زمزم، لاہور۔ ۱۵؍دسمبر ۱۹۴۵ء، ص ۳، و ۷؍دسمبر ۱۹۴۵ء، ص ۳)

جمعیت علمائے ہند

اور

عمائدینِ لیگ کے کارنامے

از

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

عرضِ مرتب

حضرت مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ کا یہ مختصر رسالہ ''جمعیت علما کیا ہے؟ (حصہ اول)'' کا حصہ تھا۔ یہ الگ شایع نہیں ہوا تھا۔ اس کی تاریخی اہمیت اور جمعیت علماے ہند کی دینی خدمات کے تعارف کا تقاضا تھا کہ اسے الگ شایع کردیا جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اس کی افادیت عام ہوسکے۔

مسلمانوں کی اصلاح، تعمیر سیرت، تہذیب اخلاق اور اسلامی زندگی کا قیام جمعیت علماے ہند کے اولین اور اہم ترین مقاصد تھے۔ اس سلسلے میں اس کے مساعی دینی تعلیم کے مراکز کے قیام، وعظ و تبلیغ کے نظام سے لے کر دستور سازی کے ذریعے مسلمانوں کے مذہبی حقوق کا حصول اور تحفظ کی کوششوں تک پھیلے ہوئے اور آج بھی نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی دینی تعلیم کے فروغ، وعظ و تبلیغ، اصلاحِ رسوم وتہذیبِ اخلاق کے دایروں سے لے کر قومی و ملکی سیاست اور دستور سازی کے میدانوں تک یہ خدمات انجام دی جارہی ہیں۔ اس رسالے سے جمعیت علماے ہند کے ان مساعی اور خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ اس رسالے کی اہمیت کا ایک پہلو ہے۔

رسالے کی تاریخی اہمیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسلم لیگ جو مسلمانوں کی نام نہاد جماعت تھی اور جس نے مسلمانوں کے دینی و ملی جذبات کو ہمیشہ برانگیختہ کرکے انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا، اس کے رہنما اسلامی سیرت کے خصایص سے تو محروم تھے ہی، انھوں نے اسلامی زندگی کے قیام میں دوسروں کی کوششوں میں بھی نہ صرف یہ کہ کبھی تعاون نہیں کیا بلکہ قدم قدم پر ہمیشہ روڑے ہی اٹکائے تھے۔ اس رسالے سے ان کے اس شرم ناک رویے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اس رسالے کی اولین اشاعت چوں کہ ''جمعیت علما کیا ہے؟'' کے ایک مضمون

کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ اس لیے اس میں ابواب و فصول کے اہتمام کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی۔ اب چوں کہ یہ ایک مستقل رسالے کی صورت میں چھاپا جا رہا ہے، اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اسے ابواب میں تقسیم اور از سرِ نو مرتب کر دیا جائے۔ اس اہتمام کے باوجود مضمون کی تحریر میں کوئی کمی بیشی یا کسی مبحث میں تقدم و تاخر کا عمل نہیں کیا گیا ہے۔

مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ کے زیرِ نظر رسالے کے مطالعے میں اس کے کمال اختصار کی وجہ سے جو ایک تشنگی محسوس ہوتی ہے، اس کا ازالہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی ڈائری سے اخذ کردہ رسالے ''قاضی بل'' اور اس کے ضمیمے کے مطالعے سے ہو جاتا ہے۔ ضمیمے کے شکل میں جمعیت علماے ہند کے مختلف اجلاسوں کی منظور شدہ قراردادیں (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۴ء) بھی مرتب کر دی ہیں۔ ❶

امید ہے کہ قارئینِ محترم رسالے کی موجودہ ترتیب و تبویب کے عمل سے اس کے مطالب کو فہم کے لیے زیادہ آسان اور سہل پائیں گے۔

ابو سلمان شاہ جہان پوری

❶ اجلاس کی قراردادوں سے متعلق کاوش مجموعے کے آخری رسالے ''مسلم لیگ کے دعاوی اور ان کی حقیقت — تحریک پاکستان کے پس منظر پر ایک تنقیدی نظر'' کے آخر میں ملاحظہ کیجیے۔ اس ضمیمے کے مطالعے کی اہمیت اُس مقام پر بھی اسی طرح ثابت ہے۔ (ا۔س۔ش)

پیش لفظ

قرآن حکیم ایک مکمل قانون ہے۔ عرش معلٰی سے نازل فرمودہ، انسانی خطا اور لغزش سے پاک، اس کا ہر حکم صحیح، ہر فقرہ صحیح، ہر حصہ پر ایمان لانا فرض، ہر حکم پر عمل کرنا لازم، اس کے ہر نظریہ کو تسلیم کرنا شرط ایمان، قانون حکومت کی طاقت چاہتا ہے۔ حکومت کے بغیر ایک قالب ہے بے جان، ایک جسم ہے بے روح۔

علمائے ملت اس حقیقت کو پہچانتے ہیں۔ وہ جس طرح کتاب اللہ پر ایمان لاتے ہیں جس طرح اس کی عظمت اور احترام کا سکہ ان کے قلوب پر ہے۔ جس طرح اس کی قانونی شوکت وحشمت ان کے دل و دماغ پر حاوی ہے اسی طرح وہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرانا بھی فرض سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ ایک ایسی آزاد حکومت کا قیام فرض سمجھتے ہیں جو قرآن حکیم کی اس حیثیت کو تسلیم کر کے اس پر عمل پیرا ہو۔ وہ ایسی آزاد حکومت کے قیام کے لیے ہر جد و جہد کو فرض سمجھتے ہیں۔ اگر اس کے لیے ان کو دوسری کسی قوم سے تعاون اور اشتراک عمل کرنا پڑے، تو وہ اس کو بھی فرض سمجھتے ہیں کیوں کہ وسیلہ فرض ہوتا ہے (۱)۔ اس اہم نصب العین کی خاطر وہ جزئیات کی نہ پروا کرتے ہیں اور نہ شرعاً یا عقلاً یہ جائز ہے کہ جزئیات کے لیے اصول کو قربان کر دیا جائے۔

دورِ خلافتِ راشدہ کے بعد تقریباً چھ سو برس تک دنیائے آباد کا بیشتر حصہ مسلم فرماں رواؤں کی نصرت اور فیروزمندی کے قدم چومتا رہا اور عساکر اسلام کی حشمت و شوکت اپنے تمام رقیبوں اور حریفوں کی نگاہوں کو خیرہ کرتی رہی۔ لیکن پھر خود مسلمانوں کی اندرونی کمزوریوں نے وہ حالت پیدا کر دی جس سے قرآن پاک نے ڈرایا تھا۔ کیوں کہ اس کا نتیجہ خود قرآن حکیم کے الفاظ میں یہ تھا کہ

فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ

''تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔''

چناں چہ عیسائی دنیا جس سے جنگ کا آغاز اسی وقت ہو گیا تھا، جب کہ خود سرورِ کائنات رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ۰۹ھ میں ''غزوۂ موتہ'' کے موقع پر عیسائی فوجوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا زاد بھائی اور حضرت علی ابن ابی طالب کے حقیقی بڑے بھائی یعنی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب خاص، محب صادق حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ اور اس لشکر اسلام کے تیسرے سالار اعظم حضرت عبداللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کو اور ان کے ساتھ مسلم مجاہدین صحابہ کی ایک جماعت کو شہید کر دیا تھا۔

یہ عیسائی دنیا جو اسلام کی پوری تاریخ میں اسلام کی حریف اور مسلمانوں سے نبرد آزما رہی۔ سات سو برس کی متواتر شکستوں کے بعد اندرونی خامیاں دور کر کے ایک تازہ دم دشمن کی طرح اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں کھڑی ہو گئی۔ اسپین (اندلس) سے نہ صرف اسلامی طاقت کو ختم کیا بلکہ مسلمانوں کا نام و نشان بھی مٹا دیا۔ اسپین کے علاوہ سسلی، مالٹا، تیونس وغیرہ دیگر اسلامی جزائر اور ممالک پر اس نے قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

برسر اقتدار مسلم فرماں رواؤں کے ان اعمال و اطوار کی بنا پر (جن کا اس وقت ذکر نہ کرنا بہتر ہے) جب علمائے اسلام کی اصلاحی اور انقلابی کوششیں ناکام رہیں تو تاحد امکان مسلمانوں کے معاشی اور سماجی نظام کو قایم رکھنے اور خود مسلمانوں کے اندرونی معاملات کو اپنے طور پر احکام اسلام کے بموجب طے کرنے اور سلجھانے کے لیے انھوں نے مسلمانوں کا معاشی نظام قایم کر کے غیر مسلم حکومت سے اس کو تسلیم کرالیا اور اس نظام کے ماتحت قاضی اور والی مقرر کر کے نکاح، طلاق، فسخ نکاح، وراثت وغیرہ کے مقدمات اور جمعہ، جماعتوں اور عیدین کی نمازوں کی امامت وغیرہ کے انتظامات ان قاضیوں اور والیوں کے سپرد کر دیے۔ اور عام مسلمانوں کے لیے

فتویٰ صادر کیا کہ

امافی بلاد علیها ولاۃ کفار فیجوز للمسلمین اقامة الجمع والاعیاد و یصیر القاضیی قاضیا بتراضی المسلمین ویجب علیهم طلب والِ مسلم

(ردالمختار: ص ۲۷۷، ج ۳، آخر فصل استیمان الکافر قبیل باب العشر والخراج والجزیۃ وایضاً ردالمختار: ص ۵۹۵، ج ۱، باب الجمعۃ)

"وہ شہر جن کے فرماں روا کفار ہوں۔ وہاں مسلمانوں کے لیے جمعہ اور عیدوں کا ادا کرنا جائز ہے اور مسلمان اپنی رضا سے کسی کو قاضی بنا دیں تو وہ قاضی ہو جائے گا اور مسلمانوں پر والی مسلم کا طلب کرنا واجب ہوگا۔"

یہ سب اس لیے کہ احکام شریعت کے بموجب نظام اجتماعی کے بغیر مسلمان کی زندگی گویا اسلام کے تخیل سے بھی خارج ہے۔

مولانا سید محمد میاںؒ

حاشیہ:

(۱) وضو، غسل درحقیقت مقصود بالذات عبادت نہیں۔ لیکن یہ فرض کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں کیوں کہ نماز بلا وضو یا بلا غسل جنابت ادا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح بقائے زندگی کے لیے کھانا پینا فرض ہو جاتا ہے۔ جب کہ کھائے پیے بغیر زندگی کے ختم ہو جانے کا خطرہ ہو۔ (مولانا سید میاںؒ)

باب اول:

ہندوستان اور منصب قضا

ہندوستان میں غیر مسلم حکام کے تسلط کا آغاز گیارھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط سے ہوا۔ شاہان مغلیہ کے زمانے میں نکاح، فسخ نکاح، امامت، نابالغوں کی تولیت وغیرہ، نیز دیوانی اور فوج داری کے مقدمات قاضیوں کے سپرد تھے۔ سلطان عالم گیر نے اپنے زمانے میں مسائل فقہ کا وہ مجموعہ مرتب کرایا جو فتاویٰ ہندیہ یا فتاویٰ عالم گیریہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہی اس زمانہ کا قانون تھا۔ یہ صیغہ ایک قاضی القضاۃ کے ماتحت رہتا تھا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا عروج ہو رہا تھا۔ عام مسلمان اس عروج کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کی طاقت اگرچہ منتشر تھی۔ خود غرض وزرا اور آرام طلب یا نااہل امرا کے جھگڑوں نے عالم گیرؒ کے بنائے ہوئے متحدہ ہندوستان کو درجنوں حکومتوں اور ریاستوں پر تقسیم کر دیا تھا۔ مگر عام مسلمان علمائے مجاہدین کی زیر سرکردگی انگریزوں سے تقریباً ایک صدی (۱) تک جہاد کرتے رہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈبلو ڈبلو ہنٹر کی کتاب کا اردو ترجمہ جو "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے عنوان سے اقبال اکاڈیمی لاہور نے شایع کیا ہے) انگریز جو اپنی ڈپلومیسی میں تمام دنیا سے فایق ہے اور رفتہ رفتہ تسلط جمانے کا عادی ہے۔ اس نے ابتدا ہی میں وہ سب کچھ نہیں کیا جو اس کا آخری منشا تھا۔ بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ابتدا میں قاضیوں کے سلسلے کو بحالہ قایم رکھا۔ ابتدا میں عدالتوں کا کام انگریز ججوں کے سپرد کیا گیا تو ان کے ساتھ مسلمانوں کے لیے قاضی اور مفتی اور ہندوؤں کے لیے پنڈت مقرر کر دیے۔ جج محض قاضی اور مفتی کے فتوے کو تحریر کر دیتے تھے۔

لیکن یہ حالت ہمیشہ کے لیے نہ باقی رکھنی تھی، نہ باقی رکھی گئی۔ ملک کے قوانین میں رفتہ رفتہ تبدیلیاں شروع کردی گئیں۔ تاکہ اس کو مغربی ڈھچر پر جاری کردیا جائے بلکہ ایک ایسا قانون بنادیا جائے جو نہ مغربی ہو، نہ مشرقی۔ ہاں غلاموں کے عین مناسب ہو اور بقاے غلامی کا بہترین وثیقہ ہو۔ مثلاً ہندو اور مسلمان دونوں زنا اور اغوا کو انتہا درجہ شرم ناک جرم سمجھتے ہیں۔ لیکن یوروپین تہذیب میں یہ صرف ایک تفریحی مشغلہ ہے بشرطے کہ حد تفریح اور فریق ثانی کی رضامندی سے آگے نہ بڑھے۔

چناں چہ ۱۸۴۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک قانون بنا کر عورت کو جرم سے بری کردیا۔ یعنی عصمت فروشی اور عصمت دری کے باوجود وہ معصوم، اور مرد کے لیے صرف معمولی سی سزاے قید تجویز کی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ عورت کا شوہر دعویٰ دائر کرے (۲)۔ اور استغاثہ کا حق صرف اس کے شوہر کو دیا گیا۔ غرض اس قسم کے قوانین نے دن بدن ترقی شروع کی اور آج جو قوانین ملک کی حالت ہے، وہ سامنے ہے۔

علماے ہند جب صرف ہندوستانیوں کے اعتماد پر انقلابی تحریکوں میں ناکام ہوگئے تو حکومت ہند کے انقلاب، اسلام کے معاشی اور سماجی نظام کے قیام کی دوسری صورتیں اختیار کیں (جن کی تفصیل اس مختصر مضمون میں نہیں ہوسکتی) حتیٰ کہ ۱۹۱۹ء میں تشدد کے ذریعے انقلاب کے بجائے "مقاومۃ بالصبر" یا عدم تشدد کی پالیسی اختیار کی گئی اور ہندو مسلم اشتراک عمل کے ذریعے آئینی جنگ کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لیے ایک دینی نظم قایم کرنے کی غرض سے اولاً علما کی تنظیم کا فیصلہ کیا گیا۔ جو "جمعیت علماے ہند" کی شکل میں بفضلہٖ تعالیٰ مسلمانان ہند کے سامنے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دینی نظم وہی ہوسکتا ہے جو وارثانِ انبیا علیہم السلام کی زیرِ قیادت ہو جن کو "شریعتِ غرا" کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اور جن کو "اولی الامر" کا خطاب دے کر عام مسلمانوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ چناں چہ حضرت حق جل مجدہ کا حکم ہے:

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ.

اسی کے ساتھ فقہاء کے مذکورہ بالا قول کے بموجب کہ ایک والی مسلم کی طلب مسلمانوں پر واجب ہوتی ہے۔ امارت شرعیہ کا قیام جمعیۃ علماے ہند کے پیش نظر رہا۔ اگرچہ صرف صوبہ بہار میں اس پر عمل ہو سکا۔ مگر باقی صوبجات میں جدوجہد جاری ہے جیسا کہ امارت شرعیہ فی الہند کے بیان میں گزر چکا۔

جمعیۃ العلماء کے نظام دینی میں عام مسلمانوں کو شامل کرنے کے لیے جمعیت علما کی ۲/ (دو آنے) والی ممبری کا سلسلہ قایم کیا گیا اور چند شرایط کے ساتھ جمعیۃ العلماء کے نظام کو جمہوری نظام بنا دیا گیا (وللہ الحمد)۔

اس تمام غیر سرکاری اور آزاد جدوجہد کے ساتھ یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ آئین ساز اسمبلیوں کے ذریعہ سے جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کے لیے شریعت کے مطابق قوانین بنوائے جائیں۔

اسمبلیوں کی قانون سازی سے اگرچہ وہ فرض نہیں ادا ہو جاتا جو مسلم پر بحیثیت مسلم عاید ہوتا ہے کیوں کہ اسمبلی کا وضع کردہ قانون اگر کلیتہً شریعت کے مطابق بھی ہو تب بھی وہ اسمبلی کا قانون ہوگا۔ اور مسلمان پر فرض یہ ہے کہ وہ خود قرآن کو قرآن کی حیثیت سے تسلیم کرے اور بحیثیت قانون اس کے احکام نافذ کرائے جب تک "ان الحکم الا للّٰہ" کے بموجب حکم اور قانون صرف اللہ کا نہیں مانا جائے گا مسلمان اپنے فرض سے سبک دوش نہ ہوگا۔ تاہم اتنا فایدہ ضرور ہو سکتا ہے کہ عملی حیثیت سے قانونی فیصلے شریعت کے مطابق ہو جاتے ہیں اور مسلمان فیصلہ کرنے والوں پر خلاف شرع فیصلے کا گناہ نہیں عاید ہوتا اور عمل کرنے والے کو بھی خلاف شرع حکم کی تعمیل پر مجبور نہیں ہونا پڑتا۔ نیز اس قسم کے قوانین کے لیے اگر مسلم حکام کی شرط منظور کرلی جاے تو آئینی طور پر مسلمانوں کا ایک سماجی نظام بآسانی قایم ہو سکتا ہے جو رفتہ رفتہ نہایت مستحکم نظام شرعی کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر دورِ حاضر میں کوئی ایسا نظام قایم ہو جائے تو آزاد یا خود مختار ہندوستان میں بھی وہ واجب التسلیم ہوگا اور اس طرح کلچرل اٹانمی (یعنی مذہبی اور معاشی آزادی) کا مطالبہ آزاد ہندوستان میں ایک

بنا بنایا تسلیم کردہ نظام ہو جائے گا۔ اس وقت نہ کیونسٹوں کی لا مذہبیت اثر انداز ہو سکے گی۔ نہ نیچریوں کی نیچریت روڑا اٹکا سکے گی۔ ان تمام امور کا لحاظ کرتے ہوئے صوبہ سرحد کی اسمبلی میں جہاں مسلمانوں کی کافی اکثریت ہے شریعت بل منظور کرایا گیا اور اس زمانے کے اخبارات کے م لعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں جمعیۃ العلماء نے اور اس کے صدر نسر م ت علامہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے کتنی جدوجہد کی۔

لیکن افسوس مرکزی اسمبلی میں پہنچ کر مسٹر جناح کی ترمیم اور حامیان مسٹر جناح کی ہم نوائی سے یہ بل اگرچہ قانون بنا مگر قطعاً غیر مؤثر اور اپنی اصلی روح سے سراسر خالی۔

حواشی:

(۱) جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء سے جہاد حریت ۱۸۵۷ء تک پورے ایک سو ایک سال اس جہاد میں صرف کر دیے۔ علما کی جدوجہد اس کے بعد بھی جاری رہی۔ جیسا کہ ابتدار سالہ میں ذکر کیا جا چکا ہے اور ''شان دار ماضی''، نیز ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' میں ان کی تشریح ہے، مگر فرق صرف یہ ہوا ۱۸۵۷ء تک صرف ہندوستانیوں کے اعتماد پر انقلاب کی کوشش تھی۔ اس کے بعد بیرونی طاقتوں سے ساز باز شروع کر دی گئی۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۹ء میں عدم تشدد کی پالیسی اختیار کر کے ہندو مسلم اشتراک عمل کے ساتھ جنگ آزادی کا فیصلہ کیا گیا۔

(۲) ایک واقعہ کا ذکر کر دینا مناسب ہے۔ دفعہ نمبر ۴۹۷ و دفعہ نمبر ۴۹۸ تعزیرات ہند جو اغوا اور زنا کے متعلق ہے اور جس میں صرف مرد کو سزا ہے عورت کو نہیں ہے۔ اس میں محمد احمد صاحب کاظمی نے ایک ترمیم پیش کی کہ عزت اور اخلاق مرد اور عورت دونوں کو مجرم گردانتے ہیں لہٰذا دونوں کو سزا ہونی چاہیے۔ بات معقول تھی۔ مگر لیگ کے حضرات نے حمایت نہ کی اور سر رضا علی صاحب نے ایک دھواں دھار تقریر کر دی کہ عورتوں کو آزادی ملنی چاہیے۔ (مولانا سید محمد میاںؒ)

باب دوم:

افسوس ناک سرگزشت

قانون فسخ نکاح کے سلسلے میں اس تمام پس منظر کے علاوہ ایک نہایت دردناک صورت اور بھی پیش تھی۔ اسلامی تعلیم اور اسلامی اخلاق سے بیگانگی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان مرد خانگی زندگی میں یا تو یورپ کی اتباع کر کے عورتوں کو مطلق العنان اور قطعا آزاد کر دیتے ہیں یا زمانۂ جاہلیت کی متابعت کرتے ہوئے ان کے حق میں خونخوار درندے بن جاتے ہیں۔ پہلی صورت کے نتیجہ میں لامذہبیت، دہریت، بے حجابی اور بے حیائی کو فروغ ہو رہا ہے۔

اور دوسری صورت کا خطرناک اور نہایت افسوس ناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورتیں ان ظالم شوہروں سے نجات پانے کے لیے بسا اوقات اغوا وغیرہ کے جرایم کی مرتکب ہوتی ہیں اور سب سے بدتر یہ کہ ظالم شوہروں سے گلوخلاصی کے لیے (معاذ اللہ) تبدیلی مذہب اور ارتداد کی شکل نکالتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہر سال سیکڑوں بلکہ ہزاروں عورتیں تمام ہندوستان اور بالخصوص صوبہ پنجاب میں عیسائی یا آریہ ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی تعداد روز افزوں ترقی کر رہی ہیں۔

یہ حالت اس وجہ سے اور بھی خراب ہوگئی کہ پنجاب ہائی کورٹ کی نظیریں اس مضمون کی ہوئیں کہ اگر کوئی عورت محض یہ کہہ دے کہ اس نے مذہب اسلام چھوڑ دیا ہے تو اس کا یہ کہنا فسخ نکاح کے لیے بالکل کافی ہے حال آں کہ اس قسم کا ارتداد بیشتر بلکہ تمام تر فرضی اور نمایشی ہوتا ہے۔ کورٹ اس امر کا ثبوت پیش کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ یہ ارتداد اور تبدیلی مذہب محض فرضی ہے۔

(تقریر محمد احمد کاظمی بسلسلہ قاضی بل اجلاس اسمبلی ۵ راپریل ۱۹۴۵ء)

اس حالت کی روز افزوں ترقی نے علماے ملت کو سراسیمہ کر دیا۔ انھوں نے بالخصوص سابق صدر جمعیۃ العلماء مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہما اور حضرت حکیم الامۃ مولانا محمد اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے اجتماعی طور پر اس مسئلے کی طرف خاص توجہ کی چناں چہ جمعیت علماے ہند کے قیام سے چند سال بعد (۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۶ء میں) ان حضرات نے اس مسئلے پر غور کیا کہ ہندوستان میں قاضی شرع نہ ہونے کی صورت میں ان مظلوم اور مجبور عورتوں کے لیے کیا انتظام کیا جائے جو شوہروں کے ظلم و تعدی یا مفقود اور لاپتہ ہو جانے کی وجہ سے انتہائی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔

چوں کہ اس سلسلے میں بہت سے مسائل بہ ضرورت شدیدہ مذہب مالکیہ سے لینے ضروری تھے نیز ان مسائل کو اختیار کرنے میں علماے حنفیہ سے مشاورت ضروری تھی اس لیے مدینہ طیبہ، مکہ معظمہ وغیرہما کے علماے مالکیہ سے عرصہ دراز تک تنقیح مسائل کے لیے خط وکتابت اور بار بار مراجعت ہوتی رہی۔ چناں چہ پانچ چھے سال کی جدو جہد اور تحقیق و تدقیق کے بعد الحمدللہ ایک مکمل قانون شرعی تیار ہو گیا اور ۱۳۵۱ھ میں اس مجموعہ کو "حیلہ ناجزہ" کے نام سے شایع بھی کر دیا گیا۔ پھر ایک مسودۂ قانون انفساخ نکاح مرتب کر کے جناب سید محمد احمد صاحب کاظمی کے ذریعہ سے اسمبلی میں پیش کرایا گیا (۱)۔

یہ بل راے عامہ کے لیے مشتہر کیا گیا۔ ہندو مہا سبھا اور بعض آریہ سماجوں کی طرف سے شدت سے اس کی مخالفت ہوئی۔ مسلم لیگی ممبران نے اس میں کوئی دل چسپی نہیں لی۔ البتہ کانگریسی ہندو ممبران اسمبلی نے ساتھ دیا اور ۱۹۳۹ء میں یہ بل اسمبلی میں منظور ہو گیا۔ جو قانون انفساخ نکاح اہل اسلام ۱۹۳۹ء سے موسوم ہوا، لیکن گورنمنٹ نے مسلم حاکم کی دفعہ کو ماننے سے قطعاً انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ یہ ظاہر کر دیا گیا کہ اگر اس دفعہ پر اصرار کیا گیا تو وہ پورے قانون کو نافذ نہ ہونے دے گی۔ بہ ہر حال وہ دفعہ اس قانون میں نہیں رکھی گئی اور یہ قانون اس صورت سے منظور ہوا کہ

اس کا نقصان نفع سے زیادہ تھا۔

اس نقص اور خامی کے تدارک کے لیے مسلم قاضی بل کا مسودہ تیار کیا گیا اور ۱۹۴۱ء میں یہ مسودۂ بل پیش کیا گیا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلوی نے اس مسودے کی ترتیب میں نمایاں حصہ لیا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ قاضیوں کا ایک نظام قایم کیا جائے اور نکاح اور طلاق کے معاملات قاضیوں کے سپرد کر دیے جائیں۔ لیکن گورنمنٹ نے پھر قاضیوں کو نکاح اور انفساخ کے اختیارات دینے سے انکار کر دیا اور مسلم لیگی ممبر صاحبان نے مجرمانہ خاموشی اور بے التفاتی اختیار کی۔

بالآخر مجبوراً مسلم قاضی بل کا وہ حصہ جو نکاح پڑھانے سے متعلق تھا جداگانہ قاضی بل کے نام سے ۱۹۴۲ء میں پیش کیا گیا اور اس دوران میں مسلم قاضی بل کو بھی جاری رکھا گیا۔ منشا یہ تھا کہ قاضیوں کا ایک مرتبہ نظام مقرر ہو جائے تو پھر نکاح اور طلاق وغیرہ معاملات ان کے سپرد کرنے میں اتنی دشواری نہ ہوگی۔

چناں چہ گورنمنٹ نے قاضی بل کو راے عامہ کے لیے مشتہر کرنے میں مخالفت نہیں کی۔ آرا کی کثرت بل کے موافق تھی۔ بالآخر گورنمنٹ نے اپنا منشا ظاہر کر دیا کہ اگر مسلم ممبران اسمبلی اس کی تائید کریں گے تو گورنمنٹ کو اس کے مان لینے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ چناں چہ مسودے کے محرک مولوی محمد احمد صاحب کاظمی نے سلیکٹ کمیٹی (منتخبہ کمیٹی) کی تحریک کی اور اس میں ممبران مسلم لیگ کی اکثریت رکھی۔ مسلم لیگ کے ممبران اسمبلی سے اس بارے میں گفت وشنید کی۔ لیکن ان کے راے قایم کرنے میں بہت دیر لگی متواتر تقاضوں کے بعد انھوں نے اپنا جلسہ کر کے کاظمی صاحب کو اطلاع دی کہ چوں کہ مختلف صوبوں میں مختلف رواج ہیں، اس لیے وہ اس بل کے مخالف ہیں۔ جب لیگی ممبران اسمبلی سے جو حفاظت اسلام کے سب سے بڑے مدعی ہیں اور کلچر اسلام کے تحفظ کے نام پر مسلمانوں کو دھوکا دے کر ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ تین سال کی گفت وشنید کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اپریل ۱۹۴۵ء میں اس

بل کو پیش کر دیا گیا۔ افسوس مسلم لیگ کے حضرات نے اس بل کی مخالفت کی اور مسلم لیگ کے معزز رکن سر محمد یامین نے ایک توہین آمیز اور مضحکہ خیز تقریر کی۔ جس میں محمد احمد صاحب کاظمی پر نہایت مکروہ اور تلخ انداز میں ذاتی حملے بھی کیے جو تہذیب اور شرافت اور آداب مجلس کے لحاظ سے نہایت شرم ناک ہیں۔ (اسمبلی کی رپورٹ میں سر یامین کی وہ تقریر بھی محفوظ ہے)۔ لطف یہ ہے کہ لیگی ممبران نے جو اسلامی قومیت کے نام پر علمائے ربانی کو چوبیس گھنٹے کوستے رہتے ہیں۔ عین اس زمانے میں کہ اسلام کی عالم گیر قومیت کے ڈھول پیٹ کر حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور ان کے رفقا کو بدنام کر رہے تھے۔ اپنی مخالفت کی دلیل یہ پیش کی کہ مختلف صوبوں میں مختلف رواج ہیں۔ محمد احمد صاحب کاظمی نے اس کا جواب نہایت معقول دیا کہ:

> ''ہندو جن کا قانون اور رواج چپہ چپہ پر مختلف ہے۔ وہ تمام ہندوستان کے لیے ایک عام قانون بنانا چاہ رہے ہیں اور اس کے لیے راؤ کمیٹی بھی مقرر کر دی ہے، مگر تعجب ہے کہ مسلمان جن کا قانون تمام دنیا کے لیے ایک ہے وہ رواج کی بنا پر اس سے انکار کر رہے ہیں۔''

کاظمی صاحب نے اس بل کے متعلق باہمی سمجھوتے کی پوری پوری کوشش کی۔ حتیٰ کہ اس پر بھی آمادگی ظاہر کی کہ میں اس بل کو واپس لے لوں گا آپ حضرات کوئی بل پیش کر دیں۔ مگر افسوس کہ قائدین لیگ جو اقتدار علما کے زوال ہی میں اپنی ترقی سمجھتے ہیں اور قائد اعظم کے اس فخریہ اعلان پر کہ میں نے علما کا اقتدار ختم کر دیا ہے خوشیاں مناتے ہیں۔ کسی طرح بھی تائید کے لیے آمادہ نہ ہوئے اور حکومت کو یہ عذر کرنے کا موقع دے دیا کہ چوں کہ لیگ پارٹی مخالف ہے، اس لیے حکومت اس بل کی تائید نہیں کر سکتی۔ (ملاحظہ ہو تقریر اشوک رائے ممبر قانون)

باب سوم:

جمعیت اور لیگ کے ممبران
اور ان کے رویوں کا فرق

اب یہ اس افسوس ناک سرگزشت کو مولوی محمد احمد صاحب اور سر محمد یامین صاحب کی تقریروں کے خلاصہ پر ختم کرتے ہیں اور چوں کہ سر محمد یامین صاحب نے اپنی تقریر میں یہ اعتراض کیا تھا کہ محمد احمد صاحب نے یہ بل صرف خاندانی قاضیوں کے فایدے کے لیے پیش کیا ہے اور قاضی کی نکاح خوانی کی جو فیس مقرر کی ہے وہ مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت ہے، لہٰذا ہم اس بل کی چند دفعات کا خلاصہ نقل کیے دیتے ہیں!

چند خاص دفعات:

دفعہ نمبر ۱: صوبہ کی گورنمنٹ ہر ضلع میں نکاح خوانی اور دیگر امور مذہبی کی ادائیگی کے لیے قاضی کا تقرر کرے گی اور مقدمات، نکاح، طلاق، خلع وغیرہ کے تصفیے کے لیے ایک یا ایک سے زاید پنچایتیں مقرر کرے گی۔ اور قاضیوں کے ممبران کی نامزدگی اور ان کے کاموں کی نگرانی وغیرہ کے لیے ہر ضلع میں ایک کمیٹی مقرر کرے گی جو ضلع کمیٹی کے نام سے نامزد کی جائے گی۔

دفعہ نمبر ۲: ضلع کمیٹی، ضلع کے جج، کلکٹر، مسلم وکیل (جس کا انتخاب وکلا کریں گے) مسلم ممبر میونسپل بورڈ اور ایک مسلمان ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ (جس کا انتخاب بورڈ کے مسلم ممبران کریں گے) اور سند یافتہ علما جن کا انتخاب علما کریں گے، پر مشتمل ہوگی۔

دفعہ نمبر ۴: عہدۂ قاضی پر تقرر کے لیے قاضی میں صفات ذیل ضروری ہوں گی۔

دیانت دار اور پرہیزگار ہو، تعلیم یافتہ ہو، مسائل نکاح سے بخوبی واقف ہو۔ اور جو قاضی تصفیہ نکاح اور مقدمات نکاح وغیرہ کے متعلق مقرر کیا جائے اس کے لیے مزید شرط یہ ہو گی کہ وہ مدارس اسلامیۂ مندرجۂ ذیل فہرست ضمیمہ کا مستند تعلیم یافتہ ہو گا اور صفات مذکورہ کے ساتھ وہ قاضی جو اس شہر یا قصبہ کا باشندہ ہو۔ خاندانی اثر رکھتا ہو اور اس کے خاندان میں عہدۂ قضا نسلاً بعد نسل چلا آ رہا ہو وہ مستحق ترجیح ہو گا۔ یہ قاضی حلقہ دار اپنے نائب مقرر کرے گا جو دین دار اور نیک ہوں اور وہ اپنے اپنے حلقوں میں نکاح پڑھائیں (۲)۔

سید محمد احمد کاظمی کی تقریر:

۵/ اپریل ۱۹۴۳ء کو اجلاس اسمبلی میں ''قاضی بل'' پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''منصب قضا سے مسلمانوں کا بہت پرانا تعلق ہے۔ مشترک سماجی اور مذہبی امور قاضیوں کے ذریعے سے انجام پاتے رہے ہیں۔ نماز جمعہ اور عید کا انتظام، طلاق، نکاح، نابالغوں، دیوانوں، گم شدگان کی تولیت اور نگرانی وغیرہ امور ان کے متعلق رہے ہیں۔ انگریزی دور کی آمد کے بعد قاضیوں کے ہاتھ سے ان کے بیشتر منصبی فرائض خارج ہو گئے۔''

ریگولیشن ۱۷۹۳ء کی دفعہ نمبر ۹۳ کی تمہید میں درج ہے:

''نمبر ۵، ڈھاکہ، مرشد آباد اور دیگر خاص پرگنوں اور قصبوں میں قاضی موجود ہیں۔ جو معاملات انتقال و تصدیق میں کاغذات کی تکمیل اور دیگر دستاویزات قانونی دربارۂ تقریبات شادی اور دیگر امور شرعی کی تعمیل اور تکمیل کرتے ہیں۔ جن کو زیر حکومت برطانیہ وہ اب تک انجام دیتے رہے ہیں۔ قرق جائدادوں کا فروخت کرنا اور ریگولیشن ۱۷۹۳ء/۲۴ کے تحت خیرات، وظائف اور بھتے بھی تقسیم کرتے رہے ہیں۔'' (تمہید مذکورہ)

متذکرہ امور اور فرائض کا تقاضا ہے کہ ایسے منصبوں پر نیک چال چلن اور قانونی قابلیت کے لوگوں کو مقرر ہونا چاہیے اور ان کی قدر افزائی ہونی چاہیے تا کہ محنت اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر حکومت ان کا منصب تسلیم کر لیا گیا تھا جو ۱۸۶۴ء تک بھی شامل دستور رہا۔ اس وقت ایک قانون بنا کر یہ کہا گیا کہ آیندہ قاضی کا منصب قانونی طور پر قایم نہ رہے گا۔ اس وقت مسلمانوں کے سامنے ایک معاشی اور سماجی دشواری پیش آ گئی۔ قاضیوں کے واسطے نفاذ حکم اور اجراے فیصلہ کے لیے حکومت کی ضرورت تھی اور حکومت نے ان کے اختیار ختم کر دیے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں سر سید نے قانون ساز کونسل سے قانون نمبر ۱۲ کو منظور کرایا جس کا مضمون یہ تھا کہ

"کسی شہر کے مسلمانوں کی طرف سے درخواست موصول ہونے پر وہاں قاضی مقرر کیا جائے گا اور اس کی وضاحت کر دی گئی کہ اس کو عدالتی یا اور کسی قسم کے اختیارات نہ ہوں گے۔"

یہ بے کار قانون بھی اپنی عبارت کی چند الجھنوں کے باعث قابل عمل نہ ہو سکا۔ میں اس وقت ۱۸۸۰ء کے قانون نمبر ۱۲ کو مفید اور قابل عمل بنانا چاہتا ہوں جو مسودۂ بل میں نے پیش کیا ہے، اس کے متعلق ہر ایک ترمیم مناسب مسودۂ کو قبول کر لوں گا۔ اگر اس منشا کو پورا کرنے کے لیے اس سے بہتر مسودۂ بل پیش کیا جائے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں کہ اپنا مسودہ واپس لے لوں۔

اس سے پہلے میں نے مسلم قاضی بل پیش کیا تھا۔ یہ بل آج تک مختلف اوقات میں ایجنڈے میں شامل رہا۔ لیکن آج میں حکومت اور مسلم لیگ پارٹی کے طرز عمل سے مایوس ہو کر آیندہ ایجنڈے پر رکھنا بے کار سمجھتا ہوں، افسوس ہے کہ مسلم لیگ کے ارکان کو اس سادہ اور بے خطر بل پر غور کرنا بھی بار معلوم ہوا ہے۔ اس بل کے ذریعے مسلمانوں کی یہ دیرینہ شکایت رفع کرنی مقصود ہے کہ انفساخ نکاح وغیرہ مقدمات کے لیے مسلمان حاکم کی ضرورت ہے۔

میں نے مستند اور شہرہ آفاق علما مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی صاحب، مولانا حسین احمد مدنی صاحب وغیرہ سے مشورہ کر کے یہ دستور بنایا ہے جہاں تک حکومت کا تعلق ہے وہ انفساخ نکاح کے تصفیہ کے لیے آزاد عدالت قایم کرنے کو تیار نہیں۔ ایسے معاملے میں حکومت کے اس قابل اعتراض رویے کو نہیں سمجھ سکتا۔

میں جانتا ہوں کہ حکومت نے قانون وقت کے ماتحت عیسائیوں، اینگلو انڈین اور یورپ والوں کو جو یہاں اتفاقی طور پر نکل آئے ہیں اور ملک کے مستقل باشندے نہیں ہیں۔ شادی کے قضیے طے کرنے کے لیے خاص عدالتوں کی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں۔

حال ہی میں اس ایوان میں میرے سامنے ایک قانون کے ذریعے پارسیوں کی شادی کے قضیے طے کرنے کے لیے خاص عدالتی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔

مگر مسلمانوں کا سوال آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہمیں معمولی حق بھی دینا نہیں چاہتی۔

ہمارے سامنے مسلمانوں کی تنظیم کے ارادے تھے اور امید تھی کہ شرع محمدی کا نفاذ کرا کے اور کم سے کم جہاں تک ان کے نکاح اور طلاق کے قضیے ہیں، ان کے شدید متعصبات رفع کر سکیں گے۔ مگر ہمیں جب ناکامی ہوئی تو ابتدائی ارادے ترک کر کے میں نے دوسرا بل پیش کیا جو اصل بل کا محض ایک جز ہے۔ اور مجھے امید تھی کہ حکومت اس پر ہمدردانہ توجہ کرے گی کیوں کہ اس کی طرف سے کہا گیا تھا کہ خاص عدالتوں کا قیام مختلف چیز ہے۔ حکومت آزاد عدالتیں قایم کرنے کے لیے تیار نہیں، لیکن جہاں تک شادیوں کا تعلق ہے حکومت غور کرنے اور منظور کرنے کے لیے تیار ہے (۳)۔

اگر مسلم ممبران اسمبلی اس کی تائید کریں۔ (رپورٹ اجلاس اسمبلی)

لیگی ممبران کی مداخلت اور استہزا:

لیگی ممبران اسمبلی اس کی تائید تو کیا کرتے ان کو تقریر سننا بھی گوارا نہ تھا۔ چناں

چہ چند مرتبہ اثنائے تقریر میں مداخلت کی۔ حتیٰ کہ صدر کو خاموش کرنا پڑا۔

کاظمی صاحب کی تقریر کے بعد سر محمد یامین صاحب نے تقریر فرمائی مگر وہ سراسر استہزا اور مذاق تھا۔ کچھ توہین آمیز پھبتیاں تھیں۔ مثلاً یہ کہ آپ قاضی ہیں، اس لیے یہ بل اپنے خاندان کے مفاد کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے صرف شمالی ہند کے چند مدارس کے علما کا تذکرہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جن میں سے ایک بھی اعتراض سنجیدہ اور مہذب نہ تھا اور جب کہ ارکان لیگ اپنی پالیسی ظاہر کر چکے تھے کہ وہ بل کی حمایت نہ کریں گے تو درحقیقت سر محمد یامین کی تقریر کا منشا صرف وقت کو پورا کرنا اور ایک خیالی خاکے کو بھر دینا تھا اور بس۔

افسوس ناک انجام:

نتیجہ یہ کہ ممبر قانون سر آسوک رائے نے اعلان کر دیا کہ مسلم لیگ پارٹی کی سرگرم مخالفت کی وجہ سے حکومت سلیکٹ کمیٹی میں منتخبہ کمیٹی کے لیے سفارش نہیں کر سکتی۔ یہ ہے جمعیت علمائے ہند جیسی کانگریسی جماعت اور مسلم لیگ جیسی حفاظت اسلام کی ٹھیکے دار جماعت کے ایک کارنامے کی مختصر روئیداد۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ۔ آمین

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

محمد میاں عفی عنہ

۴ر ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ، ۱۱ر نومبر ۱۹۴۵ء

حواشی:

(۱) یہ بل ۲۶ر اگست ۱۹۳۸ء اور ۲۰ر ستمبر ۱۹۳۸ء کو مرکزی اسمبلی میں زیر بحث آنے کے بعد ایک منتخب کمیٹی کے سپرد ہو گیا تھا۔ مسٹر جناح بحث کے دنوں میں غیر حاضر رہے، مسلم لیگ نے باقاعدہ حمایت نہیں کی، لیگی ممبران کی یہ سرد مہری دیکھ کر سرکاری ممبر نے مسلم جج یا مسلم حاکم کی قید کی (جو اس بل میں تھی) مخالفت کی اور یہ دھمکی دی کہ اگر اس شرط کو واپس نہ لیا جائے گا تو گورنمنٹ پورے قانون کو نفاذ سے روک دے گی۔ (ماخوذ از رپورٹ اسمبلی)

(۲) اس مقام پر مولانا سید محمد میاں نے درج ذیل نوٹ حاشیے میں تحریر فرمایا ہے:

"گرام سدھار کے متعلق کانگریس کی اسکیم ہے کہ ہر گاؤں یا چند گاؤں کے حلقے میں ایک پنچایت بنائی جائے جس کو رفتہ رفتہ تصفیہ مقدمات کے اختیارات دیے جائیں۔ اور معمولی مقدمات اس پنچایت کے سپرد ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ دیہاتی پنچایتیں بہت زیادہ مفید ہیں۔ عام باشندے ان بے پناہ مصارف اور پریشانیوں سے نجات پا جائیں گے جو ان کو مقدمات کی موجودہ صورتوں میں برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ نیز ہر ضلع میں جس قدر ڈپٹی مجسٹریٹ اب مقرر کرنے پڑتے ہیں ان میں بہت کمی کر دی جائے گی جس سے قوم کا روپیہ بچے گا اور عام ہندوستانیوں پر جو ٹیکسوں کی بھرمار ہے اس میں تخفیف ہو سکے گی۔ یہ تمام فوائد ہندو مسلمانوں کے لیے عام ہوں گے اور اس لیے ان کی مخالفت کرنا خود اپنی قوم کو نقصان پہنچانا ہوگا۔ لیکن شرعی نقطۂ نظر سے ان پنچایتوں میں قباحت یہ پیش آئے گی کہ مسلمان طلاق و نکاح وغیرہ کے مقدمات بھی انھیں پنچایتوں میں رکھیں گے، کیوں کہ ان کو اس میں سہولت نظر آئے گی لیکن یہ پنچایتیں چوں کہ ہندو اور مسلمان دونوں پر اور بہت ممکن ہے بعض مقامات میں صرف ہندو ممبران پر مشتمل ہوں گی لہٰذا نکاح، طلاق وغیرہ شرعی امور میں ان پنچایتوں کے فیصلے شرعاً ناجائز ہوں گے تو مسلم حاکم کی شرط منظور نہ کرنے کے باعث جو قباحت انفساخ

نکاح کے سلسلے میں اس وقت درپیش ہے، اس وقت بھی رہے گی یہ قاضی بل
کی اس قباحت کا انسداد تھا۔ یہ گرام سدھار کی پنچایتوں کے متوازی
مسلمانوں کے لیے ایک مخصوص نظام ہوتا۔ کیوں کہ اس قسم کا کوئی نظام اگر
اب بن جاتا ہے تو آزاد ہندوستان یا خود مختار ہندوستان میں اس کا تحفظ
بہت آسان ہے۔ بمقابلہ اس کے کہ مسلمان از سر نو آزاد ہندوستان میں اس
قسم کا کوئی نظام قایم کریں۔" (مولانا سید محمد میاںؒ)

(۳) کیا اس کو لیگ اور حکومت کی خفیہ ساز باز نہیں کہا جا سکتا؟ (مولانا سید محمد میاںؒ)

۵

شرکتِ کانگریس کا جواز!

تھانوی، عثمانی نقطۂ نگاہ پر تنقید کی ایک نظر

تحقیق

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان

کراچی

شرکتِ کانگریس کا جواز!

تھانوی، عثمانی نقطۂ نگاہ پر تنقید کی ایک نظر

صفحہ	فہرست
۴۳۶	حرفے چند — ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری
۴۳۵	مولانا ظفر احمد صاحب کے فتوے پر تبصرہ
۴۵۱	شرکتِ کانگریس اور شریعت غرّا - اہم سوالات اور بصیرت افروز فتاوٰی
۴۷۳	''کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ'' پر تنقید کی ایک نگاہ
۴۷۵	حقیقی سوالات
۴۸۰	غلط سوالات قایم کیے گئے
۴۸۵	صحیح سوال
۴۸۸	جوابات پر طایرانہ نظر
۵۰۴	ودیا مندر، واردھا اسکیم وغیرہ
۵۰۵	جھنڈے کی سلامی
۵۰۶	بندے ماترم کا شرکانہ ترانہ
۵۰۷	گرام سدھار اسکیم
۵۰۹	ودیا مندر اسکیم
۵۱۰	واردھا اسکیم
۵۱۰	اردو ہندی کا قصہ
۵۲۳	دوسرے سوال کے جواب پر تبصرہ
۵۲۴	تیسرے سوال کے جواب پر ایک نظر
۵۳۵	قرآن حکیم کو بازیچۂ اغراض مت بناؤ!

حرفِ چند

حضرت مورخِ ملّت کے "مقالاتِ سیاسیہ" کے پانچویں مجموعے کا ورق آپ نے اُلٹا ہے۔ اس مجموعے میں آں مرحوم کے چار رسالے ہیں۔

اس میں پہلا مضمون مولانا ظفر احمد صاحب کے فتوے پر تبصرہ کے عنوان سے روز نامہ زمزم۔ لاہور میں ۳۰ ر اکتوبر، ۳ر نومبر اور ۷ر نومبر ۱۹۴۵ء کی تین قسطوں میں شایع ہوا تھا۔ پھر یہی مضمون ۱۹۴۶ء کے آغاز میں کتابچے کی صورت میں بھی چھپا تھا۔ میرے سامنے اس کی دونوں اشاعتیں ہیں اور دونوں میں سرورق نہیں۔

یہ مضمون مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی کے جس فتوے کے رد میں تھا وہ روز نامہ خلافت۔ بمبئی کے شمارہ ۶ر اکتوبر ۱۹۴۵ء میں شایع ہوا تھا۔ مولانا عثمانی سلسلۂ تھانوی کے خلفا میں ڈی گریڈ کر دیے جانے والے مرید تھے اور اس لیے تھانوی سلسلے کے نیک نام علماے میں ان کی اہمیت نہ تھی۔ لیکن ان کے جاری کردہ فتوے میں بھی عنوان کے سوا فتوے کی کوئی شان نہ تھی۔ نہ تو اس میں استدلال کی قوت تھی نہ اطلاق کی صحت تھی اور نہ اس کے مطالعے سے ان کی سیاسی بصیرت ہی کا پتا چلتا تھا۔ مورخِ ملت نے اس پر جو نقد کیا تھا۔ وہ اگرچہ فتوے کی حیثیت سے نہ لکھا گیا لیکن اس کے اندازِ فکر، طرزِ استدلال، استخراجِ نتایج اور جس ذوقِ تفقہ، رسوخ و دیانتِ علمی، اسلوبِ تحریر کی شایستگی، زبان کی متانت اور احساسِ ذمہ داری سے لکھا گیا تھا، اس کا تقاضہ تھا کہ اس پر فتوے کا اطلاق کیا جائے لیکن اس تحریر کے درجۂ استناد اور اس کی دینی حیثیت و افادیت، مثبت اندازِ فکر، صحت مند خیالات، بلند معیارِ تحقیق اور کمالِ تفقہ کے باوجود میں اسے ایک مضمون ہی شمار کروں گا۔ میرے نزدیک اس کی دو وجہیں ہیں:

ا۔ میرے نزدیک غور و فکر و تدبر سے ہاتھ اٹھا کر، مسایل کے تجزیہ و تحلیل سے گریز کر کے، واقعات کے حقیقی پس منظر کے فہم و ادراک کے بغیر، ماضی کو بھلا کر، گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہو کر، جذبات میں بہہ کر، توہمات میں مبتلا ہو کر، حقایق

سے منہ موڑ کر، خواہشوں اور آرزوؤں کو مقصد بنا کر، محدود دایرۂ فکر اور وقتی تغیرات اور موسموں کی تبدیلیوں سے خوف زدہ ہو کر مذہبی جذبات کا ابھارنا کوئی مثبت اندازِ فکر اور پختہ و محکم رویہ نہیں ہے۔ جیسا کہ لیگی اہلِ قلم اور اس وقت خانقاہی علما کا رویہ تھا۔

اگر یہی اندازِ فکر صحیح اور رویہ درست ہوتا تو شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمہما اللہ سے بڑھ کر اس حربے کو اور کون استعمال کر سکتا تھا؟ لیکن معلوم ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے یہ رویہ ہرگز اختیار نہیں کیا!

۲۔ ہمارے بزرگوں نے کمال درجہ تقویٰ و تدین اور نہایت رسوخ فی العلوم الاسلامیہ کے باوجود سیاست کو گرد و پیش کے حالات اور وقت کے بہترین قومی و ملی مصالح اور بصیرت و تدبر کی روشنی میں استعمال کیا ہے اور اس کے لیے مذہب کے استعمال، عقیدے کے استحصال اور عوام کے جذبات کو اشتعال میں لانے سے ہمیشہ گریز کیا اور مسایل کے حل کے لیے انھوں نے ہمیشہ تاریخی بصیرت، علم و فن کا طریقہ، غیر جذباتی رویہ، اخلاص و تدبر اور موعظت و حکمت کی راہ اختیار کی۔ نیز راست گوئی اور احتیاط کا دامن انھوں نے کبھی نہیں چھوڑا۔ وہ وقتی مصالح کا شکار بھی نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنی سیرت سے ثابت کر دیا کہ وہ پختہ کار سیاست داں اور قوم و ملت کے واقعی رہنما ہیں۔

مجموعے کا دوسرا مضمون ''شرکت کانگریس اور شریعتِ غرا- اہم سوالات اور بصیرت افروز فتاویٰ'' کے عنوان سے ماہنامہ قاید مرادآباد بابت ماہ ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ (جنوری ۱۹۳۹ء) میں شایع ہوا تھا۔ یہ مضمون ایک استفتاء کے جواب میں ''دارالافتاء جامعۂ قاسمیہ مدرسۂ شاہی مرادآباد'' سے بہ طور فتویٰ جاری کیا گیا تھا۔ استفتاء کا جواب مولانا سید محمد میاں کے قلم سے تھا اور تصدیق و تصویب کرنے والوں میں جامعۂ قاسمیہ مدرسۂ شاہی کے صدر مفتی اور شیخ الحدیث مولانا سید فخر الدین احمد، شیخ التفسیر اور مہتمم مولانا عبدالحق مدنی، مولانا قاری عبداللہ استاذ شعبۂ تجوید، مولانا واحد رضا مدرس جامعۂ قاسمیہ اور مولانا سید محی الدین اختر الاسلام مدرس جامعۂ قاسمیہ و ایڈیٹر رسالہ قاید (مرادآباد) رحمہم اللہ اجمعین کے اسمائے گرامی شامل تھے۔

اس فتوے کی تحقیق وتالیف میں مولانا سید محمد میاں نے فقہ کے اعلا ذوق، کمالِ بصیرت اور سیاست میں اپنی گہری نظر اور گردو پیش کے حالات سے نہایت واقفیت اور وسیع سیاسی مطالعے کا ثبوت دیا ہے۔ یہ فتویٰ اپنی تحقیق کے معیار اور استدلال و براہین کی محکمی اور وقت کے مسایل پر حسن اطلاق کی عمدہ مثال بھی ہے۔ اس فتوے میں ان تمام نکات اور سوالات کے جواب بھی آگئے ہیں، جو اس سے پہلے حضرت تھانوی کے ملفوظات، مکتوبات، متفرق مضامین یا مستقل رسایل میں اٹھائے جا چکے تھے اور جنھیں مولانا مفتی شفیع صاحب نے ''افاداتِ اشرفیہ در مسایلِ سیاسیہ'' میں بعد میں مرتب بھی کر دیا تھا۔ اور بعض نکات مفتی صاحب نے خود اپنے رسالے ''کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ'' میں اٹھائے تھے۔ یہ ایک نہایت جامع اور معیاری فتویٰ ہے جو مورخِ ملت نے تحریر فرمایا تھا۔

جب حضرت مفتی صاحب نے ۱۹۴۵ء میں اپنا شرعی فیصلہ مرتب فرمایا اور پھر انھیں نکات کو اٹھایا تو مرحوم مورخِ ملتؒ نے خاص اس فیصلے پر ایک یادگار تبصرہ کیا جو

کشف الغوایہ عن الملوقایہ

یعنی

کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ

پر تبصرہ

کے عنوان سے شایع ہوا۔ یہ رسالہ اس فیصلے میں ''قولِ فیصل'' کا حکم رکھتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی مہذب زبان اور شریفانہ اسلوب میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ ''مقالاتِ سیاسیہ'' کے پانچویں مجموعے کا تیسرا رسالہ یہی تبصرہ ہے۔

اس مجموعے کا چوتھا اور آخری رسالہ سہارن پور کے ایک صاحب شیخ منت اللہ شاد کے ایک دو ورقے کا جواب ہے، شیخ منت اللہ وہی صاحب ہیں جو دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے ممبر بھی تھے۔ ۱۹۴۴ء میں حضرت مدنیؒ کو دار العلوم سے نکلوانے کی تحریک کے گرم عنصر یہی تھے۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا طاہر قاسمیؒ، شبیر علی تھانوی کی پارٹی کے ممبر تھے اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے خاص متقدین میں تھے۔

شیخ صاحب نے اپنے دو ورقے میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی" کو مخاطب کیا تھا۔ دونوں حضرات نے اس کا معتدل و مدلل جواب بھی دیا۔ اس کا ایک جواب مولانا سید محمد میاں نے بھی دیا تھا جو سہ روزہ زمزم۔ لاہور میں شائع ہوا تھا۔ راقم نے مولانا محمد میاں کا یہ مضمون زمزم سے اخذ کیا ہے مولانا محمد میاں" نے یہ مضمون کتابی شکل میں بھی چھپایا تھا۔ مولانا نے مذکورہ دو ورقے کی دو خوبیوں کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے۔

۱۔ اس کی غیر مہذب زبان اور غیر شریفانہ طرز بیان

۲۔ قرآنِ کریم کی آیات کو کسی ایک رخ سے پیش کرنا، دوسرے رخ پر پردہ ڈالنا اور قرآن حکیم کے سچے متبعین کو برا کہنا!

چوں کہ حضرت مورخِ ملت کا یہ رسالہ پیش کیا جا رہا ہے اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں اس کی علمی افادیت اور تاریخی اہمیت کا قارئین کرام خود اندازہ کر لیں گے۔

جمعیت علماے ہند کے مخالف علماے کرام کے خیالات اور رویوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض حضرات گرد و پیش کی ہاو ہو سے کس درجے متاثر ہو کر اور جذبات کی رو میں بہہ کر احتیاط و دیانت کے مقام سے کتنی دور نکل گئے تھے۔ اس میں کسی ایک جماعت کے اہلِ قلم اور کسی خاص مکتبِ فکر کے علما کی تخصیص نہیں، سب کا ایک ہی حال تھا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائے۔ اگرچہ زمانہ بدل گیا اور ان واقعات پر نصف صدی سے زیادہ مدت گزر گئی ہے۔ لیکن زندگی اور اس کے ہنگامے اسی طرح ہیں حالات کی پے چیدگی اور اس میں صحیح فیصلے تک پہنچنے میں اُس وقت سے کم دشواریاں آج بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح فیصلوں پر پہنچائے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ابوسلمان شاہ جہان پوری

مولانا ظفر احمد صاحب کے فتوے پر تبصرہ

از

مؤرخ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیو بندیؒ

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان
کراچی

مولانا ظفر احمد صاحب کے فتوے پر تبصرہ

شرکت کانگریس جائز ہے۔ کانگریسی جھنڈا نشان آزادی ہے

پاکستان کو دار الہجرت نہیں قرار دیا جا سکتا

مسلم لیگ میں شرکت بے دینی کی تقویت ہے۔

سنبھل کے رکھنا قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

بعض احباب نے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کے تازہ بیان کی طرف توجہ دلائی جو کہ اخبار خلافت مورخہ ۶/اکتوبر ۱۹۴۵ء میں بہ عنوان:

"کفار و مشرکین کے جھنڈے کے نیچے کسی تحریک میں شریک ہونا حرام ہے"۔
"مسلم لیگ کے مقابلہ میں کانگریس کو تقویت دینا اور لیگ کو کمزور کرنا جائز نہیں"۔

مولانا حافظ قاری ظفر احمد تھانوی خلیفہ حکیم الامۃ تھانوی کا مدلل بیان شائع ہوا ہے۔

مولانا موصوف اس بیان میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اس بات میں کچھ مضائقہ نہیں کہ مسلمان کچھ مشرکین کے خلاف دوسرے مشرکین سے مدد لیں مگر بلکہ حکم الاسلام ان مددگار مشرکین پر غالب ہو"۔

پھر فرماتے ہیں:

"سہارن پور کے خطبۂ صدارت حضرت مولانا حسین احمد صاحب صدر جمعیت علماء ہند میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہمارا کانگریس کے تعلق استعانت بامداد نہیں بلکہ محض اشتراک عمل ہے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ مسلمانوں کا مشرکین کے ساتھ جہاد آزادی میں اشتراک عمل بھی اس شرط سے جائز ہے کہ حکم اہل شرک غالب نہ ہو۔ مسلمان مشرکین کے جھنڈے تلے نہ ہوں بلکہ مشرکین اسلامی جھنڈے کے نیچے ہوں۔ چناں چہ صفحہ ۲۴۱، جلد ۳ شرح السیر میں یہ مسئلہ بھی مذکور ہے۔"

اس کے بعد مولانا نے عبارت سیر کبیر کا ترجمہ ذکر فرمایا ہے۔ اصل عبارت عربی اخبار خلافت نے نقل نہیں کی بلکہ ترجمہ پر اکتفا کیا۔ "عصر جدید" میں عربی عبارت بھی لکھ دی گئی ہے۔ مولانا کے دعوے اور دلیل کو دیکھ کر میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مولانا جیسا متبحر اور منصف مزاج عالم ایسی فاش غلطی کرے، تعجب خیز نہیں تو کیا ہے! میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولانا لوگوں کو قصداً دھوکا دے رہے ہیں، مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مولانا خود غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اگر مولانا اسی کتاب اور اسی باب کی اگلی عبارتوں پر نظر ڈالتے اور ان سے چشم پوشی نہ فرماتے تو اس عظیم الشان غلطی میں نہ پڑتے۔ شرح سیر کبیر للامام السرخسی رحمہ اللہ باب قتال اہل الاسلام اہل الشرک مع اہل الشرک ص ۲۴۱، ج ۳ میں ہے:

"ولو قال اهل الحرب لاسراء فيهم قاتلوا معنا عدونا من المشركين وهم المشركون وهم لايخافون على انفسهم ان لم يفعلوا فليس ينبغي ان يقاتلوهم معهم لان في هذا القتال اظهار الشرك والقاتل يخاطر بنفسه فلا رخصة في ذلك الا على قصد اعزاز الدين او الدفع عن نفسه"۔

ترجمہ: "اگر حربیوں (کافروں) نے (مسلمانوں) اسیروں سے جو کہ ان کے یہاں موجود ہیں یہ کہا کہ ہمارے ساتھ ہو کر ہمارے دشمن مشرکوں سے لڑو اور قتال کرو اور یہ حربی مشرک ہوں اور وہ (مسلمان اسراء) اگر ایسا نہ کریں تو اپنے اوپر کچھ خوف نہ کھاتے ہوں تو ان کو نہ چاہیے کہ ان مشرکین کے ساتھ ہو کر جنگ کریں کیوں کہ اس قتال میں شرک کا

ظاہر اور غالب کرتا ہے اور جنگ و قتال کرنے والا اپنے آپ کو خطروں میں ڈالتا ہے۔ اس لیے اس کو اس کی رخصت اور اجازت نہ ہو گی۔ گویا تو دین کو غالب کرنے کے لیے یا اپنے سے مدافعت کرنے کے لیے۔

یہ عبارت واضح طور پر بتلا رہی ہے کہ مشرکین سے قتال کا جواز دوسرے مشرکوں کے ساتھ ہو کر صرف اعزاز دین ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ مدافعت عن النفس کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ غلبہ مشرکین کا ہی کیوں نہ ہو۔ اسیر کی اسارت تو غلبہ ہی کی وجہ سے ہو گی۔ آگے چل کر فرماتے ہیں:

"فاذا كانوا يخافون اولئك المشركين الآخرين على انفسهم فلا باس بان يقاتلوهم لانهم يدفعون الان شرالقتل عن انفسهم فانهم يامنون الذين فى ايديهم على انفسهم ولايومنون الاخرين ان وقعو فى ايديهم فحل لهم ان يقاتلو دفعاً عن انفسهم"۔

ترجمہ: "یعنی اگر (مسلمان اسراء) ان دوسرے مشرکوں سے اپنے اوپر خائف ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان دوسرے مشرکین سے (اسیر کرنے والے مشرکین کے ساتھ ہو کر) جنگ کریں کیوں کہ ایسی صورت میں یہ مسلمان اسراء اپنے سے قتل کے شر کو دفع کریں گے۔ اس لیے کہ ان مسلمانوں کو ان کفار سے جن کے قبضہ میں ہیں امن ہے اور ان دوسرے مشرکین سے (جن سے قتال ہو گا) امن اس صورت میں نہیں ہے جب کہ وہ ان کے ہاتھوں میں پڑ جائیں گے تو ان کو حلال ہے کہ ان کے ساتھ جنگ کریں اپنی جانوں کی مدافعت کے لیے"۔

اس مسئلہ میں بھی باوجود غلبہ مشرکین متوقع ضرر سے بچنے کے لیے اجازت دی گئی کہ اسیر کرنے والے مشرکین کے ساتھ ہو کر دوسرے مشرکین سے قتال کیا جائے اس کے بعد فرماتے ہیں۔ وان قالوالهم قاتلو معنا عدونا من المشركين والاقتلنا كم فلاباس بان يقاتلوادفعالهم لانهم يدفعون الان شر القتل عن انفسهم وقتل اولئك المشركين لهم

حلالاً لا بأس بالاقدام علی ماھو حلال عند تحقق الضرورة بسبب الاکراہ وربما یجب ذالک فی تناول المیتہ وشرب الخمر“۔

ترجمہ : ”اور اگر یہ مشرکین (جن کے قبضہ میں یہ مسلمان اسیر ہیں) کہیں کہ تم ہمارے دشمن مشرکوں سے قتال کرو ورنہ ہم تم کو قتال کر دیں گے تو حرج نہیں کہ یہ مسلمان ان دوسرے مشرکوں سے قتال کریں کیوں کہ ایسی صورت میں وہ اپنی جانوں سے قتل کے شر کو دفع کریں گے اور ان دوسرے مشرکین کا قتل کرنا ان کے لیے حلال ہے اور اکراہ پائے جانے کے وقت میں ایسی چیز پر پیش قدمی کرنے میں کوئی نہیں ہے جو کہ ضرورت کے وقت حلال ہو جاتی ہو بلکہ بسااوقات ایسی چیزوں کو کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ جیسے مردار کو کھانا اور شراب کو پینا“۔

اس مسئلہ میں بھی متوقع ضرر سے بچنے کے لیے باوجود غلبہ مشرکین قتال مع المشرکین کی دوسرے مشرکوں کے ساتھ ہو کر اجازت دی گئی۔ پھر فرماتے ہیں :

”وان کانوا فی ضروبلاء یخافون علی انفسہم الہلاک فلابأس بان یقاتلوا معہم المشرکین اذا قالو نخرجکم من ذالک لان لہم فی ھذا القتال غرضاً صحیحا وھو دفع البلاء والضر الذی نزل بہم“

ترجمہ : اور اگر مسلمان اسیر ایسی تنگی اور بلاء میں مبتلا ہوں کہ اس کی وجہ سے ہلاکت کا خوف ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہ مشرکین کے ساتھ ہو کر دوسرے مشرکین سے قتال کریں جبکہ وہ ساتھ ہونے والے مشرکین وعدہ کرتے ہوں کہ ہم تم کو اس بلا سے نکال دیں گے۔ کیوں کہ اس قتال میں ان مسلمانوں کی صحیح غرض ہے اور وہ اس بلا اور تنگی کا اپنے اوپر سے دفع کرنا ہے جو کہ ان کے اوپر نازل ہوئی ہے“۔

اس میں بھی باوجود غلبہ کفار متوقع نفع کے لیے مشرکین سے قتال کرنا دوسرے مشرکوں کے ساتھ ہو کر حلال قرار دیا گیا۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ان تمام نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکوں کے ساتھ ہو کر

دوسرے مشرکوں اور کفار سے قتال کرنا فقط اسی صورت میں حلال نہیں ہے جب کہ غلبہ اسلام ہو بلکہ اس صورت میں بھی حلال ہے جب کہ کسی ضرر کے دفع کرنے کے لیے قتال کیا جائے۔ اگرچہ وہ ضرر بالفعل موجود نہ ہو بلکہ متوقع ہو اور اگرچہ غلبہ کفر و شرک بالفعل موجود ہو اور آئندہ بھی رہتا ہو۔ کیا تعجب کی بات نہیں ہے کہ مولانا نے موصوف نے ان تمام نصوص کو پس پشت ڈال دیا۔ کیا مولانا کو یہ معلوم نہیں ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی وجہ سے تمام ہندوستان بالخصوص مسلمان دو سو برس سے طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں؟ اور صرف ہندوستانی مسلمان ہی نہیں بلکہ بیرون ہند کے مسلمان بھی، افغانستان، ایران، عراق، شام، عرب، فلسطین، مصر، سوڈان وغیرہ کے بھی اس ہندوستان کی غلامی کی وجہ سے انتہائی مصائب وبلا میں مبتلا ہیں۔ یہ بلایا متوقعہ نہیں بلکہ متحققہ ہیں اور برابر جاری اور دائم ہیں۔ کانگریس کے ساتھ ہو کر انہیں کے زائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ مصیبتیں صرف دنیاوی ہی نہیں ہیں بلکہ دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی ہیں۔ شخصی ہی نہیں بلکہ اجتماعی بھی ہیں۔ لاکھوں مسلمان آج تک موت کے گھاٹ برطانیہ نے اتار دیے، پانی کی طرح ان کا خون بہایا، خزانے لوٹے گئے، خانماں برباد کیے گئے، دیار اسلامیہ دیار حرب بنائے گئے۔ شعائر اسلامیہ مٹائے گئے سابق میں کیا کیا نہیں ہوا، اور اب کیا کیا نہیں کیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کو ہی فوجوں میں بھرتی کیا گیا اور ان کو مسلمانان بیرون ہند اور مقامات مقدسہ اور ممالک عربیہ وغیرہ پر مسلمانوں کے قتل وغارت پر اور برباد کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ جدہ، مکہ، طائف، مدینہ منورہ کے واقعات جنگ عظیم اول اور واقعات جنگ دوم سے دریافت کیجیے!!

کانگریس کی فتح یابی پر نہ صرف متوقعہ مضرات کے دفع ہونے کی صورتیں ہیں بلکہ موجودہ مصائب متنوعہ غیر متناہیہ کا دفع ہو جانا بھی یقینی ہے۔ برطانوی شہنشاہیت کی جہنم باوجود ہر طرح کی لوٹ کھسوٹ اور زیادہ طلبی کے ہر لحہ ھل من مزید کی ندا بلند کر رہی ہے اور دو سو برس سے کرتی رہی ہے۔ ہندوستان جنت نشان کو اس نے جہنم نشان بنا دیا ہے۔ کروڑوں آدمیوں کو اس نے اپنے استقرار کے وقت سے لگاتار بھوک اور قحط کے نذر کر دیا ہے جو کہ

قدرتی طور پر نہیں بلکہ اس کے ہاتھوں موت کے چنگل کے شکار ہو گئے خود انگریز اس کا اقرار کر رہے ہیں۔ سرکاری کاغذات اس کی گواہی دے رہے ہیں۔

کانگریس کے فتح یاب ہونے پر اگر کسی مصیبت کا مسلمانوں کے لیے سامنا ہو گا تو وہ مظنون ہے جس کا دفعہ کرنے کے لیے شرکائے کانگریس کربستہ ہیں اور کانگریس سے باہر بھی آزادی خواہ مسلمان اور جمعیت علمائے ہند ہر قسم کی جدوجہد کر رہے ہیں اور یہ مصائب زمانہ ماضی اور حال کے موجودہ ہیں اور برطانوی شہنشاہیت کے بقاء پر آئندہ کے لیے یقینی ہیں۔ کانگریس کی فتح یابی پر اگر مسلمانوں کے لیے مصائب کا سامنا بھی ہو گا تو برطانیہ کے ڈالے ہوئے متواتر مصائب اور عظیم الشان بلایا کے بالمقابل ان کی حیثیت اگر ایسی نہ ہو گی جو ذرہ کو پہاڑ سے ہوتی ہے تو کم از کم اہون البلیتین ضرور ہو گی (یعنی دو مصیبتوں میں سے کم درجہ کی مصیبت) غور کرنا اور انصاف کو کام میں لانا ضروری ہے۔ حالاں کہ مسلمانوں کی شرکت پر کانگریس وہ امور نہیں کر سکتی جن کا خطرہ ظاہر کیا جاتا ہے۔

شیعوں کو مثل خوارج قرار دیتے ہیں۔ مولانا اپنے اسلاف کے طریقہ سے بھی اور انصاف سے بھی دور جا پڑے ہیں۔ غور فرمائیں اور شیعہ عقائد و اصول کی تحقیق کریں اور تاریخ اسلامی کو دیکھیں۔

پاکستان کو اسلامی سلطنت قرار دینا مولانا کے بھولے پن کی صریح دلیل ہے۔

(الف) بھلا وہ جماعت جس کو صورۃً و سیرۃً اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ عمل اور قول اس کی تکذیب کریں وہ اسلامی حکومت قائم کرے گی۔

(ب) خود قائداعظم اپنے بیانات میں نواب زادہ لیاقت علی خاں اپنے لکچروں میں جو کچھ فرما چکے ہیں۔ شاید مولانا کو ان کی اطلاع نہیں ہے۔ ذرا تفتیش فرمائیے دھوکے میں نہ پڑیے۔ چناں چہ قائداعظم کا بیان احمد آباد جو انجام مورخہ ۲۷ر اگست ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل الفاظ سے:

"پاکستان کی حکومت جمہوری ہو گی اور سارا نظم و نسق عوام کے نمائندوں کے

ہاتھوں میں ہوگا"۔

اس پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ نوابزادہ لیاقت علی خان علی گڑھ میں تقریر فرماتے ہوئے کہتے ہیں :

"ہم سے سوال کیا جاتا ہے کہ پاکستان کا دستور اساسی کیا ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ ایک جمہوری اسٹیٹ ہوگا اور اس کے دستور اساسی کی تشکیل ان علاقوں کے باشندگان بہ توسط ایک منتخب کردہ مجلس دستور اساسی خود ہی مرتب کریں گے۔ یہ چیز اظہر من الشمس ہے"۔ (روزنامہ عصر جدید، کلکتہ ۲۶ر ستمبر ۱۹۴۵ء)

(ج) کیا وہ دستور و قانون جس کو زیادہ سے زیادہ ساٹھ یا باسٹھ فیصد مسلمان اور چالیس یا اڑتالیس فی صد غیر مسلم بنائیں گے۔ ان کو چلانا اور جاری کرنا اسلامی حکومت کہا جائے گا؟ کیا اسی کو اسلامی حکومت کہا جاتا ہے؟ کیا اسلامی اصول اور نظام یہی ہے؟

مولانا موصوف کا پاکستان کو مثل ہجرۃ الی المدینہ عجیب و غریب فلسفہ ہے۔ مدینہ منورہ میں خالص قرآنی اور محمدی حکومت تھی یا وہاں کے کفار و مسلمین نے مل کر کوئی دستور اور قانون بنایا تھا؟ وہاں انسان کے بنائے ہوئے قانون پر انتظام ہوتا تھا یا وحی خداوندی پر مدار تھا؟ وہاں لوگ مکہ کو، دار دیار کو، مقابر و مساجد وغیرہ کو چھوڑ چھوڑ کر جا بسے تھے۔ کیا آپ کا یہی فتویٰ اور حکم ہے کہ یو۔ پی، بہار، اڑیسہ، آسام، مدراس، بمبئی، مالوہ اور راجپوتانہ کے مسلمان مکانوں، زمینداریوں، مساجد و مقابر وغیرہ کو چھوڑ چھوڑ کر آپ کے پاکستان میں جا بسیں؟ آپ فرماتے ہیں جب کہ مکہ میں اسلامی حکومت اور نظام اسلامی قائم نہ ہو سکا تو مدینہ منورہ کو مرکز بنایا گیا پھر بھی اس مرکز سے جس قدر اسلام کو ترقی ہوئی دنیا پر ظاہر اور روشن ہے۔ اسی طرح کیا عجب ہے کہ پاکستان سے بھی اسلام کو ترقی حاصل ہو پاکستان غلبہ امت کا ذریعہ اور غلبہ اسلام کا زینہ ہے۔ مگر قائد اعظم فرماتے ہیں :

"اور جب تک دونوں ٹکڑے آپس میں امن سے نہ رہیں تب تک برطانوی حکومت کا فوجی اور خارجی کنٹرول ضروری ہے۔ اس صورت میں مصر کی طرح کم از کم ہم اندرونی طور پر تو آزاد ہوں گے"۔

(مدینہ، بجنور۔ ۵ مارچ ۱۹۴۴ء)

برطانیہ کے نزدیک ایسے اطمینان وامن کا ہونا اور قائم رہنا (جس کو وہ تسلیم کرتی ہو) کس طرح ہوگا؟ کب ہوگا؟ ہوگا یا نہ ہوگا؟ اہل تجربہ بخوبی جانتے ہیں، قدیمی تجربات بتلا رہے ہیں کہ ایسا امن وامان برطانیہ کے نزدیک قیامت تک نہ ہوگا۔ پھر کیا زیر سایۂ برطانیہ اسلام کی ترقی ممکن ہے؟ کیا مشاہدات اس پر دلالت کرتے ہیں؟ کیا متوقع نہیں ہے کہ اور زیادہ کفر، الحاد، بے دینی اور لامذہبیت اطراف واکناف میں پھیل جائے؟ اور اگر بالفرض یہ بھی ممکن ہو تو کیا قائدین لیگ " جن کے عقائد اخلاق اعمال ہیں اور جن کا پورا قبضہ لیگ پر ہے اور جو کہ دین اور حاملان دین کے برادران وطن سے بھی زیادہ دشمن ہیں۔ اسلام کو ترقی دینے دیں گے؟ اور ترقی تو در کنار موجودہ حالت کو بھی باقی رہنے دیں گے۔ یہ چیز تو ایسی ہے کہ بلی سے دودھ کی رکھوالی کرائیے۔ مولانا آنکھیں کھولیے چشم عبرت سے واقعات عالم پر نظر ڈالیے۔

آپ کانگریسی جھنڈے کو مشرکانہ فرمارہے ہیں مگر آپ نے اس پر غور نہیں کیا یہ جھنڈا ہندوؤں کا مذہبی یا سیاسی جھنڈا نہیں ہے۔ مذہبی جھنڈا ان کا اور ہے اور ہندو سبھا کا سیاسی جھنڈا اور ہے۔ اس کا رنگ اور اس کی قطع دونوں اور ہیں۔ یہ جھنڈا برطانیہ سے جنگ کرنے والے ہندوستانیوں نے اپنی ایک جماعت کے لیے اور آئندہ آزاد ہندوستان کے لیے بنایا ہے اور وہ بھی ابتداءً کانگریس سے نہیں بلکہ خلافت کی تحریک میں جب کہ مسلمانوں کا تحریک میں بہت بڑا رسوخ اور اقتدار تھا بنایا گیا اور سبز رنگ اس میں مسلمانوں ہی کی بنا پر رکھا گیا تھا۔ اس کو فقط ہندو اکثریت کی بنا پر مشرکانہ جھنڈا اگر قرار دیا جائے گا تو آج ہندوستان کی ہر چیز اس بناء پر مشرکانہ ہو جائے گی۔ بلکہ اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا وغیرہ سب ہی مشرکانہ ہوں گے۔

آپ فرماتے ہیں اسی طرح مسلم لیگ کے مقابلہ میں کانگریس کو قوت دینا اور مسلم لیگ کو کمزور کرنا بھی کسی طرح جائز نہیں۔ یہ بھی مولانا کی ناواقفیت یا بالقصد چشم پوشی ہے۔ مسلم لیگ کی موجودہ حالت سے جو بے دینی پھیل رہی ہے اور جو نقصان اسلام اور مسلمانوں کو حاصل ہو رہا ہے وہ کانگریس تو در کنار، ہندوستان کے تمام ہندوؤں سے نہیں پہنچ رہا ہے۔

لوگ ان ہندوؤں کو کھلے طور پر کافر سمجھتے ہیں اور غیر مسلم جانتے ہوئے ان کے دین واطوار اعمال وافعال کی مغائرت اور مخالفت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس نام نہاد مدعی اسلام جماعت سے (جس کے تمام شعبہ ہائے زندگی ہی بیگانہ نہیں ہیں بلکہ وہ مجامع خاصہ اور عامہ میں اسلام اور حاملین اسلام پر پھبتیاں اڑاتے اور تمسخر بھی کرتے رہے ہیں اور مسلمان ہونے کا دعوئی صرف قومیت کی بنا پر ہے۔) عام مسلمانوں اور بالخصوص نوجوانوں اور جاہلوں پر نہایت مہلک اور ضرر رساں اثر پڑتا ہے اور وہ ان کی حرکات وسکنات کو اسلامی ہی سمجھنے لگتے ہیں اور پھر تقلید کرنے لگتے ہیں۔ مولانا کو اپنے اسلاف کے وہ فتاوئی جو نیچریوں کے متعلق لکھے گئے ہیں دیکھنے چاہئیں خصوصاً "نصرۃ الابرار" کو دیکھئے۔

مولانا نے کانگریس کے اشتراک عمل اور نوٹی فائیڈ ایریا میونسپل بورڈوں، ڈسٹرک بورڈوں کونسلوں، اسمبلیوں کے اشتراک عمل کے تفرقہ بتلانے میں عجیب وغریب فلسفہ کا اظہار فرمایا ہے۔ میری سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا کہ مولانا دوسروں کی آنکھوں میں دھول ڈال رہے ہیں یا فی الواقع واقعیت اور اصلیت سے بالکل ناواقف ہیں۔ کیا مولانا کو یہ معلوم نہیں کہ یہ جملہ ادارے اپنے متعلقہ حلقوں کی اصلاح اور بہبودی کے لیے بنائے گئے ہیں تاکہ نمائندگان ساکنین حلقہ مجتمع ہو کر اپنے اپنے حلقوں کی ضروریات کو دیکھیں اور غور وخوض، بحث ومباحثہ کے بعد مفید اور مصلح امور کے حاصل کرنے اور مضرات کو دور کرنے کے وسائل وذرائع اختیار کریں اور قوۃ حاکمہ سے سپرد کردہ وحاصل شدہ اختیارات کے ماتحت عملی کارروائیاں عمل میں لائیں اور غیر سپرد شدہ امور میں حکومت سے درخواست کریں۔ ان میں داخل ہونا محض اختیاری ہے کسی پر کوئی جبر واکراہ نہیں ہے۔ جس کا جی چاہے اپنا الکشن کرا کر داخل ہو جائے۔ تحتانی اداروں میں کوئی تنخواہ بھی نہیں ہے۔ مگر ان سب اداروں میں داخل ہونا باوجود غیر مسلم عنصر کی اکثریت اور افسر کی غیر مسلمیت کے جائز بلکہ واجب شمار کیا جاتا ہے اور کانگریس کی شرکت پر حرام ہونے کا فتوئی ہے۔

مولانا موصوف کا سادہ پن تو ملاحظہ فرمایئے کہ غلامیت پر برطانیہ جیسی ملعون چیز

کے متعلق روٹیوں کے چند ٹکڑوں کو حاصل کرنے کے لیے بھوکے مرنے کی بنا پر جواز اور حلت کا فتویٰ دے رہے ہیں۔ حالاں کہ ان اداروں کی ممبریت نہ روٹیوں کے ٹکڑے دلواتی ہے اور نہ ان میں نہ جانے والا بھوکوں مرتا ہے بلکہ اس کے برعکس ہزاروں بلکہ لاکھوں خرچ کر کے اپنا نام و نمود اور خیالی عزت و اقتدار کے واسطے دوبڑوں کے سامنے ذلیل ہو کر جاتے ہیں اور غیر مسلم ممبروں کے ساتھ ان مجامع میں اشتراک عمل کرتے ہوئے برطانوی شہنشاہیت کی غلامی کی داد دیتے ہیں اور کانگریس اس آزادی طلب جماعت میں اشتراک عمل کر کے حکومت تسلطہ کے غیر منصفانہ احکام و اعمال پر تنقید کرتا ہوا آزادی وطن جیسی مبارک و مسعود چیز کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ (جس پر تمام یا اکثر مصائب دینیہ اور دنیاویہ کے زوال کا توقف ہے اور جس سے انتقام مظالم سابقہ و لاحقہ وابستہ ہے اور جو کہ اعدائے وطن و مذہب اسلام کی نظروں میں ہر آن میں کانٹے سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے)، اس کو فرماتے ہیں کہ ناجائز ہے اور دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتی۔ مولانا کو غالباً قیاس کی ابحاث سے ذہول ہو گیا ہے۔ مولانا بحث اسی میں ہے کہ آیا غیر مسلموں سے مسلمانوں کو کسی مقصد صحیح اور مباح کی بناء پر اشتراک عمل جائز ہے یا بہر حال ممنوع ہے۔ جب کہ آپ اس کو باوجود غلبہ کفر و شرک روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے جائز بتا رہے ہیں۔ حالاں کہ یہ غیر واقعی ہے۔ کیوں کہ ان میں سے بہت سے اداروں میں تنخواہ نہیں ہے اور صرف اضطراب کو وجہ جواز قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بھی غیر واقعی ہے۔ جو لوگ اس میں نہیں جاتے اور عموماً باشندگان ہندو ہی لوگ اور دیگر غربا ہیں، بھوکے نہیں مر رہے ہیں تو آزادی وطن جس سے ٹکڑوں ہی کے حاصل ہو جانے کی توقع نہیں ہے بلکہ بے شمار مذہبی، ملکی، تجارتی، زراعتی، صنعتی مالی بھلائیوں وغیرہ کی بھی توقع دی ہے اور پھر غلامیت کی بنا پر موہوم یا مظنون اضطراب و اکراہ موجود نہیں بلکہ دونوں محقق ہیں۔ کیا گزشتہ سال کا قحط بنگال و دکن اور اس کے مصائب اسی کا ثمرہ نہیں تھا۔ کیا بات بات پر شہنشاہیت کے مصالح کے لیے جبر و اکراہ نہیں کیا جاتا، کیا ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ اور آرڈیننسوں وغیرہ کا اجراء اسی غلامی کی پیداوار نہیں ہیں؟ کیا دو سو سال کی مصیبتیں ہندوستان

کے لیے فراموش کر دینی جائز ہیں؟ کیا ایسے اعداء کے لیے اسلام یہی حکم کرتا ہے جو آپ فرمارہے ہیں؟ کیا الحب فی اللہ والبغض فی اللہ من الایمان کا یہی مطلب ہے جو آپ لکھ رہے ہیں؟ مولانا ایک دن آپ کو اور ہم کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ یوم یقوم الناس لرب العالمین کو یاد کیجیے اور اس طرح مسلمانوں کو گمراہی میں مبتلا نہ کیجیے۔ آج الیکشن کے لیے آپ کو استعمال کیا جارہا ہے۔ مگر اس سے پہلے آپ کی جماعت اہل علم و تدین کے لیے کیا کیا نہیں کہا گیا ہے؟ اور الیکشن کے بعد کیا کیا کہنے اور کرنے کے امکان موجود نہیں ہیں۔ دیدۂ عبرت کھولیے۔

آپ کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کے لیے پھر وہی شرح "سیر کبیر" کی عبارت دہراتے ہوئے فرق ثابت کرنے کے لیے کوشش فرماتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ :

"کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل جہاد آزادی میں اشتراک عمل ہے، جس پر مذہبی حیثیت سے ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ موت وحیات کا مدار ہے۔ اس کے ان شرائط کا لحاظ ضروری ہے جو شرح سیر کبیر کے حوالے سے اوپر نقل کیے گئے ہیں"

مولانا آپ نے نقل میں قصداً بلا قصد کوتاہی فرمائی ہے اور فقط غلبۂ اسلام کو معیار جواز اشتراک قرار دے رہے ہیں! حالاں کہ دفع ضرر خواہ متوقع ہو یا محقق، یہ بھی اس کے لیے معیار ہے جو کہ کانگریس کے اشتراک عمل میں بداہتہً موجود ہے اور حالاں کہ آپ خود لیجسلیچر اور ملکی اداروں میں موہوم یا متوقع منافع کے لیے اور اضطرار کی بناء پر اشتراک عمل کی اجازت دیتے ہیں۔ قتال کی خصوصیت کو اس میں دخل نہیں ہے اور اگر بالفرض قتال ہی کی خصوصیت آپ اس امر میں معتبر فرمائیں تو بھی سیر کبیر میں اعزاز دین اور دفع ضرر عن النفس کے لیے قتال کو مباح قرار دیا گیا ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو واجب بھی کہا گیا ہے۔ مولانا غالباً آپ نے اس پر بھی غور نہیں فرمایا کہ کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل میں قتال بالسیف والاسلحہ (جو کہ بہت زیادہ خطرات کا موجب ہے، اور جن کی بناء مسلم نفس کی حفاظت پر قوی اثر پڑتا ہے) نہیں ہے۔ عدم تشدد کانگریس کی پالیسی ہے۔ سیر کبیر تو قتال بالسیف میں

بھی دفع ضرر کے لیے اجازت دیتی ہے۔ آپ کیوں نہیں ان نصوص کو ملاحظہ فرماتے۔

آپ کا یہ ارشاد کہ

"اس کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوگا جو کانگریس کی ڈھائی سالہ وزارت میں دنیا دیکھ چکی ہے کہ ودیا مندر اسکیم اور دیہات جیسی اسکیمیں رائج کر دی جائیں گی اور جن دیہات میں دو چار گھر مسلمانوں کے ہوں گے ان کو ہندو بننے پر مجبور کیا جائے گا۔ گاؤں سے نکل جانے کا الٹی میٹم دے دیا جائے گا۔ یہ واقعات ہیں جو کانگریس کی ڈھائی سالہ حکومت میں ہو چکے ہیں اور جب کبھی کفر وشرک کو قوت دی جائے گی، ایسے ہی مناظر سامنے آئیں گے"۔

افسوس ہے کہ مولانا لیگی پروپیگنڈے اور فرضی یا غلط بیانات کا شکار ہو رہے ہیں۔ مولانا نے خود واقعات کی تحقیق کی ہوتی تو بات بھی تھی۔ لیگ کو اپنے مقاصد مشومہ کے لیے اسی طرز عمل کی پسندیدگی ہے، جو کہ اس کے اساتذہ اقوام مغربیہ کا جاری ہے۔ ان کو بدنام کرنے کے لیے اپنے مخالف کے متعلق، پر کو کبوتر بنانا اور ذرہ کو پہاڑ بنا دینا تو درکنار صریح جھوٹ اور بہتان سے بھی جھجک نہیں آتی۔ مندرجہ ذیل عبارت اینویل رجسٹر ۱۹۳۹ء صفحات ۴۴ تا ۵۰ اور امرت بازار پتریکا الہ آباد کے بیان ماخوذ از اینویل رجسٹر ۱۹۴۵ء صفحہ ۴۳ کے اقتباساتِ ذیل کو ملاحظہ فرمائیں۔

"پیرپور کمیٹی نے رپورٹ شائع کر کے یو۔ پی، بہار اور سی پی کے واقعات کو جو کانگریس کی داستانہائے مظالم بنا کر اس کی اسلام دشمنی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے مسٹر جینا اور لیگ کو بالفاظ ذیل چیلنج کیا تھا:

"میں متعدد بار اعلان کر چکا ہوں اور پھر اپنی پوری ذمہ داریوں کے پورے احساس کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ کانگریس وزارتوں کے خلاف متذکرہ تمام الزامات قطعی بے جا اور جھوٹ کے پہاڑ ہیں مسٹر جینا یا اور کوئی شخص جو ایسے الزامات عائد کرتا ہے، اس کا فرض ہے کہ دنیا میں جو طریقے رائج ہیں ان میں سے کسی ایک طریقہ سے کام لے کر ان الزامات کو صحیح ثابت کرے اور اگر ایسا کوئی نہیں کر سکتا تو پھر دنیا میں ہر سمجھ دار شخص ان

سے یہی توقع کرے گا کہ وہ اپنی زبان اور قلم کو قابو میں رکھے اس سلسلے میں میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ مسٹر جینا نے جو الزامات عائد کیے ہیں۔ اگر ان کا کوئی ادنی جزء بھی صحیح ثابت کر دے تو اس کے بعد کانگریس وزارتوں کو چوبیس گھنٹے بھی قائم رکھنے کی مہلت نہ دوں گا"۔

(امرت بازار پتریکا الہ آباد انڈین رجسٹر ۱۹۳۹ء، ص ۳۴)

ایک عرصے کے بعد مسٹر جینا نے تحریک کی کہ ان کی تحقیقات کی واسطے رائل کمیشن طلب کیا جائے اس پر کانگریس ہائی کمانڈ نے خودداری، وطن دوستی اور غیرت سے کام لے کر تجویز کیا کہ فیڈرل کورٹ کے ججوں پر مشتمل کمیشن تحقیقات کرے مگر مسٹر جینا نے اس تجویز کو نہ مانا اور وائسرائے سے خواہش کی کہ ایسا رائل کمیشن مقرر کرائے لیکن وائسرائے لنلتھگو نے اس مطالبے کو در خور اعتناء نہ سمجھ کر مسٹر جینا کو تنبیہ کر دی جس کے بعد مسٹر جینا نے سکونت اختیار کیا۔

(انڈین رجسٹر ۱۹۳۹ء صفحہ ۴۴-۵۰)

پروفیسر کیلپنید نے جن کو آکسفورڈ یونیورسٹی نے ۱۹۴۱ء میں ہندوستانی مسائل کی تحقیقات کے لیے بھیجا تھا اور جو تحقیقات ختم کر کے سر اسٹیفورڈ کرپس کے عملہ مشیران کے رکن ہو گئے تھے۔

اپنی یادداشت کے ساتویں باب ڈسٹرٹ اور ڈسینژنین میں لکھتے ہیں کہ

"پیرپور رپورٹ میں مندرجہ اور دیگر داستانہائے مظالم جو کانگریس وزارتوں کی طرف منسوب کیے گئے ہیں کوئی وزن نہیں رکھتے میں نہ مسٹر جینا سے ان کے سلسلے میں جس قدر گفتگو کی، میں سمجھتا ہوں کہ وہ ان کو یا کانگریس کی اسلام دشمنی کو ثابت نہیں کر سکے"۔

(انڈین رجسٹر ۱۹۴۲)

اس اجلاس کے بعد (اجلاس پٹنہ ۱۹۳۸ء) مسلم لیگ نے حکومت سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے جو مسلمانوں پر کانگریس کے مظالم کی تحقیقات کرے۔ مگر اس پر کوئی توجہ نہ کی گئی۔ بلکہ بعض گورنروں نے کہہ دیا کہ ان کے صوبے میں

کوئی مظالم نہیں ہوئے۔ تاہم کانگریس کے خلاف مسلم لیگ کا پروپیگنڈہ جاری رہا۔

(روشن مستقبل ص ۴۳۳، ایڈیشن نمبر ۴)

مندرجہ بالا عبارتوں سے ان مظالم کی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ وہ بالکل فرضی ہیں اور اگر واقعی تھے تو جب کہ گورنمنٹ نے رائل کمیشن کے مطالبہ تحقیقات کو نہ مانا تو حسب قرارداد کانگریس فیڈرل کورٹ کے ججوں کی، جن میں مسلم لیگ کے معتمد علیہ مسلمان جج بھی موجود تھے اور جو کہ بالکل غیر طرف دار تھے تحقیقات کو کیوں ٹھکرایا گیا اور کیوں نہ کوئی کارروائی گورنمنٹ کے خلاف اس کے نہ ماننے پر کی گئی؟ اس پر سکوت کرنا یا تو اپنی دروغ گوئی کا اقرار ہے یا اپنی نامردی کا اعلان ہے۔ حالاں کہ ایکٹ ۱۹۳۵ء میں گورنروں کی اقلیتوں کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ پھر لیگ اور مسٹر جینا کا سکوت کیا معنی رکھتا ہے۔

ودیامندر اسکیم اور واردھا اسکیم کے متعلق جمعیۃ العلماء اور شرکائے کانگریس اور دیگر مسلمانوں نے اپنی جدوجہد برابر جاری رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوّل الذکر میں مسلم مدارس کا نام "بیت العلم" رکھا گیا اور ثانی الذکر کو یو، پی اور بعض دیگر صوبہ جات میں رائج نہیں کیا گیا۔ (دیکھیے اخبار اسٹیٹس مین، ۱۱ر فروری ۱۹۳۹ء سی، پی حکومت کا اعلان) اور اس سے زائد بھی کوششیں جاری تھیں۔ مگر کانگریسی حکومتوں کے استعفیٰ اور واقعات ۱۹۴۲ء اور جنگی احوال واحکام کی وجہ سے یہ سب چیزیں پیچھے ڈال دی گئیں۔

کیا مولانا کو معلوم نہیں کہ انگریزی حکومت کے شرمناک کارناموں کی بناء پر عیسائیت کا فتنہ کس قدر بڑھتا رہا ہے اور اب بھی بڑھ رہا ہے۔ عیسائی مشزیوں کے اعداد وشمار کی بناء پر سالانہ ایک لاکھ سے زیادہ آدمی ہندوستان میں عیسائی ہو جاتے ہیں۔ ماہوار آٹھ ہزار سے زیادہ لوگوں کے عیسائی ہو جانے کا اوسط ہے۔ ہر جگہ مشن اسکول کالج، تبلیغی ادارے، گرجے، مشن ہسپتال وغیرہ کا جال پھیلا ہوا ہے۔ تقریباً ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ صرف کیا جاتا ہے۔ مرکزی اسمبلی میں سب سے پہلی دفعہ عیسائی بنانے اور مشن پر صرف کرنے کا بجٹ میں صرفہ پاس ہوتا ہے۔ کیا اس کے مقابلے میں اگر کانگریس کے فتح یاب ہونے پر کچھ لوگوں

کے ارتداد کا خطرہ ہے یا واقعہ پیش آیا تو کون سا اھون البلیتین (دو مصیبتوں میں سے خفیف) ہے۔ نیز یہ بھی قابل واگذاشت مسئلہ نہیں ہے کہ مسلمان ہونے والوں کی تعداد کانگریسی حکومت کے علاقوں میں کچھ رہی ہے یا نہیں؟ اور کیا ان واقعات میں کانگریس نے کوئی رکاوٹ کی تھی؟ مظنونات کو مولانا اہمیت دیتے ہیں اور واقعات سے چشم پوشی فرماتے ہیں۔

مسلمان کانگریس میں شرکت اور جدوجہد آزادی اسلام کی تقویت اور بلندی اور ترقی کے لیے کر رہے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کو نازل ہونے والے مصائب سے بچانا چاہتے ہیں۔ کوئی ادنیٰ درجے کا مسلمان بھی کفر کو بلند کرنا نہ چاہتا ہے نہ جائز سمجھتا ہے۔

ان معروضات کو پیش کرتا ہوا امیدوار ہوں کہ مولانا تحریر و تقریر میں غور و انصاف سے کام لیں۔ واللہ الموفق

محمد میاں عفی عنہ

ناظم جمعیت علمائے ہند

۱۱/ ذی قعدہ ۱۳۶۴ء

(= ۱۷/ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

شرکتِ کانگریس اور شریعتِ غرّا

اہم سوالات اور بصیرت افروز فتاویٰ

از

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ ۔ پاکستان

کراچی

شرکت کانگریس اور شریعت غرا

اہم سوالات اور بصیرت افروز فتاویٰ (۱)

(از دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد)

سوال نمبر ۱:

ایک ایسا ملک جس کے باشندگان میں ایک چوتھائی سے کچھ زیادہ مسلمان ہوں اور اکثریت کفار کی ہو، ایسی حالت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ وہ اپنے دینی امور کیسے انجام دیں۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ وہاں کی اکثریت ذالی قوم مسلمانوں کے مذہبی فرائض مثلاً قربانی گاؤ و اذان وغیرہ میں مخل ہو اور آزادی کے ساتھ ان فرائض کو ادا کرنے نہیں دیتی ہو اور حکومتِ مسلطہ کا قانون بھی مسلمانوں کی پشت پناہ نہ ہو۔

الجواب:

رسول اللہ ﷺ کی مقدس زندگی، آپ کا طریقِ عمل ہر زمانے میں ملتِ اسلامیہ کے لیے بہترین لائحہ عمل ہے، ہر ایک مؤمن کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اسی کی طرف دوڑتا ہے اور اسی کی اتباع کر کے دارین کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مقدسہ کے دو حصے ہمارے سامنے ہیں، ان کے یہ دو نام ہیں: مکی زندگی، مدنی زندگی۔ ان دونوں

زندگیوں میں نمایاں تفاوت ہے اور اسی کے بموجب قرآن پاک میں خداوندی احکام موجود ہیں۔

مکی زندگی کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

اِتَّبِعْ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ لاَ اِلٰہَ اِلاَّ ھُوَ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَO (سورۂ انعام، پارہ ۷، آیت ۱۹/۱۳) "تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے جو وحی نازل کی جارہی ہے اس کی اتباع کرو اور مشرکین سے اعراض کرتے رہو"۔

فَاصْدَعْ بما تومروا عرص عن المشرکین (سورۂ حجر، آیت ۹۴) "جس کا تمھیں حکم کیا جارہا ہے صاف صاف بیان کرتے رہو اور مشرکین سے اعراض کرتے رہو"۔

اعراض کرنے کے معنی یا تفسیر دوسری آیات میں کردی گئی:

دع اذاھم وتوکل علی اللہ (سورۂ احزاب، آیت ۴۸) "ان کی ایذا رسانی سے قطع نظر کرو اور اللہ پر بھروسا رکھو"۔

جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْم۔
(سورۂ نحل، آیت ۱۲۵)

"سب سے بہتر صورت سے مقابلہ کرو، تو دیکھو گے جن سے عداوت تھی وہ خالص دوست ہوگئے"۔

واللہ اعلم بالصواب۔ حاصل یہ رہا کہ اپنے مسلک پر پوری قوت سے قائم رہ کر اپنے فرائض کو انجام دیتے رہو۔ ان کی ایذا اور سختی کا جواب نرمی، بلند اخلاق اور کریمانہ صفات صداقت اور مظلومانہ حقانیت سے دو۔ اسی مقدس زندگی کا اصول یہ تھا۔

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (سورۂ کافرون، آیت ۶) "تمھارے لیے تمھارا دین۔ میرے لیے میرا دین"۔

اسی زمانے کا یہ پروگرام ہے۔

کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃ (سورۂ نساء، آیت ۷۷) "اپنے ہاتھوں کو روکو اور

نماز قائم کرو"۔

اس مقدس حیات میں چند دور گزرے (الف) سری۔ پوشیدہ تبلیغ (ب) تبلیغ جہرا (ج) تبلیغ جہری کے ساتھ دشمنوں کے تمام حملوں کا صبر و استقامت، بالفاظ دیگر عدم تشدد سے مقابلہ۔

سیدنا بلالؓ، ابو فکیہہؓ، مصعب بن عمیرؓ، عمار بن یاسرؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت صدیق اکبرؓ وغیرہ وغیرہ صحابہ کرام اور خود حضرت سرور کائنات فخر موجودات ﷺ کے سیکڑوں واقعات اس حقیقت کے لیے شاہد ہیں۔ علامہ ابن قیم زاد المعاد میں تحریر فرماتے ہیں:

اقام صلی اللہ علیہ وسلم بعد ذالک (النبوۃ) ثلث سنین۔ یدعو الی اللہ سبحانہ تعالیٰ مستخفیاً۔ ثم نزل علیہ "فاصدع بما تؤ مروا عرض عن المشرکین"۔ فاعلم صلی اللہ علیہ وسلم بالدعوۃ وجاھد قومہ بالعداوۃ۔ واشتدالاذی علیہ وعلی المسلمین حتی اذن لھم بالھجرتین۔ (زاد المعاد کشوری ص ۲۰، ج ۱)

(ترجمہ) "رسول اللہ ﷺ نبوت کے بعد تین سال تک مکہ معظمہ میں خفیہ طور پر اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ پھر ارشادِ الٰہی نازل ہوا۔ فاصدع بما تو مر الآیۃ۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اعلانیہ تبلیغ اسلام شروع کر دی۔ اور کھلم کھلا اپنی قوم کا مقابلہ کرنے لگے۔ حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں پر کفار کی زیادتی روز افزوں ہوتی رہی حتی کہ دو مرتبہ ہجرت کا حکم ہوا"۔

(د) جو غیر مسلم آپ کے ساتھ موالات برتتے، اس کے ساتھ موالات۔ چناں چہ ابو طالب وغیرہ بنو ہاشم سے آپ ﷺ موالات کرتے رہے۔ مکہ معظمہ میں آپ اور مسلمان اور بنو ہاشم ان سب کی ایک جماعت مانی جاتی تھی۔ اس جماعت کی طرف سے گفتگو وغیرہ جب ہوتی تو اکثر ابو طالب پیش پیش رہتے۔ چناں چہ شعب ابی طالب کے حصار کے بعد اس سے رہائی اور اس جیسے متعدد واقعات ہیں ابو طالب نے پوری جماعت کی طرف سے گفتگو کی۔ اس زمانہ میں صدیق اکبرؓ نے ابن دغنہ کی پناہ حاصل کی۔ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت نے حبشہ

میں جا کر شاہ حبشہ کی پناہ حاصل کی جو اب تک مسلمان نہیں ہوا تھا۔ ابو طالب کی زندگی تک کفار مکہ رسول اللہ ﷺ کو ستانے میں اس قدر آزاد نہ تھے۔ کیوں کہ ابو طالب کافر تھے اور رسول اللہ ﷺ کو اپنی پناہ میں لیے ہوئے تھے۔ جب ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو اب کفار مکہ قطعاً آزاد تھے۔ اب دل کھول کر حضور کے ساتھ گستاخیاں شروع کیں۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ طائف تشریف لے گئے۔ اور جب وہاں کفار نے انسانیت سے گزر کر ظلم و تعدی کیا تو پھر آپ مکہ کی طرف واپس ہوئے۔ لیکن مکہ میں داخلہ کسی کی پناہ لیے بغیر خطرناک تھا۔ تو آپ نے مطعم بن عدی کافر سے امان اور پناہ حاصل کی۔ اس قسم کی تفصیلات سے احادیث مقدسہ اور کتب سیر و تواریخ کے اوراق پُر ہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانے میں پیش نظر یہ تھا کہ مسلمانوں میں قوت مقابلہ پیدا ہو جائے۔ مگر قوت مقابلہ کے وجود تک صبر و استقلال صادق مظلومیت پر ثبات اور استقامت کا حکم تھا۔ ظلم و تعدی سے درگزر کرنے کے لیے بار بار اعرض عن المشرکین کے احکام نازل ہو رہے تھے۔ جہاد سے ممانعت تھی اور جب یہ صورت مکہ معظمہ میں ممکن نہ ہو سکی تو آپ نے ہجرت فرمائی اور پھر ایک دراز عرصے تک ہجرت کا ہی حکم رہا۔ حتیٰ کہ خداوند عالم نے مکہ کو فتح کرایا اور مظلومیت کو غلبہ سے اور خطرات کو امن سے اور گزندوایذی کو راحت سے مبدل فرمایا۔ سیرت اور احادیث کے تمام واقعات درج کیے جائیں تو سیکڑوں صفحات بھی ناکافی ہوں۔ ہم سر دست حضرت سیدنا مولانا شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے مختصر کلمات درج کیے دیتے ہیں۔ جو مذکورہ بالا تمام بیان کے لیے شاہد بھی ہوں گے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ثم امر بالدعوة فاشتغل بها اخفاءً فامنت خديجة و ابوبكر الصديق و بلال وامثالهم رضى الله عنهم۔ ثم قيل له فاصدع بما تومر۔ وقيل وانذر عشيرتك الاقربين فجهر بالدعوة وابطال وجوه الشرك۔

فتعصب عليه الناس۔ وآذوه بالسنتهم وايديهم كقصه القاء سلى جزو

روالخنق وهو صابر فی کل ذلك یبشر المومنین بالنصر وینذر الکافرین بالانهرام کما قال الله تعالیٰ سیهزم الجمع ویولون الدبر۔

ثم ازدادوا فی التعصب فتقاسموا علی ایذاء المسلمین ومن ولیهم من بنی هاشم وبنی المطلب فهدوا الی الهجرة قبل الحبشة فوجدواسعة قبل السعة الکبریٰ۔ ولما فاتت خدیجة رضی الله عنها ومات ابوطالب عمه وتفرقت کلمة بنی هاشم فزع لذلك وکان قد نفث فی صدره ان علو کلمة فی الهجرة نفثا و اجمالیاً۔

فتلقاه برویة و فکر فذهب وهله الی الطائف ولقی عناءً شدیداً۔

ثم الی بنی کنانة۔ فلم یرمنهم مایسره فعاد الی مکة بعهد زمعة۔

ثم قال۔ ثم کان النبی صلی الله علیه وسلم یستنجد۔ من احیاء العرب۔

ثم قال۔ ثم عاهد النبی صلی الله علیه وسلم۔ الیهودو امن شرهم

ثم قال ورغبهم فی الهجرة من اوطانهم لانها یومئذٍ دار الکفر۔ ولایستطیعون اقامة الاسلام هناك وشدالمسلمین بعضهم ببعض بالمواخاة۔ وایجاب الصلة والانفاق والتوارث فتلك المواخاة لتتفق کلمتهم فیتاتی الجهاد ویمتعوا من اعدائهم وکان القوم الفوالتناصر بالقبائل ثم لما رای الله فیهم اجتماعا ونجدة اوحی الی نبیه ان یجاهدو یقعدلهم کل مرصد۔ حجة الله البالغه ص ۱۸۹ و ۱۹۱، ج ۲ وفی الطبقات الکبیرات لابن سعدواقام بنخلة (ای حین مراجعة من الطائف) ایاماً فقال له زید بن حارثه کیف تدخل علیهم یعنی قریشا وهم اخرجوك فقال یازید ان الله عاجل لما تری فرجاً ومخرجاً۔ وان الله ناصر دینه ومظهرنبیه ثم انتهی الی حراء فارسل رجلا من خزاعة الی مطعم بن عدی۔ ادخل فی جوارك قال نعم۔ ودعابنیه وقومه فقال تلبسوا السلاح وکونوا عند لرکان البیت فانی قد اجرت محمداً فدخل رسول الله صلی الله علیه وسلم و معه زید بن حارثه حتی انتهی الی المسجد الحرام فقال مطعم بن عدی علی راحلته فنادی یامعشر القریش انی قد

اجرت محمداً ولا یهجه احدمنکم فانتهی رسول الله صلی الله علیه وسلم الی الرکن فاسلمه وصلی رکعتین وانصرف الی بیته ومطعم بن عدی و ولده مطبقون به (الطبقات ابن سعد کاتب الواقدی، صفحه ۱۴۲، جلد ۱، وبمعناه فی سیرۃ النبی صلی الله علیه وسلم لابن هشام ص ۴۰۶، ج ۱)

پھر تبلیغ کا حکم کیا گیا۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ خفیہ طور پر تبلیغ میں مشغول ہو گئے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضرت صدیق ابو بکر، حضرت بلال رضی اللہ عنہما اور ان جیسے حضرات مشرف بایمان ہوئے۔ پھر حکم نازل ہوا فاصدع بما تومر۔ اور حکم نازل ہوا۔ انذر عشیرتک الاقربین چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ اور دلائل شرک کا ابطال اعلانیہ طور پر شروع کر دیا۔ لوگوں نے آپ کے مقابلے پر عصبیت کا اظہار شروع کیا اور آپ کو زبانوں اور ہاتھوں سے تکلیف دینی شروع کر دی جیسے اونٹ کی اوجھ ڈالنے یا گلا گھونٹنے کا قصہ۔ آپ ان تمام مصائب پر صبر کرتے رہے۔ مسلمانوں کو فتح و نصرت کی بشارت دیتے تھے اور کافروں کو ہزیمت اور شکست کی خبر دیتے تھے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔ سیھزم الجمع ویولون الدبر پھر کفار مکہ عصبیت کے اظہار میں اور بڑھ گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کی اور ان لوگوں کی ایذا رسانی کا معاہدہ کر لیا جو آل ہاشم اور آل مطلب میں سے مسلمانوں کے ساتھ تھے، اب مسلمانوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کی رہنمائی کی گئی۔ ان حضرات نے حبشہ پہنچ کر بڑی فراخی سے پیشتر (جو مدینہ طیبہ میں حاصل ہوئی) ایک فراخی حاصل کر لی۔ جب حضرت خدیجہؓ کی وفات ہو گئی اور حضور کے چچا ابو طالب بھی مر گئے اور آل ہاشم کا شیرازہ منتشر ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ اس صورت حال سے پریشان ہوئے۔ آپ کے ذہن مبارک میں یہ بات مجمل طور پر القا کر دی گئی کہ آپ کی تحریک کی بلندی ہجرت میں ہے۔ آپ نے اس اجمالی الہام پر غور و فکر شروع کر دیا۔ آپ کا خیال طائف کی طرف منتقل ہوا اور وہاں پہنچ کر آپ نے سخت تکلیف برداشت کی۔ پھر آپ کو بنی کنانہ کا خیال آیا۔ مگر ان سے کوئی خوشگوار بات نظر نہ آئی۔ اس کے بعد آپ زمعہ سے معاہدہ کر کے مکہ معظمہ میں واپس تشریف لے آئے۔

حضرت شاہ صاحب اس کے بعد فرماتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ قبائل عرب سے قوت حاصل کرتے رہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہود سے معاہدہ کیا اور ان کے شر سے مامون ہوئے۔

پھر شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو رغبت دی کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ طیبہ چلے آئیں۔ کیوں کہ ان کے وطن اس زمانے میں دارالکفر تھے اور وہ وہاں پر اسلامی قانون جاری نہیں کر سکتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اخوت کا رشتہ قائم کر کے نیز صلہ رحمی اور اتفاق و توارث کو واجب کر کے مسلمانوں میں قوت پیدا کی۔ یہ مواخاۃ اس لیے تھی کہ ان کا کلمہ متفق ہو تاکہ جہاد ممکن ہو سکے اور اپنے دشمنوں سے محفوظ ہو سکیں۔

وہ لوگ قبائل سے تعاون حاصل کرنے کے عادی تھے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کے اجتماع اور قوت کو دیکھ لیا تو اپنے نبی کے پاس وحی بھیجی کہ جہاد کریں اور کفار کے مقابلہ کے لیے ہر ایک مرصد میں بیٹھیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ، جلد ۲، صفحہ ۹۱۔۱۸۹)

ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے (طائف سے واپسی پر) رسول اللہ ﷺ نے چند روز نخلہ مقام میں قیام فرمایا۔ حضرت زید بن حارثہؓ نے عرض کیا کہ آپ قریش کے شہر میں (مکہ میں) کیسے تشریف لے جائیں گے۔ قریش نے تو آپ کو خارج کر رکھا ہے۔ حضور (ﷺ) نے فرمایا میاں زید! اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کے لیے جو تمھاری نظر کے سامنے ہیں کوئی سبیل پیدا کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد فرمائیں گے اور اپنے نبی کو غلبہ دیں گے۔ پھر رسول اللہ ﷺ حراء تک تشریف لائے۔ آپ نے بنی خزاعہ کے ایک شخص کو مطعم بن عدی کے پاس بھیجا کہ "کیا میں تمھاری پناہ میں داخل ہو سکتا ہوں؟" مطعم ابن عدی نے اقرار کر لیا۔ اور اپنے لڑکوں اور اپنی برادری کے آدمیوں کو بلا کر کہا ہتھیار لگا لو اور ارکان بیت اللہ کے پاس بیٹھ جاؤ کیوں کہ میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ مکہ میں تشریف لائے اور زید بن حارثہ آپ کے ساتھ تھے۔ آپ مسجد حرام میں پہنچے۔ پھر مطعم بن

عدی اپنی اونٹنی پر کھڑا ہوا اور آواز دی اے جماعت قریش میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دے دی۔ ان کو کوئی شخص پریشان نہ کرے پھر رسول اللہ ﷺ "رکن" کے پاس تشریف لے گئے اس کو بوسہ دیا۔ دو رکعت نماز ادا کی۔ اور دولت خانہ پر تشریف لے گئے۔ مطعم بن عدی اور اس کے لڑکے آپ کے گرداگرد گھوم رہے تھے۔ طبقات ابن سعد ص ۲۱۲، ج ۱۔ یہی مضمون سیرت ابن ہشام میں بھی ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ ص ۲۰۶، ج ۱)

یہ تمام واقعات اس قدر معروف و مشہور ہیں کہ ان کا انکار گویا آفتاب نیمروز کا انکار ہے۔

سوال یہ ہے کہ آیا اس قسم کے احکام آج بھی شریعت غرا میں موجود ہیں یا سب کے سب منسوخ ہو گئے۔ چوں کہ فتویٰ ہمیشہ حالات اور مقتضیات کے بموجب ہوتا ہے تو اگر کسی ملک یا شہر کے حالات مکہ جیسے ہوں تو کھلی ہوئی چیز ہے کہ جیسے احکام وہاں جاری ہوں گے یہ ایک واضح اور جلی قیاس ہے۔ جس کے لیے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ ظاہر ہے کہ سفر کے احکام اور ہوتے ہیں۔ حضر کے احکام اور پانی پر قدرت کی صورت میں اور احکام ہوتے ہیں اور قدرت نہ رہنے کی شکل میں دوسرے احکام ہوتے ہیں۔ یہ جملہ احکام قرآن، حدیث اور کتب فقہ میں موجود ہیں۔ اسی صورت سے دارالحرب کے احکام اور ہوں گے اور دارالاسلام کے احکام اور۔ چناں چہ جب سوال میں ہندو کے بجائے انگریز کو رکھ لیا جاتا ہے مثلاً اسی سوال میں جس کا یہ جواب لکھا جا رہا ہے۔ اکثریت کفار کے بجائے یہ کہیں کہ حکومت انگریز کی ہے اور یہی سوالات اسی نوعیت سے کیے جاتے ہیں تو جواب وہی دیا جاتا ہے، جو دوسرے شخص کا جواب ہندو کے مقابلے میں ہونا چاہیے۔ مگر بایں ہمہ ذیل کی عبارت اصول تفسیر کی مشہور اور مستند کتاب اتقان فی علوم القرآن سے نقل کر کے پیش کی جاتی ہے۔ جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ مدنی زندگی کے یہ تمام احکام جن کا تعلق دارالحرب سے ہے وہ منسوخ نہیں ہوئے۔

الثالث ما امر به بسبب ثم يزول السبب كالامر حين الضعف والقلة بالصبر

والصفح ثم نسخ بایجاب القتال وھذا فی الحقیقۃ لیس نسخابل من من قبیل النسأ۔ کمال قال اللہ تعالیٰ اوننسھا۔ فالنسا ھوالامر بالقتال الی ان یقوی المسلمون وفی حال الضعف یکون الحکم وجوب الصبر علی الاذی (اتقان فی علوم القرآن، ص ۳۱۱)

نسخ کی تیسری قسم وہ احکام ہیں جو خاص اسباب اور وجوہات کی بنا پر تھے پھر وہ زائل ہو گئے۔ جیسے کمزوری اور قلت کے وقت صبر اور درگزر کا حکم تھا۔ پھر قتال کے وجوب سے یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔ مگر در حقیقت نسخ نہیں ہے اس کو اصطلاحاً نسا کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ احکام جو موخر یا ملتوی کر دیے گئے ہوں۔ چناں چہ قرآن پاک میں اس قسم کے متعلق تذکرہ موجود ہے: "اوننسھا"۔ پس مسلمانوں میں قوت حاصل ہونے تک جدال وقتال کا حکم ملتوی مانا جائے گا اور کمزوری کی حالت میں تکلیف اور مخالفین کی اذیت پر صبر کرنا ہی واجب ہو گا۔

الحاصل: حالات مذکورہ سوال نمبر ۱ کے پیش آنے کے وقت مسلمانوں پر لازم ہو گا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی کے حالات اور واقعات سے سبق حاصل کریں اور ترقی مسلم کے اہم نظریہ کو سامنے رکھتے ہوئے ملکی اور ملی مصالح کے بموجب اشتراک عمل یا ترک موالات کے اصول پر کاربند ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب

محمد میاں غفی عنہ

سوال نمبر ۲:

مذکورہ بالا ملک میں کوئی ایسی جماعت ہو جو اپنا نصب العین اس ملک کو غلامی سے نجات دلانا بتلاتی ہو اور عمل کا یہ حال ہو کہ حکومت مسلطہ کے ساتھ قوانین کے وضع ونفاذ میں شریک ہو۔ بلکہ حکومت کے بڑے عہدوں پر مذکورہ جماعت کے ذمہ دار افراد جماعت کی اجازت سے فائز ہوں اور پھر یہ کہ ۹۹ فیصدی کفار اس کے ممبر ہوں اور کسی امر کے فیصلہ کے لیے رائے شماری کا اصول ہو تو کیا صرف اس بنا پر کہ یہ جماعت اپنا نصب العین تکمل

آزادی ظاہر کرتی ہے۔ مسلمان اس کے اندر شریک ہو جائیں اور اپنے مذہبی و ملکی مفاد اور حقوق کا نگہبان اس جماعت کو تسلیم کر لیں؟

الجواب:

سوال نمبر ۲ کے چند حصے ہیں:

پہلا حصہ: اس جماعت کی حقیقت اور حالت سائل کے خیال کے بموجب۔

دوسرا حصہ: کیا اس میں شرکت جائز ہے۔

تیسرا حصہ: کیا اس جماعت کو ملکی اور مذہبی مفاد اور حقوق کا نگہبان بنایا جا سکتا ہے۔

اس جماعت کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے سائل صاحب نے حکومت تسلط کے ساتھ تعاون کو آزادی کامل کے نصب العین کے منافی قرار دیا ہے۔ مگر منافات کی وجہ نہیں بیان فرمائی۔ نصب العین کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ فی الحال حاصل ہو۔ ہر ایک تاجر کا نصب العین نفع ہوتا ہے۔ مقدمہ باز کا نصب العین کامیابی ہوتا ہے۔ جنگجو کا نصب العین فتح اور نصرت ہوتا ہے۔ مگر نصب العین کے حصول سے پہلے بہت کچھ مرحلے طے کیے جاتے ہیں جن میں نفع کے بجائے نقصان نظر آتا ہے۔ سوداگر بسا اوقات مدتوں نفع کی امید پر ہزاروں روپیہ خرچ کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح مقدمہ باز اور یہی حال جنگجو اور مبارز کا ہے۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نصب العین کے حصول سے پہلے اپنی زندگی کو نصب العین پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ سیرت مقدسہ کا وہ واقعہ تو ہر مسلمان کو یاد ہونا چاہیے جو حدیبیہ کے موقع پر پیش آیا تھا۔ خدا کے مقدس اور برتر رسول ﷺ نے مکہ کے کفار کے ساتھ اتنی دب کر صلح کی کہ فاروق اعظم جیسا مدبر اور دور اندیش بھی جھنجلا اٹھا۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر کوئی مکہ کا باشندہ مسلمان ہو کر آئے گا تو اس کو واپس کرنا مسلمانوں پر لازم ہوگا اور کوئی مسلمان اگر معاذ اللہ مرتد ہو کر مکہ کے کافروں میں جائے تو اس کے متعلق مسلمان کوئی مطالبہ نہ کر سکیں گے۔ فاروق اعظم سے ضبط نہ ہو سکا۔ عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم حق پر نہیں؟ جواب ہوا،

مذہب کا سوال نہیں آتا بلکہ اس کا تعلق اس کاروبار سے ہوتا ہے۔

جو بھی اس کاروبار کو کرتا ہوگا۔ اس کو فائدہ ہوگا۔ خواہ مسلمان ہو یا ہندو مثلاً اگر غیر ملکی کپڑے کا بائیکاٹ کر کے ملکی کپڑے کا استعمال ہو تو ملک کے پارچہ بافوں کا فائدہ ہوگا جو خوش قسمتی سے زیادہ تر مسلمان ہیں۔ اگر غیر ملکی ظروف کا بائیکاٹ کر کے ملک کے بنے ہوئے ظروف کا استعمال کیا جائے تو ظاہر ہے کہ اہل ملک کا فائدہ ہوگا۔ جو مراد آباد میں اکثریت کے ساتھ بلکہ کلیتہً مسلمان ہی ہیں۔ یہاں مقابلہ مذہب کے لحاظ سے نہیں بلکہ طبقات اور اقتصادی جماعتوں کے لحاظ سے ہے۔ جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں۔
(مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کا رسالہ "آنے والے انقلاب کی تصویر")

اس صورت میں اشتراک عمل کے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں۔ خصوصاً جب کہ عام مسلمانانِ ہند۔ خواہ نیک ہوں یا بد، عالم ہوں یا غیر عالم، دیندار ہوں یا دنیادار ہوں۔ اس قسم کے معاملات میں ہندو مسلم اشتراک کو جائز بلکہ ضروری سمجھتے چلے آئے ہیں۔ بلکہ اشتراک ہی میں مفادِ ملت کا تحفظ یقین کرتے رہے ہیں۔ مثلاً سرکاری ملازمتوں، کونسلوں، اسمبلیوں، میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، ٹاؤن ایریا، ایجوکیشنل بورڈ، اسکول، تجارتی انجمن، مزدوروں کی یونین، وکلاء کے ایسوسی ایشن، صنعت و حرفت کی انجمنیں، زمینداروں کی انجمن وغیرہ وغیرہ۔ سیکڑوں چیزیں ہیں جن میں آئے دن مسلمان ہندوؤں کے ساتھ شریک رہتے ہیں۔ اس شرکت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ مذہب کا نام لے کر اس شرکت کے لیے اپیل کرتے ہیں۔ ہزاروں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ کیا آج تک کسی نے فتویٰ دیا کہ چوں کہ ان چیزوں میں ہندوؤں کے ساتھ اشتراک ہوتا ہے یا ہندو اکثریت کے ساتھ ہیں۔ لہٰذا اشتراکت حرام، باطل اور ناجائز ہے۔ پھر جب کہ وہ جماعت جس کے متعلق سوال کیا جارہا ہے۔ ان ہی چیزوں اور صرف ان ہی چیزوں کے متعلق ہے جن میں اشتراک رات دن روا رکھا جاتا ہے تو پھر اس جماعت میں اشتراک کو ناجائز کیوں کہا جائے گا۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ میونسپل بورڈ، کونسل وغیرہ میں (اگر مسلمان اقلیت میں ہیں) تو ان کی اکثریت یا مساوات ناممکن ہے۔ لیکن

ضرور حق پر ہیں! فاروق اعظمؓ نے عرض کیا پھر اس قدر پست ہو کر صلح کی کیا ضرورت ہے؟

یہ صلح اس وقت ہوئی تھی کہ (۱۴۰۰) چودہ سو جاں نثارانِ اسلام اس سے کچھ پہلے رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر پوری صداقت اور کامل خلوص کے ساتھ میدان جنگ سے نہ بھاگنے کا یا بالفاظ دیگر موت کا عہد کر چکے تھے۔

مگر کیا معمولی سا خطرہ اور وسوسہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر اس وقت اسلام کی کامیابی کلمتہ اللہ کی برتری نہ تھی۔ معاذ اللہ۔ ضرور تھی۔ مگر سیاست کے تقاضے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ چناں چہ حضرت حق جل مجدہ کی بارگاہ سے اس کامیاب سیاست کو فتح مبین کا خطاب دیا گیا۔

اور عرش معلی سے رب العالمین کی وحی نازل ہوئی انا فتحنالك فتحاً مبيناً

ہمارا مقصود یہ ہرگز نہیں کہ کانگریس کے موجودہ تعاون کو صلح حدیبیہ کی مقدس تاریخ کے ساتھ تشبیہ دیں۔ مقصود یہ ہے کہ نصب العین کے حاصل کرنے کے لیے بہت سے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں اور کامیابی کے ساتھ ان مراحل پر گزرنا ہی سیاست کہلاتا ہے۔

بہر حال نصب العین کا جب فی الحال وقوع پذیر اور موجود ہونا ضروری نہیں تو اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ایسی جماعت کا حکومت تسلطہ سے موجودہ تعاون آیا اس بنا پر ہے کہ نصب العین بدل دیا یا اس بنا پر ہے کہ نصب العین کے لیے مقرر کردہ لائحہ عمل (پروگرام) کا ایک جزیہ بھی ہے۔

مگر چوں کہ اس جماعت کو اب سے ڈیڑھ سال پیشتر جب کہ وہ حکومت سے بائیکاٹ کیے ہوئے تھی۔ تب بھی اسی نظر سے دیکھا جاتا تھا حالاں کہ نصب العین یہی تھا۔ لہذا اولاً تو یہ سوال کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ ثانیاً اس جماعت کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ تعاون اپنا نصب العین حاصل کرنے کے لیے ایک وقتی تدبیر ہے۔ جو اسلامی قانون کے لحاظ سے "الحرب خدعہ" (جنگ ایک پالیسی کا نام ہے) کے تحت میں آسکتی ہے۔

بہر حال موجودہ تعاون کو جب کہ ابطال دعویٰ کی دلیل نہیں قرار دیا جاسکتا تو اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جس جماعت میں ۹۹ فیصدی غیر مسلم ہوں اور تصفیہ معاملات کثرت آراء سے ہوتا ہو۔ تو اس جماعت میں مسلمانوں کو شریک ہونا جائز ہے یا نہیں اور آیا اس کو اپنے مذہبی اور ملکی حقوق کا نگراں بنایا جاسکتا ہے یا نہیں۔ تو جواباً عرض ہے کہ جہاں تک مذہبی مفاد اور حقوق کی حفاظت کا تعلق ہے اس کی نگرانی خالصاً فریضۂ مسلم ہی ہے غیر مسلم جب خود احکام اسلام کا منکر ہے تو اس پر احکام اسلام کی حفاظت ڈالنا سراسر غلطی ہے۔ اگر ان احکام کا احترام اس کے دل میں ہوتا تو وہ مسلمان نہ ہو جاتا۔

اسی بنا پر اگر کوئی جماعت خالص اسلامی حقوق اور مفاد کی نگرانی کا ذمہ دار کسی غیر مسلم جماعت کو یا اسی جماعت کو جس کو مسلم جماعت نہ کہا جاسکتا ہو۔ گردان کر اس میں شرکت کی دعوت دے، یا غیر مسلم جماعت میں شرکت کے لیے خالص اسلامی حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری کو شرط قرار دے۔ (جیسا کہ مسلم لیگ کانگریس سے مطالبہ کر رہی ہے) تو ہمارے خیال میں سراسر دھوکا اور غلط کاری ہوگا۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ دولت کے تحفظ کی توقع ان سے کی جارہی ہے جو اپنے عقیدے میں رہزن ہیں۔ بہر حال مذہبی حقوق کا تحفظ تو خالصاً فریضۂ مسلم ہے اور اس کے لیے اُن کو ہر مناسب تدبیر کرنی چاہیے۔ چناں چہ جمعیت علماے ہند کا خود اپنا مستقل نظام اسی مقصد کے لیے ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے حقوق اور ضروریات کو حاصل کیا جائے اور ان کی حفاظت کی جائے اور ان کی مذہبی، تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی اصلاح اور ترقی ہو وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ اپنے ابتداے قیام سے آج تک ان مقاصد کے لیے گراں قدر قربانیاں پیش کرتی رہی ہے۔ (ملاحظہ ہو رسالہ جمعیۃ علماء کیا ہے؟)

باقی رہا ملکی مفاد، مثلاً اپنے ملکی کی مصنوعات کو غیر ملکی مصنوعات پر ترجیح دینا۔ تاکہ باشندگان ملک کی بے روزگاری دور ہو۔ فاقہ ٹوٹے یا زراعت کے سلسلے میں ایسی صورتیں سوچنا۔ کہ زراعت پیشہ اصحاب کو سہولت ہو۔ تو ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاملات میں

زیر بحث جماعت کے کل ممبر گزشتہ سال ۱۳۰۰ لاکھ تھے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ۱۶۰ لاکھ مسلمان ممبر بن کر اس جماعت پر قبضہ کر لیں اور جو حیثیت اس کی اب ہے اس کو بدل ڈالیں۔

سوال نمبر ۳:

اگر اس جماعت سے مسلمان خواہش کریں کہ ملک کی آزادی سے پہلے ملک میں ایک باہمی سمجھوتا ہو جائے کہ آزادی کے بعد طریقہ حکومت کیا ہو گا، مسلمانوں کی حیثیت کیا ہو گی اور اپنے مذہبی فرائض میں مسلمان آزاد ہوں گے یا نہیں؟ تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ غیر ملک کا باشندہ یہاں حکومت کر رہا ہے۔ پہلے ہم دونوں مل کر اس کو یہاں سے نکال دیں۔ اس کے بعد جو صورت ممکن ہو گی اس پر عمل کیا جائے گا۔ کیا ان حالات کے ماتحت مذکور الصدر جماعت کے ساتھ مسلمانوں کو وابستہ ہونا چاہیے؟

الجواب:

فرض کرلو صورت وہی ہے جو سائل صاحب نے پیش فرمائی۔ تو اس اصول میں تو بظاہر سائل صاحب متفق ہیں کہ حکومت متسلطہ انقلاب کی مستحق اور اخراج کے قابل ہے۔ بہر حال جب کہ حکومت متسلطہ بھی مسلمانوں کے لیے ایک مصیبت اور بلا ہے تو فقہی رو سے ہر مکلف کا فرض ہوتا ہے کہ وہ غور کرے کہ اسلام کے نکتہ نظر سے فائدہ کس صورت میں زیادہ ہے یا کون سی چیز زیادہ ضرر رساں ہے اور کون سی کم! اور پھر شرعی تدبیر یہ ہے کہ جو اہون اور ہلکی ہو اس کو اختیار کر لے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اور فقہائے کرام کا مسلمہ اصول ہے کہ اذا بتلی ببلیتین فلیختر اھونہما جب دو مصیبتوں میں گھر جائے تو ہلکی مصیبت کو اختیار کر لے۔ اب سوال یہ ہے کہ بڑی مصیبت متسلطہ شہنشاہیت ہے یا ہندو یا وہ جماعت جس کے بارے میں سوال ہو رہا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس جماعت کا یا ہندوؤں کا ضرر جو کچھ بھی ہے وہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں تک محدود

ہے اور وہ بھی اس صورت سے کہ ہندوستان کے تمام صوبے اور جملہ مقامات اس ضرر میں مساوی نہیں۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے یا جہاں مسلمانوں کی ریاست ہے وہاں معاملہ برعکس ہے اور پھر ضرر کی بھی یہ حیثیت ہے کہ ہندو یا یہ جماعت مسلمانوں کو ۱٦ آنہ نقصان پہنچا سکتی ہے تو مسلمان بھی زیادہ نہیں تو ۸ نقصان ضرور پہنچا سکتے ہیں۔ ہر ایک فریق دوسرے کا محتاج ہے۔ مساوی نہیں تو کچھ فرق کے ساتھ بہر حال حاجت ضرور ہے۔ لیکن تسلط شہنشاہیت کے نقصانات اس جماعت کے نقصانات کے ساتھ ایک اور (۱۰۰) سو بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ کی نسبت رکھتے ہیں اور صورت یہ ہے کہ مسلمان بظاہر اسباب تنہا۔ اس شہنشاہیت کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ وہ بہر حال زیر دست ہیں۔ مجبور اور لاچار اور حکومت تسلطہ خود سائل صاحب کے سوال نمبر ۱ کے آخری فقرہ کے بموجب مسلمانوں کی پشت پناہ نہیں اور نہ صرف یہ کہ پشت پناہ نہیں بلکہ مسجد شہید گنج (جہاں فوج کی امداد سے سکھوں کے ہاتھوں مسجد کو شہید کرا دیا گیا) کراچی اور کان پور کے تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ موقع ملنے پر مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ کچلنا چاہتی ہے۔ آج ہماری آنکھوں کے سامنے آزاد سرحد کے پاکباز مجاہد مسلمانوں پر زندگی تنگ کر رکھی ہے۔ بلاشبہ ہر روز ان کی تباہی پر اتنا خرچ کیا جاتا ہے کہ ہندو نے سو سال میں بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں اتنا خرچ نہیں کیا۔ لاکھوں روپیہ کے گولے ہر روز سرحد کے غیور مسلمانوں اور عاشقان اسلام مجاہدین پر پھینکے جا رہے ہیں اور ان کے لاکھوں روپیہ کے سرمایے کو برباد کیا جا رہا ہے۔ آبادیوں سے نکال کر وحشی جانوروں کی طرح پہاڑوں کے غاروں میں زندگی بسر کرنے پر ان کو مجبور کر رکھا ہے۔ علاوہ ازیں فلسطین کے خونین واقعات رات دن دنیائے اسلام کو بے چین کیے ہوئے ہیں۔ لاکھوں مقدس نفوس، شہید، برباد، تباہ اور خانماں برباد کیے جا چکے ہیں۔ امان اللہ خان کا انقلاب اسی شہنشاہیت کے چشم و ابرو کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔ اس پر کروڑہا روپیہ خرچ کیا گیا۔ (زمانہ جنگ) میں ایران پر قبضہ جما لیا۔ اس کی آزادی ختم ہوئی۔ رضا شاہ پہلوی کو دوسرے ملک میں جانا پڑا جہاں وہ وفات پا گیا۔

چند روز ہوئے حضر موت کے عربوں پر آگ اور خون کی بارش کر کے حضر موت پر قبضہ کر لیا۔ عمان، مسقط پر طاغوتی پنجہ گڑا ہوا ہے اور اس طرح جزیرہ نما عرب کو محصور کر لیا ہے کہ ابن سعود، امام یمن، شیوخ حضر موت وغیرہ وغیرہ۔ عام عربی ریاستیں اسی شہنشاہیت کے رحم و کرم پر ہیں۔ جن کو ہڑپ کرنے کے لیے موقعے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ترک، ایران، افغانستان، عراق، مصر اس کے جبر و قہر سے پریشان ہیں۔

اگر ترکوں کو کسی صورت سے مستثنیٰ بھی کر دیا جائے تو باقی ممالک تو اس شہنشاہیت کے باعث گویا ہر وقت ملک الموت کے پنجے میں ہیں۔ بقول ؎

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما در آں باشد

یورپ کی خانہ جنگی ان ممالک کے لیے کچھ سامان بقا بنی ہوئی ہے۔ لیکن کیا کوئی مدبر کسی وقت ان اسلامی ممالک کی طرف سے مطمئن رہ سکتا ہے؟

یہ اس وقت ہے کہ یورپ اور ایشیا میں تقریباً (۸۰) اسی لاکھ مربع رقبہ مسلمانوں سے چھینا جا چکا ہے ان ممالک کی آزاد حکومتوں کو برباد کر کے مسلمانوں کا قلع قمع کیا جا چکا ہے۔

خود ہندوستان کی طویل و عریض اسلامی حکومت کو اسی شہنشاہیت نے برباد کیا۔ بہر حال اگر اس جماعت سے جس کا ذکر سوال میں ہے یا ہندو سے اگر یہ نقصان پہنچ رہا ہے کہ کہیں کہیں اذان بند کر دی جاتی ہے یا نتیجہ گاؤ پر کچھ فساد برپا کر دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ وہ بھی اسی شہنشاہیت کے بل بوتے پر اور اسی شہنشاہیت کے اس اصول کے موجب ہے کہ "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" تو اس شہنشاہیت نے۔

(۱) ہندوستان سے اسلامی حکومت کو فنا کیا جس کو ہندو ایک ہزار برس تک بھی نہ مٹا سکا تھا اور نہ مٹا سکتا تھا۔

(۲) بلا کسی شرط کے مسلمانوں پر اپنی شہنشاہیت کو مسلط کر کے ان کے مذہبی احکام میں رخنہ ڈالا۔ مساجد کو شہید کیا۔ ان کو ضبط کیا اور سرکاری عمارتوں میں تبدیل کر لیا۔ چناں چہ آج تک بہت سی مسجدیں، سرکاری دفاتر بنی ہوئی ہیں۔ جن میں ہائی کورٹ

لاہور کی مسجد سانتی حکومت نے اور چند مساجد کو صوبہ بمبئی کی کانگریسی وزارت نے واگذار کیا۔

(۳) ہندوستان کی صنعت و حرفت کو جو ۹۵ فیصدی مسلمانوں کے قبضہ میں تھی۔ یورپ کی اور مانچسٹر کی مصنوعات کو ترقی دینے کے لیے برباد کر کے کروڑوں با ایمان بندگان خدا کو مفلس اور قلاش۔ پراگندہ دل بنایا۔

(۴) سود در سود اور زمینداروں پر ٹیکس کے قانون بنا کر مسلمانوں کی زمینداریوں کو غیر مسلموں کے قبضے میں پہنچایا۔ حالاں کہ ہندوستان کی زمینداری پر ۱۴ آنے مسلمانوں کا قبضہ تھا۔

(۵) سرکاری زبان انگریزی قرار دے کر مسلمانوں کی زبان، ان کے کلچر پر اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچایا۔ جس کا خطرہ آج اردو، ہندی کے قضیے سے پیش کیا جارہا ہے اور اس انقلاب کے باعث مسلمانوں کو ملازمت کے سلسلے میں اتنا پیچھے کر دیا کہ جدوجہد کے باوجود آج تک مسلمان اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکے (دیکھو "حکومت خود اختیاری" اور "مسلمانوں کا روشن مستقبل" مصنف سید طفیل احمد صاحب اور "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ" ایڈورڈ ٹامس۔ مترجمہ حسام الدین بی۔ اے اور "علماء ہند کا شاندار ماضی" (ا) اور داستان بربادی مصنف محمد میاں کاتب حروف)

(۶) تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اختیار کر کے تفریق بین المسلمین کا مجرم بنا۔ حالاں کہ اس سے پہلے یہ تفریق نہ تھی۔ (ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد افغانستان اور ایران کا گلا گھونٹا۔ حتیٰ کہ وہ آج تک خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتے۔

(۷) مصر، مالٹا، فلسطین، شرق اردن، عدن وغیرہ وغیرہ کتنے ہی ممالک ہیں جن کو مسلمانوں سے چھینا۔

(۸) عالمگیر جنگ واقعہ ۱۹۱۴ء میں مسلمانوں کو دھوکا دے کر (کہ ترکوں سے مذہبی جنگ

نہیں، ترکی بدستور محفوظ رہے گی) ہزاروں مسلمانان ہند کو بدترین اور جہنمی گناہ کا مجرم بنایا اور مسلمانان ہند کے ذریعے سے ترکوں کو برباد کیا۔ حجاز مقدس پر ہوائی جہازوں، فوج اور مشین گنوں وغیرہ سے حملہ کیا اور سب سے زیادہ یہ کہ عرب مقدس میں ہر طرف سے غلہ کی آمد بند کر کے مدینہ طیبہ کے ہزاروں مقدس باشندگان کو جو حرم اطہر (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے عشق میں دور دراز شہروں سے آکر قیام پذیر ہوئے تھے، بھوکا رکھا یہاں تک کہ سیکڑوں مقدس نفوس نے اس بھوک و پیاس کی حالت میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال اگر سائل کے سوال کو سراسر حقیقت پر مبنی قرار دیا جائے، تب بھی ہر ہندوستانی مسلمان کا اولین فرض ہے کہ وہ تسلط شہنشاہیت کے عذاب عظیم کو جلد از جلد ہندوستان سے نکال کر تمام عالم اسلامی کو پریشانی اور بربادی سے نجات دلائے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جماعت (جس سے بظاہر کانگریس مراد ہے) اپنا پہلا اصول یہ قرار دے چکی ہے کہ مذہب کے معاملے میں اسٹیٹ غیر جانبدار رہے۔ ہر ایک اقلیت کا کلچر رسم و رواج وغیرہ محفوظ ہوں گے۔ ہر شخص کو ضمیر کی آزادی، رائے کی آزادی حاصل ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

(دیکھو فنڈامنٹل رائٹس یا کانگریس کے بنیادی اصول)

اور اسی طرح وہ اسی اعلان میں ہندوستان میں حکومت کا طرز بھی صفائی سے بتا چکی ہے کہ طریقہ حکومت جمہوری ہوگا (وغیرہ وغیرہ) جیسا کہ خود مسٹر جناح کا بھی اعلان ہے کہ پاکستان میں طریقہ حکومت جمہوری ہوگا اس کے علاوہ کانگریس یہ بھی تسلیم کر چکی ہے کہ صوبجات خود مختار ہوں گے جملہ اختیارات دیے جائیں گے جن کو صوبے منظور کر لیں وغیرہ۔

علاوہ ازیں اگر وہ شرائط مذہب کی حفاظت سے متعلق ہیں تو کانگریس جو یقینا مسلم جماعت نہیں ہے۔ اس سے حفاظت مذہب کا مطالبہ غیرت مسلم کے سراسر مخالف، کون

خود دار مسلمان گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنی مسجد کے تحفظ کی دستاویز گاندھی یا جواہر لال سے لکھوائے (معاذ اللہ)۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

علاوہ ازیں جب کہ حکومت متسلطہ کے مظالم وہ ہیں (جو مشتے نمونہ از خروارے) اوپر ذکر کیے گئے اور اس بنا پر انقلاب ضروری ہے تو موجودہ دنیا کا کون سا ہوشمند کسی معاہدے کو اطمینان کے قابل سمجھ سکتا ہے۔ جب کہ جملہ معاہدات قوت کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک معاہدہ ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم سے بھی ہوا تھا۔ مگر کیا کہیں اس کا نام و نشان ہے۔ فلسطین کے عربوں سے جو معاہدہ کیا گیا تھا، کیا آج اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ جمعیۃ الاقوام کے معاہدات مسولینی اور ہٹلر کی ردی کی ٹوکری میں پڑے ہوئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اور آج دوسری جنگ عظیم کے بعد اٹلانٹک چارٹر کی تصدیق، انڈونیشیا اور جاوا وغیرہ کے آزادی چاہنے والے مسلمانوں کے خون شہادت سے کی جا رہی ہے۔

اب اس حالت میں صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ ہندوستان کی ہر جماعت اپنی اندرونی قوت بھی مستحکم کرے اور پورے ہندوستان کے مشترک مفاد کے لیے انگریز کو دھکیلنے اور وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لیے مشترک جدوجہد کرتی رہے۔

جمعیت علمائے ہند کا پورا نظام اسی مقصد کے لیے ہے جس کو علماء کی قیادت کا شرف حاصل ہے اور جس کی شاخیں ہندوستان کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کو تقویت پہنچانا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے۔

باقی اقلیت کی شکایتیں اگر ہیں یا آیندہ ہوں تو ان کا علاج وہی ہوگا جو آج انگریز کے مقابلے پر کیا جا رہا ہے یا دنیا کی عام جمہوریتوں میں اقلیت کی پارٹی اکثریت کے مقابلے میں کرتی رہتی ہے۔ چناں چہ جمعیت علمائے ہند کا یہی مسلک اور اس کا یہی فتویٰ ہے کہ مسلمان اپنی قوت مستحکم کرنے کے لیے زائد سے زائد جمعیت علمائے ہند کے ساتھ مربوط ہوں اور انگریز

کو نکالنے کے لیے زیادہ سے زیادہ انقلاب کے خوگر اور مشاق ہیں اور اس مقصد کے لیے دیگر اقوام ہند سے تعاون اور اشتراک عمل میں کوئی پس و پیش نہ کریں بلکہ اگر انگریز کو نکالنے کی صورت یہی بنتی ہو کہ اقوام ہند سے اشتراک عمل کیا جائے تو جس قدر حکومت مسلطہ کے دردناک عذاب کا اپنے سروں سے اتار کر پھینک دینا ضروری ہے اتنا ہی دیگر اقوام ہند سے تعاون اور اشتراک عمل بھی ضروری ہے۔

اللھم اھد قومی انھم لا یعلمون

کتبہ

اضعف العباد محمد میاں عفی عنہ خادم دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد

(دستخط) حضرت مولانا سید (فخر الدین احمد) صاحب صدر مفتی و شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد

حضرت مولانا عبد الحق صاحب مدنی شیخ التفسیر و مدیر جامعہ قاسمیہ۔ مراد آباد

مولانا قاری عبد اللہ صاحب استاذ تجوید۔

مولانا واحد رضا صاحب مدرس مدرسہ شاہی مراد آباد

مولانا سید محی الدین اختر الاسلام صاحب مدیر رسالہ قائد۔

۲۳ رمضان ۱۳۵۷ھ

حواشی :

(۱) یہ استفتاء رسالہ قائد مراد آباد بابت ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء سے نقل کر کے شائع کیا جا رہا ہے ایک دو جگہ چند سطریں بڑھائی گئی ہیں جن کو قوسین میں کر دیا گیا ہے۔ محمد میاں

(۲) یہ کتاب ممنوعۃ الاشاعت ہے۔ محمد میاں

کشف الغوایۃ عن الوقایۃ

یعنی

کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ

پر تنقید کی نگاہ

از

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلامؒ۔ پاکستان

کراچی

کشف الغوایۃ عن الوقایۃ
یعنی

''کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ''

پر تبصرہ ❶

حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیو بندی کا ایک تازہ رسالہ نظر سے گزرا۔ رسالہ کے سرورق پر درج ہے۔ ''وقایۃ المسلمین عن ولایۃ المشرکین''، یعنی کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ۔

رسالے کے مطالعے، بعض دوستوں کی فرمایش اور چند حضرات کے سوالات نے احقر کو تحریر سطور ذیل پر مجبور کر دیا۔

وقت تنگ ہے، فرصت معدوم اور فریضہ نہایت تلخ۔

مگر ضرورت مجبور کر رہی ہے کہ ان تلخیوں اور دشواریوں کو برداشت کیا جائے۔

رسالہ کو دیکھنے کے بعد غیر متوقع طور پر سخت مایوسی ہوئی اور بہت قلق ہوا، کیوں کہ

(۱) حقیقی سوالات میں سے کوئی ایک بھی پیش نہیں کیا گیا۔

(۲) جو سوالات قایم کیے گئے وہ واقعات سے بے گانہ، مغالطہ آمیز، گم راہ کن۔

(۳) جب کہ سوالات غلط اور واقعات سے غیر متعلق ہیں تو ان کے جوابات بھی لامحالہ سوالات کے بہ موجب ہی ہوں گے۔

(۴) جوابات میں جن واقعات کو بہ طور نظیر اور بہ طور شاہد پیش کیا گیا ہے، افسوس ہے کہ وہ بھی غلط ہیں اور مولانا نے بلا تحقیق لیگی پروپیگنڈے پر اعتماد کر لیا ہے۔

---

❶ احقر یہ تبصرہ: ۱۷ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ (۱۹ فروری ۱۹۴۶ء) کو مرتب کر کے اشاعت کے لیے ایک اخبار کے حوالے کر چکا تھا، مگر الیکشن کا زمانہ ختم ہو گیا اور اخبار کو اس رسالے کی اشاعت کا موقع نہ مل سکا۔ لہٰذا دوستوں کی فرمایش کو پورا کرنے کے لیے رسالہ کی شکل میں شایع کیا جا رہا ہے۔ (واللہ ولی التوفیق و بہ نستعین)

۱۔ حقیقی سوالات:

جن کی طرف سایل نے قطعاً توجہ نہیں کی، حال آں کہ شرکت کانگریس پر بحث کرتے وقت ان کا پیش نظر رہنا از بس ضروری ہے اور ان کا حل کیے بغیر کوئی جواب حقیقی جواب نہیں ہو سکتا۔

(الف) ہندوستان کی حیثیت کیا ہے۔ آیا مدینۂ طیبہ کی طرح دار الاسلام ہے یا وہ حیثیت رکھتا ہے جو فتح مکہ سے پیشتر مکۂ معظمہ کی حیثیت تھی؟ یعنی دار الحرب ہے۔ یا وہ حیثیت رکھتا ہے جو ہجرت حبشہ کے زمانے میں حبشہ کو حاصل تھی؟

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز اور حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا فتویٰ فتاویٰ عزیزیہ میں موجود ہے اور حضرت گنگوہیؒ کا مفصل فتویٰ خود مولانا محمد شفیع صاحب نے اپنے دار الاشاعت سے چند سال ہوئے شایع فرمایا تھا۔

مولانا محمد شفیع صاحب کی ایک عبارت سے بھی یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان دار الحرب ہے۔ کیوں کہ وہ ہندوستان پر کفار کا تسلط کامل مانتے ہیں اور مسلمانوں کو مستامن قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو (فائدہ مہمہ: ص ۱۹) اس کے بعد رسالے کے آخر میں تصریح فرمادی ہے کہ

> ”ہندوستان جو صدیوں تک دار الاسلام رہا ہے اور اب ایک عرصے سے اس پر غیر مسلم حکومت کا تسلط ہے اور بہت سے خلاف شرع توانین نافذ ہیں اور مسلمانوں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں، للہٰذا مسلمانوں کے ذمے واجب ہے کہ اس تسلط کے ازالے یا تقلیل کی جو صورت جس حصۂ ملک میں وہ کسی تدبیر سے حاصل کر سکیں اس میں کوتاہی نہ کریں کہ یہ بھی استخلاص دار الاسلام کی ایک فرد ہے۔“ (ص ۴۷)

(ب) انگریزوں کی ہندوستان میں کیا حیثیت ہے؟ وہ محارب ہیں، غاصب

اور جابر ہیں۔ جنھوں نے خیانت، دھوکے، فریب، چال بازی اور جبر و قہر سے مسلمانوں کی حکومت چھینی اور اب تک وہ اسی سابق رویے پر باقی ہیں اور دن بہ دن اپنے اس رویے میں ترقی کر رہے ہیں۔

جنھوں نے بیرونِ ہند تمام دنیاے اسلام میں مسلمانوں کو ختم کیا، ان کی حکومتیں تباہ کیں اور ان کو جبر و استبداد کی فولادی زنجیروں میں جکڑ بند کیا۔ یا وہ مسالم اور معاہد ہیں؟

اگر کوئی معاہدہ ہوا تو کب ہوا اور وہ معاہدہ کیا تھا؟

(ج) جو نظام حکومت ہندوستان میں قایم ہے اس کے ساتھ مسلمانوں کو کیا معاملہ کرنا چاہیے؟ جب کہ

(ا) اس کے ماتحت ایسا نظام تعلیم قایم ہے جس نے مسلمانوں کو دین سے نہ صرف یہ کہ نا آشناے محض کیا بلکہ معاذ اللہ متنفر بنا دیا!

اس نظام تعلیم کے تربیت یافتہ اکثر و بیشتر عقاید اسلام، تہذیب اسلام، اسلامی معاشرت اور اسلامی احکام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حتیٰ کہ آج اس شخص کو بے وقوف مانا جاتا ہے جو داڑھی رکھے، مونچھیں کٹائے، خوراک و پوشاک، وضع قطع میں اسلامی آداب و تہذیب کا خیال رکھے۔ اس نظام تعلیم کے باعث مسٹر جناح جیسا قایدِ اعظم بھی مسلمان عورت اور ہندو یا سکھ یا عیسائی مرد کے نکاح کے جواز کا قانون بنوانا چاہتا ہے اور قرآن پاک کے صاف اور صریح احکام کو جنجال اور تہذیب اور ترقی کے مخالف، تقاضاے وقت کے لیے ناکافی قرار دے کر منسوخی کے قابل قرار دیتا ہے۔

(دیکھو رسالہ ''سول میرج اور لیگ'')

وراثت کے سلسلے میں رسم و رواج کو شریعت پر ترجیح دی جاتی ہے اور قانونی موشگافیوں کے ذریعے سے شریعت بل کو ناکارہ کر دیا جاتا ہے۔

(دیکھو رسالہ ''شریعت بل اور لیگ'')

اسی نظام تعلیم کی برکت ہے کہ نکاح، طلاق وغیرہ میں علما کے اقتدار کو برداشت نہیں کیا جاتا اور قاضی بل کی مخالفت اس لیے کی جاتی ہے کہ اس سے علما کو اقتدار

حاصل ہوگا۔

اسی نظام تعلیم کا اثر ہے کہ پردے کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔شریف خاندانوں کی لڑکیاں نہ صرف یہ کہ بے پردہ بازاروں میں پھرتی ہیں بلکہ برہنہ ہوکر رقص کرنے میں بھی فخر محسوس کرتی ہیں (معاذ اللہ)۔اس نظام تعلیم کے باعث گانا، بجانا، جوا کھیلنا وغیرہ منکرات ومنہیات کو عموم حاصل ہورہا ہے بلکہ حاصل ہوچکا ہے۔

انھیں نتائج کے پیش نظر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ اور دیگر اکابر علما نے انگریزی تعلیم کو حرام قرار دیا تھا۔

(۲) اس نے ایسا فوجی نظام قایم کیا جس کی بناپر ایک دین دار مسلمان بھی مجبور ہوجاتا ہے کہ وہ حجاز مقدس پہنچ کر مقام مقدسہ پر گھوڑے دوڑائے اور غلافِ کعبہ کو گولیوں کا نشانہ بنائے۔

(۳) اس نے ایسا اقتصادی نظام بنایا جس کے ماتحت ہندوستان کی تین چوتھائی آبادی فاقہ کشی کے لیے مجبور ہے۔ باوجودے کہ بارش نہ ہونے کی صورت میں بھی ہندوستان میں اتنا غلہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایک سال سے زیادہ باشندگانِ ہند کی غذا کے لیے کافی ہو۔مگر اس نظام کے باعث ہندوستان فاقہ زدہ ملک بن گیا ہے۔ انتہا یہ کہ ایک قحط میں صرف دوماہ میں صوبۂ بنگال میں تقریباً پینتیس لاکھ یا نوے لاکھ مرد عورتیں اور معصوم بچے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ایک دردناک موت کا شکار ہوجاتے ہیں۔

(د) ہندوستان میں ہندوؤں کی کیا حیثیت ہے۔وہ محارب ہیں یا مسالم یا ذمی؟

حضرت مولانا کو حضرت تھانویؒ کے فتاویٰ کا بہت کافی علم ہونا چاہیے۔کیا یہ غلط ہے کہ حضرت تھانویؒ نے ہندوؤں کو ذمی قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔تتمہ امداد الفتاویٰ: جلد۴،صفحہ ۵۶۔

(ہ) ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک جماعت ہے جو علمائے کرام کی زیر قیادت ہے۔جس کی مرکزی جماعت میں دو ثلث علما کا ہونا ضروری ہے۔جس کا صدر اور ناظم اعلا صرف عالم ہی ہوسکتا ہے، جو تقریباً ۲۶ سال سے ہندوستان میں علمائے کرام کی زیر قیادت مسلمانوں کی ہر قسم کی خدمت حسب مقدرت و استطاعت انجام دے رہی

ہے۔ جس کی جلیل القدر نمایاں خدمات کی فہرست کے لیے بھی اخبار کے کئی کالم درکار ہیں۔ جس نے علما کو حسب مقدرت ایک مرکز پر جمع کیا اور دیو بندی، بریلوی، اہلِ حدیث کے اختلافات کو جو غیر ضروری حد تک بڑھ کر وقت کو تباہ کر رہے تھے ختم کیا۔ جس نے علما کا ایک مرکز مستقل بنایا۔ جس کا اعلان ہے کہ وہ ہر ایک فیصلہ شریعت کی روشنی میں کرتی ہے۔ جس میں ہندوستان کی چوٹی کے علما شامل ہیں جو زمانہ اور حالاتِ زمانہ کے نبض شناس ہیں اور جن کے فیصلے شریعت غرا کی روشنی ہی میں ہوتے ہیں۔ جو حسب ضرورت انگریز اور اس کی حکومت سے نبرد آزما ہوتی اور جب ضرورت پیش آتی ہے وہ ہندوؤں کے مقابلے میں اسلام کی حفاظت کرتی ہے۔ جو آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کی حامی ہے اور اس مقصد عظیم کے لیے قربانیاں پیش کر رہی ہے۔

جن کے ارکان اور اعوان کا مستقل نظریہ یہ ہے کہ جب تک آزاد ہندوستان میں اسلام کو آزادی کامل حاصل نہ ہوگی وہ جدو جہد انقلاب برابر جاری رکھیں گے۔

(ملاحظہ ہو "اغراض و مقاصد و دستور العمل جمعیتِ علمائے ہند")

ایک دوسری جماعت ہے جس پر گریجویٹ اور مغربیت زدہ لوگوں کا تسلّط ہے۔ جس کا صدر ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو اسلام کا نام لے۔ خواہ اس کا عقیدہ کچھ ہو۔ حتیٰ کہ شیعہ، رافضی، تبرائی، قادیانی، اور منکرِ خدا اور رسول، ملحد، اور زندیق بھی اس کا صدر، اس کا ناظم اور ہر ایک عہدہ دار بن سکتا ہے اور پھر صدر کو اختیار ہے کہ وہ ایسے ہی لوگوں کو مجلس عاملہ کے ارکان بنائے۔ یعنی امتِ اسلامیہ کا ارباب حل و عقد ملحدوں اور زندیقوں کو کردے۔ چناں چہ آج اس کے صدر اور اس کی مجلس عاملہ کے زیادہ تر ارکان وہی لوگ ہیں جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے فتاویٰ کے بہ موجب لامذہب اور نیچری ہیں۔

کثرت رائے پر فیصلے کا اصول اس میں مسلم ہے جس میں مطابقت شریعت کی کوئی پابندی نہیں۔ بلکہ اس کے ارکان اسمبلیوں میں پہنچ کر زیادہ تر ایسے قوانین کے بر خلاف پوری قوت صرف کر دیتے ہیں جو اسلام اور شریعت اسلام کے مطابق ہوں۔ جن سے مذہب اور مذہبی لوگوں کا اقتدار متصور ہو سکے۔ چناں چہ شریعت بل، مسلم

قاضی بل وغیرہ کے نظایر موجود ہیں۔

اس کے کسی عہدے پر عالم یا پابند شرع ہونے کی یا اس کی کسی دستوری مجلس میں علما کی جماعت کی کوئی شرط یا قید نہیں ہے۔ بلکہ علما کے ساتھ ان کا طرز عمل معاندانہ اور خودغرضانہ ہے۔ مثلاً ۱۹۳۷ء میں اس کے صدر (مسٹر محمد علی جناح) نے جمعیتِ علماے ہند کے اکابر کے ساتھ یہ عہد کیا تھا کہ وہ مذہبی امور میں جمعیتِ علماے ہند کی قیادت تسلیم کریں گے اور سیاسی امور میں انگریز پرست ٹوریوں کے خلاف حریت پسند علما کے لیے دست و بازو بنیں گے۔ لیکن الیکشن کی کامیابی کے بعد جب ایفاے عہد کا وقت آیا تو کہہ دیا کہ وہ وعدے سیاسی تھے اور پھر کامیابی کے زعم اور غرور میں بار بار اعلان کیا کہ میں نے علما کے اقتدار کو ختم کر ڈالا۔ اور صرف صدر پر ہی منحصر نہیں بلکہ اس کے اراکین زیادہ تر وہی ہیں جو علما کے اقتدار کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے سیکڑوں اراکین میں علما کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں۔

اس جماعت نے اگرچہ ہندوستانیوں کے عام جذبات سے مرعوب ہو کر اعلان بھی کیا ہے کہ مکمل آزادی ہمارا نصب العین ہے، مگر اس کی تجاویز اور اس کے افعال اس نصب العین کے برعکس رہے ہیں۔

یہ جماعت اس کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ہندو اور مسلمانوں کے تعاون اور اشتراکِ عمل کے بغیر آزادی نہیں مل سکتی۔ برادرانِ وطن کے ساتھ اتحاد اور اتفاق کے تعلقات کو اپنا اصول گردانتی ہے مگر اس نے ہندو مسلم مفاہمت کے زریں موقعوں سے پہلو تہی کی اور کر رہی ہے اور اس طرح خود مسلمانوں کی عافیت کو تباہ کر رہی ہے جو عموماً ہندوستان میں اور بالخصوص یوپی، بہار، مدراس وغیرہ اقلیت کے صوبوں میں تعداد میں کم بھی ہیں اور دنیاوی ذرایع کے لحاظ سے کم زور بھی۔

اور اپنے اس طرزِ عمل سے ''تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کو قوت پہنچا رہی ہے جو برطانوی سامراج کے استحکام و بقا کے لیے سنگ بنیاد ہے۔ اس جماعت کے گرد و پیش میں اگرچہ کچھ علما نظر آتے ہیں مگر ان کو اس جماعت میں آئینی حیثیت کچھ بھی حاصل نہیں۔ اور یقین ہے کہ الیکشنی ہنگاموں کے ختم ہونے کے بعد

عزت واحترام کے بجائے ان کی سادہ لوحی کا مذاق اُڑایا جائے گا، جس سے اقتدارِ ملت کو اور دھکا لگے گا۔

ان حالات اور واقعات کے پیش نظر سوال یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کون سی جماعت...... اسلامی جماعت کہلانے کی مستحق ہے؟ مسلمانوں کو کس جماعت میں شامل ہونا چاہیے؟

اور اگر "مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ" جیسی احادیث کے بہ موجب اس قسم کی جماعتوں میں داخل ہونا ضروری ہے تو وہ اول الذکر جماعت ہوسکتی ہے یا ثانی جماعت۔

غلط سوالات قایم کیے گئے:

(الف) سوالات قایم کرنے میں سب سے پہلی خیانت یہ کی گئی ہے کہ جمعیتِ علما کی تاریخی شان وعظمت کو، جس کو حضرات علما نے ہزاروں مصیبتیں برداشت کر کے قایم کیا ہے، یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ وہ اس قدر قلت میں ہے کہ اس کو کوئی قوم موجودہ آئین کے اعتبار سے مسلمانوں کا نمایندہ تسلیم نہیں کرتی۔

یعنی شرعی فتویٰ صادر کرانے کے لیے ایک جابر اور غیر مسلم حکومت کے آئین کو آڑ بنایا گیا۔ جمعیتِ علما کی حیثیت وعظمت کو جو مذہبی اور شرعی نقطۂ نظر کے بجائے انگریزی آئین کے چشمے سے دیکھا گیا۔

اور حضرات اکابر علما مثلاً حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (قدس اللہ سرہٗ العزیز) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (قدس اللہ سرہٗ العزیز) کے ارشادات کو نظر انداز کر دیا گیا، جن میں جمعیتِ علما کی شرعی اہمیت وعظمت کو واضح انداز میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

(ملاحظہ ہو رسالہ "جمعیتِ علما کی شرعی اہمیت وعظمت")

برطانوی سامراج کے ہوا خواہ اور کاسہ لیس اگر جمعیتِ علما اور مسلم قوم پرور طبقے کی تحقیر کریں تو تعجب نہیں، کیوں کہ ان کی پالیسی یہی ہے اور ان کا فایدہ اسی میں ہے،

مگر عجیب بات تو یہ ہے کہ جب کہ جمعیتِ علماے ہند اپنی سرفروشانہ قربانیوں کے ذریعے خدا کے فضل و کرم سے پارلیمنٹری لحاظ سے نمایندہ حیثیت حاصل کر چکی، متعدد صوبہ جاتی اسمبلیوں میں اس کے گروپ موجود ہیں اور اس کے ٹکٹ پر کام یاب ہونے والے وزیر یا پارلیمنٹری سیکرٹری بنے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ خود حکومت برطانیہ اپنی قدیم پالیسی کے برخلاف اس کی نمایندہ حیثیت تسلیم کرنے پر مجبور ہو چکی ہے، لیکن حضرت سایل اس کو ایسی حقیر اقلیت قرار دے رہے ہیں جس کا کوئی شمار ہی نہیں۔ کیا یہ تعصب اور ابلہ فریبی کی بدترین مثال نہیں؟

(ب) کانگریس کا ذکر کرتے ہوئے کانگریس کے بنیادی اصول کی اُن دفعات کو قطعاً نظر انداز کر دیا جن میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ہر اقلیت کا مذہب، تمدن، زبان، رسم الخط وغیرہ وغیرہ محفوظ ہوں گے۔

پھر ان اعلان کو قطعاً نظر انداز کر دیا جو بعد کے اجلاسوں میں بار بار دہرائے گئے کہ مسلمانوں کی مسجدیں، تعلیم گاہیں، قبرستان، اوقاف آزاد ہوں گے۔ اُن کو مذہبی رسوم و عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، قربانی وغیرہ میں پوری آزادی حاصل ہوگی۔ (تفصیل کے لیے دیکھو رسالہ ''توضیح تجاویز'')

(ج) اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا گیا کہ کوئی کانگریس مین اس پر مجبور نہیں کہ وہ عدم تشدد کو بہ طور عقیدہ تسلیم کرے۔ چناں چہ کمیونسٹ، سوشلسٹ اور فارورڈ بلاک والے کانگریس میں شامل رہے اور کمیونسٹوں یا فارورڈ بلاک والوں کو اس لیے نہیں خارج کیا گیا کہ وہ عقیدتاً عدم تشدد کے قایل نہیں تھے، بلکہ دوسرے اختلافات کے باعث ان کا اخراج ہوا، جیسا کہ اخبار بین طبقے پر پوشیدہ نہیں۔ بے شک گاندھی جی کا ایک مخصوص طرز زندگی ہے اور ان کے معتقد اُس کا فلسفہ بھی بیان کرتے ہیں مگر کسی کانگریس مین کے لیے ضروری نہیں کہ وہ گاندھی کے طرز زندگی یا اس کے کسی اُصول یا فلسفی نکتے کو تسلیم کرے۔

(د) ۱۹۳۹ء میں صدر کانگریس (سوبھاش چندر بوس) کے دوبارہ انتخاب کے سلسلے میں کانگریس کے دائیں اور بائیں بازو میں بہت سخت رسہ کشی رہی۔ دونوں

طرف سے اخبارات میں زور شور کے مضامین شایع کیے گئے۔ اسی سلسلے میں اچاریہ کرپلانی (سیکرٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی) نے مسٹر گاندھی اور ان کی پالیسی کی تعریف و توصیف میں ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ اس کا خطاب سوبھاش پارٹی سے تھا، اس کو مسلمانوں کے خلاف اور مسلمانوں کے لیے بر مقابل فرض کر کے غلط طور پر اس کے مضمون کے ایک فقرے کو نقل کیا گیا اور اسی بحث کے خاتمے پر مولانا آزاد نے سوبھاش چندر بوس کی قیادت و امامت کے بجائے مسٹر گاندھی کی سیاسی قیادت و رہنمائی کی جو تعریف کی تھی اس کو مذہبی قیادت و امامت کے معنی میں لیا گیا اور لفظ ایمان کو مذہبی ایمان کے ہم معنی گردانا گیا، جو سراسر تلبیس ہے۔ بہ قول حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ فتوے کے لیے معنوں (مراد) کا اعتبار کرنا ضروری ہے، عنوان کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ (ملاحظہ ہو "افادات اشرفیہ" ص ۶)

لہٰذا مفتی کا فرض ہے کہ وہ مراد اور معنوں کا لحاظ رکھے۔ ادیبانہ یا شاعرانہ الفاظ پر فتویٰ صادر کرنا اصولِ فتویٰ کے مخالف ہے۔ ورنہ پھر حکیم الامت، سلطان العلوم، خاتم المحدثین، قطب العالم، امام ربانی، علامہ زمان، امام الاتقیاء جیسے تمام ہی الفاظ پر بحث چل سکتی ہے۔

(ہ) لیگ کے بڑے ذمے دار لوگوں کے متعلق صرف اتنا ہی کہا گیا کہ یہ حضرات شریعت کے پابند نہیں (ص ۳)۔ حال آں کہ بڑے ذمے دار لوگوں میں وہ ہیں جو عقاید کے لحاظ سے خود حضرت مولانا محمد شفیع صاحب اور حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب کے فتاویٰ کے بہ موجب زندیق، ملحد اور کافر ہوتے ہیں اور ان حضرات کے فتاوی کے پیشِ نظر محض فاسق کی قیادت و امامت کے تسلیم کرنے نہ کرنے کا مسئلہ نہیں رہتا بلکہ زندیق، ملحد اور مرتد کی قیادت تسلیم کرنے اور اس کے غلبہ و اقتدار کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ (مزید تفصیل رسالے کے آخری صفحات میں "دوسرے سوال کے جواب پر تبصرہ" کے زیر عنوان ملاحظہ فرمائی جائے)

(و) کانگریس میں بلاشرط مسلمانوں کے داخلے کا لفظ بھی گم راہ کن ہے.........

.... بلاشرط کی تفسیر اگر یہ ہے کہ تحفظِ ملت کی کوئی شرط نہیں تو یہ سراسر غلط اور قطعاً غلط

ہے۔ کانگریس کا بنیادی اُصول یہ ہے اور اس کا بار بار اعلان کر چکی ہے کہ کسی مذہبی معاملے میں تعرض نہیں کیا جائے گا۔ مسلمانوں کا مذہب، ان کا کلچر، رسم ورواج، ان کی زبان، تعلیم، ان کا رسم الخط، مسجدیں، مقابر، تمام مذہبی رسوم وفرائض مثلاً نماز، روزہ، قربانی وغیرہ محفوظ رہیں گے۔ (ملاحظہ ہو "توضیح تجاویز")

ان تمام بنیادی اصول اور بنیادی اعلانات کے بعد بلاشرط شرکت کے کیا معنی؟ اور اگر بلاشرط کی کوئی اور تفسیر ہے تو اس کا بیان کرنا ضروری تھا نیز ان شرایط کا بیان کرنا بھی ضروری تھا جن کو کانگریس نے تسلیم نہیں کیا تاکہ اندازہ ہو جاتا کہ آیا وہ شرایط اس قابل ہیں جن کی بناپر حصول آزادی جیسے مقصدِ عظیم کو حاصل کرنے کے لیے کانگریس کے اشتراک سے اجتناب کیا جائے یا چند قریہ شکموں کی اغراض کا نام شرایط ہے؟

(ز) مسلم لیگ کے اصول اور مطالبے کو بیان کرتے ہوئے بھی تلبیس سے کام لیا گیا۔

ارشاد ہوتا ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ مسلمان سب اس کے زیرِ علم جمع ہو کر اپنی مستقل تنظیم کریں اور جماعتی حیثیت سے ہندوؤں کے ساتھ کوئی معاہدہ کر کے جنگ آزادی میں حصہ لیں۔

اگر واقعی یہی اصول ہے اور بہ قول اربابِ لیگ، مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمایندہ بھی ہے، حتیٰ کہ بہ قول مسٹر جناح ۹۹ فیصدی مسلمان اس کے ساتھ ہیں تو پھر آج تک کانگریس سے معاہدہ کیوں نہیں کر لیا۔ مصالحت کی ہر گفتگو کے موقع پر کچھ نئی شرطوں کا اضافہ کر کے صلح کے بجائے منافرت اور باہمی عداوت کی خلیج کو وسیع کرنے کی کوشش کیوں کی گئی۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ اصول محض نمایشی ہیں، حقیقی اصول یہ ہے کہ تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کی تائید کی جائے اور انگریزی حکومت کے ملعون اقتدار کی رسی دراز کی جائے۔

(ح) اصول لیگ کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

حقوقِ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ مستقل اور علاحدہ ہو۔

اس کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو آزاد خود مختار

حکومت ملنا چاہیے۔اسی کا نام مطالبۂ پاکستان ہے۔ (ص ۲)

اس کے بعد سوال نمبر ۳ میں مطالبۂ پاکستان کی تفسیر یہ کی گئی ہے۔

''مسلم اکثریت کے صوبوں میں آزاد خود مختار حکومت۔'' (ص ۳)

حال آں کہ مطالبۂ پاکستان کی یہ تفسیر خود سایل کی تجویز کردہ ہے۔ ورنہ مسٹر جناح اور دیگر قایدینِ لیگ تو رات دن یہ ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں کہ پاکستان کے معنی ہیں ''تقسیم ہندوستان'' اور یہ کہ مسلم ہندوستان، ہندو ہندوستان سے ایسے ہی علاحدہ ہو جیسے ایران اور افغانستان۔ حتیٰ کہ مسٹر جناح نے ایک بیان میں تصریح کردی ہے کہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو یا تو ہندو حکومت کا سٹیزن (شہری) بن جانا ہوگا اور جب کہ مسٹر جناح قوم کو مذہب کے مرادف قرار دیتے ہیں تو ہندو حکومت کے سٹیزن اور ہندو حکومت میں حصہ دار بننے کی صورت صرف یہی ہے کہ وہ ہندو حکومت کا ہم عقیدہ اور ہم قوم بن جائے اور ہندو قومیت میں خود کو مدغم کردے۔

مسٹر جناح دوسری صورت یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہندو حکومت کے ماتحت مسلمان اجنبی ملک کے باشندوں (مستامن) کی حیثیت سے رہیں، جیسے ایران یا افغانستان کے باشندے ہندوستان میں آکر رہ سکتے ہیں۔

یہ دونوں صورتیں پسند نہ ہوں تو مسٹر جناح نے اپنے اس بیان میں وعدہ کیا ہے کہ وہ پاکستان میں ان کا استقبال کریں گے۔

بہ ہر حال اگر صرف حصۂ مستقل اور آزاد خود مختار حکومت کا نام پاکستان ہے تو اس پاکستان کو کانگریس بار بار تسلیم کرچکی ہے۔ ہندوستان کے ہر ایک حصے کے لیے آزادی و خود مختاری حتیٰ کہ علاحدگی کا حق بھی تسلیم کرچکی ہے۔

پھر کانگریس کی مخالفت اور اس کے مقابلے میں انگریز کی حمایت کے کیا معنی؟ جس نے لیگ کی کوئی بات بھی تسلیم نہیں کی اور نہ تسلیم کرنے کا وعدہ۔

اور اگر پاکستان کے یہی معنی ہیں تو جمعیت علماے ہند کیوں مورد عتاب ہے؟ اس کی حمایت اور اتباع کیوں نہیں کی جاتی؟ جمعیتِ علماے ہند لیگ کی تجویز پاکستان سے کہیں زیادہ واضح الفاظ میں اعلان کرچکی ہے۔

''وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا، مسلم کلچر اور تہذیب وثقافت آزاد ہوگی، وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔''

نیز جمعیتِ علماے ہند کا اعلان ہے:

''ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خود مختاری اور آزادی کے حامی ہیں۔ غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یک ساں ہو۔

ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے، مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب وثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی۔ یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔''

(''جمعیتِ علماے ہند کا فارمولا'': منظور شدہ اجلاسِ لاہور ۱۹۴۲ء)

مذکورہ بالا تنقیح اور تنقید کے پیشِ نظر سوال کی صحیح شکل یہ ہے:

صحیح سوال:

ہندوستان پر ایک غیر ملکی حکومت کا جبریہ قبضہ ہے، جس کو ہندوستان کے رہنے والے کسی طرح پسند نہیں کرتے۔ ہندوستانیوں کی خواہش ہے کہ پردیسی قوم کو جو ہزاروں میل دور سے آکر ہمارے ملک و وطن پر جبراً قابض اور متسلط ہے اور ہمارے تمام خزاین و منافع کو ہمارے ہاتھوں سے چھین کر لے جارہی ہے اور جس کی بہ دولت اہلِ ملک بھوکے اور محتاج ہو گئے ہیں جلد سے جلد ہمارا ملک خالی کردے۔ تاکہ اہلِ ملک خود اپنی مرضی کے موافق حکومت قایم کریں اور اپنے ملکی ذخایر سے خود متمتع

ہوں۔ لیکن وہ پردیسی حکومت کسی طرح ہندوستانیوں کی خواہش کا احترام کرنے کو تیار نہیں ہوتی اور اپنی مادی طاقت کے بل پر جبراً حکومت کر رہی ہے۔ ہندوستانیوں کے پاس مادی قوت اور طاقت نہیں ہے۔ کیوں کہ تمام مادی طاقتیں اور قوتیں اسی پردیسی قوم نے اپنے قبضے میں کر رکھی ہیں، حتیٰ کہ ہندوستانیوں کو اتنی بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے بھی ہتھیار رکھ سکیں۔

اس لیے ہندوستان کی ایک مشترک ملکی مجلس بنائی جاتی ہے تاکہ اس میں تمام ملتوں کے نمایندے شریک ہوں اور اس بیرونی طاقت کے مقابلے میں متحدہ محاذ قایم کریں۔ اس جماعت کا اصل اصول یہ ہے کہ وہ صرف انھیں امور میں بحث کرے گی اور انھیں امور کے متعلق تجویز پاس کرے گی جو ہندوستان کی بسنے والی تمام جماعتوں اور ملتوں میں یکسانیت کے ساتھ مشترک ہوں، جو ملکی اور دنیاوی اُمور سے متعلق ہوں۔ اس نے بنیادی اصول یہ طے کیے ہیں کہ ہر باشندۂ ہندوستان کو حقوق ذیل حاصل ہوں گے۔

(۱) اپنی راے آزادی سے ظاہر کرنا اور اشتراکِ عمل و باہمی اختلاط میں مکمل آزادی اور امن کے ساتھ بغیر اسلحہ کے ایسی اغراض کے واسطے مجتمع ہونا جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہ ہوں۔

(۲) ہر باشندۂ ہندوستان کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی اور وہ اپنے مذہب کا اعلان آزادی سے کر سکے گا، اور مذہب کے فرائض و رسوم آزادی سے برت سکے گا۔ بہ شرطے کہ اس سے انتظامِ عامہ اور اخلاق میں کوئی نقص نہ واقع ہو۔

(۳) ملک کی اقلیتوں کے تمدن اور ان کی زبان اور رسم تحریر محفوظ ہوں گے۔ نیز ملک کے وہ مختلف رقبے جو بہ اعتبار اختلافِ زبان کے قایم ہیں ان کا تحفظ ہوگا۔

(۴) تمام باشندگان ہندوستان بلا امتیاز مذہب و مسلک یا ذات و قوم و جنسیت کے قانون کی نظر میں برابر ہوں گے۔

(۵) کوئی باشندۂ ہندوستان خواہ مرد ہو یا عورت بہ وجہ اپنے مذہب یا ذات یا جنسیت کے کسی پبلک ملازمت یا عہدے یا اعزاز سے یا کسی تجارت یا پیشہ سے ممنوع

نہیں سمجھا جائے گا۔

(۶) تمام باشندگان ہندوستان کو متعلق استعمال آب چاہ اور تالابوں کے، نیز تعلیم گاہوں اور مقاماتِ تفریح عامہ کے استعمال کے متعلق کہ جن کی برقراری اور انتظام اسٹیٹ (حکومتِ وقت) کی طرف سے یا لوکل فنڈ (ڈسٹرکٹ یا میونسپل بورڈ) سے ہوتا ہو یا جن کو پرائیویٹ اشخاص نے پبلک کے فایدے کے واسطے مخصوص کر دیا ہو یا مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

اس کے بعد دفعہ ۹ حسب ذیل ہے:

(۹) مذہب کے معاملے میں اسٹیٹ (حکومتِ وقت) غیر جانب دار رہے گی۔ (ملاحظہ ہو بنیادی حقوق و فرایض (فنڈامینٹل رائٹس) پاس کردہ اجلاس آل انڈیا کانگریس کمیٹی، منعقدہ ۸ر اگست ۱۹۳۱ء بہ مقام بمبئی)

دفعہ ۲ کا ابہام مسلمانوں کے تیوہاروں سے زیادہ ہندوؤں کی ہولی وغیرہ کے لیے خطرناک ہے۔ مگر تاہم چوں کہ قربانی کے مسئلے کے متعلق شبہ پیش کیا گیا، لہٰذا کانگریس نے اجلاس کلکتہ منعقدہ ۱۹۳۷ء میں، پھر اجلاس ہری پورہ منعقدہ ۱۹۳۸ء میں تصریح کر دی۔

بنا بریں مسلمانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ آزاد ہندوستان میں اور سوراج کی حکومت میں ان کا مذہب اور مذہبی فرایض، اذان، نماز، جمعہ، عیدین، روزہ، حج، زکوٰۃ، مذہبی تبلیغ، مساجد، مقابر، قربانی، مذہبی جلوس، مذہبی جلسے وغیرہ جملہ مذہبی رسوم اور مذہبی ادارے محفوظ ہوں گے اور اس طرح ان کی تہذیب و تمدن، ان کے تعلیمی ادارے، خانقاہیں، امام باڑے، عیدگاہیں، تکیے، کربلائیں، آثارِ قدیمہ، اوقاف وغیرہ سب محفوظ ہوں گے، کسی پر کوئی رکاوٹ اور قید نہ ہوگی۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''توضیح تجاویز'')

جوابات پر طایرانہ نظر:

مولانا محمد شفیع صاحب نے جوابات کے ضمن میں ''احکام القرآن للجصاص'' اور شرح سیر وغیرہ سے عبارتیں نقل فرمائی ہیں۔ مگر جب کہ سوالات ہی غلط ہیں تو ان

عبارتوں سے استدلال بے موقع، ان کا جواب دینا طول لاطائل اور تضییع اوقات۔

طلوعِ آفتاب کے وقت اگر کوئی شخص نماز پڑھنے کی اجازت مانگے گا تو اس کو منع کر دیا جائے گا اور ایک متفق علیہ حدیث بھی پڑھ کر سنا دی جائے گی۔ لیکن ایک شخص یہ کہہ رہا ہے کہ آفتاب نکل چکا، درختوں کی چوٹیوں اور اونچے مکانات کی منڈیروں کو دیکھو، دھوپ نظر آرہی ہے، کیا اس شخص کے جواب میں بھی اس حدیث کو پیش کیا جائے گا؟ اور اگر کوئی سمجھ دار اس حدیث کو پیش بھی کر دے تو وہ پیش کرنے والے کی دلیل ہوگی؟ یا سننے والا کہہ سکے گا کہ ممانعت کی جو وجہ حدیث میں بیان فرمائی گئی ہے چوں کہ وہ موجود نہیں لہٰذا نماز جائز ہے اور یہ حدیث میری دلیل ہے۔

(۲) مولانا موصوف نے دارالاسلام کا نقشہ سامنے رکھا اور مسلم غیر مسلم کے معاملات کی تین صورتیں بیان فرمادیں، اور ہر ایک صورت کے متعلق احکام القرآن وغیرہ کی عبارتیں نقل فرمادیں۔ مگر افسوس! مولانا اس اہم ترین صورت کو نظر انداز کر گئے جو آج ہندوستان پر چسپاں ہوتی ہے اور شرکتِ کانگریس کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اس کا پیش نظر رکھنا لازمی اور ضروری ہے، ورنہ صحیح جواب مرتب نہیں ہو سکے گا۔

بے شک اگر مسلمانوں کے پاس حکومت، فوجی طاقت، قوت وحشمت ہوتی جیسی کہ حضرات فقہائے کرام کے مبارک زمانوں میں مسلمانوں کے پاس تھی تو کسی غیر مسلم سے استعانت تو درکنار جنگ کے موقعوں پر ان کو ملازم رکھنا یا اسلامی فوج میں ان کو بھرتی کرنا بھی ہم اپنی خودداری غیرت وحمیت اور اپنی تاریخی شجاعت کے مخالف سمجھتے۔ لیکن اس وقت تو یہ صورت درپیش ہے کہ حکومت نہ مسلمانوں کے پاس ہے نہ ہندو کے پاس۔ ہندو اور مسلمان دونوں غلام ہیں۔ تیسری طاقت کے فولادی پنجے کے ظلم واستبداد میں جکڑے ہوئے۔

مسلمان ہندوؤں کے ساتھ وطنی اشتراک رکھتے ہیں اور ملکی لحاظ سے ان دونوں کا مفاد ایک ہے۔ زیادہ صاف الفاظ میں سوال یہ ہے کہ دو کافر ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ مفاد مسلم کا تقاضہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی موافقت کر کے

دوسرے کوختم کردے، آیا یہ جایز ہے یانہیں؟ اگر ایک فریق کی موافقت کرتے ہوئے اس کواس کے جھنڈے کے نیچے آنا پڑتا ہے، اس کوقاید تسلیم کرنا پڑتا ہے، اس کے زیرِ کمان مصایب برداشت کرنا پڑتے ہیں، حتیٰ کہ بعض اوقات جان کی نوبت آجاتی ہے تواس کوجایز کہا جائے گا یانہیں؟

افسوس اور تعجب کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انگریز کے ساتھ ان تمام تعلقات کے جواز کی تو مولانا کھینچ تان کر صورت نکال دیتے ہیں (ملاحظہ ہو فایدہ مہمہ: ص ۱۹) مگر شرکتِ کانگریس پر بحث کرتے ہوئے سرے سے یہ صورت ہی حذف کردیتے ہیں۔ حال آں کہ اسی سیر کبیر میں (جس کی طویل طویل عبارتیں حضرت مولانا محمد شفیع صاحب نے پیش فرمائی ہیں) اس صورت کے متعلق جواز کا حکم موجود ہے۔ اور بہ طور نظیر سیدنا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی پیش فرمایا ہے کہ آپ شاہ حبشہ (نجاشی) کے جھنڈے تلے نجاشی کے دشمن سے لڑے تھے۔

اور وجہ اس کی یہ بیان فرمائی ہے کہ

لم یکن للمسلمین یومئذ ملجأ غیرہ.

(ملاحظہ ہو باب الاستعانة باهل الشرك واستعانة المشركين بالمسلمين)

(۳) حضرت مولانا محمد شفیع صاحب ''تیسری صورت'' کے زیرِ عنوان تحریر فرماتے ہیں:

> ''اور اصل یہ ہے کہ کفر و کفار سے بغض و عداوت اور اظہار مخالفت، اہم مقاصد اسلام میں سے ہے اور اس کے مقابلے میں کفار کی متابعت و موالات اور دوستانہ تعلقات حرام صریح اور مخالطت و مشابہت وغیرہ ممنوع اور ناجایز ہیں۔ صرف مصالحت اور اشتراک عمل کی وہ صورت جس میں غلبہ حکم اسلام کا ہو یا معاملات اجارہ و تجارت کی اجازت دی ہے، باقی ہر قسم کا اختلاط و اشتراک کفار کے ساتھ حرام و ناجایز ہے۔'' (انتہیٰ)
>
> (ص ۲۰)

اس کے بعد آپ نے چند آیتیں اور حدیثیں نقل فرمائی ہیں۔

مولانا کے اس ارشاد کے بعد قرآن حکیم کی آیتوں کا مطالعہ فرمائیے۔ ارشادِ ربانی ہے:

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ.

(سورۂ ممتحنہ: ۸)

''اللہ تعالیٰ تم کو ان (مشرکین) کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف سے منع نہیں کرتا جنھوں نے تم سے دین اور مذہب کے بارے میں جنگ نہیں کی اور تم کو تمہارے وطنوں اور مکانات سے خارج نہیں کیا۔''

غیر مسلم ماں باپ کے متعلق ارشاد ہوا:

صَاحِبْھُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا.

یعنی ان کے ساتھ دنیا میں اسی طرح رہو جس طرح ماں باپ کے ساتھ رہا کرتے ہیں۔

غیر مسلم کتابی عورت کے ساتھ نکاح کی اجازت دی گئی جو انسان کی زندگی کا سب سے عزیز اور دل چسپ رشتہ ہے اور قرآن حکیم اس کی دل بستگی کو ان الفاظ میں ادا فرماتا ہیں۔

ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ. (سورۂ بقرہ: ۱۸۷)

''وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔''

اس قسم کی متعدد آیتوں کے بعد ان بے شمار احادیث پر نظر ڈالیے جو حسن اخلاق، رافت، نرمی اور رحم و کرم کے متعلق وارد ہوئی ہیں جن میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں۔ بالخصوص پڑوسیوں کے ساتھ بلا امتیاز مذہب و ملت حسن سلوک کا یہاں تک حکم ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس درجہ تاکیدی احکام نازل ہوئے کہ مجھے یہ خیال ہونے لگا کہ ان کو ترکے میں بھی کچھ حصہ دیا جائے گا۔

بہ ہر حال اس قسم کی آیات اور احادیث کے پیشِ نظر مولانا کا یہ ارشاد اس عنوان اور تعبیر کے ساتھ قابل قبول نہیں۔ تاہم کسی تاویل کے ساتھ ہم قبول کر سکتے تھے، اگر

حضرت مولانا نے تمام سرکاری محکموں فوج کی خون آشام ملازمتوں، پولیس کی جفا پیشہ نوکریوں کی حرمت کا فتویٰ بھی دے دیا ہوتا، جن میں انگریز جیسے رئیس الکفار کی موالات، اعانت، اس سے محبت، اس کے حق میں وفا شعاری، جاں نثاری اور جاں سپاری کے تمام ملعون فرایض شب و روز انجام دینے پڑتے ہیں، اس خبیث قوم کی حمایت میں غریب مسلمانوں ناموسِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائیوں پر گولیاں چلانی پڑتی ہیں، ان کو تباہ برباد کیا جاتا ہے، بچوں کو یتیم کیا جاتا ہے، باعصمت خواتین کی بے حرمتی کی جاتی ہے اور شوق اطاعت میں خانۂ کعبہ کی خدمت کو بھی (معاذ اللہ) پامال کر دیا جاتا ہے۔ مگر افسوس مولانا ان کے مستامن ہیں، کیوں کہ وہ ہندوستان پر غلبہ حاصل کر چکے ہیں، لہٰذا ان کی اطاعت اور اعانت ضروری ہے۔

(ملاحظہ ہو "فایدۂ مہمہ": ص ۱۹)

(۴) مولانا کے ارشاد مندرجۂ بالا کے بہ موجب لیگ کی شرکت بھی حرام ہے، کیوں کہ لیگ ان تمام ملازمتوں کو جایز قرار دیتی ہے اور اس کے اراکین غیر مسلموں کی اطاعت اور وفاداری کے ذریعے اونچے اونچے خطابات حاصل کیے ہوئے ہیں اور کونسلوں اور اسمبلیوں میں پہنچ کر غیر مسلموں کے ساتھ اختلاط کرتے ہیں، ان سے مل کر قانون بناتے ہیں۔ وغیر ذالک

اگر مولانا لیگ اور کانگریس دونوں کی شرکت کو ناجایز قرار دیتے نیز الیکشن اور انتخابات میں ووٹ دینے کو حرام قرار دیتے، کیوں کہ اس انتخاب سے لامحالہ انگریز یا ہندو کے ساتھ اختلاط و اشتراک کرنا ہوگا۔ تب تو بے شک مولانا کو حق تھا کہ اس اصل کو پیش کریں اور اگر کوئی نکتہ ایسا موجود ہے جس کی بنا پر لیگ کی شرکت اور انتخابات کی جدوجہد کو جایز قرار دیا جا سکتا ہے تو مفتی کا فرض ہے کہ دوسری جانب میں بھی اس نکتے کا لحاظ رکھے۔ ورنہ افتا کے جلیل القدر منصب کی انتہائی توہین ہے اور شریعت غرا کو معاذ اللہ بازیچۂ اطفال بنانا ہے۔

(۵) حضرت مولانا نے صفحہ ۲۱ پر آیت کریمہ پیش کی ہے۔ جس کا ترجمہ مولانا کے الفاظ میں یہ ہے:

''تم کو چال چلنی ہے اچھی ابراہیم کی اور جو اس کے ساتھ تھے، جب کہا اپنی قوم کو ہم الگ ہیں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا۔ ہم منکر ہوئے تم سے اور کھل پڑی ہم میں اور تم میں دشمنی اور بیر ہمیشہ کو جب تک تم یقین نہ لاؤ اللہ اکیلے پر۔''

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں:

''اس آیت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ کفر و اسلام کی تفریق ایسی چیز ہے کہ جو لوگ نسلی طور پر پہلے سے ایک قوم تھے، ان کو اس تفریق نے دو جداگانہ قومیں بنا دیا۔ چہ جائے کہ مسلمانوں کی مستقل قوم کو کفار کے ساتھ ملا کر متحدہ قومیت کا تصور باندھا جائے۔'' (ص ۲۱)

اس آیت کے تحت میں مسئلہ قومیت کو ٹھونس دینا اور اس آیت کریمہ کو قرآن حکیم کی سیکڑوں آیات سے ٹکرا دینا جن میں انبیاء علیہم السلام نے غیر مسلموں کو اپنی قوم کہہ کر خطاب فرمایا ہے حضرت مولانا ہی کا مخصوص کمال ہے۔ اس موقع پر ہم اس مسئلے پر بحث نہیں کرتے۔ اس کی مفصل بحث ''متحدہ قومیت اور اسلام'' (مصنفہ حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی) اور رسالہ ''خطرناک نعرے'' میں ملاحظہ کی جائے۔ حضرت سحبان الہند نے اپنے خطبۂ صدارت جمعیتِ علما کانفرنس میرٹھ منعقدہ ۹، ۱۰/ فروری میں بھی اس مسئلے پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔)

یہاں تو اختصار کے ساتھ یہ عرض کرنا ہے کہ جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مکۂ معظمہ میں ابو طالب وغیرہ کی پناہ میں تھے۔ جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ابن دغنہ کی پناہ لی۔ صحابۂ کرامؓ نے حبشہ جا کر شاہ حبشہ کی پناہ لی اور اس کی فوج میں بھرتی ہو کر شاہ حبشہ کے جھنڈے کے نیچے کھڑے ہو کر اس کے مخالفین کا مقابلہ کیا۔ اس وقت وہ اس آیت کریمہ پر عامل تھے یا نہیں تھے؟

(٦) لطیفہ یہ ہے کہ آپ صفحہ ۲۲ پر مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ کی حدیث پیش فرماتے ہیں ''جو شخص کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرے وہ انھیں میں سے ہے۔'' اس کے باوجود آپ مسلمانوں کو مسٹر جناح، راجہ محمود آباد، سر ظفر اللہ کی زیر قیادت

شرکت لیگ کی دعوت دے رہے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس حدیث کی تائید وتشریح کے طور پر خَالِفُوا الْمُشْرِکِیْنَ اَحفُوا الشَّوَارِبَ وَاعْفُوا اللُّحٰی. کی حدیث بھی پیش فرمارہے ہیں۔ جس کا ترجمہ مولانا کے الفاظ میں یہ ہے۔

''مشرکین کی مخالفت کرو۔ مونچھوں کو کٹواؤ اور داڑھیوں کو چھوڑ دو۔''

(ص ۲۲)

حضرت مولانا اسی سلسلے میں حدیث بھی نقل فرمارہے ہیں۔

اَنَا بَرِیْءٌ مِّنْ کُلِّ مُسْلِمٍ یُّقِیْمُ بَیْنَ اَظْہُرِ الْمُشْرِکِیْنَ.

''میں اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان مقیم ہو۔''

اور لطف یہ ہے کہ حضرت والا کا دولت خانہ دیوبند میں ہے اور وہ بھی ایسے موقع پر کہ سڑک کی دوسری جانب اور پشت کی جانب ہندوؤں کے مکانات ہیں۔ مولانا نے بریکٹ میں ''بہ اختیار خود'' کا لفظ بڑھا کر ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

''جو مشرکین کے درمیان (بہ اختیار خود) مقیم ہو۔''

حال آں کہ مولانا صاحب نہ صرف یہ کہ بہ اختیار خود اس محلے میں مقیم ہیں بلکہ گزشتہ چند سال میں آپ نے قدیم مکان سے ملحق ایک عالی شان مکان بھی اسی محلے میں تعمیر فرمایا ہے۔

حدیث بالکل صحیح ہے۔ ہم بھی اجازت نہیں دے سکتے کہ کوئی مسلمان واشنگٹن یا لندن میں جا کر مقیم بن جائے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو ہماری قومیت (نیشن) سے خارج ہو جائے گا۔ یہی دنیا کا سیاسی آئین ہے۔ مگر افسوس مولانا تو حدیث کو بے محل استعمال کر کے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کو معاذ اللہ بے وقعت کر رہے ہیں۔

معاذ اللہ ہم کفار کے ملک میں نہیں ٹھیرے، ہم اپنے ملک میں ہیں۔ ہندوستان ہمارا ہے، پورا ہندوستان ہمارا ہے۔ ہندو ہندوستان بھی ہمارا ہے۔ پاکستان بھی ہمارا ہے۔ ہم ہندوستان کے ایک چپے سے بھی اپنے اس استحقاق کو ختم نہیں کر سکتے جو ہمارے آبا و اجداد نے صرف اخلاق کی قوت سے نہیں بلکہ فوجی قوت کے ساتھ

ہندوستان کے ہر ایک گوشے اور چپے پر قایم کیا ہے۔

مگر بدقسمتی یہ ہے کہ انگریز ہمارے سروں پر آکر زبردستی سوار ہو گیا۔ ہم اس کو دھکیلنا چاہتے ہیں اور اس جابر قوت کا دھکیلنا مذہبی، اخلاقی، آئینی اور قانونی فرض ہے، ہندو ہمارے ساتھ ہے، لہٰذا ہم ہندو کے ساتھ ہیں۔ انگریز تیسری طاقت ہے جس کو ہم ختم کر رہے ہیں (بفضلہٖ تعالیٰ) وہ نیم جان ہو چکا۔ اب اگر وہ زندگی چاہتا ہے تو ہندوستان سے نکل جائے۔

یہی وہ سبق ہے جو سید الطائفہ مقدام اعظم حضرت مولانا شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں مسلمانانِ ہند کو دیا تھا۔

آپ نے ارشاد فرمایا:

"کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کی ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں موید بنایا ہے۔ اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اجتماع کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش فریقین کے عمایدین نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے خلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ ادھر حکومت کا آہنی پنجہ روز بہ روز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش بھی باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ الخ" (ص ۲۵)

(۷) مولانا محمد شفیع صاحب نے موالاتِ کفار کی حرمت کے متعلق شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہٗ العزیز کا مندرجۂ ذیل ارشاد گرامی نقل کیا ہے:

"رہا یہ شبہ کہ موالات اور چیز ہے اور معاملہ اور چیز ہے۔ آیت موالات کو منع کرتی ہے نہ معاملات کو۔ تو میں کہوں گا کہ ہاں موالات اور

معاملے میں مفہوم کے لحاظ سے فرق ضرور ہے۔ لیکن موالات کے مفہوم میں قربت اور نزدیکی پیدا کرنے والے تعلقات اور باہمی نصرت و معاونت کے تمام ارتباطات لغوی معنی کے لحاظ سے داخل ہیں۔ پس تمام ایسے معاملے جن کی وجہ سے دشمن کے ساتھ میل جول، ربط و اتحاد بڑھے۔ ایسے معاملات جو ان کی معاندانہ طاقت کو بڑھائیں۔ ایسے تعلقات (فوجی ملازمت وغیرہ) جو مسلمانوں کی ہلاکت اور شوکت اسلامیہ کے مٹانے میں دخل رکھتے ہوں، ایسے روابط جن کی وجہ سے انھیں موقع ملے کہ مسلمانوں کی رضامندی پر استدلال کرسکیں، ایسے مراسم جن سے ان کے ساتھ محبت و الفت کا اظہار ہوتا ہو۔ بہ راہِ راست یا بہ واسطہ موالات ممنوعہ محرمہ میں داخل ہیں۔'' (ص ۲۳)

ہر ایک انصاف پسند مولانا محمد شفیع صاحب کی اس جرأت پر یقیناً تعجب کرے گا کہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ارشاد گرامی سے استدلال کرتے ہوئے جس قوم سے موالات کو حضرت شیخ قدس سرہٗ حرام قرار دے رہے ہیں مولانا محمد شفیع صاحب اس سے موالات کو جائز گردانتے ہیں اور جس قوم پر موالات کی مذکورہ بالا تعریف صادق نہیں آتی، وہاں حضرت شیخ کے ارشاد کو پیش کرکے عوام کے لیے سخت مغالطہ پیدا کررہے ہیں۔

ہندو اور انگریز یا بہ الفاظ دیگر کانگریس اور حکومت کے حالات پر نظر ڈالیے، انگریز ہندوستان پر حکم راں ہیں۔ اس کو ہندوستان کے ہر فرد پر ہر ایک اقتدار، تسلط اور برتری حاصل ہے۔ شرعی اصطلاح میں اسی کو ''ولایت عامہ'' کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی حکومت اور اس کے اقتدار کو تسلیم کرلینا اور حاکم ہونے کی حیثیت سے اس کی اطاعت اعلا درجہ کی موالات ہے۔

ہندو یا کانگریس ہندوستان کے حکم راں نہیں۔ کانگریس کا اقتدار اپنے ممبران پر محض اخلاقی ہے، قانونی نہیں۔ حکومت کے حکم سے سرتابی کرنے والے کو ہر ممکن سزا دی جاسکتی ہے۔ اس کو گولی سے بھی اڑایا جاسکتا ہے مگر کانگریس کے حکم سے سرتابی

کرنے والے کو کانگریس اخلاقی سرزنش کے سوا نہ کوئی جسمانی سزا دے سکتی ہے نہ مالی۔

کانگریس کے عہدہ داروں کو نہ حکومت کی عظمت حاصل ہوتی ہے نہ ولایت کی عزت۔ کیا کوئی تسلیم کرسکتا ہے کہ مولانا آزاد صدر کانگریس ہندوستان کے بادشاہ ہیں؟ یا ان کو ہندوستان کے وائسرائے یا کسی عہدہ دار کے درجے کا اختیار اور پاور حاصل ہے؟ کیا ضلع کانگریس کمیٹی کی حیثیت کسی کلکٹر یا کسی تحصیل دار کے برابر مانی جاتی ہے؟ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ آئینی اور قانونی طور پر صدر کانگریس کو میونسپل کمشنر بلکہ ایک کانسٹبل کی قوت اور پاور بھی حاصل نہیں ہوتی۔

کانگریس ایک پنچایت ہے۔ جس طرح ایک محلے کے باشندے محلے کی ضروریات کے لیے ایک مشترک پنچایت بنالیں۔ وہ مشترک ضرورتوں میں باہمی تعاون اور اشتراک عمل کا ایک نظام ہوتا ہے۔ اس کے سرپنچ یا مکھیا کا احترام کیا جاتا ہے۔ مگر اس کو ولی یا حاکم نہیں مانا جاتا۔ اس اشتراک پر موالات کا اطلاق حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کی جدت ہے۔ اگر اس اشتراک عمل یا باہمی تعاون کو حرام قرار دیا جائے تو میونسپل بورڈ، انجمن زمین داران، انجمن تاجران، انجمن وکلا، مزدوروں کی یونین وغیرہ تمام حرام قرار دی جائیں۔ ایک دفتر میں ہندو اور مسلمانوں کا مل کر کام کرنا، ایک کارخانے میں دونوں کا وجود، ایک ہوسٹل میں ہندو مسلم طلبہ کا رہنا، یہ تمام چیزیں حرام ہونی چاہییں۔ مگر کیا آج تک کسی نے ان کو حرام کہا ہے اور کیا مولانا ان کو حرام فرما سکتے ہیں؟

(۸) حضرت مولانا محمد شفیع صاحب اس سے انکار نہیں کرسکے کہ حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت سید الطائفہ مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند قدس سرہما العزیز نے شرکت کانگریس کے جواز کا فتویٰ دیا۔

آپ ان دونوں بزرگوں کے احترام پر بھی مجبور ہیں اور ان کے فتووں سے کھلے طور پر انحراف وسرتابی بھی پسند نہیں فرماتے۔ لہٰذا آپ نے ایک منطقی حل تحریر فرمایا یعنی۔ کانگریس کے دو دور قرار دے کر ہر ایک کے متعلق علاحدہ علاحدہ احکام تجویز

فرمادیے۔ (دیکھو صفحہ ۳۹)

ہم یہاں پر مولانا کے پیش فرمودہ دونوں دور نقل کر کے ان کے متعلق مختصر سی روشنی ڈالنا تکمیل مضمون کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ نے کانگریس کے پہلے دور کی پہلی اور دوسری خصوصیت یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگِ آزادی کے علم بردار اور تحریک پر قابو یافتہ مسلمان تھے۔ ہندو ساتھ لگ گئے تھے۔

دوسری خصوصیت یہ ارشاد فرمائی ہے.

مسلمانوں کی اپنی تنظیم بہ ذریعۂ خلافت کمیٹی مکمل تھی اور جماعتی حیثیت سے اہلِ خلافت نے ہندوؤں سے صلح کی تھی۔

اس کے بر مقابل دوسرے دور کی پہلی اور دوسری خصوصیت یہ بیان فرمائی:

(۱) جنگِ آزادی کے علم بردار اور تحریک پر پورے قابو یافتہ ہندو ہیں۔ مسلمان ساتھ لگ گئے ہیں۔

(۲) موجودہ کانگریس میں مسلمانوں کی مستقل قومیت ہی تسلیم نہیں اور نہ کوئی مطالبہ قومی اور مذہبی حیثیت سے کانگریس کے پلیٹ فارم پر سنا جا سکتا ہے۔ کانگریس میں داخلہ انفرادی طور سے اور وہ بھی بلا شرط ہو سکتا ہے۔

ہماری دیانت وصداقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان دونوں دوروں کی دونوں خصوصیتوں کو غلط کہیں اور مولانا کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کریں کہ آپ جیسے گوشہ نشین مصنفین کے لیے موزوں یہی ہے کہ ان سیاسی قصوں کو انھیں خدام کے حوالے کر دیں جنھوں نے اپنی عزیز زندگیاں ان کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔

مولانا نے تحریکِ خلافت کے زمانے کو کانگریس کا پہلا دور قرار دیا ہے۔ حال آں کہ

(الف) اس سے تقریباً ۳۵ سال پیشتر حضرت گنگوہی اور حضرت شیخ الہندؒ شرکت کانگریس کا فتویٰ صادر فرما چکے ہیں۔

(ب) اس وقت (۱۸۸۸ء) میں مسلمان کانگریس میں بہت کم ہیں، کانگریس میں زیادہ تر ہندو ہیں، قیادت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے، سرسید کی سرکردگی میں ہندو

مسلمانوں کی مشترک جماعت دوسری ہے، اس میں اکثریت مسلمانوں پر وہ اسی طرح چھائی ہوئی ہے جیسے آج لیگ چھائی ہوئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ''نصرۃ الابرار'' کے سوال سوم کے الفاظ جو اس حقیقت کو واضح کررہے ہیں۔

سید احمد خاں نیچری نے جو ایک جماعت ایسوسی ایشن قایم کی ہے (الی قولہ) اور اس کی مدد کے واسطے جابجا ایسوسی ایشنیں انجمن اسلامیہ کے نام سے لوگوں نے شہروں میں قایم کی ہیں، جو شخص ان سے اتفاق کرنے سے برخلاف معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ طرح طرح کا فساد اور فتنہ برپا کرکے اس کو جبراً ملانا چاہتے ہیں۔ آیا ایسی جماعت میں مسلمانوں کو شامل ہونا اور ان کی مدد کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اور نیچری لوگ بدخواہ اسلام ہیں یا نہیں؟

(ج) مسلمانوں کو مستقل قوم کی حیثیت سے اس وقت بھی کانگریس تسلیم نہیں کرتی تھی۔ چناں چہ کانگریس کے اجلاس اول منعقدہ ۱۸۸۵ء مین کانگریس کا پہلا مقصد یہ قرار دیا گیا کہ

(۱) ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متفق و متحد کرکے ایک قوم بنانا۔

(۲) اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو اس کی دماغی، اخلاقی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔

(ملاحظہ ہو: روشن مستقبل، شان دار ماضی، علماے حق کے مجاہدانہ کارنامے وغیرہ)

اور کانگریس کی اسی تجویز کے بعد انگریز نے ہندو مسلم دو جدا قومون کا الہام اپنے پرستاروں کے دلوں میں ڈالا۔ چناں چہ سرسید جو پہلے ہندو مسلمانوں کو ایک قوم کہا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک تقریر میں انھوں نے ہندوؤں سے شکایت کی تھی کہ وہ ان کو ہندو کیوں نہیں کہتے؟ اس الہام کے بعد مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا اعلان کرنے لگے اور اسی تفرقہ انگیز مقصد کے لیے اپنی اور کالج کی تمام سرگرمیاں وقف کردیں۔ (ملاحظہ ہو ''روشن مستقبل'' وغیرہ)

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے فتوے کے وقت یہ ماحول

موجود تھا۔

(د) کانگریس کی تاریخ موجود ہے۔ سال بہ سال صدروں کے نام موجود ہیں۔ ۱۸۸۸ء کے اجلاس منعقدہ الہ آباد کے صدر جارج یول تھے۔

(ہ) مولانا فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی تنظیم خلافت کمیٹی کے ذریعے مکمل ہو چکی تھی۔ حال آں کہ شیخ الہندؒ کے اس خطبے کے وقت جس کا اقتباس سطور بالا میں پیش کیا گیا، خلافت کمیٹی کی عمر کل ایک سال تھی۔ کیوں کہ نومبر ۱۹۲۰ء میں یہ اجلاس ہوا، جس کی صدارت حضرت شیخ رحمہ اللہ نے فرمائی۔ اور ۱۹۱۹ء میں چند روز کے فرق سے جمعیۃ العلماء اور خلافت کمیٹی کا قیام ہوا۔

(و) خلافت کمیٹی کی تنظیم مسئلہ خلافت کی بنیاد پر تھی۔ چناں چہ خلافت کے ختم ہونے کے ساتھ وہ تنظیم بھی ختم ہو گئی۔ آزادئ ہند کے لیے کانگریس کا نظام یہی تھا۔

(ز) آزادئ ہند کی تحریک کے قاید اس وقت بھی مسٹر گاندھی تھے۔ چناں چہ ستیا گرہ کی تحریک مسٹر گاندھی نے جاری کی۔ انھیں کی قیادت میں وہ تحریک چلتی رہی اور ۵ر فروری ۱۹۲۲ء کے چوری چورا کے واقعے کے بعد مسٹر گاندھی نے تحریک کو بند کر دیا۔ اسی وجہ سے کہ تحریک کی باگ ڈور مسٹر گاندھی کے ہاتھ میں تھی۔ کھدر پہننے، چرخہ چلانے اور ستیا گرہ کے متعلق مخالفین تحریک نے وہی الزام لگائے جو آج مولانا عاید فرما رہے ہیں۔

اس وقت حضرت مولانا محمد شفیع صاحب نے خود چرخہ کاتا یا نہیں؟ اس کا علم تو مولانا کو ہوگا۔ البتہ یہ دنیا جانتی ہے کہ آپ نے وقت کے مناسب ایک رسالہ لکھا جس میں چرخہ کاتنے کی فضیلت بیان کی تھی۔ وہ رسالہ بہت مقبول ہوا اور بے شمار فروخت ہوا۔

(ح) ارشاد ہوتا ہے کہ جماعتی حیثیت سے اہلِ خلافت نے ہندوؤں سے صلح کی تھی۔ کیا حضرت مولانا اس دعوے کا کوئی ثبوت پیش فرما سکتے ہیں؟

کس قدر تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ مولانا محض اپنے مزعومات کی تصحیح کے لیے اپنی مرضی کے موافق واقعات تصنیف فرما رہے ہیں۔ اگر یہ ارشاد ہوتا تو ایک

حقیقت بھی رکھتا کہ اہلِ لیگ نے ہندوؤں سے صلح کی تھی۔ کیوں کہ ۱۹۱۶ء میں مسٹر جناح کانگریس سے میثاق کر چکے تھے، مگر اہلِ خلافت اس زمانے میں جیل خانوں میں تھے اور انھوں نے اس میثاق کو پسند نہیں کیا۔ کیوں کہ اس میثاق میں مسٹر جناح نے شوقِ قیادت میں مسلمانوں کے حقوق کا گلا گھونٹا تھا۔ پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کو اقلیت بنا دیا تھا۔

(ملاحظہ ہو ''مسلم لیگ کی آٹھ مسلم کش سیاسی غلطیاں'' اور ''توضیح تجاویز'')

بہ ہر حال اہلِ خلافت سے کوئی صلح نہیں ہوئی۔ اور اگر مصالحت سے یہ مراد ہے کہ کانگریس نے ایسے اصول قرار دیے تھے جو مسلمانوں کے لیے اطمینان بخش تھے تو وہ اصول آج بھی موجود ہیں بلکہ ان میں بہت زیادہ باضابطگی پیدا ہوگئی اور متعدد اجلاسوں میں ان کا اعادہ کیا جا چکا ہے۔

(۹) دورِ اول کے سلسلے میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ارشاد کو نقل کرنے کے بعد مولانا محمد شفیع صاحب نے چند نتیجے اخذ کیے ہیں۔ ان میں سے ''الف'' اور ''ج'' کا اجمالی جواب سطور بالا میں گزر چکا۔ نتیجہ ''ب'' حسبِ ذیل ہے۔

(ب) اس تائید و حمایت کو بہ ضرورت وقت غنیمت سمجھا گیا۔

مولانا نے یہ تشریح نہ فرمائی کہ وہ ضرورت کیا تھی۔ اور وہ اب کس طرح ختم ہوگئی؟ کیا ہندوستان آزاد ہو چکا اور تحریک خلافت کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہو گیا؟ فلسطین، عراق، شام وغیرہ سے یورپین حکومتوں کا انتداب اُٹھ گیا؟ کیا دوسری جنگِ عظیم میں عربوں کو تنگ نہیں کیا گیا؟ ایران پر قبضہ بھی جما لیا گیا جو اب تک باقی ہے۔ رضا شاہ پہلوی کو ایران بدر کر کے غریب الوطنی کی موت پر مجبور نہیں کیا گیا؟ وغیرہ وغیرہ

نتیجہ (د) میں تحریر فرماتے ہیں:

جوازِ صلح کے لیے شرائط یہ نہیں کہ (۱) خدا کی باندھی ہوئی حدود میں اس مصالحت سے کوئی رخنہ نہ ڈالا جائے۔ (یہ شرط بہ طور شرط آج بھی ہے۔ جمعیتِ علما

کے کسی رکن کا قول یا دوسری کوئی تجویز بھی اس شرط کے برخلاف نہ ہوگی۔ یہ دوسری بات ہے کہ محض افواہ پر اعتماد کر کے فیصلہ کرلیا جائے، اس کا کوئی علاج نہیں۔ باقی بعض وہ لوگ جو کسی امر میں بھی حدود شریعت کا لحاظ نہیں رکھتے اگر وہ تحریک کے بارے میں حد سے تجاوز کر جائیں تو ان کی ذمے داری خود انھیں کے اوپر ہے۔ ایسے بے مہار لوگ خود حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے اس ارشاد کے وقت بھی موجود تھے جس کی جانب خود حضرت رحمہ اللہ کے اسی ارشاد کے مندرجۂ ذیل فقرے میں اشارہ موجود ہے

''..... یا مسلمان ہندوارتھی کو کندھا نہ دے!'' (ص ۲۶)

(شرط دوم) فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنا امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔ (ص ۲۷)

یہ شرط کانگریس کے نزدیک اب بھی مسلم ہے۔ باقی ودیا مندر اسکیم وغیرہ کے نام سے جو اشتباہ مولانا کو پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے متعلق چند سطور بعد عرض کیا جائے گا۔

(۳) دنیاوی معاملات میں صلح وآشتی اور رواداری کو شیوہ بنایا جائے، اگر اس شرط کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک ہندو اور ہر ایک مسلمان اس پر عمل پیرا ہو ورنہ صلح ختم۔ تو انفرادی طور پر اس قسم کی شرط نہ شرعاً ضروری ہے نہ عادتاً ممکن۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ملک کا ہر ہر فرد قانون کا پابند اور شرایط پر مکمل عمل پیرا ہو۔ بالخصوص اس عمومی جہالت کے زمانے میں جب کہ لاکھوں انسان ہر روز آئین اور اخلاق کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتار ہوتے رہتے ہیں اور جیل خانوں کو آباد کرتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں خود انھیں ایام میں کٹار پور وغیرہ کے مشہور فسادات ہوئے جن میں فریقین کے بہت سے آدمی مارے گئے، مگر ان فسادات سے اس صلح میں کوئی فرق نہیں آیا۔

(ملاحظہ ہو ''روشن مستقبل''، ''تاریخ مسلم لیگ'' وغیرہ)

کاش! حضرت مولانا محمد شفیع صاحب حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے مندرجۂ ذیل فقروں پر بھی نظر ڈال لیتے۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں:

''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذاہب کی حد سے گزر جاتے ہیں، لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتا ہے۔''

(ص ۲۶، سطر ۴-۷)

''ان کو (لیڈروں) کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔''

آخر میں ارشاد ہے:

''ان دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائیاں اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں، اتفاق کے حق میں سم قاتل ہے۔''

ہم حیران ہیں کہ حضرت شیخ رحمہ اللہ کی ان تصریحات کی موجودگی میں کس طرح وہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں جو مولانا نے تصنیف فرمائے۔

کیا یہ الفاظ شہادت نہیں دے رہے کہ صلح و آشتی کی فضا مطلوب اور مقصود ہے۔ مگر موجود اس زمانے بھی نہیں! اور وہ تمام جھگڑے جن کی بنا پر آج مولانا محمد شفیع صاحب شرکت کانگریس کو حرام قرار دے رہے ہیں۔ اس وقت بھی موجود تھے جب یہ خطبہ حضرت شیخ الہندؒ کی جانب سے اسٹیج پر پڑھا جا رہا ہے۔

(۳) دورِ اول کی تیسری خصوصیت کے متعلق ارشاد ہے۔

اس وقت مصالحت میں سب سے اہم چیز یہ تھی کہ محض ایک سیاسی مطالبہ یعنی آزادیٔ ہندوستان میں اشتراک ہوگا۔ فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنا امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے گا۔

اس کے برمقابل دوسرے دور کی تیسری خصوصیت مولانا نے حسبِ ذیل ارشاد فرمائی:

''اب کانگریس مسلمانوں کے مذہبی، تمدنی، معاشرتی سب امور میں

نہ صرف یہ کہ دخل دینا چاہتی ہے بلکہ جبری طور سے شعائرِ اسلام کو مٹا کر
ہندو رنگ چلانے کی سعی پیہم کر رہی ہے۔" (ص ۴۵)

تیسری خصوصیت کے الفاظ سے یہ تو واضح ہو گیا کہ مطالبۂ آزادی میں ہندو سے اشتراک جائز ہے۔ باقی دورِ ثانی کے متعلق جو ارشاد ہوا وہ ایک انصاف پسند واقف حال انسان کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

کاش! مولانا کچھ تشریح فرما دیتے کہ کانگریس نے اسلام کے کس شعار کو مٹایا، کانگریس نے کہاں کہاں جبر کیا اور کس موقع پر مسلمانوں کے متعلق ہندوانہ رنگ کے غلبہ کی پیہم سعی کی؟

اگر "کانگریس" اور "کانگریسی حکومت" کا فرق بھی مولانا کے پیش نظر ہے تو کانگریس کی جانب "جبر" کی نسبت اور بھی زیادہ تعجب انگیز ہو جاتی ہے۔ مسلم لیگ کی طرح کانگریس بھی ایک عوام کی جماعت ہے۔ اس کا کوئی فیصلہ حکومت کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات حکومتِ وقت کے مخالف ہوتا ہے اور اسی بنا پر کانگریس اور حکومت میں تصادم ہوتا رہتا ہے۔ مسلم لیگ، جمعیتِ علما جیسی جماعتوں کی طرح کانگریس کا ہر ایک فیصلہ مشورہ اور اپیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو تسلیم کرنا ایک اخلاقی فرض ہوتا ہے۔ قانونی فریضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات قانون کے مخالف ہوتا ہے۔ لہٰذا کانگریس کے فیصلے کو جبر نہیں کہا جا سکتا۔

بایں ہمہ کانگریس کے کسی فیصلے کے متعلق بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ وہ شعائر اسلام کے مخالف ہوتے ہوئے مسلمانوں کے لیے لازم اور ضروری گردانا گیا اور پھر یہ کہنا تو سراسر افترا اور بہتان ہے کہ شعائر اسلام کے برخلاف ہونے اور مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود کانگریس نے اس کو باقی رکھا اور مسلمانوں کے احتجاج کا ذرہ برابر اثر نہیں لیا۔

یہ بات غیر ممکن نہیں کہ کانگریس کا کوئی فیصلہ کسی اسلامی حکم کے مخالف ہو جائے اور جمعیتِ علما کا ایک کام یہ بھی ہے کہ اگر کوئی فیصلہ خلاف شرع ہو تو اس پر تنبیہ کر کے اس کی اصلاح کرائے۔ مگر واقعات کی دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی کہ کانگریس

نے کوئی فیصلہ خلاف شرع کیا اور جمعیتِ علما یا مسلمانوں کی تنبیہ کے باوجود اس میں تبدیلی نہیں کی۔

مولانا نے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب کے ان مضامین کے اقتباسات نقل کیے ہیں جو واردھا اسکیم یا نہرو رپورٹ کے متعلق ان حضرات نے شایع فرمائے تھے۔ ہمیں ان مضامین سے انکار نہیں بلکہ ہم فخریہ کہتے ہیں کہ وہ مضامین شایع کیے گئے۔ وہ مضامین درحقیقت علماے جمعیت کے دعوے کی دلیل ہیں کہ وہ کانگریس کے تابع یا اس کے مقلد نہیں۔ ہر معاملے میں وہ راے رکھتے ہیں۔ اگر کانگریس کا فیصلہ اس کے موافق ہوتا ہے تو وہ کانگریس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اگر مخالف ہوتا ہے اس پر سخت سے سخت تنقید کرتے ہیں۔ اس کا مقابلہ کرتے ہیں تاوقتے کہ ان کی راے کے موافق نہ ہو جائے۔ چناں چہ ان دونوں مسئلوں میں کانگریس کو جھکنا پڑا۔ نہرو رپورٹ دریاے راوی میں غرق کی گئی اور واردھا اسکیم ملتوی کردی گئی۔

ودیا مندر واردھا اسکیم وغیرہ:

مولانا نے اس موقع پر اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل پیش نہیں فرمائی۔ البتہ صفحہ ۳۰ پر ارشاد ہے۔

چناں چہ کانگریسی جھنڈے کو ہندوانہ اسلامی اور بندے ماترم کا مشرکانہ ترانہ تو کانگریس کے آئین وشعار میں داخل کرلیا گیا۔

> ''واردھا اسکیم، ودیا مندر اسکیم، دیہات سدھار اسکیم کے نام سے ایسے قانون پورے ہندوستان کے لیے جاری کیے۔ جن کا سیاست اور آزادی کے مطالبہ سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ ان سب کا خلاصہ ہندوستان کی ہر قوم مسلم وغیر مسلم کو ہندوانہ رنگ میں رنگنے اور ہندو طرزِ معاشرت اور مشرکانہ رسم و رواج کا عادی بنانے کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی زبان بھی بجاے اردو کے ہندی بنانے کی پیہم کوشش شروع

کر دی اور دفتری زبان تو جہاں جہاں بس چلا بدل ہی ڈالی۔ الخ‘‘

(ص ۳۰)

یہی وہ مادہ ہے جس پر مولانا کے تمام فتوے کا مدار ہے اور جس کو انتہائی غیض و غضب کے ساتھ مولانا نے پیش فرمایا ہے۔ مگر افسوس! واقعات کے پیشِ نظر ہم اس تمام بیان کو تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ حضرت مولانا سے شکایت ہے کہ مولانا نے تحریر فتوے کے وقت صرف لیگی پروپیگنڈے پر اعتماد کیا، اصل حقیقت کی قطعاً تحقیق نہیں فرمائی۔

جھنڈے کی سلامی:

اگر جھنڈے کو سلامی مشرکانہ فعل ہے تو اسلام کا کوئی اصول کانگریسی اور احراری یا لیگی جھنڈے میں تفریق کر کے ایک کے لیے سلامی کو جائز اور دوسرے کے لیے حرام اور مشرکانہ فعل نہیں قرار دے سکتا۔

کیا لیگ کے جھنڈے کو سلامی نہیں دی جاتی؟ کیا احراری اپنے جھنڈے کو سلامی نہیں دیتے؟ اگر سلامی دینا ناجائز اور مشرکانہ رسم ہے تو پہلے حضرت مولانا کو اسلامی جماعتوں اور بالخصوص لیگ کو ہدایت کرنی چاہیے تھی، اس کے بعد اس کو کانگریس کے مظالم میں شمار کرنا چاہیے تھا۔ اگر بادشاہ کے سامنے زمین بوسی ناجائز ہے کیا مولانا ہندو بادشاہ اور مسلمان بادشاہ میں فرق کریں گے؟ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کو تو جہانگیر بادشاہ نے اسی بات پر دو سال کی سزا دی تھی کہ حضرت مجدد صاحبؒ نے جہانگیر کے سامنے زمین بوسی اور سجدے کو حرام قرار دیا تھا۔

بہر حال اگر جھنڈے کی سلامی مشرکانہ رسم ہے تو اس جرم میں احرار، لیگ اور کانگریس وغیرہ تمام جماعتیں مساوی حیثیت رکھتی ہیں۔

رہ گیا کانگریسی جھنڈا تو اس کو ہندوانہ علامت قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے یونین جیک کو عیسائیوں کا شعار گردانا جائے۔ مگر دنیا جانتی ہے کہ یونین جیک عیسائیوں کا شعار نہیں، وہ برطانوی سامراج کی علامت ہے۔ اسی طرح کانگریس کا ترنگا جھنڈا

ہندوؤں کا شعار نہیں بلکہ ہندوستان کے غریب اور کم زور مزدوروں اور کسانوں کی متفقہ آواز کی علامت ہے جو حکومت برطانیہ کے یونین جیک کے مقابلے میں بلند کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے سامراجی حکومت اس کی مخالف ہے اور جب چاہتی ہے اس کو خلاف قانون قرار دے دیتی ہے۔ ہندو کے مذہبی جھنڈے دوسرے ہیں جو مختلف رنگوں اور مختلف سایز کے ہوتے ہیں۔

باقی رہا سلامی دینے کا طریقہ تو وہ تمام جماعتوں کا ایک ہے۔ اگر کانگریس کے حق میں وہ مشرکانہ اور ہندوانہ ہے تو دوسری جماعتوں کے حق میں اس کا یہی حکم ہونا چاہیے۔

بہ ایں ہمہ نہ کانگریس کے آئین میں ہے اور نہ کسی کانگریس مین کے لیے ضروری ہے کہ وہ لامحالہ جھنڈے کو سلامی دے۔ احقر تقریباً سولہ سال سے کانگریس کا ممبر ہے، مگر کبھی جھنڈے کی سلامی یا پرارتھنا میں شرکت کو احقر پر یا اس کے ساتھیوں پر ضروری نہیں قرار دیا گیا۔

بندے ماترم کا مشرکانہ ترانہ:

اس سلسلے میں مولانا نے حیرت انگیز پردہ داری سے کام لیا ہے، اس کو دوسرے دور کی پیداوار قرار دیا ہے، حال آں کہ یہ ترانہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں تحریکِ بنگالہ کے دوران میں تصنیف ہوا تھا، جس کو تقریباً ساٹھ سال گزر گئے۔ کانگریس کے اسی دوران میں (جب کہ مولانا کے نزدیک شرکت کانگریس جایز تھی) یہ پورا ترانہ پڑھا جاتا رہا۔

۱۹۳۰ء کی تحریک کے دوران میں یہ اعتراض پیدا کیا گیا کہ اس ترانہ کے کچھ بند ایسے ہیں جن سے شرک کی بو آتی ہے۔ کانگریس نے سرکاری طور پر اس ترانہ کو اب تک منظور نہیں کیا تھا، ل البتہ ایثار اور قربانی کی اس تاریخ کی بنا پر جو اس ترانہ کے ساتھ وابستہ ہے، کانگریسی ہندوؤں نے اس کو یاد کرلیا تھا۔ بہ ہر حال مسلمانوں کے اعتراض کے بعد اس ترانہ کے متعلق کانگریس نے غور کیا۔

تحریک بنگالہ کی تاریخ سے دل چسپی رکھنے والے اس ترانے کے حامی تھے۔ مگر کانگریس نے مسلمانوں کے اعتراض کے پیش نظر تمام قابل اعتراض اشعار کو خارج کر کے صرف ابتدا کے دو شعروں کے جس کا مضمون قابل اعتراض نہیں، پڑھنے کی اجازت دی۔ یہ صرف اجازت ہے لزوم قطعاً نہیں۔

چناں چہ بندے ماترم کے دو شعر کسی کسی کانگریسی ہندو کو یاد ہوتے ہیں۔ سلامی کے وقت بسا اوقات یہ اشعار نہیں پڑھے جاتے اور اگر مسلمانوں کا اصرار اتنا شدید نہ ہوتا تو یہ دو شعر بھی ختم ہو چکے ہوتے۔ بندے ماترم کے بند کے بعد ایک گیت پڑھا جاتا ہے وہ بھی دورِ اول ہی کی یادگار ہے۔ اس کی زبان بے شک ہندی اور ٹھیٹ ہندی ہے۔ اس کے مضمون پر آج تک کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ مگر اس نظم کا پڑھنا بھی ضروری نہیں بلکہ کانگریس کی طرف سے عام اجازت ہے کہ جو نظم جس زبان میں پسند ہو، پڑھی جائے۔ چناں چہ تقریباً دس سال پیشتر بہت سی نظمیں اردو میں لکھی گئیں۔ ان کو یاد بھی کیا گیا اور پڑھا بھی گیا۔ خان عبدالغفار خان صاحب کی جماعت نے ایک پشتو کا ترانہ مقرر کر رکھا ہے وہ اس کو پڑھتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی جماعت کوئی دوسری نظم اختیار کر لے تو کانگریس کی طرف سے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

گرام سدھار اسکیم:

ہمیں افسوس ہے کہ اس کے متعلق جو کچھ تحریر کیا گیا وہ انتہائی درجے غلط اور گم راہ کن ہے۔ یہ اسکیم کانگریسی وزارتوں سے پہلے سے جاری تھی، کانگریسی نظام کا مقابلہ کرنے کے لیے سرکاری طور پر جاری کی گئی تھی، تاکہ دیہاتیوں کو اس میں الجھا کر شرکت کانگریس سے روکا جائے اور یہی خدمت اس نظام نے کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہونے کے بعد انجام دی۔

دورانِ جنگ میں اس نظام کے ذریعے سے فوجی بھرتی اور پروپیگنڈے کا کام لیا گیا۔ کانگریسی وزارتوں نے اپنے زمانے میں اس کی اصلاح کی اور اس کو ترقی

دینے کی کوشش کی۔ حضرت مولانا کے نزدیک برطانوی سامراج کا ہر ایک فعل خالص اسلامی تعلیمات کے مطابق اور اسلامی شعایر کو ترقی دینے والا ہوتا ہے، لہٰذا انگریزی حکومت کے کسی فعل پر کوئی نکتہ چینی کس طرح کر سکتے ہیں؟ بلکہ نکتہ چینی گناہ ہے۔ مشرکانہ حکومت تو کانگریسی وزارت ہی ہے، لہٰذا کانگریسی دور کے گرام سدھار پر اعتراض کر دیا گیا۔ حال آں کہ کانگریسی دور کے گرام سدھار کے ممبران اور عہدہ داران اکثر و بیشتر لیگی صاحبان تھے اور ملازمین تو بیشتر لیگی ہی رہے۔ یہ کانگریسی وزارت کی دوسری اسلام دشمنی اور شرک پرستی تھی کہ اس نے عہدوں اور ملازمتوں کے سلسلے میں لیگیوں کو مسلمان کانگریسیوں پر ترجیح دی۔ نواب صاحب چھتاری اور نواب اسماعیل خاں صاحب (میرٹھ) جب وزارت سے محروم ہوئے تو گرام سدھار ضلع کی چیرمینی ہی کو غنیمت سمجھا۔

یا حبذ الا مارولو علی الحجارۃ.

''حکومت ہو خواہ کنکریوں ہی پر ہو۔''

بہ ہر حال اصلاح دیہات یا گرام سدھار کا منشا مذہبی اصلاح نہ تھا، نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے! اس کا منشا فقط اقتصادی اور عمرانی اصلاح ہے۔ مثلاً دیہات کے راستوں اور گلیوں کی صفائی، دیہات کے کنوؤں کی درستی، گاؤں والوں کے لیے دواخانوں اور اطبا کا انتظام، حلقہ بہ حلقہ حکیموں یا ڈاکٹروں کا تقرر، شبینہ مکاتب کا قیام، چھوٹے چھوٹے دارالمطالعہ اور کتب خانے قایم کرنا تاکہ زیادہ سے زیادہ آبادی کو خواندہ بنایا جائے۔

ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دیہاتی پنچایتیں قایم کی جائیں اور پولیس کی رشوت ستانی اور انگریزی عدالتوں کے پے چیدہ نظام کے باعث جو پریشانیاں عوام کو پیش آتی ہیں ان کا انسداد ہو۔ عدل و انصاف کو فریضۂ انسانی کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ سہل الحصول کر دیا جائے اور ہندوستان میں تمام مہذب دنیا کے آئین و قانون کے برخلاف اسٹامپ وغیرہ کے ذریعے جو لوٹ جاری ہے اور انتہائی درجے شرم ناک طور پر عدل و انصاف کو جس طرح گراں کر دیا گیا ہے۔ اس کو رفتہ رفتہ ختم کیا جا سکے۔

بہ ہر حال کانگریسی اصلاحات انگریزی حکومت کے لیے یقیناً تباہ کن ہیں مگر مسلمانوں یا اسلام کے لیے ان کی مضرت اسی وقت تک ہے جب تک کسی لیگی صاحب کو کوئی عہدہ یا کوئی ملازمت نہیں ملتی۔

اس قسم کی تلبیس کے لیگی صاحبان تو عادی ہیں مگر حضرت مولانا کے لیے قطعاً موزوں نہیں۔

مولانا موصوف نے حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی ایک تحریر کا بھی حوالہ دیا ہے، مگر لطیفہ یہ ہے کہ تحریر میں شکایت ہے مدھوبنی آشرم اور پھل واری کیمپ جیل کے نصابِ تعلیم کے متعلق اور حضرت مولانا نے عنوان قایم فرمایا ہے ''دیہات سدھار اسکیم کے خلاف احتجاج'' بہ ظاہر مولانا دیہات سدھار، اور مدھوبنی آشرم یا کیمپ جیل کے باہمی فرق کو نہیں سمجھتے کہ ایک شعبے کی شکایت دوسرے شعبے کے سر تھوپ رہے ہیں۔ اس قسم کی بھول بھلیاں منصب افتا کے تو قطعاً خلاف ہے۔

بہ ایں ہمہ جمعیتِ علما کی یہ کوشش ہے کہ تمام مسلمان آبادیوں میں اس کی شاخیں قایم ہو جائیں جو اسلامی پنچایت کی حیثیت رکھیں اور خالص شرعی امور میں گرام سدھار کا متبادل نظام ہو اور صوبائی طور پر نیز مرکزی طور پر امیر شریعت ''والی مسلم'' کا انتخاب ہو جائے۔ تاکہ بیت المال کا نظام با قاعدہ ہو سکے اور تعلیمی، تبلیغی، معاشی اور اصلاحی اداروں کی نگرانی اور ان کا تکفل بہ آسانی ہو سکے۔ مگر افسوس! جمعیتِ علماے ہند کی اس جدو جہد کے لیے بھی حضرت مولانا محمد شفیع صاحب جیسے بزرگوں کو شکوک و شبہات ہی رہتے ہیں۔ جو جمعیتِ علما کی جدو جہد کی راہ میں دشوار گذار چٹان بن جاتے ہیں۔

ودیا مندر اسکیم:

یہ اسکیم نہ کانگریس کی تجویز کردہ تھی نہ منظور کردہ۔ سی پی کی وزارت نے ایک تعلیمی نظام قایم کیا اور اس کا یہ نام رکھ دیا۔ جمعیت علما نے اس پر شدید نکتہ چینی کی اور وہ اس میں بہت کچھ اصلاحات کرانا چاہتی تھی مگر لیگی حضرات نے وزارت سے سمجھوتا

کرلیا اور اس کے مقابلے میں "مدینۃ العلم" کی اسکیم حکومت سے منظور کرالی۔

یہ صرف چند ماہ میں ہو گیا۔ مگر لیگی صاحبان کی یہ ایمان داری ہے کہ شور و غوغا اب تک باقی ہے۔ حتیٰ کہ مولانا کو یہ دھوکا ہو گیا کہ کانگریس نے کوئی توجہ ہی نہیں کی، اور اسی غلط فہمی کی بنا پر یہ طویل و عریض فتوی صادر فرمادیا۔

واردھا اسکیم:

غالباً احقر کا یہ خیال درست ہے کہ یہ اسکیم بھی کانگریس کی تجویز کردہ نہیں ہے۔ بلکہ اچھوت ادھار کی طرح سے مسٹر گاندھی کی ایک تجویز تھی، جس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے گاندھی جی نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی زیرِ صدارت ایک کمیٹی بنادی اور اس کمیٹی نے یہ اسکیم مرتب کی۔ یہ اسکیم مفید ہے یا مضر؟ اس کے متعلق خود علما کے دو خیال ہیں۔ بہ ہر حال اکثریت نے اس کو پسند نہیں کیا۔ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب اور آپ جیسے گوشۂ نشین حضرات کو تو غالباً نافذ ہو چکنے کے بعد بھی اس کے نقصان اور نفع کی خبر نہ ہوئی مگر جمعیتِ علما اور امارت شرعیہ بہار کے انھیں (معاذ اللہ) ہندو پرست مولویوں کا کام تھا کہ جیسے ہی یہ اسکیم شایع ہوئی اس پر تنقید کردی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس اسکیم پر کانگریسی وزارتیں عمل نہ کرسکیں۔ بلکہ صوبۂ یوپی کی وزارت نے ایک دوسری اسکیم جاری کی جو بے شک تعلیم کے نام سے اس وقت جاری ہے۔

مگر کس قدر افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ وہ حضرات جنھوں نے انگریزی حکومت کی تباہ کن، اسلام کش تعلیمی اسکیموں کو شراب طہور سمجھا، حتیٰ کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی مذاق کو سرتاپا مسخ کردیا، وہ صرف اس پر چراغ پا ہیں کہ واردھا اسکیم وجود میں کیوں آئی اور باوجودے کہ اس پر عمل نہیں ہوا مگر وہ اس کے برخلاف پروپیگنڈا اور زہر افشانی سے نہ تھکتے ہیں نہ شرماتے ہیں۔

اردو ہندی کا قصہ:

اس سلسلے میں مذکورہ بالا بیان قلم بند کرنے سے پیشتر ضروری تھا کہ حضرت مولانا

اردو کی فرضیت یا کم از کم استحباب کو ثابت کرتے، لیکن افسوس مولانا کے طرز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق و تفتیش مولانا کے پیشِ نظر ہے ہی نہیں۔ بلکہ لیگ کی حمایت اور جمعیتِ علما کے برخلاف پروپیگنڈے کے لیے کچھ اوراق سیاہ کردینے مقصود ہیں۔

حضرت مولانا ارشاد فرماتے ہیں کہ دفتری زبان تو جہاں جہاں بس چلا بدل بھی ڈالی۔

مگر افسوس! مولانا نے کسی ایک صوبے کا نام بھی نہیں لیا کہ جہاں اردو زبان رائج تھی اور کانگریس یا کانگریسی حکومت نے اردو کے بجائے ہندی جاری کردی۔

ہاں! یہ ضرور ہوا کہ مسلم لیگ کے تمام شور و غوغا کے باوجود اور اردو ہندی کے اس تمام ہنگامے کے باوجود، بنگال کی سرکاری زبان بدستور بنگالی رہی، وہاں لیگی وزارت کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس کو اردو کردیں۔ سندھ اور آسام نے بھی غالباً بنگال ہی کی اتباع کی اور جس چیز کی حمایت کا شور تمام ہندوستان میں مچایا جاتا ہے اپنے صوبوں اور اپنے اقتدار کے موقعوں پر اس کو نظر انداز کردیا بلکہ اپنے صوبوں میں اردو کو دفن کردیا۔ اب اس کے بر مقابل کانگریس اور کانگریسی وزارتوں کی اردو دشمنی ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) صوبہ یوپی میں اردو اور ہندی دونوں کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔

(۲) صوبۂ بہار میں انگریزی حکومت کے زمانے میں سرکاری زبان ہندی تھی۔ وہاں حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی انڈی پنڈنٹ پارٹی کا یہ کارنامہ تھا کہ اس پارٹی نے جیسے ہی وزارت سنبھالی اردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ پھر کانگریسی منسٹری نے اس کی تصدیق کردی۔

یوپی میں جس قدر اسمبلی کی رپورٹیں کانگریسی وزارت کے زمانے میں شایع ہوئیں یا جس قدر نشر و اشاعت سرکاری طور پر ہوا، وہ دونوں زبانوں میں ہندی میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ صوبۂ یوپی کانگریس نے اردو میں بلیٹن شایع کرنے کا سلسلہ قایم کیا۔ پھر اردو کا اخبار ''ہندوستان'' جاری کردیا اور اب ''قومی آواز'' جاری کردیا گیا ہے۔ اگر حکومت کی طرف سے اجازت مل جاتی تو اب تک دو اخبار اردو کے

اور بھی جاری کیے جا سکتے تھے۔

یہ تو کانگریسی وزارتوں اور صوبائی کانگریس کی اردو دشمنی تھی۔ اب انڈین نیشنل کانگریس کی اردو دشمنی ملاحظہ ہو کہ کانگریس تسلیم کر چکی ہے کہ سرکاری زبان ہندوستانی ہوگی، جس کے رسم الخط دونوں ہوں گے فارسی رسم الخط بھی اور دیوناگری کا رسم الخط بھی۔

کاش! بنگال کی لیگی وزارت اردو کا رسم الخط ہی منظور کر لیتی تو لیگیوں کو شرم و حیا کے لیے ایک سہارا مل جاتا۔

ایک اہم بحث کانگریس پلیٹ فارم پر یہ رہی کہ ہندوستانی کس کو کہا جائے؟ اس کے متعلق ایک اصول معین کرتے ہوئے کہ شمالی ہندوستان کی زبان ہندوستانی زبان ہے، ایک کمیٹی بنا دی گئی جو ہندوستانی ڈکشنری مرتب کرے۔ سید سلیمان صاحب ندوی بھی اس کمیٹی کے رکن تھے، مگر ابھی کمیٹی اپنا کام ختم نہ کرنے پائی تھی کہ کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔

ہمیں تسلیم ہے کہ اردو ہندی کا مسئلہ دونوں جماعتوں میں عصبیت اور حمایت بے جا کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کانگریس ایک مشترک قومی جماعت کی حیثیت سے جو کچھ کر سکتی تھی اس میں اس نے کوتاہی نہیں کی۔ اعتراض یہ تھا کہ گاندھی جی ہندی ساہتیہ سمیلن کے ممبر اور سرپرست ہیں، اس سے ہندی کو تقویت ہوتی ہے تو اگر مولانا حسین احمد صاحب یا مولانا کفایت اللہ صاحب ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ترقی اردو جیسی انجمن کی سرپرستی کر سکتے ہیں تو گاندھی جی وغیرہ کو بھی یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ ترقی ہندی کی کسی انجمن کے ممبر یا سرپرست بن سکیں۔

مگر امسال سمپورنانند اور پرشوتم (داس ٹنڈن) کے اصرار بے جا کا یہ اثر ہوا کہ گاندھی جی نے ہندی ساہتیہ سمیلن سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا۔

اور اب اُن (گاندھی جی) پر اردو پڑھنے اور اردو لکھنے کا شوق سوار ہے جیسا کہ اخبارات کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا محمد شفیع صاحب نے رسالے کے آخر میں ''چند شبہات اور ان کا ازالہ''

کے عنوان سے اولاً ایک حدیث پیش فرما کر اس پر جرح کی ہے۔

اس سلسلے میں حامیان کانگریس کے جو رسایل احقر کی نظر سے گزرے ہیں، ان میں کسی نے بھی اس حدیث سے استدلال نہیں کیا۔ نہ مولانا نے کسی رسالے یا کسی صاحب کا حوالہ دیا ہے۔ لہٰذا اس حدیث کے متعلق ردوقدح طول لاطائل ہے۔

اس کے بعد آپ نے یہودِ مدینہ سے معاہدے کی عبارت نقل فرما کر وہی اعتراض دہرایا ہے جو ناداستگی سے یا قصداً مطعون کرنے کی غرض سے پیش کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے اس معاہدۂ مبارکہ سے سیدنا حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے اپنے خطبۂ صدارت (اجلاس جمعیتِ علماے ہند منعقدہ پشاور) میں استدلال کیا ہے، اس کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ العالی نے اپنے رسالہ ''قومیتِ متحدہ اور اسلام'' میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت کو بلفظہٖ نقل کیا ہے۔

ان دونوں بزرگوں کا استدلال فقط اس جزو سے ہے کہ ایک وطن کے رہنے والے ''مسلم اور غیر مسلم'' کو تیسری طاقت کے مقابلے میں ''امۃ واحدۃ'' کہا گیا ہے۔

حضرت مولانا اور مولانا کے ہم خیال بزرگوں کی تمام طویل وعریض تحریریں اس استدلال پر کوئی حرج نہیں پیش کر سکیں۔

باقی رہا شرکتِ کانگریس کا جواز — اس کے دلایل دوسرے ہیں جن میں سے بعض کی طرف احقر نے گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا ہے۔ چند دلایل رسالہ ''جواز شرکت کانگریس میں'' ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں۔

ان دو شبہات کا جواب دینے کے بعد مولانا نے حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے فتوے پر تنقید فرمائی ہے۔

صفحات گزشتہ میں ہم اس تنقید کا جواب مختصر طور پر دے چکے ہیں۔ مگر ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ یہاں کسی قدر تفصیل سے بحث کی جائے اور ناظرین کو طوالت کے برداشت کرنے کی تکلیف دی جائے۔

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا گیا:

(۱) ایک جماعت قومی مسمّیٰ بہ "نیشنل کانگریس" جو ہندو اور مسلمان وغیرہ سکنائے ہند کی، واسطے رفع تکالیف وجلبِ منافع دنیاوی چند سال سے قایم ہوئی اور ان کا اصل اصول یہ ہے کہ بحث انھیں امور میں ہو جو کل جماعت ہائے ہند پر مؤثر ہوں اور ایسے امر کی بحث سے گریز کیا جائے جو کسی ملت یا مذہب کو مضر یا خلاف سرکار ہو تو ایسی جماعت میں شرکت درست ہے یا نہیں؟

(۲) سید احمد خان نیچری نے جو ایک جماعت (ایسوسی ایشن) قایم کی ہے اور لوگوں کو بہ ذریعہ اعلان مطبوعہ ۸/ اگست ۱۸۸۸ء یوں ترغیب دے رہا ہے کہ میری جماعت میں بڑے بڑے ہندو ذی وجاہت مثل راجہ بنارس وغیرہ جو کانگریس کے بر خلاف ہیں شامل ہیں، ہر شخص جو داخل ہو، پانچ پانچ رُپیہ چندہ ماہواری میرے نام علی گڑھ یا بنارس میں راجہ صاحب کے نام روانہ کیا کرے وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کی مدد کے واسطے جا بہ جا (ایسوسی ایشن) انجمن اسلامیہ کے نام سے لوگوں نے شہروں میں قایم کی ہیں۔ جو شخص ان کے ساتھ اتفاق کرنے سے بر خلاف معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ طرح طرح کا فساد اور فتنہ برپا کر کے اس کو جبراً ملانا چاہتے ہیں۔ آیا ایسی جماعت میں مسلمانوں کو شامل ہونا اور ان کی مدد کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں اور نیچری لوگ بدخواہِ اسلام ہیں یا نہیں؟

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ العزیز نے جواب تحریر فرمایا:

"(جواب) اگر ہندو مسلمان باہم شرکت بیع و شرا و تجارت میں کر لیویں اس طرح کہ کوئی نقصان دین میں یا خلاف شرع معاملہ کرنا اور سود اور بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آوے، جایز ہے اور مباح ہے۔ مگر سید احمد سے تعلق رکھنا نہیں چاہیے، اگر چہ وہ خیر خواہی قوم کا نام لیتا ہے، یا واقع میں خیر خواہ ہو۔ مگر اس کی شرکت مآل کار، اسلام و مسلمانوں کو سم قاتل ہے۔ ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہرگز نہیں بچتا۔ بس اس کے شریک مت ہونا اور ہنود سے شرکت معاملہ کر لینا اور اگر ہنود کی شرکت سے اور

معاملہ سے کوئی خلاف شرع امر لازم آتا ہو یا مسلمانوں کی ذلت واہانت یا ترقی ہنود ہوتی ہو تو وہ کام بھی حرام ہے، جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ اسی طرح پر ہے اور بس۔ فقط بندہ رشید احمد گنگوہی عُفی عنہٗ۔'' (نصرۃ الابرار)

خدا کا شکر ہے حضرت مولانا محمد شفیع صاحب نے فتوے کو فرضی نہیں فرمایا۔ البتہ آپ کا خیال یہ ہے کہ حالات میں تبدیلی ہوگئی، لہٰذا فتویٰ بھی بدل گیا۔ لہٰذا سب سے پہلے ان حالات● اور اس ماحول کی تنقیح ضروری ہے جو اس فتوے کا پس منظر ہیں۔ اور جو اس وقت درپیش تھے اور جو مفتی کے سامنے یقیناً رہنے چاہییں۔

(۱) انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک اگرچہ ایک انگریز نے کی تھی۔ کیوں کہ سلطنت برطانیہ کے مفاد کے پیشِ نظر اس کے نزدیک ضروری تھا کہ ہندوستان میں ایک ایسی جماعت ہو جو پارلیمنٹ کے حزب اختلاف کی طرح حکومت پر تنقید کرتی رہے اور اس کو ضروری امور کا مشورہ دیتی رہے۔ تا کہ ۱۸۵۷ء جیسا ہنگامہ دوبارہ نہ پیش آسکے۔ مگر ہندوستان کے وہ فرعون صفت انگریز افسر جو ہندوستانیوں پر نادر شاہی حکومت کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ ایسی جماعت سے ہرگز خوش نہ ہو سکتے تھے، کیوں کہ ایسی جماعت کے وجود سے ان کی مطلق العنانی پر زد پڑتی تھی۔ یہ جماعت سلطنت برطانیہ کے حق میں اپنی خیر خواہی اور وفاداری کا خواہ کتنا ہی اعلان کرتی مگر اس کا وجود ہی ان فرعونیوں کی نظر میں گستاخی اور شوخ چشمی تھا۔ مسٹر بیک جو اس زمانے میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھے، اسی فرعونی ذہنیت کے آدمی تھے۔

سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ''مسٹر ڈبلیو سی بونٹ'' وکیل کلکتہ کانگریس کے پہلے صدر بنائے گئے۔ جن سے مسٹر بیک کو بنگالی ہونے کے سبب سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ کیوں کہ اس زمانے میں بنگالی سیاست میں پیش پیش تھے۔ حتیٰ کہ سرسید بھی اس وقت تک بنگالیوں کو ہندوستانیوں کا سرتاج کہا کرتے تھے۔ مزید برآں کانگریس نے اپنے پہلے ہی اجلاس میں وہ تجویزیں پاس کیں جو نادر شاہی حکام کے نشۂ نخوت وغرور کے

● تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ''مسلمانوں کا روشن مستقبل''، ''علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے''، ''روح روشن مستقبل'' وغیرہا۔

لیے ناخوش گوار تر شی تھی ۔ مثلاً

(۱) آئین ہند کی تحقیقات کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے ۔

(۲) وزیر ہند کی کونسل توڑ دی جائے ۔

(۳) صوبوں کی کونسلوں کے ممبروں کی تعداد بڑھائی جائے ۔

(۴) سول سروس کا امتحان ہندوستان میں بھی جاری کیا جائے ۔

(۵) فوجی اخراجات میں اضافہ نہ کیا جائے ۔ (وغیرہ وغیرہ)

ان تجاویز میں ایک بھی ایسی نہ تھی جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہوتی بلکہ فوجی اخراجات میں اضافہ کی ممانعت تو خاص طور پر مسلمانوں کے لیے مفید تھی کیوں کہ آزاد قبایل کے مسلمان پٹھانوں پر حملے جاری رکھنے اور ان کی رفتار کو بڑھانے کے لیے فوجی اخراجات میں اضافہ کیا جا رہا تھا ۔

مگر یہ چوں کہ مسٹر بیک کی مخصوص ذہنیت کے خلاف تھیں اور اِن سے ہندوستان میں حکومت کرنے والے انگریزوں کے اختیارات کم ہوتے تھے، اس لیے ان سے مسٹر بیک اور ان کے ہم نواؤں کے تن بدن میں آگ لگ گئی ۔ انھوں نے کانگریس کی مخالفت شدومد سے شروع کردی ۔ چناں چہ ایک طرف تو انھوں نے اینگلو انڈین اخبارات کے ساتھ مل کر کانگریس کے خلاف مضامین نکالے اور دوسری طرف کانگریس اور ملکی نفع کے کاموں اور بنگالیوں کی حمایت سے سرسید کا دل ہٹانے میں مصروف ہو گئے ۔ سرسید کی ضعیفی کا زمانہ تھا ۔ مسٹر بیک نے ان کے کاموں میں ہاتھ بٹانا شروع کیا ۔ حتیٰ کہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ایڈیٹری سرسید کے بجائے خود ہی کرنے لگے اور سرسید کے نام پر اپنے مطلب کے مضامین نکالنے شروع کردیے ۔ رفتہ رفتہ سرسید کو ملکی مفاد اور کانگریس کا سخت مخالف بنا لیا ۔ حتیٰ کہ ۱۸۸۷ء میں بڑے دن کے موقع پر لکھنؤ کی تعلیمی کانفرنس میں سرسید نے کانگریس کے خلاف سخت تقریر کی ۔

مسٹر بیک کی ذہنیت رکھنے والوں میں سب سے زیادہ نمایاں صوبۂ متحدہ کے لیفٹیننٹ گورنر ''سر آکلینڈ کالون'' تھے جو ۱۸۵۷ء سے سرسید کے دوست تھے اور کانگریس کے اس قدر مخالف تھے کہ انھوں نے الہ آباد میں کانگریس کے اجلاس

(۱۸۸۸ء) کو روکنے میں پوری قوت صرف کر دی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ بہ ہر حال دسمبر ۱۸۸۷ء میں کانگریس کے خلاف سر سید کی معرکتہ الآرا اسپیچ سے موصوف کو حد درجہ خوشی ہوئی اور ہفتہ بھر کے اندر سید صاحب کو حکومت کی طرف سے نائٹ (سر) کا خطاب مل گیا اور یہ فخریہ کہا جانے لگا کہ کالون صاحب نے تار کے ذریعے سے اس کی منظوری انگلستان سے منگائی ہے۔ مارچ ۱۸۸۸ء میں کالون صاحب علی گڑھ آئے اور کالج کے طلبہ کی اس قدر زیادہ تعریف کی کہ اس سے پہلے کسی نے نہ کی تھی۔ اور اس سے اگلے مہینہ (اپریل) میں سر سید میرٹھ تشریف لے گئے اور نوچندی کے میلے میں کانگریس کے خلاف دوسری زبردست تقریر کی۔ (روح روشن مستقبل: ص ۷،۸)

اسی سال اگست میں مسٹر بیک نے سر سید سے کانگریس کے خلاف انڈین پٹریاٹک ایسوسی ایشن (جماعت محبانِ وطن) قائم کرائی (جس کا تذکرہ استفتا میں ہے) کانگریس کی مخالفت ملک میں امن وامان، برٹش گورنمنٹ کے استحکام کی کوشش، مسلمانوں میں حکومت برطانیہ کی وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا، اس انجمن کے مقاصد تھے۔ اور کانگریس کی مخالفت کے باعث یہ جماعت (اینٹی کانگریس) کہلائی جاتی تھی۔ (روح روشن مستقبل: ص ۹)

(۲) ۱۸۵۷ء میں جس طرح حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اپنے شیخ طریقت حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی زیر قیادت جہادِ آزادی میں حصہ لیا تھا، اسی طرح لدھیانہ کے اس خاندان نے بھی اس جہاد میں بہت کافی حصہ لیا تھا۔ جس کے ایک ممبر مولانا عبدالعزیز صاحب نقش بندی مجددیؒ تھے اور آج مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی اور مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی اسی حریت پسند خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اس وقت جب انڈین نیشنل کانگریس قایم ہوئی تو مولانا موصوف نے اس کی حمایت کی۔ سر سید گروپ نے ان کے برخلاف ایک طوفان اٹھا دیا اور ایک فرضی استفتا مرتب کر کے علما سے اس کا جواب حاصل کیا۔ حضرت گنگوہیؒ سے اس پر دستخط کرائے گئے اور پھر یہ فتویٰ مولانا عبدالعزیز صاحب پر چسپاں کر کے پروپیگنڈا کیا گیا کہ مولانا عبدالعزیز صاحب ہندوؤں سے مل گئے۔

ایمان فروش ہیں فاسق ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مولانا عبدالعزیز صاحب نے یہ تماشہ دیکھا تو حیران رہ گئے اور انھوں نے بہ ذات خود ایک استفتا کیا۔ اس پر ان تمام بزرگوں نے معذرت کی۔ چناں چہ حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ معذرت یہ ہیں:

''حامداً ومصلیاً۔ بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہٗ عرض کرتا ہے کہ لدھیانہ سے ایک استفتا اس مضمون کا آیا تھا کہ جو شخص ہنود کی اعانت اور مسلمانوں کو ضرر دیوے وہ کیسا ہے۔ بندے نے جواب لکھا تھا کہ وہ فاسق ہے۔ یہ خلاصہ سوال و جواب کا ہے۔ اب وہ فتویٰ بندے کا طبع ہوا اور اس کے اول تین صفحے لکھے دیکھے جس سے معلوم ہوا کہ وہ سوال مولوی عبدالعزیز صاحب لدھیانوی کی نسبت ہے۔ اور وہ وجوہ اعانت و اضرار اس میں مصرح لکھے ہیں۔ لہٰذا بندہ راست راست کہہ کر مسلمانوں کو مطلع کرتا ہے اور اپنا ذمہ بری کرتا ہے کہ مولوی عبدالعزیز صاحب ہرگز ہرگز مصداق اس فتوے کے نہیں ہیں اور جو امور ان کی طرف اس تحریر میں منسوب ہیں، ان کی وجہ سے بندہ ہرگز ان کو محل اس جواب و فتوے کا نہیں جانتا۔ اگر سایل اس تفصیل کو درج سوال کرتا تو بندہ ہرگز یہ جواب نہ لکھتا۔ جو کچھ اس تحریر میں درج ہے، اس کی تاویل صحیح ہے۔ اگر واقعی ان سے یہ امور ایسے ہی سرزد ہوئے ہیں۔ اور اس عبارت میں جو گستاخ کلام نسبت مولوی صاحب کے ہے وہ سخت نازیبا ہے۔ بندے کے نزدیک علما کی شان میں ایسا کلام موجب ہتک اسلام و علم ہے۔ پس جو صاحب اس بندے کو صادق جانتے ہیں اور جو بندے کی تحریر کی وجہ سے مولوی عبدالعزیز صاحب سے بدعقیدہ ہوئے ہیں میں ان کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ ہرگز مصداق اس فتوے بندے کے نہیں۔ ان سے معذرت کرنا اور معافی چاہنا اور اتحاد و محبت کرنا لازم ہے۔ واللہ ولی التوفیق

کتبہ الراجی رحمتہ اللہ رشید احمد گنگوہی عفی اللہ تعالیٰ عنہٗ''

جب یہ حقیقت منقح ہو چکی تو اس کے بعد شرکت کانگریس اور شرکت ایسوسی ایشن کے متعلق مندرجۂ بالا سوالات علمائے کرام کے سامنے پیش کیے گئے۔

(۳) مولانا عبدالعزیز صاحب کے مندرجۂ بالا واقعہ اور سوال دوم کے الفاظ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کانگریس کے حامی علما کے برخلاف جو شرم ناک پروپیگنڈا آج کیا جا رہا ہے وہ اسی زمانے کی پیداوار ہے۔ کانگریس پر اسلام کشی کی فردِ جرم اسی وقت سے لگا دی گئی ہے اور کانگریسی علما کے لیے اسلام فروشی، غدارِ ملّت، ہندوؤں کے غلام، فاسق، کافر وغیرہ وغیرہ اسی وقت تصنیف ہو چکے تھے۔ آج جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ اسی آموختہ کو دہرایا جا رہا ہے۔

(۴) انڈین نیشنل کانگریس کے لفظی معنی ہیں: ہندوستانی قومیت (نیشن) رکھنے والوں کی جماعت۔

پہلے ہی اجلاس میں یہ قرار دیے گئے۔

(۱) ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔

(۲) اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو۔ اس کی دماغی، اخلاقی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔

(۳) ایسے حالات کی اصلاح و ترمیم کرانا جو ہندوستان کے لیے مضرت رساں اور غیر منصفانہ ہوں اور اس طرح ہندوستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت کو استوار کرنا۔

(۵) رفع تکالیف اور جلب منافع کے دنیاوی امور کو جو انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم پر طے پاتے ہیں۔ جن کا تعلق بہ حیثیت ہندوستانی ہونے کے تمام باشندگان ملک سے یک ساں ہوتا ہے ان کو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ العزیز بیع و شرا اور خرید و فروخت کے معاملات کی حیثیت دے رہے ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ان امور کی یہ حیثیت نہ ہو اور مولانا محمد شفیع صاحب کے نظریے پر عمل کیا جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ میونسپل بورڈ سے لے کر اسمبلیوں، کالجوں

اور ایوان تجارت تک کسی بھی ہندوستانی ادارہ یا سرکاری محکمہ میں شرکت کو جایز کہا جائے۔

(٦) کسی بات کا سرکار کے مخالف نہ ہونا بھی جواز شرکت پر اثر انداز نہیں، کیا کوئی عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ انگریز بہادر کی سرکردگی میں تو ہندو مسلم اشتراک جایز ہو؟ اور اگر یہ منحوس سایہ ہٹ جائے تو وہ جایز چیز ناجایز ہو جائے۔ اگر معاذ اللہ ایسا ہے تو قرآن وحدیث مرجع شریعت نہ رہا بلکہ انگریزی ہیئت، معاذ اللہ شریعت کا گنبد بن گیا۔

(٧) فتویٰ ظاہر کرتا ہے کہ ایسے مسلمانوں کے ساتھ اشتراک عمل اور تعلق انتہا درجے خطرناک ہے جو اسلام کے نام پر اپنی اغراض اور اپنے ذاتی خیالات کو کامیاب بنائیں۔

ہندو بے شک کافر ہے۔ اس کے پاس کفر وشرک موجود ہے مگر وہ نمایاں زہر ہے، جس سے ہر انسان بچ سکتا ہے، لیکن اس نام نہاد قایدِ اسلام کے پاس میٹھا زہر ہے جس کو تمیز کرنا مشکل اور نتیجہ تباہی اور بربادی۔

حضرت مولانا محمد شفیع صاحب بھی قادیانیوں کے ساتھ اشتراکِ عمل اور تعلق کو حرام کہا کرتے تھے اور یہی نکتہ بیان فرمایا کرتے تھے۔

(٨) فتوے سے موجودہ مسلم لیگ کی شرکت کا حکم بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ سرسید تاہم مذہبی شخص تھے۔ نماز روزے کے بھی غالباً پابند تھے۔ شراب وغیرہا سے قطعاً مجتنب تھے۔ اگرچہ قرآن حکیم کی آیتوں کی تاویل وتفسیر اپنی رائے کے مطابق کرتے تھے۔ نبوت ورسالت، معجزہ، وحی وغیرہ کے متعلق اپنے مخصوص خیالات کے حامی تھے۔ مگر تاہم قرآن حکیم کے احکام کو جنجال نہ کہتے تھے۔

دوسروں کو بے شک یورپین وضع قطع کی ترغیب دیتے تھے مگر خود اپنی پرانی وضع قطع پر آخر تک قایم رہے۔

لیکن موجودہ مسلم لیگ اور اس کے قایدان تمام خطرات میں سرسید اور ان کے ایسوسی ایشن سے کہیں آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ نماز روزے کی پابندی تو درکنار، نماز

روزے سے صحیح واقفیت بھی نہیں۔ ان کے نزدیک قرآن پاک کے احکام معاذ اللہ ترقیاتِ زمانہ سے پس ماندہ اور جنجال ہیں۔

(دیکھو تقریر مسٹر جناح متعلق سول میرج بل ۱۹۱۲ء)

یورپین ڈانس، کاک ٹیل وغیرہ محبوب مشاغل، وضع قطع ٹھیٹ یورپین، علما کے اقتدار ختم کرنے کا عزم مصمم، مسلم رافضیوں اور قادیانیوں کا معجون مرکب۔ یہ تمام واقعات اظہر من الشمس ہیں جو ان سے چشم پوشی کرے یا ان پر پردہ ڈالے اس سے بڑھ کر مداہن فی الدین کون ہوسکتا ہے؟

(۹) انڈین نیشنل کانگریس میں جواز شرکت کے حکم سے نیشن اور قومیت کے بارے میں بھی حضرت گنگوہیؒ کے خیال کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اگر فی الواقع مدار قومیت مذہب ہوتا اور متحدہ قومیت ناجائز ہوتی تو حضرت گنگوہیؒ جیسے دقیقہ رس فقیہ کے لیے قطعاً ناممکن تھا کہ وہ مشترک جماعت کے لیے نیشنل کانگریس (قومی جماعت) کا لفظ برداشت کرتے اور پہلے ہی وحلہ میں اس پر تنقید نہ کرتے۔ بالخصوص جب کہ سوال کا پہلا لفظ ہی یہ ''ایک جماعت قومی'' اور جب کانگریس کا پہلا مقصد ہی یہ ہو کہ ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متفق و متحد کرکے ایک قوم بنانا۔

''السکوت فی معرض البیان بیان'' کیا ایسے ہی موقع کے لیے نہیں ہے اور کیا اس اصول کے بہ موجب متحدہ قومیت کے متعلق حضرت گنگوہیؒ کا نظریہ واضح نہیں ہوجاتا؟

مذکورہ بالا تصریحات کے بعد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمایئے اور خود فیصلہ کیجیے کہ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب جو تلبیس کا الزام خدام جمعیتِ علما پر لگاتے ہیں وہ کس پر عاید ہوتا ہے۔ جب فتویٰ اپنے موافق نہ ہو تو مولانا کا اصرار یہ ہے کہ واقعات کو اپنے خیال کے مطابق تصنیف کرلیا جائے۔ مگر مفتی کے لیے نہ دانستہ طور پر ایسا کرنا جائز ہے اور نہ نادانستہ طور پر۔ انما شفاء العی السوال صرف مستفتی کے لیے نہیں۔ بسا اوقات مفتی کے لیے بھی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:

(۱) یہ فتویٰ ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۸ء) کا شایع شدہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جس کانگریس کی شرکت کا سوال ہے وہ اب سے تقریباً انسٹھ برس پہلے کی کانگریس ہے۔ جب کہ اس کی بنیاد کسی انگریز کے ہاتھوں قایم ہوئی تھی ●۔ اور اپنی بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔

(۲) اس وقت کی کانگریس کے اغراض و مقاصد اس سے زاید نہ تھے کہ باشندگان ملک کی تکلیف کے ازالے یا کسی خاص فایدے کی تحصیل کے لیے حکومت کے سامنے کوئی درخواست پیش کی جائے۔ جیسے آج کل کسی محلے میں بسنے والے ہندو مسلمان مل کر میونسپل بورڈ میں محلے کی روشنی یا صفائی وغیرہ کے لیے کوئی مشترک درخواست دیں۔ نہ کسی حکومت کا مقابلہ تھا۔ نہ کسی نئے نظام حکومت کی تشکیل و تجویز زیر بحث تھی۔ نہ اقلیت و اکثریت کی جنگ تھی اور ظاہر ہے کہ ایسی درخواستوں میں مسلمان اور ہندو کا اجتماع ایک نوع مصالحت و معاملے کے سوا کوئی چیز نہ تھا۔ (انڈین نیشنل کانگریس کا ابتدائی مقصد اور اس کے پہلے اجلاس کی تجاویز ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں اور مولانا کی اس خانہ ساز تاویل کی حقیقت کا اندازہ کر لیں۔ تاریخ پر کتابیں تصنیف کی جاتی ہیں۔ تاریخ کے واقعات تصنیف نہیں کیے جاتے۔ مگر افسوس مولانا واقعات تصنیف کر رہے ہیں)۔

(۳) اس وقت کی کانگریس کے اصول مقررہ میں سے تھا کہ کانگریس کسی ایسے امر میں بحث نہ کرے گی جو کسی مذہب و ملت کو مضر ہو۔ کانگریس کا یہی اصول آج بھی ہے۔ باقی گرام سدھار وغیرہ جن چیزوں سے مولانا کو اشتباہ ہوا ان کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

(۴) اس وقت کی کانگریس کا یہ بھی اصول تھا کہ کسی ایسے امر میں بحث نہ کرے گی جو خلاف سرکار ہو۔

(بہ ظاہر یہ ہے جڑ کی چیز۔ یعنی ہندو مسلم اشتراک کانگریس کے پلیٹ فارم پر

● کیا انگریز کے قایم کرنے سے اس میں شرکت جایز ہو گئی تھی۔

اس لیے ناجایز ہے کہ وہ خلاف سرکار ہے۔ باقی سرکار کی موافقت میں اگر ہندو مسلمان حرام موت اور کتے کی موت مرنے کے لیے بھی اشتراک عمل کریں تو وہ بھی جایز (معاذ اللہ) گویا جواز کا مدار سرکار کی موافقت یا مخالفت ہے (اس نظریہ کی بنا پر تو اب شرکت کانگریس واجب ہونی چاہیے۔ کیوں کہ سرکار خود کانگریس ہے۔)

(۵) حضرت گنگوہیؒ قدس سرہٗ سے اس کانگریس کی شرکت کا سوال کیا گیا۔ جس کی کیفیات وحالات اوپر معلوم ہوئے۔

(ناظرینِ کرام دو قسم کے حالات وکیفیات ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ایک واقعات کی روشنی میں اور ایک خود ساختہ)

(۶) ایسی جماعت کے ساتھ بھی حضرت موصوف نے صرف شرکت معاملہ کی اجازت دی جیسے بیع، شرا وغیرہ کی شرکت ہو، نہ یہ کہ دونوں قوموں کے اتحاد واشتراک سے کسی متحدہ قومیت کی بنیاد ڈالی جائے اور یہ شرکت معاملہ کی اجازت بھی شرایط ذیل کے ساتھ دی۔

(الف) اس شرکت ومعاملہ سے کوئی امر خلاف شرع لازم نہ آئے۔

(ب) اس میں مسلمانوں کی ذلت واہانت نہ ہو۔

(ج) اس شرکت سے ہنود کو تقویت وترقی نہ ہو۔

(متحدہ قومیت، کانگریس کے ابتدائی مقاصد میں سے ہے اور لفظ ''ایک جماعت قومی'' اس مقصد کی جانب اشارہ بھی کر رہا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے اس لفظ کے موجود ہوتے ہوئے جواز کا فتویٰ دیا اور شرکت کانگریس کو خرید وفروخت جیسے دنیاوی معاملات کی حیثیت میں رکھا۔ بقیہ شرایط جیسا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ العزیز کے زمانے میں مفقود تھیں وہ اب بھی مفقود ہیں۔ ہاں جس قدر کانگریس نے قوت حاصل کی ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے مشترک ہے۔ چناں چہ اسمبلی میں ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کو تناسب آبادی سے زیادہ نشستیں ملی ہوئی ہیں۔ وزارتوں میں ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی شامل ہیں۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں اگر ہندو وزیرِ اعظم ہوتا ہے تو مسلم اکثریت کے صوبوں میں

وزیر اعظم مسلمان ہوتا ہے۔ البتہ تحریکِ پاکستان کا اثر یہ ہوگا کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی حیثیت نفی کے برابر ہو جائے گی۔ اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں وہ ہندوؤں کے محتاج ہو جائیں گے — کیوں کہ ہندو ہندوستان میں مجموعی حیثیت سے مسلمان زیادہ سے زیادہ دس فیصدی کے قریب ہوں گے۔ اور مسلم ہندوستان میں ہندو تقریباً پینتالیس فیصدی رہیں گے۔)

اس تفصیل کے ملاحظے کے بعد ناظرینِ کرام خود غور فرمائیں کہ خیانت اور عقل و دیانت سے بعید جیسے الفاظ جو حضرت مولانا محمد شفیع صاحب نے استعمال فرمائے ہیں ان کا مصداق کون ہے؟

دوسرے سوال کے جواب پر تبصرہ

دوسرے سوال کا جواب جو مولانا نے پیش فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ لیگ کے زعما اور اربابِ حل و عقد اگرچہ فاسق ہیں اور بسا اوقات وہ قانون ساز اسمبلیوں میں اسلامی احکام کی پروا بھی نہیں کرتے مگر با ایں ہمہ وہ خوارج کی حیثیت میں ہیں اور کفار کے مقابلے میں خوارج سے اشتراکِ عمل جائز ہے۔ پھر اس دعوے کی دلیل کے لیے صفحہ ۴۴ و ۴۵ پر سیر کبیر، مبسوط اور نیل الاوطار کی عبارتیں نقل فرمائی ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ حقیقی سوال کو مولانا نے یہاں بھی نظر انداز فرمایا!

سوال یہ ہے کہ جنگِ آزادی میں مقابلہ کس سے ہے؟ ہندو سے یا انگریز سے۔ کیا ہندو نے آزادی حاصل کرالی ہے اور وہ مسلمانوں کو غلام بنائے ہوئے ہے یا ہندو اور مسلمان دونوں غلامی کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور انگریز کی چیرہ دستی دونوں پر حاوی ہے؟

کیا واقعی لیگ نے علم آزادی بلند کیا؟ کیا اس نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں کوئی ایک قدم بھی انگریز کے مقابلے میں اُٹھایا؟ یا پوری چالیس سال کی زندگی آزادی کی راہ میں روڑا بننے اور ''تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کو کامیاب بنانے میں صرف ہوئی اور آج بھی جو کچھ وہ کر رہی ہے اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ پورے پانچ

سال (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۴ء) میں جو بے پناہ قربانیاں کانگریس اور مسلم قوم پرور طبقہ نے پیش کی ہیں جن کے سبب سے تمام ہندوستان میں جذبات آزادی شباب پر پہنچ چکے ہیں، تقسیم ہندوستان کا ناقابل حل مطالبہ کر کے ان کے رخ کو انگریز کے مقابلے سے ہٹا کر خود آپس میں ایک دوسرے کی طرف کر دیا جائے اور انگریز کو موقع دے دیا جائے کہ وہ ہندو اور مسلمانوں کی انتہائی بے اعتمادی کے بہانے کو آڑ بنا کر تفویض اختیارات کے وعدے میں زیادہ سے زیادہ کاٹ چھانٹ کر سکے، بھولے بھالے مسلمان برافروختہ ہیں کہ ہمیں پاکستان نہیں دیا جا رہا ہے، اور بساط سیاست کا بہترین شاطر خوش ہے کہ ہندوستان اور برطانوی سامراج کی کشاکش کا فیصلہ میرے سپرد ہو رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا مسلم حلقے میں آزادی کی علم بردار لیگ ہی ہے؟ آخر جمعیتِ علما نے کیا قصور کیا ہے؟

کیا ملی حمیت، غیرتِ ایمانی اور عالمانہ خودداری کا تقاضا یہی ہے کہ آپ خود اپنے پلیٹ فارم، اپنی جماعت، اپنے مستقل نظام کو چھوڑ کر خوارج کی قیادت و سیادت کے سامنے گردن جھکائیں۔

لیگی وکیل اور بیرسٹر جو فیس اور محنتانہ کے بغیر بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے اور مذہبی مقدمات بھی فیس ہی لے کر لڑاتے ہیں وہ اگر اپنے اوپر قیاس کرتے ہوئے علما پر رشوت ستانی اور کانگریس کی وظیفہ خواری کا بہتان باندھیں تو کچھ تعجب نہیں۔ مگر آپ کو تو حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا احمد علی صاحب، حضرت مولانا محمد صادق صاحب جیسے اکابر اور ان کے مخلص خدام کی صداقت، دیانت، للّٰہیت، خلوص، اور بے غرضی میں شک نہ ہوگا۔

آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ جمعیتِ علما کی پالیسی کا مرتب کرنا انھیں حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ان حضرات کو چھوڑ کر ان کے در پر جاتے ہیں جو آپ کا اقتدار ختم کرنے کے درپے ہیں اور وہ یہ بھی گوارا نہیں کرتے کہ

اپنی جماعت میں آپ کو کوئی اچھی حیثیت دیں۔
آپ کو شکایت یہ ہے کہ یہ حضرات شرکتِ کانگریس کو جایز کیوں کہتے ہیں، مگر آپ اس کی قدر نہیں کرتے کہ یہ حضرات جس درجہ انگریز کے مقابلے میں سخت ہیں۔ ایسے ہی وہ ہندو کے مقابلے میں بھی سخت ہیں۔
جب بھی کسی اسلامی حق کے فوت ہونے کا خطرہ ہوتا ہے تو لیگ سے زیادہ یہ حضرات ہندو کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ کیا شدھی سنگھٹن کی تحریک کا جمعیتِ علماے ہند نے مقابلہ نہیں کیا؟ کیا رنگیلا رسول کے رسواے عالم قضیے میں کسی لیگی نے کوئی کارنامہ انجام دیا؟ یا انھیں حضرات نے مقابلے کے لیے سینے تان دیے۔ کیا نہرو رپورٹ کو ختم کرا دینا جمعیتِ علما اور قوم پرور طبقہ کا کام نہ تھا؟ کیا تحریک مدحِ صحابہؓ میں ان حضرات نے قربانیاں پیش نہیں کیں؟ آپ نے واردھا اسکیم، نہرو رپورٹ وغیرہ کے متعلق حضرت مولانا سجاد صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا احمد سعید صاحب وغیرہما کے جو مضامین اپنے ثبوت میں پیش کیے ہیں۔ حال آں کہ اگر آپ انصاف سے کام لیں تو ان کی شہادت ہمارے حق میں ہے۔
وہ بیانات شاہد ہیں کہ وارذھا اسکیم، نہرو رپورٹ وغیرہ کے سلسلے میں جمعیتِ علما کے افراد نے کس طرح تمام تعلقات کو بالاے طاق رکھ کر کانگریس کا مقابلہ کیا۔ حتیٰ کہ کانگریس کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لے۔
اگر واقعات کی صحیح واقفیت کے ساتھ خداوند عالم نے کسی کو عدل و انصاف کی دولت بھی دی ہے تو اس کا فیصلہ یہی ہوگا کہ ہندو اور انگریز دونوں جماعتوں سے مقابلہ کرنے والی ہندوستان کے طول و عرض میں صرف جمعیتِ علماے ہند ہے اور بس۔ مگر ناس ہو ذہنیت کی اس پستی کا کہ نگاہیں اگر اٹھتی ہیں تو اَپ ٹو ڈیٹ انسان پر، اُن کے دلوں پر فیشن ایبل لوگوں کی عظمت کا سکہ لگا ہوا ہے، ان کے نزدیک وہی شخص ملک و ملت کا زعیم ہو سکتا ہے جو انگریزی وضع کا غلام، مغربیت زدہ اور سرمایہ دار ہو۔ یہ غریب مولوی، بوریے پر بیٹھنے والے، رات کو چراغ کے سامنے اپنی پیشانیاں سینکنے والے، ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی وضع قطع کے پابند ہر موقع پر قرآن و حدیث پیش

کردینے والے، ہر معاملے میں سنت کی پچر لگا دینے والے، جن کی پیشانیوں پر گٹھے پڑے ہوئے، بڑی بڑی داڑھیاں اور ڈھیلے پاجامہ، نیچے کرتے، عمامہ باندھنے والے سیاست کیا جانیں۔ انگریزوں نے ان کو منہ نہیں لگایا تو ہندوؤں کے زرخرید غلام بن بیٹھے۔ یہ ہے ذہنیت جو قوم کی اکثریت پر مسلط — اور افسوس علما کی ایک جماعت بھی اگرچہ وہ خدا کے فضل سے بہت کم ہے، مگر اس ذہنیت سے مرعوب ہے۔

جمعیتِ علما کے خدام اس ذہنیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور یہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ ماہر سیاست وہی ہو سکتا ہے جو عالم قرآن ہو۔ بے شک اس کے لیے ان کو بہت قربانیاں دینی پڑیں گی مگر وہ خدا کے نام پر کمر کس چکے ہیں۔ و باللہ التوفیق منہ الاعانتہ

آخر میں حضرت مولانا محمد شفیع صاحب نے حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی ایک عبارت تنظیم المسلمین کے حوالے سے نقل کی ہے۔ مگر چوں کہ حضرت موصوف کے ارشادات کے متعلق ایک مستقل رسالہ اشرف الافکار شایع کیا جا رہا ہے، لہٰذا ان اوراق میں اس کے جواب کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

تیسرے سوال کے جواب پر ایک نظر

ہم شکر گذار ہیں کہ حضرت مولانا نے اس موقع پر دو باتیں بہت ہی مفید ارشاد فرمادیں۔ جمعیتِ علما کے افراد کی جانب سے اگر یہ باتیں کہی جاتیں تو ان پر ہزار شک وشبہ وارد کیے جاتے۔ مگر الحمد للہ حضرت مولانا نے خود ہی ان دو اصول کو تسلیم فرمالیا۔

(۱) ارشاد ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ اپنے اختیار سے اپنے اوپر غیر مسلم حکومت مسلط کرنے کا مطالبہ کرنا یا اس کو قبول کرنا کسی طرح جایز نہیں ہو سکتا۔ (ص ۴۶)

(۲) ہندوستان جو صدیوں تک دارالاسلام رہا ہے اور اب ایک عرصے سے اس پر غیر مسلم حکومت کا تسلط ہے اور بہت سے خلافِ شرع قوانین نافذ ہیں اور مسلمانوں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے ذمے واجب ہے کہ اس تسلط کے

ازالے یا تقلیل کی جو صورت جس حصۂ ملک میں (ممکن ہو)، وہ کسی تدبیر سے حاصل کرسکیں، اس میں کوتاہی نہ کریں کہ یہ بھی استخلاص دارالاسلام کی ایک فرد ہے۔

(ص ۴۷)

ان دو اصولوں کا عادلانہ فیصلہ تو یہ ہے کہ مطالبۂ پاکستان کو ناجائز اور شرکت کانگریس کو واجب کہا جائے، مگر افسوس مولانا اس سے غلط نتیجہ اخذ کر رہے ہیں۔

مولانا کا خیال یہ ہے کہ اگر ہندوستان کا ایک مرکز رہے تو ہندو اکثریت کے سبب پورے ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت ہوگی۔ گو اس میں بڑی جدوجہد کے بعد کسی حد تک مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ بھی کرلیا جائے (ص ۴۶) اور دو مرکز ہونے کی صورت میں مسلم مرکز میں حکومت مسلمانوں کی ہوگی۔ جس کے سبب اپنی حدود میں اسلامی احکام کے موافق دستور اور نظام جاری کرنے پر قدرت حاصل ہوگی۔ نیز با اقتدار حکومت دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کی پوری حفاظت اور نگرانی کرسکے گی جو مسلمانوں کی اقلیت زدہ منتشر قوت کے ذریعے کسی حال میں متصور نہیں۔

لہٰذا مسلمانوں کے لیے دو مطالبے ضروری ہیں۔ ایک اپنے لیے مستقل مرکز کا، جس کو پاکستان سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسرے مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا غیر مبہم الفاظ میں مکمل معاہدہ جس کی نگرانی اسلامی مرکز کے فرائض و اختیارات میں داخل ہو۔ (ص ۴۷)

اگر خیالی دنیا کا نقش قایم کر کے شرعی حکم نافذ کیا جائے تو صرف یہی نہیں کہ مسلم ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت اور ہندو ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کا اطمینان بخش تحفظ کا خیال قایم کیا جائے بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے اور انقلابی دنیا کے تاریخی واقعات اس کی نظیر بھی پیش کرسکتے ہیں کہ متحدہ ہندوستان کے پریزیڈنٹ کے لیے یہ شرط لگادی جائے کہ ایک مرتبہ ہندو ایک مرتبہ مسلمان ہو۔ اور مسلمان پریزیڈنٹ کسی صورت سے ڈکٹیٹرانہ اختیارات حاصل کر کے پارلیمنٹ توڑ دے اور ہندوستان کو مکمل طور پر دارالاسلام بنادے اور چوں کہ ہندوستان کے جملہ جہات و جوانب میں مسلم اکثریت کے ممالک ہوں گے۔ لہٰذا مسلمان پریزیڈنٹ کے لیے

ایسی صورت پیدا کرنا ممکن بھی نہ ہوگا۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ صرف خیالی نقشے کی بنیاد یا کسی تمنا اور آرزو کے تصور پر قوم کی رہنمائی کرنا یا کسی فتوے کا صادر کرنا قوم کو تباہی کے خندق میں دھکیلنا ہے۔

آپ ہندوستان کے دو حصہ بھی کر دیں۔ اپنے حصے میں ہندو ہندوستان کی کوئی مداخلت بھی گوارا نہ کریں اور یہ بھی چاہیں کہ مسلم ہندوستان کی با اقتدار حکومت دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کی پوری حفاظت اور نگرانی کر سکے یعنی ہندو ہندوستان کا مرکز، مسلم مرکز کے ماتحت اور زیر اثر ہو۔

اور لطف یہ کہ ان آرزوؤں اور تمناؤں کے لیے آپ عملی طور پر ایک قدم بھی نہ اُٹھائیں۔ برطانوی سامراج سے درخواست و التجا۔ کانگریس کو لعن و طعن۔ لہٰذا مسلمانوں کے درمیان منافرت کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنا آپ کا عملی پروگرام ہو تو واقعہ یہ ہے۔

این خیال ست و محال ست و جنوں

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی اسکیم اگر خدانخواستہ کام یاب ہو جائے تو پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی وزن اور ان کی کوئی قیمت باقی نہ رہے گی۔

ہندو ہندوستان میں اس لیے کہ وہاں مجموعی حیثیت میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ دس فیصدی ہوگی۔ گویا ہندو مرکز میں مسلمان نوے فیصدی اکثریت کے ماتحت رہے گا۔

آپ ہزار خواب دیکھتے رہیں کہ مسلم مرکز ان کے حقوق کا محافظ ہوگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کے پاس کیا قوت ہوگی اور کون سا اقتدار اس کو حاصل ہوگا کہ وہ ہندو ہندوستان میں مداخلت کر کے وہاں کے مسلمانوں کی محافظت کر سکے، بالخصوص جب کہ بین الاقوامی قانون یہ ہے کہ ایک سلطنت کو حق نہیں ہے کہ وہ دوسری آزاد سلطنت کے اندرونی معاملات میں دخل انداز ہو۔ ورنہ اس کی آزادی بے معنی۔

چند سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ اسٹالن نے اپنے حریف ٹراٹسکی کے حامیوں کو چن چن کر روس سے ختم کیا۔ ہٹلر نے نازی پارٹی کے مخالفین کو ایک ایک کر کے گولی سے

اڑا دیا۔ مصطفیٰ کمال نے اپنے مخالفین کو پھانسیوں پر چڑھا دیا۔ کیا کسی دوسری حکومت نے ان کے معاملے میں مداخلت کی؟

فلسطین، شام، عراق کے تصفیے کو چھوڑ دیجیے کہ وہ نیم آزاد حکومتیں ہیں، ایک دوسرے کی امداد نہیں کرسکتیں۔ مگر روس اور جرمنی کی حکومتوں اور ان کے نظام کے دشمن تو امریکا اور برطانیہ جیسی دنیا کی عظیم الشان حکومتیں تھیں۔ اپنے ملک میں خبروں کے پہنچانے اور مخالفت کے اُبھارنے کے سوا بھی کچھ کرسکیں؟

آپ قوم کو جس مرکز کی دعوت دے رہے ہیں کیا اس کی اتنی طاقت ہوگی کہ وہ بین الاقوامی قانون کے برخلاف دوسری قوم کے ملک میں مداخلت کرسکے۔ جب کہ آپ نے یہ بھی تسلیم کرلیا ہے کہ ہندو اور مسلمان دو جدا جدا نیشن ہیں اور ہندوستان میں ہندو نیشن (قوم) کی حکومت ہوگی۔

مسٹر جناح پاکستان کی حمایت میں ہر ایک پروپیگنڈا کے باوجود اس اعتراف پر مجبور ہوئے کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کے لیے صرف تین راستے ہوں گے۔ یا وہ ہندو نیشن قبول کرلیں، اور ہندو اکثریت میں مدغم ہوجائیں (ہندو حکومت کے سٹیزن اور شہری بن جائیں) یا وہ اجنبی شخص کی طرح رہیں کہ حکومت میں ان کا کوئی حصہ اور حق نہ ہو۔ جیسے کوئی افغانی ہندوستان میں آکر رہتا ہے یا پھر وہ پاکستان میں چلے آئیں۔

یہ ہر حال ہندو ہندوستان میں تو مسلمان کی قیمت اس طرح ختم ہوئی۔

ممکن ہے کسی ذہن میں یورپ کی وہ جابرانہ تاریخ ہو کہ یورپ کی عیسائی حکومتوں نے سلطنت عثمانیہ میں رہنے والے عیسائیوں کی پشت پناہی کرکے ان کو موقع بہ موقع بغاوت پر آمادہ کیا اور رفتہ رفتہ بہت سے صوبوں کو سلطنت عثمانیہ سے آزاد کرا دیا۔ اور پھر ۱۹۱۴ء کی جنگ میں عربوں کو باغی بنا کر اس کی رہی سہی طاقت بھی ختم کردی۔ مگر اس تاریخ پر نظر ڈالنے کے وقت سب سے پہلے تو یہ خیال رکھنا ہے کہ مسلم حکومتوں کی کمزوری اور عیسائی حکومتوں کی مستعدی اور چستی تقریباً ساتویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔ چناں چہ آٹھویں صدی کے مشہور مؤرخ علامہ ابن

خلدونؒ نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں اس کا رونا رویا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تقریباً چھ سو برس کی جدو جہد کے بعد وہ شکل کام یاب ہوئی ہے۔ اس طرح آپ کو اپنے اس تخیل کے پورا کرنے کے لیے کتنا عرصہ درکار ہوگا؟ اس کا اندازہ کیجیے۔ اس کے سوا اہم بات یہ ہے کہ یہ حریفانہ حرکت جیسا آپ ہندو کے ساتھ کر سکتے ہیں اسی طرح ہندو بھی آپ کے ساتھ کر سکتا ہے۔ بلکہ اس کے لیے بہت زیادہ سہل اور آسان ہے۔ کیوں کہ آپ کی طاقت تو ہندو ہندوستان میں دسویں حصے کی برابر ہوگی۔ مگر ہندو کی طاقت مسلم ہندوستان میں تعداد کے لحاظ سے نصف کی برابر ہوگی اور اقتصادی لحاظ سے نصف سے بہت زاید۔ آپ نے انقلاب کے راستے کی ابھی ایک منزل بھی طے نہیں کی اور بنگال کا ہندو انقلابی ذہنیت میں تمام ہندوستان سے بڑھا ہوا ہے، وہ تقسیم بنگالہ سے بھی بہت پیشتر سے انقلاب کی مشق کر رہا ہے۔

ہندو ہندوستان کے اس تجزیے کے بعد آپ مسلم ہندوستان کو لیجیے۔ وہاں

(۱) سب سے بڑے دو صوبوں میں یعنی پنجاب اور بنگال میں غیر مسلم ۴۴ اور ۴۷ فیصدی ہوگا اور مجموعی حیثیت سے مسلم ہندوستان میں ہندو ۴۵ فیصدی ہوگا۔

(۲) مسلم ہندوستان کے حصے منتشر ہونے لگے۔ بنگال اور آسام ہندوستان کے مشرق میں اور پنجاب وغیرہ تقریباً آٹھ سو میل کے فاصلے کے بعد مغرب میں ان دونوں حصوں میں تعلق قایم رکھنے کے لیے ہندو ہندوستان کی خوشامد کی ضرورت ہوگی اور اس طرح مسلم فیڈریشن اپنے اجزا کو جمع ہی نہ کر سکے گا اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہی نہ ہوگا اور اگر اس نے تعلق قایم کیا تو ہندو کو حق ہوگا کہ وہ اس تعلق کی جو قیمت چاہے مسلمان سے وصول کر لے۔

(۳) ہندو ہندوستان کی سرحدوں پر کوئی بڑی طاقت نہ ہوگی اور مسلم ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر روس کی طاقت ہوگی۔ روس اور امریکا کی کشاکش نے جاپان کو زندہ کر دیا تو مشرقی سرحد بھی ایسی ہی مخدوش ہو جائے گی اور وہ سرحدیں جو ہندو ہندوستان سے ملی ہوئی ہیں ان کے تحفظ کے لیے بھی کافی فوج رکھنی پڑے گی ورنہ پھر ہندو ہندوستان سے ان شرایط پر معاہدہ کرنا ہوگا جو وہ چاہے، کیوں کہ مسلم ہندوستان

ایسے معاہدے کا زیادہ محتاج ہوگا۔ باقی رہا ایران اور افغانستان تو ایران کے متعلق تو روس کی کوشش شروع ہوگئی اور بڑی حد تک زیر اثر کرنے میں وہ کامیاب بھی ہوگیا۔ صرف افغانستان باقی رہ گیا۔ جس کی آبادی تقریباً پونے دو کروڑ ہے یعنی پنجاب کی آبادی سے تقریباً نصف۔ اس کی اقتصادی کمزوری محتاج بیان نہیں۔ نہ ریلوے ہے، نہ اس کی کانیں برآمد ہیں، نہ جدید اسلحۂ جنگ ہیں، نہ اس کے پاس کوئی بندرگاہ ہے، نہ اس کے یہاں مل اور کارخانے ہیں۔ اس کی بقا صرف اس لیے ہے کہ وہ برطانوی اور روسی سرحدوں کے درمیان حد فاصل بنا رہے۔ پھر اس حد فاصل کی تمام ذمے داری پاکستان پر پڑے گی اور اگر ان خطرات سے بچنے کے لیے برطانوی سامراج کا دامن سنبھالا جائے تو یہ آزادی غلامی سے بھی بدتر ہوگی اور پاکستان کا مقدس علاقہ برطانوی اغراض کا ایک مرکز ہوگا اور فوجی مقاصد کی مضبوط چھاونی۔

مختصر یہ کہ پاکستانی تجویز مسلمان کی حیثیت اور اس کے قدر و منزلت کو تمام ہندوستان میں ختم کردے گی۔ اور اپنے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان کی متحدہ طاقت بھی ختم کرکے ہر حملہ آور کے لیے اس کو لقمۂ تر بنادے گی۔

البتہ اگر ایک مرکز رکھا جائے اور صوبہ جات مکمل خودمختار ہوں، حتیٰ کہ ان کو مرکز سے علاحدگی کا حق بھی ہو، جیسا کہ کانگریس منظور کرچکی ہے تو وہ تمام فایدے جو پاکستانی اسکیم کے ذریعے حاصل ہونے ہیں، ان مکمل خودمختار صوبوں کو لامحالہ حاصل ہوں گے۔ تقسیم و تفریق اور جذبات منافرت کی برانگیختگی سے جو خطرات پیدا ہورہے ہیں وہ ختم ہوجائیں گے اور جس طرح مسلم ہندوستان میں مسلمان کی قدر قیمت ہوگی ہندو ہندوستان میں بھی مسلمان اجنبی اور بدیشی نہ ہوگا۔ بلکہ ہندو نیشن قبول کیے بغیر مسلمان اور خالص مسلمان رہتے ہوئے حکومت کا حصہ دار ہوگا اور کاروبار مملکت میں دخیل ہوگا۔ اور اگر فی الواقع اس کے کسی صوبے یا چند صوبوں کے گروپ نے اپنی طاقت کا صحیح موازنہ کرکے مرکز سے علاحدہ ہونا چاہا تو اس کا بھی اس کو حق ہوگا۔

اب جب کہ پاکستانی تجویز تمام ہندوستان میں مسلمان کا وزن گرادیتی ہے اور بالخصوص ہندو ہندوستان میں اس کو ہندو حکومت کا تابع محض محکوم، اور مستامن بنادیتی

ہے جو بہ قول مسٹر جناح ہندو نیشن قبول کیے بغیر حکومت کا حصہ دار نہیں بن سکتا تو مولانا محمد شفیع صاحب کے ارشاد کے بہ موجب مطالبۂ پاکستان قطعاً ناجائز ہوگا۔ کیوں کہ نہ صرف یہ کہ اپنے اختیار سے بلکہ اپنے اصرار اور شدید اصرار سے اپنے اوپر غیر مسلم حکومت کو مسلط کیا جائے گا۔ جو حضرت مولانا کے ارشاد نمبر ایک کے بہ موجب قطعاً ناجائز ہے۔

حضرت مولانا کے ارشاد کا دوسرا حصہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستان جو صدیوں تک دارالاسلام رہا اور اب ایک عرصے سے اس پر غیر مسلم حکومت کا تسلط ہے اور بہت سے خلاف شرع قوانین نافذ ہیں اور مسلمانوں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے ذمے واجب ہے کہ اس تسلط کے ازالے یا تقلیل کی جو صورت جس حصۂ ملک میں (ممکن ہو)، وہ کسی تدبیر سے حاصل کر سکیں اس میں کوتاہی نہ کریں کہ یہ بھی استخلاص دارالاسلام کی ایک فرد ہے۔ (ص ۴۷)

مگر عقل وانصاف سر پیٹ لیتا ہے جب اس تعمیم کے باوجود جو خط کشیدہ عبارت کے الفاظ میں ہے، ادائے واجب کی شکل صرف کانگریس کی مخالفت اور جمعیتِ علما کی تغلیط قرار دے دی جاتی ہے اور انگریز سے (جو اصل محارب ہے جس نے دارالاسلام کو دارالکفر بنایا) کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس کو امن دہندہ قرار دے کر اس کی مخالفت کو خلاف شرع گردانا جاتا ہے (جو مولانا کے رسالے کا لب لباب ہے اور صفحہ ۱۹ و ۲۰ پر اس کی تصریح بھی کر دی ہے)۔

رہا یہ سوال کہ کانگریس کی حکومت جمہوری ہوگی، ہندوستان پھر بھی دارالاسلام نہ بنے گا۔ تو اول تو یہ ہے کہ انگریز جس کا تسلط ہندوستان کے سوا دوسرے بہت سے دارالاسلاموں کو پنجۂ استبداد میں جکڑے ہوئے ہے اس کے مقابلے میں یہ جمہوری حکومت ان بہت سے دارالاسلاموں کے لیے نجات اور آزادی کا ذریعہ بنے گی اور اسلام کی عمومی برادری کے لحاظ سے مسلمانانِ ہند کی جدو جہد ان کے فرض کی ادائیگی میں ممد و معاون ہوگی۔ دوم یہ کہ جب اس جمہوری حکومت کے ماتحت مسلم اکثریت کے صوبے خود مختار ہوں گے اور مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو شرعی محکموں

کے قیام کا حق ہوگا تو کیا یہ استخلاص دار الاسلام کا ایک فرد نہ ہوگا۔

خاتمۂ کلام اور ضروری درخواست:

حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کے اس رسالے میں بہت سی عبارتیں تنقید طلب باقی رہ گئی ہیں۔ مگر چوں کہ صرف اصولی سوال پر تبصرہ پیش نظر تھا، لہٰذا ان عبارتوں پر تنقید وتبصرہ ضرورت سے زیادہ ہے۔

البتہ حضرت مولانا سے نہایت ادب کے ساتھ یہ استدعا ضروری ہے کہ سیاسیات کے ان پیچیدہ قصوں کو انھیں کے حوالے کیجیے جو اپنی زندگی سیاسیات کے لیے وقف کیے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ حضرت تھانویؒ کے مسلک کے بہ موجب اخبارات کا پڑھنا بھی تضیع اوقات ہے تو بہتر ہے کہ ان مسایل کے متعلق شرعی فیصلوں سے بھی اجتناب فرمایا جائے۔

اگر تقسیم کار جماعت کا کوئی مستحسن اصول ہوسکتا ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ان مسایل پر اس اصول کو کیوں نظر انداز کردیا جاتا ہے اور تمنائے اتحاد کے باوجود جماعت کو وقف اختلاف کیوں کیا جاتا ہے۔

هذا. واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين
والصلوة والسلام على رسوله النبى الامى الكريم
وعلى اله واصحابه اجمعين.

بندہ ناچیز
محمد میاں عفی عنہ
۱۲؍ جمادی الثانی ۱۳۶۵ھ
مطابق ۱۵؍ مئی ۱۹۴۶ء

قرآنِ حکیم کو بازیچۂ اغراض مت بناؤ!

از

مؤرخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

قرآنِ حکیم کو بازیچۂ اغراض مت بناؤ!
صرف اپنے مطلب کے رخ کو پیش کرنا تحریف ہے

شیخ مشیت اللہ صاحب شاد سارن پور کے دوورقہ کا جواب

شیخ مشیت اللہ سارن پور کے کوئی صاحب ہیں۔ ان کے نام سے ایک دوورقہ پمفلٹ شائع ہوا تھا، جس میں قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیات کو جمع کیا گیا تھا اور حضرت مولانا آزاد اور حضرت مولانا مدنی مدظلہما کو مخاطب کر کے انتہادرجہ توہین آمیز انداز میں (معاذ اللہ) ان بزرگوں کو وہ سب کچھ کہا گیا تھا جس کا نقل کرنا بھی ایک علم دوست، انصاف پسند، دین دار مسلمان کے لیے تکلیف دہ ہے۔

کسی ایک رخ سے متعلق قرآن پاک کی آیات کو پیش کر کے دوسرے رخ پر پردہ ڈال دینا اور قرآن حکیم کے سچے متبعین کو برا کہنا بالکل وہی مثال رکھتا ہے۔ کہ آیت کریمہ کے ایک جزو لاتقربوا الصلوۃ (نماز کے قریب مت جاؤ) کو پیش کر کے نماز پڑھنے والوں پر لعن طعن کیا جائے۔ اور ان کو کتاب اللہ اور احکامِ الٰہیہ سے منحرف قرار دیا جائے۔

اس بیان میں موصوف نے آیاتِ قرآنیہ پیش کرتے ہوئے کانگریس اور جمعیت علماء سے نفرت دلانے اور مسلم لیگ کی طرف ترغیب میں بزعمِ خود آسمان کے تارے توڑ لیے ہیں۔

مگر مشیت اللہ صاحب کو جوش میں یہ خبر نہیں رہی کہ وہ لیگ کے پیروں میں کلہاڑا مار کر اس کو فنا کر رہے ہیں۔ ہم مشیت اللہ صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ حضرت والا! اگر ان آیات کے معانی وہی ہیں جو آپ بتلا رہے ہیں تو انگریزوں سے موالات (جس پر لیگ کا عمل ہے اور پہلے سے رہا ہے) کیوں جائز اور فرض ہو گیا؟ کیا انگریز کافر نہیں ہیں؟ کیا جو آیات آپ نے اس دو ورقہ میں پیش فرمائیں ہیں اور ان سے ہندوؤں سے موالات کا حرام ہونا، ان کے کافر ہونے کی بنا پر بزعم خود ثابت کیا ہے، تو کیا انگریز ان کے مصداق نہیں ہیں؟ کیا وہ مسلمان ہو گئے ہیں؟ کیا یہ آپ کی پیش کردہ آیات ان کے حق میں منسوخ ہو گئی ہیں اور کیا لیگ انگریزوں اور بالخصوص سابق وائسرائے لارڈ لنلتھگو سے ساز باز نہیں رکھتی رہی؟ اس کو رازدار نہیں بتلایا اور موجودہ وائسرائے کو اس نے شملہ میں اس کی دعوت نہیں دی۔

(دیکھو مدینہ، بجنور، نمبر ۵۴، جلد ۳۴، مورخہ ۲۱ر جولائی ۱۹۴۵ء)

اور کیا آپ ان آیات کو بھول گئے ہیں، جن میں یہود و نصاریٰ کی موالات کو خصوصیت اور تصریح کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ کیا وہ آیات منسوخ ہو گئی ہیں؟ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ قرآن شریف میں مندرجہ ذیل آیت بھی موجود ہے:

"یاایہا الذین امنوا لاتتخذوا الیہود و النصارے اولیاء بعضہم اولیاء بعض و من یتولہم منکم فانہ منہم ان اللہ لایہدی القوم الظالمین"۔ (سورۂ مائدہ: ۵۱)

"اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست مت بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی اور دوست ہیں اور تم میں جو ان سے دوستی کرے گا۔ وہ ان ہی میں سے ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا"۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"یاایہا الذین امنوا ان تطیعوا فریقاً من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین"۔ (سورۂ آل عمران: ۱۰۰)

"اے ایمان والو! اگر تم کسی فریق کی ایک کتاب میں سے اطاعت اور فرمانبرداری کرو گے، تو وہ تم کو ایمان کے بعد کفر کی طرف لوٹا دیں گے"۔

آپ نے ان آیات کے ساتھ ان آیات کو بھی کیوں نہ ذکر فرمایا، بلکہ اُوپر کا حصہ جس میں یہود و نصاریٰ کا ذکر ہے، حذف کر کے بعد کا حصہ "بعضھم اولیاء بعض و من یتولھم الخ ذکر فرمایا۔ کیا یہ صریح دھوکا دہی نہیں ہے؟ کیا لاتقربوا الصلوۃ والی مثال اس پر چسپاں نہیں ہوتی؟ کیا لیگ وزارتوں کے لیے اسمبلیوں اور کونسلوں کی سیٹوں پر فائز ہونے کے لیے ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کی چیرمینی، ممبری اور دوسرے عہدوں پر قبضہ کر کے (حکومت کی جو خدمات انجام دیتے ہیں، وہ ۱ـ) انگریزوں (نصاریٰ) کی موالات نہیں ہے؟ کیا برطانوی شہنشاہیت کے کیل و پرزے بن کر اس کی مشینری کو چلانے کے لیے لیگی حضرات ہر وقت بے چین و بے قرار نہیں ہیں اور کیا یہ موالات نہیں ہے؟ (دیکھو "بیان القرآن" جلد صفحہ ۱۲)۔ کیا وہ مرقع لیگ کا جو زمیندار (لاہور) ۲۵/ مارچ ۱۹۴۱ء میں صفحہ ۲، کالم ۵ میں کھینچا گیا ہے، اس پر روشنی نہیں ڈالتا؟ مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

"ہم مسلم لیگی بھی دوسری جماعتوں کی طرح برطانیہ ہی کی فتح چاہتے ہیں۔ ہم برطانیہ کو مظفر و منصور دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم صدیوں سے برطانیہ کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کا رویہ خواہ کتنا ہی سخت و تند کیوں نہ ہو، اس کے قوانین کتنے ہی مطلق العنانہ کیوں نہ ہوں، پھر بھی ہم مدتوں سے اکٹھے رہتے آئے ہیں"۔

صفحہ ۷، کالم نمبر ۸ مین فرماتے ہیں:

"مسلم لیگ ایسے وقت میں برطانیہ کو پریشان کرنا نہیں چاہتی جب کہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اور نہ فوجی بھرتی میں رکاوٹ بننا چاہتی ہے اور نہ اس نے سول نافرمانی کا حربہ استعمال کیا، بلکہ وہ غیر جانبدار ہے۔ اگرچہ اس کی غیر جانبداری بھی جارحانہ رنگ کی نہیں ہے۔ اس نے کچھ ارکان کو اجازت دے دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو برطانیہ کی مصیبت کے وقت کام آسکتے ہیں۔ سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب نے، جو پنجاب مسلم لیگ کے ایک سربر آوردہ رکن ہیں، اتنی زبردست فوجی امداد کی ہے کہ جس کی مقدرت کسی اور شخص کو نہیں ہو سکتی"۔

۱ـ اس مقام پر کتابت کی غلطی سے عبارت بے معنی ہو گئی تھی۔ قوسین کا جملہ اضافہ کر کے عبارت کو با معنی اور مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ (ا۔ س۔ ش)

صفحہ ۸، کالم نمبر ا میں فرماتے ہیں :

"اور ہم ہندی مسلمان بھی (خواہ ماضی میں ہمیں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رہا ہو) انگریزوں کے ساتھ ہیں اور اس وقت بھی ہم تمہاری امداد کرنا چاہتے ہیں"۔

کیا یہ عبارتیں لیگ کی انگریزوں کے ساتھ ہر قسم کی موالات پر دلالت نہیں کرتیں ؟ دلی دوست، مناصرۃ، امداد، تعلقاتِ محبت، تعاون، سب کے سب کیا لیگ اور انگریز میں ثابت نہیں ہوتے ؟ کیا مشیت اللہ صاحب موصوف بتائیں گے کہ برطانیہ جیسی کافر حربی محارب جس نے عالم اسلامی کو فنا کرنے، مقاماتِ مقدسہ کو روند کر کچل ڈالنے، ہندوستان میں اسلامی طاقتوں کو فنا کردینے، افواج و اموال و حکوماتِ اسلامیہ کو اندرون ہندوستان و بیرون ہندوستان ٹرکی، شام، فلسطین، عراق، مصر، سوڈان، شمالی لینڈ، چناق قلعہ، مکہ معظمہ، مدینہ، طائف وغیرہ میں دو سو برس سے برباد کرنے کی پالیسی جاری رکھی ہو اور آج بھی اس کی فوجیں فلسطین، شام، عراق، ایران میں مسلمانوں کو طرح طرح کی مصائب میں مبتلا کیے ہوئے ہیں، جو آیندہ کے لیے بھی اس کے پاس طاقت عظیم ہو، اس کے ساتھ موالات و اعانت جائز اور صحیح ہے، بلکہ واجب ہے۔ اور ہندوؤں سے موالات جو کہ ایک ہزار برس سے مسلمانوں کے ذمی اور رعایا تھے اور پھر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ (ایک ہی وقت میں) برطانیہ کے غلام اور رعایا بن گئے، وہ آج مسلمانوں ہی طرح بے دست و پا ہیں۔ نہ ان کے پاس فوجیں ہیں، نہ ہتھیار، نہ حکومت ہے، نہ سامان حرب و کارو زار غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے مسلمانوں کی طرح دم توڑ رہے ہیں اور وہ کانگریس (جو کہ تمام ہندوستانیوں کی خواہ وہ کسی نسل اور مذہب کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں، آزادی خواہ جماعت ہے) حرام اور ممنوع ہے۔ کیا شریعت اسلامیہ میں ہر کافر کا حکم ایک ہی ہے ؟ کیا حربی اور ذمی، محارب و مسلم، مستامن و غیر مستامن سب کے احکام ایک ہی ہیں ؟ وہ کفار جن سے موالات ظاہری نہ کرنے میں قوی اور یقینی اندیشہ ہو اور وہ کفار جن سے موالات ظاہری نہ کرنے میں کسی مضرت کا اندیشہ نہ ہو اور وہ کفار جن سے موالات کرنے میں ان کی ہدایت و

اصلاح کی امید ہو اور وہ کفار جن سے ہدایت کی امید نہ ہو، مہمان ہونے والا کافر اور غیر مہمان جو بھی غیر مسلم ہو وہ سب کے سب ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جائیں گے۔ ذرا "تتمہ امداد الفتاوی"، جلد نمبر ۴، صفحہ ۸ اور "بیان القرآن"، جلد دوم صفحہ ۱۱ ملاحظہ فرمائیے۔ کیا محارب حربی کا حکم تمام کافروں سے سخت اور شدید نہیں ہے؟ جس کے مصداق اوّل درجے میں انگریز ہیں اور ذمی کافروں کے احکام تمام کافروں کے احکام سے نرم نہیں ہیں؟ اور کیا مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ ہندوؤں کے حکم کو ذمیوں کے مثل نہیں بتاتے۔ دیکھو امداد الفتاوی جلد نمبر ۴، صفحہ ۵۶۔

کیا ان کی نظر سے آیت لاینھا کم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحبُّ المقسطین (سورۂ ممتحنہ: ۸) نہیں گزری، جس میں فرماتے ہیں کہ

"اللہ تعالیٰ تم کو ان کافروں سے بھلائی اور انصاف کرنے سے منع نہیں کرتا جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہ کی ہو اور تم کو تمھارے گھر بار سے نہ نکالا ہو۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ انہ ھوالسمیع العلیم وان یروا ان یخدوک فان حسبک اللہ (سورۂ انفال: ۶۱)

"اور اگر کافر لوگ تم سے صلح کرنے پر مائل ہوں، تو تم بھی مائل ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ پر اعتبار کرو۔ وہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ یہ لوگ دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں تو (پرواہ مت کرو) اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کافی ہے"۔

کیا آپ کو جناب رسول ﷺ کے معاملات صلح حدیبیہ، صلح یہود، صلح قبائل مشرکین، صلح نصاری نجران وغیرہ کے معلوم نہیں ہیں؟ کیا آپ نے

الاالذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئًا ولم یظاھروا علیکم احدا فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم (سورۂ توبہ: ۴)

"تم مشرکین سے برأت کا اعلان کر دو۔ مگر وہ مشرک جن سے تم نے عہد و پیمان

کیا ہو اور انھوں نے عہدوں میں کمی نہ کی ہو اور نہ تمہارے دشمنوں کی مدد کی ہو، تو تم ان سے ان کے عہد کو جس مدت تک کے لیے کیا گیا ہو پورا کرو"۔

قرآن میں نہیں دیکھا کیا آپ نے کانگریس کے دستور کو نہیں دیکھا۔ کیا اس کی دفعات آپس کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے عہد نہیں ہیں۔ کیا ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ نے کانگریس سے پیکٹ اور عہد نہیں کیا تھا، جس کو میثاقِ ملّی کے نام سے شہرت دی گئی کہ کانگریس نے آپ کے اس میثاق ملّی کو توڑا اور جب کہ ہر ریزولیوشن کثرتِ رائے سے پاس ہونے کا اصول مسلم ہے تو کیا لیگ نے پنجاب اور بنگال کی سیٹوں کو آبادی سے گھٹا کر اکثریت کو اقلیت میں نہیں بدلا؟ اور مسلمانوں کے ساتھ صریح غداری نہیں کی؟ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ یہی لیگی ۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس میں اقلیتوں سے وہ شرمناک معاہدہ جس کو اقلیتوں کا معاہدہ کہتے ہیں، کر کے نہیں آئے؟ جو کہ صریح غداری تھی اور کیا لیگ نے کمیونل ایوارڈ تسلیم کر کے مسلمانوں کے ساتھ پنجاب اور بنگال میں کھلی غداری نہیں کی، جس میں مسلمانوں کو بنگال میں ۲/۱، ۴۷ (ساڑھے سینتالیس) اور پنجاب میں ۴۹ فی صد کر دیا گیا۔ غور کیجیے غدار کون ہے؟ کیا مشیت اللہ صاحب روزانہ قرض کے، تجارت کے، زراعت اور لین دین کے، زمینداریوں اور صنعت و حرفت کے معاملات ہندوؤں کے ساتھ ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے؟ کیا تمام اداراتِ زندگانی اور تمام ملازمتوں میں ہندوؤں کے ساتھ خلط ملط نہیں رہتا؟ کیا ہندو وکلا و بیرسٹر، ہندو ڈاکٹروں اور انجینروں وغیرہ سے معاملات نہیں ہوتے؟

کیا یہی لیگ اور اس کے زعما کونسلوں میں جا کر ساتھ ساتھ نشست و برخاست، پارٹی بندیاں، ٹی پارٹی اور لنچ پارٹی اور تمام معاملات مودت و محبت و دوستی سے انجام نہیں دیتے؟ پھر سب کو حرام کیوں نہیں قرار دیتے۔ کیا آزادیٔ ہندوستان اور غلامی کی زنجیروں سے خلاصی کے لیے ہمارا اجتماع ہی حرام ہے اور لیگ کے لیے ہر معاملہ خواہ کتنی ہی یگانگت کا کیوں نہ ہو، سب حلال بلکہ واجب ہے؟

آپ کو جاننا چاہیے کہ جمعیت کا کانگریس اور غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ موالات (دلی دوستی) مناصرة، اعانت یا استعانت کا نہیں ہے، بلکہ اشتراکِ عمل کا ہے۔ جیسے کہ کسی ہندو کو دہلی جانا ہو اور کسی مسلمان کو بھی وہاں جانا ہو، تو دونوں کو ضروری ہو گا کہ ایک ہی سڑک پر، ایک ہی گاڑی میں، ایک ہی اسٹیشن پر، ایک ہی پلیٹ فارم سے، ایک ہی کھڑکی سے، ایک ہی قسم کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوں۔ اور اس مقصد اور راہ میں جن چیزوں کا کرنا اور جن سے بچنا لازم ہو، دونوں عمل میں لائیں۔ اس کو اشتراکِ عمل کہتے ہیں۔ یہ موالات نہیں ہے، سمجھیے! کلام اللہ کا احترام کیجیے، کلام پاک کی مقدس آیتوں کو اپنی اغراض کا آلہ مت بنائیے۔

چوں بنگری عمل اہل دل مگو کہ خطا است

عمل شناس نہ دلبرا خطا ایں جا است

یہ ایسا ہی ہے کہ اگر کسی گاؤں میں بھیڑیا لاگو ہو گیا ہو، کبھی ہندو کے بچے کو اٹھا لے جاتا ہو، اور کبھی مسلمان کے بچے کو، کبھی سید کے بچے کو اور کبھی چمار کے بچے کو، کبھی غریب کے بچے کو اور کبھی امیر کے بچے کو، ایسے وقت میں سب گاؤں والے اپنی پنچایت کریں اور گاؤں کی ناکہ بندی کی رائے پاس کر کے متفقہ طور پر بھیڑیے کو قتل کرنے اور گاؤں میں گھسنے سے روکنے کی تدبیریں عمل میں لائیں۔ تو کیا کوئی ادنےٰ سمجھ والا بھی اس کو ناجائز کہہ سکتا ہے؟ برطانوی سامراج بھیڑیے سے بھی زیادہ خونخوار اور بُرا ہے، جو اپنی شہنشاہیت اور مستعمرانہ اغراض کے لیے ہندوستانیوں کا خون چوس رہا ہے۔ اس کو نکالنا ہر ایک ہندوستانی کا فرض اولین ہے، بلکہ مسلمانوں کا فرض سب سے زیادہ ہے۔ اس کی بادشاہت کو برطانیہ نے برباد کیا ہے اور اسی کی برادری ہے جو فلسطین، عراق، ایران وغیرہ اسلامی ممالک میں برباد کی جارہی ہے۔ اور جس قدر اس نے مسلمانوں کو برباد کیا ہے اس قدر ہندو کو نہیں کیا، مگر مسلمان تنہا اس کو نکال نہیں سکتا۔ اس کے لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ دوسروں کو ساتھ لے کر اس خونخوار درندے کو ہندوستان سے نکالے اور جب تک نکال نہ سکے آرام نہ لے۔

مشیت اللہ صاحب! میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ مسلمانوں کو دھوکا نہ دیجیے۔ بغیر علم فقہ و تفسیر آیتوں کی تحریف نہ کیجیے۔ لیگ برطانوی جماعت ہے۔ برطانیہ کی اغراض کے لیے برطانیہ کے رجعت پسندوں نے بنوائی ہے اور آج بھی وہ برطانیہ کی خدمات انجام دے رہی ہے اور برطانیہ ہر طرح اس کی سرپرستی کر رہا ہے۔ ہر قسم کے پروپیگنڈے کی اس کو اجازت ہے۔ صرف ایک دہلی شہر سے نو دس اخباروں کے جاری کرنے کی، نیز کاغذ وغیرہ کی سہولتیں دی گئیں ہیں۔ جمعیت کو، مسلم مجلس کو، کانگریس کو، مسلم نیشلسٹ کو، برطانیہ کی طرف سے ہر قسم کی رکاوٹیں ہیں۔ کیا یہی بات اور اس جیسی بیسیوں باتیں آپ کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ لیگ سے توبہ کیجیے اور جمعیت اور کانگریس میں داخل ہو کر سب سے بڑے دشمن اسلام کا ہندوستان سے خاتمہ کیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم کو ہدایت نصیب کرے۔ ہم نے لیگ میں داخل ہو کر خوب جانچا ہے، تب اس سے علاحدہ ہوئے ہیں۔

مرادِ ما نصیحت بود و گفتیم
حوالت باخدا کردیم و رفتیم

آپ کی دائرۂ تہذیب سے نکلی ہوئی باتوں کا جواب ہم بے موقعہ دیکھتے ہیں، اس لیے خاموشی اختیار کرتے ہیں۔

(مولانا) محمد میاں عفی عنہ

حوالہ: زمزم، لاہور۔ ۳۰؍ نومبر ۱۹۴۵ء، صفحہ ۳

مسلم لیگ کے دعاوی اور ان کی حقیقت

تحریک پاکستان کے پس منظر میں
ایک تنقیدی نظر

از

مورخِ ملت

حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

تدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

مسلم لیگ کے دعاوی اور ان کی حقیقت

تحریک پاکستان کے پس منظر میں ایک تنقیدی نظر

پیش لفظ

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کا یہ رسالہ اولاً ۱۹۴۶ء کے آغاز میں "خطرناک نعرے اور جمعیت علماے ہند کا صراط مستقیم" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں تحریک پاکستان کے پس منظر کے بعض افکار و مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر یہ کوئی پہلی اور آخری تحریر نہیں۔ اس سے پہلے بے شمار مضامین، کتابچے اور مفصل کتب شائع ہو چکی تھیں، جو مفید معلومات، عالمانہ تجزیوں اور نہایت قابلِ غور افکار پر مشتمل تھیں۔ اس سلسلے میں :

۱۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے رسائل، متحدہ قومیت اور اسلام، پاکستان کیا ہے؟ (حصہ اول و دوم) یادگار ہیں۔ ان کے علاوہ "کشف حقیقت" میں "پاکستانی فارمولے" کے بارے میں نہایت فکر انگیز، معلومات افزا اور مفصل بحث ہے۔ خطبات و مکاتیب میں مباحث و افکار مزید ہیں۔

۲۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا رسالہ : متحدہ قومیت اور اسلام، تحریک پاکستان پر ایک نظر،

۳۔ مولوی محمد ابرار احمد صدیقی سیوہاروی کا رسالہ : "پاکستان کی حقیقت" اور

۴۔ ابو المحاسن مولانا سید محمد سجاد بہاری کا رسالہ "پاکستان کی چیستان" موجود ہیں۔

۵۔ تاریخی و تنقیدی نقطۂ نظر سے "نئی زندگی" الٰہ آباد کا خاص نمبر (۱۹۴۶ء) مرتبہ ڈاکٹر سید محمود ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ تمام کتب و رسائل اگرچہ ایک خاص نقطۂ نظر کے ترجمان ہیں، مگر اپنے فکر اور مواد

ہر دو اعتبار سے اس موضوع پر ضروری حد تک مفصل، جامع، فکر انگیز، معلومات کا خزانہ، زبان وبیان کی خوبیوں سے مرصّع اور اپنے مصنفین کے بہترین اخلاق و تہذیب اور ان کی ملّی بہی خواہی، اسلامی افکار، حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اور سیاسی تدبر و بصیرت کا آئینہ ہیں۔ کوئی محقق اور مصنف انھیں نظر انداز کر کے تحقیق و تاریخ کا قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔

قومیت کے مسئلے پر حضرت مدنی اور مولانا سیوہاروی کے رسائل جو ایک ہی عنوان سے ہیں، دینی، تاریخی، سیاسی، فکری، منطقی ہر لحاظ سے جامع الاطراف اور نہایت فکر انگیز و معلومات افزا ہیں۔ دیگر رسائل میں پاکستان کی تحریک، پس منظر، افکار و دعاوی، عواقب و نتائج وغیرہ کے مطالعے کے لیے بہترین مواد ہے۔

اس قسم کے لٹریچر میں مولانا سید میاںؒ کا یہ رسالہ جواب "تحریک پاکستان کا پس منظر ...... افکار و دعاوی پر ایک نظر" بہ قامتِ کہتر اور بہ قیمت بہتر کی ایک عمدہ مثال ہے۔ جو حضرات ہر مسئلے کے تفصیل میں مطالعے کے شایق ہیں، ان کے ذوقِ مطالعہ کے لیے تو یہ مہمیز کا کام دے گا، لیکن جو حضرات مختصر مطالعے کو پسند کرتے ہیں، ان کے ذوق کی تسکین کے لیے یہ مختصر رسالہ تحریک کے تاریخی اور نفسیاتی پس منظر، عالمانہ تبصرے، مدبرانہ تجزیے، زبان کی سنجیدگی، لہجے کی شائستگی، بیان کی سادگی، اسلوب کی دل نشینی، استدلال کی پختگی، رائے کی اصابت، غرض کہ فکر، زبان، اسلوب اور مواد، ہر اعتبار سے اطمینان بخش ثابت ہوگا۔

تحریک پاکستان کے کامیابی سے ہم کنار ہونے سے پہلے جن حضرات نے اس کی موافقت یا مخالفت میں قلم اٹھایا تھا، وہ ان کی محض رائے تھی اور اس کی بنیاد سب کے یکساں اخلاص کے اعتراف کے باوجود سب کے الگ الگ تاریخی اور دینی مطالعے، گرد و پیش کے مشاہدے، بانیاں تحریک کے افکار و دلائل اور سیرت کے تجزیے پر تھی۔ فکر و رائے کے سوا کسی کے پاس کوئی ایسی کسوٹی نہ تھی، جس پر کس کر کسی کی رائے و فکر کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ کر دیا جا سکتا، البتہ تحریک کے کامیابی سے ہم کنار ہونے کے بعد روز بہ روز ایسے حالات

وواقعات رونما ہوتے چلے گئے کہ سابقہ رائے کی صحت کا فیصلہ کرنا آسان ہوتا گیا اور اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ رائے ان حضرات کی درست تھی جنہیں جھٹلایا گیا تھا اور جن کی رائے کی اصابت تو کجا ان کی نیت کا اخلاص بھی تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن جو حالات پیش آچکے ہیں ان میں سے کون یہ جرأت کرسکتا ہے کہ ان کی نیت کے اخلاص، رائے کی اصابت، فکر کی پختگی اور سیرت کی مضبوطی کو جھٹلائے! نصف صدی کی تاریخ نے کتنے ہی رازوں سے پردہ ہٹادیا ہے۔ اخلاص کے کتنے ہی دعوے جھٹلا دیے گئے اور قوم و ملت کی بہی خواہی اور فلاح و بہبود کے کتنے منصوبے تھے، جن پر خدا کو گواہ ٹھہرایا گیا تھا، لیکن تاریخ نے ورق الٹا تو معلوم ہوا کہ وہ دشمن کی سازش تھی اور اس کے مدعی نہ صرف سازش کا شکار ہوئے تھے بلکہ ان میں سے بعض بالارادہ دشمن کے آلۂ کار تھے۔ لیکن جنہیں دشمن کا ایجنٹ اور ملت کا غدار کہا گیا تھا، کیا کوئی بات ایسی بھی سامنے آئی جو ان کے اخلاص نیت میں شک پیدا کرے یا جس سے ان کی رائے کی اصابت کا رد کیا جاسکے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ ان بزرگوں نے جو کچھ کہا تھا، وہ حرف حرف پورا ہوا اور جن خطرات و خدشات کا اظہار کیا تھا، وہ ایک ایک خطرہ پیش آچکا ہے اور کوئی خدشہ ایسا نہیں جس سے گذشتہ پچاس سال میں قوم دوچار نہ ہوچکی ہو۔ گذشتہ نصف صدی کی تاریخ کی ہر صبح و شام نے ان کی اصابتِ رائے پر مہر تصدیق ثبت کی ہے اور خواہ زبانیں اس کے اعتراف میں خاموش رہی ہوں، لیکن حالات و واقعات نے چیخ چیخ کر ان کے اخلاص و تدبر کی گواہی دی ہے۔

آج ہم پلٹ کر ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو اچٹتی ہوئی نظر میں بھی اندازہ کرلیتے ہیں کہ گذشتہ ساٹھ سال کے ابتدائی دس برس (۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء) میں لیگی قیادت نے جوش و جذبات، نفرت و تعصب اور جھوٹ اور فریب کی جو فصل بوئی تھی اور بزدلی، بے اعتمادی، شک و تذبذب اور عدم یقین کا جو سبق پڑھایا تھا، ہم آج تک وہی فصل کاٹ رہے ہیں اور بزدلی و بے اعتمادی کے پڑھائے ہوئے سبق کے سحر میں گرفتار ہیں۔

لیگی سیاست نے جو مسائل پیدا کیے تھے، ان میں سے معقول اور اطمینان بخش حل کسی

مسئلے کا بھی نہیں نکلا۔ محض جذباتی باتیں اور خطرناک نعرے تھے اور مسلمانوں نے انھیں کو اپنی سادگی سے مسائل کا حل سمجھ لیا تھا۔

جمعیت علماے ہند کے سامنے یہ مسئلہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں الیکشن کے وقت اچانک نہیں آگیا تھا، بلکہ ۱۹۲۰ء کے بعد تقریباً پچیس برس تک اس کے غور و فکر کا بہ طورِ خاص یہ اہم موضوع رہا تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبرومندانہ اجتماعی زندگی کے قیام کے بارے میں جمعیت علماے ہند کے اکابر نے شب و روز سوچا تھا اور اس کے حصول و قیام کے لیے مسلسل جد و جہد کی تھی۔ اس کا کوئی سالانہ اجلاس اور مجلس عاملہ کا کوئی جلسہ ایسا نہیں ہوا، جس میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اور اس کے اسلامی حقوق کے حصول و تحفظات کا کوئی چھوٹا یا بڑا مسئلہ زیرِ غور نہ آیا ہو۔ جمعیت علماے ہند کی تاریخ اس کی گواہ اور مولانا سید محمد میاںؒ کی تالیف لطیف جمعیت علما کیا ہے؟ اس کی مستند تاریخی دستاویز ہے۔ اگرچہ اسناد و حوالہ جات کا سلسلہ بہت دراز ہے۔ جمعیت علما نے اس مسئلے میں ملک کی دوسری جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی بھی نہ صرف کوشش کی بلکہ اسے مسلم لیگ کے سوا مسلمانوں کی تمام حریت پسند جماعتوں کا تعاون حاصل بھی رہا تھا۔

جمعیت علماے ہند کے رہنماؤں نے اس مسئلے کا نہایت معقول اور اطمینان بخش حل پیش کیا تھا اور یہ حل نہ صرف مسلمانوں کے لیے اطمینان بخش تھا بلکہ ملک کی اکثریت کے لیے قابل قبول اور اقلیتوں کے مذہبی، سماجی، سیاسی، تہذیبی اور دیگر ہر طرح کے حقوق کا بھی ضامن تھا۔ مولانا سید حسین احمد مدنی کے قلم سے ”مسٹر جناح کا پراسرار معمہ اور اس کا حل“ جو یادگار رسالہ ہے۔ اس کے ضمیمۂ ثانی میں مولانا سید میاںؒ لکھتے ہیں:

> ”پراسرار معمہ“ کے مفصل حل کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے موقف کے متعلق جمعیت علماے ہند کا فیصلہ بھی نقل کر دیا جائے۔ تاکہ رسالہ کے ملاحظہ کرنے والے یہ فیصلہ کر سکیں کہ جمعیت علما صرف منفی پہلو میں مسلم لیگ کا خلاف نہیں کر رہی، بلکہ اس کے سامنے ایک واضح اور صاف نقشہ ہے

جس کو وہ پاکستان سے بہتر سمجھتی ہے اور از روے دیانت اس کا یہ فیصلہ کہ پاکستان کا مبہم مطالبہ مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ جس طرح ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر کے بہت سے پاکستان بنا دیے گئے۔ عراق علاحدہ، شام علاحدہ، فلسطین علاحدہ، حجاز علاحدہ وغیرہ وغیرہ جو فرانس اور برطانیہ کے پنجۂ استبداد میں کسے ہوئے آج تک کراہ رہے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۴۵ء کی جنگ کے بعد وعدہ آزادی کو پورا کرتے ہوئے ہندوستان کے حصے بخرے کر دیے جائیں۔ جو ہمیشہ ایک دوسرے کے بمقابل انگریزی اقتدار کے متمنی رہیں اور لطف یہ کہ خود مسلمانوں کے مطالبے کی بنا پر ہو، جیسا کہ مسٹر جناح نے فرمایا تھا:

"اور جب تک دونوں ٹکڑے آپس میں امن سے نہ رہیں، تب تک برطانوی حکومت کا فوجی اور خارجی کنٹرول ضروری ہے"۔

(مدینہ بجنور، نمبر ۱۷، جلد ۳۳، مورخہ ۵/ مارچ ۱۹۴۴ء)

ان بزرگوں کا وہ فیصلہ کیا تھا؟ وہ فیصلہ وہی تھا، جس کا اعلان جمعیت علماے ہند کے ۱۹۳۱ء اور ۱۹۴۵ء کے اجلاسوں میں کیا گیا تھا۔ اس رسالے میں اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جمعیت علماے ہند کے لٹریچر اور اس کے رہنماؤں کی تحریرات اور خطبات وبیانات میں اگر ہزاروں نہیں تو سیکڑوں صفحات اس کی وضاحت میں موجود ہیں۔ جن سے اس کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے اور گذشتہ نصف صدی سے زیادہ کے تجربات اور مشاہدات ان بزرگوں کی اصابتِ راے پر شاہد عدل ہیں۔

ان کی اصابتِ راے اور ان کے تدبر و فراست کی یہ کتنی بڑی دلیل ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ساڑھے تین کروڑ کی جس اقلیت کو حقیر سمجھ کر پاکستان کی اکثریت اور اس کے مفاد پر قربان کر دیا گیا تھا اور انھیں ہندوستان کی اسی ہندو حکومت، جو خود مسلم لیگ کے رہنماؤں کے قول کے مطابق ایسی سخت اسلام دشمن، مسلم کش، متعصب اور تنگ دل و تنگ نظر تھی کہ کسی صورت میں مسلمانوں کے وجود اور ان کی زبان اور تہذیب کو برداشت نہ کر سکتی تھی، کی وفاداری کی ذلت آمیز تلقین کر کے اسی کے حوالے کر آئے تھے، آج وہ جنوب

مشرقی ایشیا کی سب سے بڑی مسلم تعداد اور ایک باعزت قوم ہے، تاریخ کا یہ بھی کتنا عجیب اتفاق ہے کہ جس جماعت کے بزرگ لیگ کے ظلم و ستم کا سب سے زیادہ نشانہ بنے تھے، وہ ہی جماعت اور اس کے مقتدر رہنما ہی اُن کی قیادت کے اہل قرار پائے۔

اس رسالے میں تحریک پاکستان کے پیش منظر، پس پردہ اغراض و مقاصد اور لیگی رہنماؤں اور تحریک پاکستان کے شارحوں کے افکار و دعاوی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز جمعیت علماے ہند کے تاریخی فیصلے کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مطالعہ محض تاریخی ضرورت اور ذوق کی تسکین کا ذریعہ ہی نہیں، اس میں بڑی عبرتیں اور بصیرتیں ہیں۔

اس رسالے کے فاضل مؤلف مولانا سید محمد میاںؒ نے جمعیت علماے ہند کے جس تاریخی فیصلے پر اس میں روشنی ڈالی ہے۔ یہی فیصلہ مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا اور اس وقت کی تمام حریت پسند جماعتوں کے علاوہ کانگریس نے بھی اس کے اصول و فلسفہ کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے خطرناک نعروں، جذباتی بیانوں اور اشتعال انگیز تقریروں نے اس فیصلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔

اس رسالے کے مطالعے سے ایک صحت مند اور مثبت اندازِ فکر کی تعمیر میں مدد ملے گی۔ یہ سیاسی کارکنوں کی تربیت کا ایک عمدہ نصاب بھی ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ نہ صرف جمعیت علماے ہند اور جمعیت علماے اسلام سے تعلق و دلچسپی رکھنے والوں میں بلکہ تاریخی و سیاسی مطالعے کے عام شائقین اور تاریخ و سیاست کے طالب علموں میں بھی پسند کیا جائے گا۔ اس لیے کہ اس میں تاریخِ سیاست کے ایک اہم مسئلے کی مثبت انداز میں وضاحت اور حقایق کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

اس رسالے کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا تو یہ مختلف عنوانات کے تحت ایک مسلسل اور رواں مضمون تھا۔ زیرِ نظر ایڈیشن چند ابواب اور بعض اہم ضمیموں میں منقسم اور مرتب کر دیا ہے۔ بعض اقتباسات کے حوالوں کی صراحت کر دی ہے۔ اس سے مطالب

کی تفہیم میں آسانی اور انھیں ذہن نشین کرنے میں سہولت ہو جائے گی۔

ضمیموں میں سب سے پہلے مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ ہی کی چند تحریرات ہیں، جو دستیاب ہو گئی ہیں۔ان کا مقصد صرف یہی نہیں کہ ان تحریرات کا محفوظ ہو جانا ضروری تھا، بلکہ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ تحریرات رسالے کے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں موضوع کی مزید وضاحت ہے اور کوئی نہ کوئی علمی وفکری نکتہ ان میں ضرور ایسا ہے جس کا قارئین کرام کے علم و مطالعہ میں آنا ضروری تھا۔

اس موضوع اور مسئلے کے متعلق زمزم، لاہور کا ایک شذرہ بھی ہے جس میں جمعیت علماے ہند کے فیصلے پر تبصرہ ہے۔ نیز مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک مضمون اور ایک دوسرے مضمون میں اس کی وضاحت و استدراک ہے۔ ان میں مولانا دریابادی نے اپنے مخصوص انداز میں پاکستان کی اسکیم کے پس منظر اور اس کے رہنماؤں کے افکار و دعاوی اور ان کی سیرت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے علاوہ مسٹر محمد علی جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کے دو بیانات پر تبصرے ہیں۔ نواب زادہ کے بیان پر مولانا سید محمد میاں کے قلم سے تبصرہ ہے اور مسٹر جناح کے بیان پر ایڈیٹر زمزم کا ایک شذرہ ہے۔ اسی طرح ''کانگریس کے حقِ خود ارادیت'' پر مولانا سید محمد میاں ہی کے قلم سے ان کے ایک بیان کی وضاحت میں ''علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' (حصہ دوم) سے ایک اقتباس نقل کر دیا ہے۔

ان مشمولات کے اضافے سے یہ رسالہ افکار اور تاریخ کی ثابت شدہ حقیقتوں کا مرقع بن گیا ہے۔

امید ہے کہ ان تحریرات کی شمولیت کی افادیت کو محسوس کر لیا جائے گا۔

ابو سلمان شاہ جہان پوری

باب اول:

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

استقلال قوم اور استقلال مرکز کا

خوابِ پریشاں

سیاست، صرف فلسفہ نہیں! سیاست کا بیشتر حصہ حال اور ماضی کے واقعات سے مرتب ہوتا ہے۔

منطقی دلائل، دل چسپ بیانات اور ولولہ انگریز تقریریں جو موجودہ ماحول اور ماضی قریب کے واقعات کی حقیقتوں سے بہرہ اندوز نہ ہوں، فریب نظر ہیں، سراب ہیں۔ جس کے تشنہ کام ذرات کی درخشانی تشنہ لبوں کو مو دریا کا دھوکا دیتی ہے۔ حال آں کہ وہاں تشنگی اور سراب کی ہلاکت کے سوا سیرابی کا نام ونشان بھی نہیں۔

اسلامی ہندوستان کی فضا آج نعرۂ پاکستان سے گونجی ہوئی ہے اور فرقہ وارانہ ذہنیت نے (جس کی پرورش برطانوی سامراج کی "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" والی پالیسی تقریباً دو سو برس سے کر رہی ہے۔) جذباتی فضا کے لیے اس نعرے کو انتہا درجے دل کش اور جاذب توجہ بنا دیا ہے۔ انتہا یہ کہ ہمارے محترم بزرگ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی بھی اس موجِ طوفاں سے دامن نہ بچا سکے اور باوجودے کہ آپ عملی سیاست سے ہمیشہ کنارہ کش رہ کر محض فکری اور منطقی سیاست کے خوگر رہے ہیں، اس ارشاد پر مجبور ہو گئے یا مجبور کر دیے گئے

کہ :

"بہر حال ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں۔ اس قوم کی وحدت اور شیرازہ بندی کے لیے ضرورت ہے کہ اس کا کوئی مستقل مرکز ہو"۔......الخ

(الامان ہو منشور وغیرہ)

استقلال مرکز کا خواب کتنا شیریں ہے! کاش اس کی تعبیر بھی اتنی ہی شیریں ہو!

مگر طاغوتِ برطانیہ کی سامراجی پالیسی جو اپنے فولادی پنجوں میں ہندوستان کو دبائے ہوئے ہے اور جس نے مسلم زندہ کو مردہ لاش بنا دیا ہے اور وہ خون کے آنسو رلانے والے واقعات جو اس سامراجی پالیسی کے ماتحت ہندوستان اور بیرون ہند میں رونما ہو چکے ہیں اور جن کی نمک پاشی جراحت ہائے مسلم پر شب و روز ہو رہی ہے، وہ ہمیں اس اعلان پر مجبور کر رہی ہے کہ استقلال قوم کا خواب، خواب پریشان ہے۔ یہ سبز باغ دنیا بھر کی گندگیوں سے بھرا ہوا ہے۔

یہ ایک ناپاک دلدل ہے۔ اگر مسلمان اس میں پھنس گئے تو غیر محدود مدت تک خود ہی نیم بسمل کی طرح تڑپتے رہیں گے اور دوسروں کو بھی سامراجی پنجۂ ستم میں تڑپائیں گے۔ افسوس مسلمان اس قدر زود فراموش ہے۔ اسے یاد نہیں کہ صرف تین سال پہلے سابق جنگ جرمنی کے زمانے میں استقلال قوم اور استقلال مرکز کا یہی سبق عربوں کو پڑھایا گیا تھا۔

فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اپنی اغراضِ مشئومہ کے موجب قوم کا معیار، نسل کو قرار دیا گیا تھا اور ہندوستان میں قوم کا مدار، مذہب گردانا جا رہا ہے۔

کرنل لارنس کی رسوائے عالم شخصیت کیا فراموش ہو گئی؟ جس نے انتہائی فصاحت و بلاغت سے یہ سبق عربوں کے ذہن نشیں کرایا تھا!

آج مسٹر جناح وہی سبق ہندوستان کے بھولے بھالے مسلمانوں کو یاد کرا رہے ہیں۔ ہندوستان کے ایک گمنام غیور مجاہد کا یہ فقرہ جو انجمن افغانان بمبئی کی جانب سے ایک ہینڈ بل کی شکل میں شائع کیا گیا ہے کس قدر معنے خیز ہے کہ

"مسٹر جناح ہندوستان کے کرنل لارنس ہیں"

عربوں کے لیے، عرب فیڈریشن کی آرزو، پاکستانی تخیل سے زیادہ سہل اور ممکن الوقوع تھی۔ اور مفید بھی ہو سکتی تھی اور تمام ممالک جو عرب فیڈریشن کے ماتحت ہوئے ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ ان کے درمیان پنجاب اور بنگال جیسا بعد المشرقین نہیں ہے۔ ان سب کی نسل ایک، زبان ایک، طریق زندگی ایک۔ یہ قدرتی لطیفہ جو حضرت علامہ عثمانی ہندوستانی پاکستان میں ظاہر فرماتے ہیں، وہاں بھی موجود ہے کہ ان تمام ممالک میں عربوں کی کثرت ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی طرح عرب غیر مسلح اور دو صد سالہ قفس غلامی کے پروردہ نہ تھے۔

دُوَل متحدہ (فرانس اور برطانیہ و روس) کی باہمی رقابت سے فایدہ اٹھانے کے بھی کافی امکانات موجود تھے۔

ایران اور پھر افغانستان، چینی، ترکستان کے تسلسل سے وہ تمام امکانات موجود تھے جو پاکستانی خواب کے مفتوں آج بلند آہنگی سے بیان کرتے رہتے ہیں مگر جو نتیجہ ہوا اس کو پورا عالم اسلام ۲۶ سال سے آنکھیں کھولے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ گریہ و بکا، نوحہ و ماتم اور کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔

کیا اسی کا نام استقلال مرکز اور استقلال قوم ہے؟

کیا اسی مرکز مستقل سے بقول مولانا عثمانی "قومی محرکات و عزائم" فروغ پا سکیں گے۔ فلسطین، دمشق، عراق، حضر موت، شام، لبنان وغیرہ اور اسلامی ممالک کے مسلم باشندوں، واجب الاحترام اسلامی بھائیوں، عزیز دوستوں، اور اولوا العزم آبا کے مجبور اور بے کس فرزندوں کی آہیں، کیا ہندی مسلمانوں کے کانوں تک پہنچ کر ان کی چشم عبرت کے پردے نہیں اٹھا سکتیں؟ پھر یہ اتفاقی امر یا وقتی پالیسی نہیں بلکہ تاریخ شاہد ہے اور واقعات اعلان کر رہے ہیں کہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی ہر ایک سامراج اور بالخصوص برطانیہ کی قدیم اور مستقل پالیسی ہے۔ کیا مملکت مصر کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا گیا!

اور پھر مصر کو اندرونی آزادی اور سوڈان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ بند کر کے مصر کی طاقت کو دوبارہ نہیں کر دیا گیا۔

آئرلینڈ میں مذہبی جھگڑے پیدا کر کے اس کی غلامی کو دراز کرنے کی کوشش کی گئی اور جب ایک حصے کی بے پناہ قربانیوں نے برطانوی سامراج کا ناطقہ بند کر دیا تو "السٹر" کا ایک پاکستان بنا کر ملک کے باقی حصے کو آزاد کر دیا گیا۔ آئرستان کا یہ پاکستان آج تک انگریزی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ بند ہے۔ سلطنت عثمانیہ کی تاریخ پڑھو، یورپ کا نقشہ سامنے رکھو، آپ کو درجنوں پاکستان نظر آئیں گے۔

ان میں وہ پاکستان بھی ہیں جو سلطنت عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے قائم کیے گئے۔ سلطنت عثمانیہ ختم ہو گئی، مگر کیا ان پاکستانیوں نے بھی سامراجی اغراض کو پنجۂ استبداد سے نجات پائی؟ یورپ کے نقشے میں ایسٹونیا، لتھونیا، پولینڈ، چیکوسلاواکیہ وغیرہ بہت سے پاکستان آپ کو نظر آئیں گے۔ مگر کیا ان پاکستانیوں میں سے کسی کے متعلق بھی یہ وہم کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی قوم کے لیے مستقل مرکز ہے جہاں سے اس کے قومی عزائم اور قومی محرکات فروغ پا سکتے ہیں۔

مسٹر جناح اس حقیقت کو پہنچانتے ہیں، چناں چہ گذشتہ سال نیوز کرانیکل کے نمایندے کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے پاکستان کی مجوزہ حیثیت کو مصر کی اس حیثیت سے تشبیہ دی تھی جو ۱۹۳۶ء کے معاہدے کی رو سے اس کو حاصل ہے (ملاحظہ ہو مدینہ ۵/ مارچ ۱۹۴۴ء اور ہندوستان ٹائمز ۱۰/ نومبر ۱۹۴۵ء ڈاکٹر عبداللطیف کا بیان)۔ بہر حال مصر جیسی داخلی آزادی سے جو اسی وقت تک باقی رہ سکتی ہے کہ سامراج کے اغراض سے متصادم نہ ہو۔ یہ توقع رکھنا کہ قومی عزائم اور ملی محرکات اس کے ذریعے سے فروغ پا سکیں گے آرزوے بے معنے اور خیال باطل نہیں تو اور کیا ہے! بہر حال یہ ہے استقلال قوم کا خارجی پہلو اور برطانیہ کی وہ سامراجی پالیسی جس کا ننگا ناچ دوسرے ممالک دیکھ رہے ہیں یا دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اگر مستقل مرکز کے بطن کو چاک کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مستقل مرکز غیر

مسلم اقوام کا تابع مہمل اور ان کی ٹھوکروں میں پامال ہونے والا ایک گیند ہوگا۔ اس سلسلے میں ہم ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کا بیان درج کر دینا مناسب سمجھتے ہیں، جو بزعم خود پاکستان کے مصنف اول ہیں اور اب اس بنا پر کہ مسٹر جناح نے اپنی بہت بڑی ناقابل تلافی سیاسی غلطی اور بے عمل ضد اور ہٹ کے باعث ہندو مسلم مفاہمت اور انگریز کو ہندوستان سے باہر نکال دینے کا بہترین موقعہ کھو دیا ہے، وہ پاکستانی تحریک کے صف مقابل میں ہیں۔ آپ نے مدراس یونی ورسٹی میں ایک انسٹی ٹیوٹ کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"اگر پاکستان میں شمالی جنوبی اور شمالی مشرقی ہندوستان کے صرف وہی علاقے شامل ہوں، جہاں مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں، مثلاً: لاہور مغرب اور جنوب کا علاقہ، اور مشرقی بنگال، تو یقیناً ریاست کا قوام اسلامی طرز کا ہو سکتا ہے اور وہاں کی اقلیتوں کو مناسب مراعات اور تحفظات دے کر وہاں کا آئین اسلامی بنیادوں پر بنایا جا سکتا ہے۔ (لیکن ظاہر ہے کہ اس صورت میں پاکستان چند غیر ترقی یافتہ شہروں کا نام ہوگا، جن کی حیثیت سرحد کے آزاد علاقے سے زائد نہ ہوگی) لیکن اس کے برخلاف جیسا کہ پچھلے سال گاندھی، جناح مراسلت کے دوران میں تجویز کیا گیا، اگر پاکستان کے صوبے اپنی موجودہ شکل میں شامل کیے جاتے ہیں یعنی پورا پنجاب اور پورا بنگال اور آسام تو پاکستان کی مسلم اکثریت محض برائے نام رہ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کسی طرح بھی اسلامی حکومت قائم نہیں کی جا سکتی۔ وہاں کی حکومت میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا تناسب ۶۰ اور ۴۰ کا ہوگا، بلکہ اگر مسٹر جناح کی اس منطق کا اطلاق جس کی بنا پر انھوں نے ہندوستان کی مرکزی عارضی حکومت میں برابر کی نمایندگی کا مطالبہ کیا تھا، اس پاکستان پر بھی کیا جائے تو پاکستان کی حکومت میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی نمایندگی برابر ہوگی"

(ہندوستان ٹائمز، مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۴۵ء)

یہ چالیس فی صدی کی (غیر مسلم) نسبت اس فیڈریشن میں ہوگی جو مسلم اکثریت، کے صوبوں سے ترتیب دیا جائے گا صوبجاتی حکومتوں میں یہ تعداد اور بھی بڑھ جائے گی۔

کیوں کہ اخبار منشور، مورخہ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کے شائع کردہ اعداد و شمار کے موجب بنگال میں غیر مسلم آبادی ۴۶ فی صدی ہے اور پنجاب میں ۴۳ فی صدی اور آسام

میں ۶۷ فی صدی، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں اگرچہ غیر مسلم آبادی ۹ فی صدی یا ۱۳ فی صدی ہے، مگر ان تینوں صوبوں کی کل مسلم آبادی چونسٹھ لاکھ چھتیس ہزار باون (۶۴۳۶۰۵۲) ہوتی ہے۔ یہ مجموعی تعداد پنجاب، بنگال اور آسام کی تقریباً ساڑھے دس کروڑ آبادی میں شامل ہو کر مسلمانوں کی تعداد کو زیادہ سے زیادہ ساٹھ فی صدی تک پہنچا سکتی ہے۔ یہ چالیس فی صدی کی اقلیت کسی وقت اور کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں ہو سکتی اور جب کہ دولت اور اندرونی نظم میں یہ تعداد مسلمانوں سے بدرجہا فائق ہو تو اس پاکستان کو اقتصادی طور پر بھی اپنی مرضی کا تابع بنائے رکھے گی اور سیاسی لحاظ سے بھی اس پُر شوکت پاکستان کے حصول کے لیے انگریزی اقتدار کو حیاتِ جاوید بخش دینا، انگریز دوستی نہیں تو کیا ہے۔

اندرون ہند برطانیہ کی سامراجی پالیسی :

برطانیہ کی بیرونِ ہند پالیسی کے مطالعے کے بعد اس کی وہ پالیسی بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے جس کو وہ اندرون ہند اختیار کیے ہوئے ہے اور جس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ استقلال مرکزیا "دو قوموں کی صدا" ممکن ہے۔ مسلمانوں کے رجحانات و جذبات کی تعبیر ہو، مگر وہ مسلمانوں کے ذہن و دماغ کی پیداوار نہیں۔ درحقیقت وہ برطانیہ کی نفاق پرور اور تفرقہ انگیز پالیسی کی ایک ترقی یافتہ منزل ہے۔

یہ حقیقت عریاں ہو چکی ہے کہ برطانوی سامراج کا سنگِ بنیاد دو چیزیں ہیں :

(۱) ہندوستانیوں میں ہندی قومیت کا فقدان :

پروفیسر سیلے نے لکھا تھا :

"اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی عملی روح نہ بھی ہو بلکہ صرف اس قدر احساس عام ہو جائے کہ اجنبی حکومت سے اتحادِ عمل ہندوستانیوں کے لیے شرمناک ہے، تو اسی وقت سے ہماری

شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا، کیوں کہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور نہ
اس پر ناتحمانہ حکمرانی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس طرح حکومت کرنی بھی چاہیں تو اقتصادی طور
پر قطعہ بار ہو جائیں گے"۔
(اکسپنشن آف انگلینڈ، بہ حوالہ متحدہ قومیت اور اسلام، صفحہ ۷۱)

سر جان مینارڈ نے ایک اخبار میں لکھا تھا:
"ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم
عناد ہے اور یہ واقعہ ہے کہ یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت نہ قائم ہو سکتی تھی، نہ برقرار
رہ سکتی تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں
شروع ہوئی برطانیہ سے پہلے بھی ظالم سلاطین گزرے ہیں، جنھوں نے کبھی غیر مسلمین
پر جزیہ لگایا، اور کبھی گائے ذبح کرنے پر مجنونانہ جوش میں سزائیں دیں۔ لیکن یہ واقعات
گاہے ماہے پیش آتے تھے۔ شجر علم کا پھل چکھنے سے پہلے عوام میں مذہبی افتراق کا احساس نہ
تھا اور خواہ ہندو ہوں یا مسلمان دونوں ایک ہی معبد میں مصروف پرستش رہتے تھے"۔
(ماخوذ از ان ہیپی انڈیا، صفحہ ۴۰۸)

(۲) تفرقہ انگیزی:

لارڈ الفنسٹن، گورنر بمبئی نے ۱۸۵۹ء میں تحریر کیا تھا:
"نفاق ڈال کر حکومت کرنا رومیوں کا اصول تھا۔ اور یہی اصول ہمارا بھی ہونا
چاہیے"۔ (ان ہیپی انڈیا)
ایک اور انگریزی آفیسر کارنے ٹکس نے ۱۸۲۱ء میں لکھا تھا:
"ہندوستان میں ہماری حکومت کی ہر صیغے کو خواہ وہ خارجی تعلقات سے واسطہ رکھتا
ہو یا عدالتی اور حربی نظم و نسق سے، یہ اصول ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ تفرقہ ڈال دو اور
حکمرانی کرو"۔ (حکومت خود اختیاری، صفحہ ۵۱)
ان دو اصولوں کی روشنی میں سامراج کے کارناموں پر ایک نظر ڈالیے۔
ہندوستان کی صحیح تاریخ سے واقفیت رکھنے والا شخص اگر دولتِ انصاف سے محروم
نہیں تو بلا تامل اعتراف کرے گا کہ جہادِ حریت ۱۸۵۷ء تک ملی اختلافات کا وجود نہ تھا۔

فوجوں میں بغاوت شروع ہوئی تو ہر مقام کے سپاہی اپنی چھاؤنی میں آگ لگا کر دہلی کے معزول اور معطل بادشاہ کی طرف دوڑ پڑے۔ ہندو سپاہی بہادر شاہ کی جے پکارتے تھے۔ ناناصاحب نے کان پور میں انگریزی فوج کو ختم کرنے کے بعد بہادر شاہ شہنشاہ ہند کی سلامی کے طور پر ایک سو ایک توپیں داغیں، کنور جگدیش سنگھ (بہار) مہارانی لکشمی بائی (جھانسی) جیسے بہادر مرد اور عورتیں اس جنگِ آزادی کے نمایاں سپہ سالار تھے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے برطانوی کارکنانِ حکومت کو تفرقہ انگیزی کے اصول پر عمل کرنے کے لیے بہت زیادہ مستعد اور چست کر دیا۔

اس اصول پر پہلا عملی کارنامہ، تاریخوں کو مسخ کر کے کورس میں داخل کرنا تھا۔

یہ خدمت اگرچہ سر ہنری ایلیٹ (سکریٹری صیغہ خارجہ گورنمنٹ ہند) ۱۸۴۹ء میں انجام دے چکے تھے، مگر ۱۸۵۷ء تک اس نے ذہنوں کو مسخ نہیں کیا تھا۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی اس جماعت کا محرک اول اگرچہ ایک خیر اندیش انگریز تھا مگر اس نے دوسرے اجلاس ہی میں طے کر دیا کہ ایک ایسی جماعت مرتب کی جائے جو ایسے حالات کی اصلاح اور ترامیم کرانے میں یکجہت ہو جو ہندوستان کو نقصان پہنچانے والے اور غیر منصفانہ ہوں اور اس بنا پر ان کو متحدہ قوم کہا جا سکے۔

اس قسم کی متحدہ قوم اس اصول کے مخالف تھی جس پر برطانوی سامراج کی بنیاد قائم کی گئی تھی۔ لہٰذا دوسرے اجلاس کے بعد سے ہی انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت شروع کرا دی گئی اور اگست ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ میں "یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" یعنی 'جماعت محبان وطن' قائم کی گئی۔ جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کانگریسی خیالات کی تردید کی جائے اور اس کے نشو و نما کو ہر ممکن صورت سے دبایا جائے۔

اس انجمن میں ہندو مسلم دونوں شریک تھے اور اسی لیے یونائیٹڈ کا لفظ اس کے ساتھ بڑھادیا گیا تھا، مگر یہ صورت بھی ناکافی سمجھی گئی اور ۱۹۰۰ء میں ایک دوسرا شوشہ چھوڑا گیا۔

سر اینٹونی میکڈانل لیفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ نے ایک گشتی حکم اس مضمون کا جاری

کرایا کہ عدالتوں اور کچہریوں میں ہندی حروف میں لکھی ہوئی درخواستیں لی جا سکیں گی۔ اس حکم پر ہندوؤں کی طرف سے گورنمنٹ کے شکریے کے جلسے اور مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ سے اظہارِ ناراضگی کے جلسے منعقد ہونے لگے اور ہندو مسلمانوں میں جدائیگی ہو گئی۔ یہ جدائیگی اور تفرقہ ایک تخم تھا۔ اس کی آبیاری کے لیے مسلمانوں کو ایک علاحدہ قوم قرار دے کر جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرانا ضروری تھا، تاکہ یہ تخم سوختہ نہ ہو جائے۔ جداگانہ انتخاب کے متعلق بھی اس زمانے میں وہ تمام دلائل پیش کیے جاتے تھے جو آج دو قوم کی تھیوری کے متعلق مسٹر جناح اور ان کے ہم نوا پیش کر رہے ہیں۔

اس وقت ایک خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کی نشستیں محفوظ کر دی جائیں اور انتخاب مخلوط رہے۔ مگر جو الہام شملہ کی چوٹیوں سے خود ساختہ رہنمایانِ قوم کے دلوں پر نازل ہو چکا تھا، اس نے اس اشتراک کو بھی جائز قرار نہیں دیا۔

جس طرح پاکستانی تحریک کے متعلق گورنمنٹ کا کوئی بیان مخالف ہوتا ہے کوئی نیم موافق، تاکہ شوقِ طلب میں اضافہ ہو اور مسلمان استقلال قوم واستقلال مرکز کو واقعی اپنا مطالبہ قرار دے کر اپنے جذبات کو اس مصنوعی مقصد کے لیے وقف کر دیں۔ اسی طرح جداگانہ انتخاب کی یہ استدعا کچھ عرصہ لیت و لعل کے حوالے رہی۔ اور پھر بہ ہزار عنایت و نوازش منظور فرمائی گئی، لیکن اس جداگانہ انتخاب نے ہندو مسلم منافرت میں مزید اضافہ کر دیا۔

ہندوؤں کو مسلمانوں سے بے نیاز کر دیا، الیکشنوں کی کامیابیاں انھیں لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں جو ہندو مسلم منافرت میں پیش پیش ہوں، انتہا یہ کہ انتخاب میں کامیابی کے لیے وزارتوں اور عہدوں کے حریفوں نے مسجدوں تک کو شہید کر دیا۔ مسجد شہید گنج کا واقعہ اس طرزِ انتخاب کا شرمناک نتیجہ ہے جس کی حقیقی وجوہات عام طور پر مشہور ہو چکی ہیں۔

کانگریس کی قربانیوں نے فرقہ وارانہ ذہنیت کے بجائے ملکی خدمات کا وقار اس درجہ بڑھا دیا ہے کہ ہندو مہاسبھا اس کے سامنے سرنگوں ہو گئی۔

گذشتہ الیکشنوں میں مسلم لیگ کو بھی اس وقار کے سامنے جھکنا پڑا اور مسٹر جناح کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ جمعیت علمائے ہند کا دامن سنبھالیں۔ قوم پرور طبقے کا فروغ برطانوی سامراجی پالیسی کے لیے پیغامِ موت ہے، لہٰذا سیاسی اسٹیج پر ایک تماشہ کیا گیا اور وہ نظریۂ پاکستان کی اشاعت ہے، جس کی تخلیق لندن کے ہوٹلوں میں ایک عرصہ پیشتر ہو چکی تھی۔

استقلال قوم اور استقلال مرکز اسی نظریے کی ایک خوب صورت اور دل فریب تعبیر ہے۔ اس سلسلے کی بہت سی شہادتوں میں ہم صرف مندرجہ ذیل شہادت پر اکتفا کرتے ہیں، جو مدینہ بجنور مورخہ ۲۱ر اگست ۱۹۳۱ء، نمبر ۵۹ سے ماخوذ ہے۔ مسلمان پڑھیں اور استقلال مرکز کے ہلاکت آفریں نعرے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں:

"گذشتہ اخبار میں ہم نے یہ خبر لکھی تھی کہ ہزہائنس سر آغا خان ایک کروڑ روپے کے سرمائے سے بدیشی پارچے کو فروغ دینے کی غرض سے ایک کمپنی قائم کرنے والے ہیں۔ اخبار الامان سے اب معلوم ہوا ہے کہ نہ صرف ہز ہائنس آغا خان نے بلکہ ملا سیف الدین طاہر صاحب بوہرا قوم کے مقتدی اور اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے اکثر ممبروں نے دس کروڑ روپے کے سرمائے سے ایک کمپنی قائم کی ہے، جس کا صدر دفتر دہلی ہوگا۔ اس کمپنی کے قیام کا اصل محرک کون ہے اور اس کے اصلی مقاصد کیا ہیں؟

اس کے صحیح حالات اب تک سینۂ راز میں ہیں، تاہم اس کے قیام پر اس خط سے کسی قدر روشنی پڑتی ہے جو مسٹر ہوڈل جج ممالک متحدہ نے کسی مستفسر کے جواب میں لندن بھیجا تھا اور وہ اتفاقاً "سنڈے گرافک" کے ہاتھ پڑ جانے سے شائع ہو گیا اور اسی غرض سے ہم اس کا متن ذیل میں درج کرتے ہیں:

"مدت سے ہندوستان کی صورتِ حالات قابو سے باہر ہو رہی ہے۔ ہم نیم پارلیمنٹری حکومت کا حتمی وعدہ کر چکے ہیں، جو برطانوی افسروں کے بغیر نہیں چل سکتی۔ برطانوی افسر زیادہ عرصے تک نہیں رہیں گے۔ سول سروس کے تمام شعبے یہاں تک ہندوستانیوں سے بھر دیے گئے ہیں یا بھرے جا رہے ہیں کہ آیندہ چند سال میں ان میں ڈھونڈھنے سے بھی انگریز کا نام نہیں ملے گا۔ میں ان حالات میں ہندوستان کے مسئلے کا ایک

ہی حل دیکھتا ہوں کہ اسے ہندو اور مسلمان حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسنٹ کا تنازعہ ختم کرنے کے لیے ۳۵ سال کی مسلسل پارلیمنٹری جنگ کے بعد ایسا ہی کرنا پڑا تھا۔ ہندوؤں نے ہمیں ہندوستان کے ساتھ کاروبار کرنے سے روک دیا ہے۔ اب ہمیں مالیہ معاف کرنا پڑا ہے تاکہ کاشتکار زندہ رہ سکیں۔ یہ ایک نہایت ہی یاس انگیز صورت حال ہے اور اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اس تعفن کو پھیلنے سے روک دیا جائے اور قدرتی تقسیم کے مطابق ملک کے حصے کر دیے جائیں۔ اگر ہندو کاروبار تجارت نہیں کریں گے تو بمبئی کی جگہ کراچی شہر بندرگاہ کا کام دے سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مزید ۲۵ یا ۳۰ سال کے لیے ہندوستان پر ہمارا اثر واقتدار قائم رہے۔ اب برطانوی حکومت کے پرانے طریقہ کار کی طرف عود کرنا ممکن ہے۔ ہمارے پاس کارکن اصحاب موجود نہیں ہیں۔ اب دور ماضی کو قائم نہیں کر سکتے۔۔ نیز ہم نے اپنا کام بھی کر لیا ہے، کیوں کہ ہندوستان میں ریلیں اور نہریں قائم ہیں۔ اب اسے ایسا طرزِ حکومت دے دو جو اس کے لیے موزوں اور قدرتی ہو۔ لیکن جب تک ہندوستان میں ہمارا اثر واقتدار قائم ہے، ہمیں تحریک مقاطعہ کو پورے زور سے روکنا چاہیے۔ خونریزی کو روکنے اور دقیانوسی ہندو سسٹم کا سدباب کرنے کے لیے ہمیں کراچی اور دہلی سے کام شروع کرنا چاہیے، جہاں دنیا کی ایک بڑی مسلم طاقت قائم ہوگی۔ ہم خواہ کچھ کریں یہ ہو کر رہے گا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اسے جلد از جلد معرض عمل میں نہ لائیں اور اس کے ساتھ سب سے پہلے تاجرانہ تعلقات کیوں نہ قائم کریں۔ جب بحر قزدیں یا بحر روم کی طرف وسیع ملکوں کا خیال کیا جائے گا تو بڑے بڑے امکانات نظر آتے ہیں"۔ (مدینہ، بجنور۔ ۲۱/اگست ۱۹۳۱ء، نمبر ۵۹)

کیا مذکورہ بالا تمام شہادتوں اور تجربوں کے بعد بھی اس فیصلے میں پس و پیش کی گنجائش ہے کہ استقلال قوم اور استقلال مرکزی کی صدا انگریزی ڈپلومیسی کے تاریک گنبد کی صدائے بازگشت ہے، جس سے صرف سامراج کا فایدہ ہے۔ مسلمان اگر اس کی حمایت کرتے ہیں تو سراسر فریب خوردگی اور نادانی ہے اور بس۔

باب دوم:

مسئلۂ قومیت

گل کرائسٹ، بلنچلی وغیرہ یورپین سیاست کے ماہرین نے نیشن (قوم) کو صرف مذہب میں منحصر نہیں رکھا، بلکہ تصریح کردی ہے کہ جغرافیائی، نسل یا معاشی حیثیت سے نیشن (قوم) کی تشکیل وترتیب ہوتی ہے۔

ہمارا عرفِ عام قوم کو بسا اوقات برادری اور نسل کے مرادف قرار دیتا ہے۔ جب قوم کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو جواب میں سید، شیخ یا برہمن، کھتری وغیرہ کہا جاتا ہے۔

کتاب اللہ میں تقریباً ساڑھے تین سو مقام پر لفظ قوم آیا ہے، جس کا اطلاق عموماً نسلی لحاظ سے ہے اور کہیں کہیں جغرافیائی حیثیت سے۔

بہر حال کتاب اللہ کے اطلاقات لفظ قوم کو مذہب کا مرادف قرار نہیں دیتے۔ بیشک اسلام نے قبائلی عصبیت کو ختم کر کے انسانی برادری کو صرف دو حصوں میں تقسیم کردیا ہے اور اس قومیت کو بھی پسند نہیں کیا جس کی بنیاد اسلام کے عمومی اتحاد کے مقابلے میں قبائلی عصبیت کے نخوت اور غرور پر ہو۔ چناں چہ متعدد احادیث میں اس نخوت اور غرور پر نکیر کیا گیا اور اس کو ایک لعنتی چیز قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مسلم شریف والی روایت کو اگر روایت باللفظ تسلیم کرلیا جائے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ صحابہ نے ایک موقعہ پر قوم کے جواب میں لفظ مسلم کا اطلاق فرمایا ہے۔

مگر شریعت غرا کے عمومی اطلاقات نے نوع انسان کی ان دو صنفوں کو جو مذہب کی بنیاد پر ہوں، لفظ ملت سے تعبیر کیا ہے۔ چناں چہ حضرت حق جل مجدہٗ کا ارشاد ہے:

"ملة ابكم ابراهيم هو سما كم المسلمين"۔ (سورۂ حج کا آخری رکوع) "تمھارے باپ ابراہیم کی ملت"۔ اس نے تمھارا نام مسلم رکھا ہے۔

اسی طرح متعدد آیتوں میں اس تقسیم کے موقع پر لفظ ملت ارشاد ہوا ہے:

آل عمران میں ہے: "فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفاً"

سورۂ انعام میں ہے: "دينا قيما ملة ابراهيم حنيفاً"

سورۂ یوسف میں یہ اطلاق زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول نقل فرمایا گیا ہے:

"انی ترکت ملة قوم لا یومنون"۔ میں نے ان کی ملت چھوڑ دی جو ایمان نہیں لاتے۔

پھر ارشاد ہوا:

"واتبعت ملة اباءی"۔ میں اپنے باپ دادوں کی ملت کا پیرو ہوں۔

اسی طرح سورۂ نحل، سورۂ بقرۃ، سورۂ ص میں مذہبی تقسیم کے موقع پر لفظ ملت ارشاد ہوا ہے۔

غیر موزوں نہ ہوگا اگر اس موقع پر خود عمائدین لیگ کے بھی کچھ اقوال نقل کردیے جائیں کہ سرسید مرحوم نے اپنے ایک لیکچر میں ارشاد فرمایا تھا:

"قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ یاد رکھو ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے، ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک کے رہنے والے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔

جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جائیں"۔

(مجموعۂ لیکچرز سرسید، صفحہ ۱٦۷ بہ حوالۂ روشن مستقبل، صفحہ ۲۷۱، طبع سوم)

مسٹر عبدالعزیز صاحب نے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ ۱۹۳۸ء (بمقام پٹنہ) کے خطبۂ

استقبالیہ میں فرمایا تھا:

"مسلمان متحدہ قومیت کی تحریک کے صرف اس پہلو کو تسلیم کر سکتا ہے جو ملک کے لیے آزادی اور اختیارات حاصل کرنے میں مددگار ہو، اور ہندوستان کے معاشی مسائل حل کرنے میں معاون ہو، لیکن وہ اسے کسی طرح قبول نہیں کر سکتا کہ اپنی قومی ہستی کو ہندوستان کی متحدہ قومیت میں ہضم کر دے۔ وطن اور روٹی کا مت بنا کر وہ ان کی پرستش نہیں کر سکتا یا وطن کو آزاد کرانے اور روٹی کے مسئلے کو حل کرنے میں کسی سے پیچھے رہنا پسند نہیں کرتا۔

لیکن ایسی متحدہ قومیت جس میں اس کا ملی وجود، اس کا خاص تصور زندگی، اس کی مخصوص تاریخی روایات، اس کے بعض مذہبی شعار اور سیاسی حقوق فنا ہو جائیں اس کے لیے کبھی قابل قبول نہیں۔"

(تاریخ مسلم لیگ از مرزا اختر حسین صاحب بی۔اے، صفحہ ۵۔۵۰٦، مطبوعہ بمبئی)

شیخ الاسلام مدظلہ اپنے رسالے "متحدہ قومیت اور اسلام" میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہندوستان میں سکونت کرنے والی قومیں اور افراد بحیثیت مسکن و وطن بہت سی ایسی چیزوں میں مشترک ہیں جن کو موجودہ پردیسی حکومت نے اپنی اغراض کے ماتحت پامال کر دیا ہے اور ہندوستان کے باشندوں کی زندگی تلخ کر دی ہے۔ بلکہ تمام ہندوستان کے رہنے والوں کے لیے فنا کا گھاٹ آگے کر دیا ہے۔ چوں کہ ان مشترکہ مفادات کے ضائع ہونے سے سب ہی فنا ہو رہے ہیں، اس لیے تمام ہندوستانی متفق ہو کر ان ضائع شدہ حقوق کو حاصل کریں اور اس پردیسی قوم کے جوئے کو اپنے کندھوں اور گردنوں سے نکال پھینکیں۔ ان کے لیے متحدہ جدوجہد ہو اور تمام ہندوستانیوں کے لیے ملکی اور مشترکہ مفادات کے لیے ترقی کی راہ کھل جائے۔ یہ مقصد متحدہ قومیت سے ہے، جس کا رابطہ اتحاد وطنیت سے ہے"۔ (زیر عنوان "ہندوستان کے لیے راہ عمل")

اس کے بعد زیر عنوان "قومیت متحدہ کے مجوزہ معنے" تحریر فرماتے ہیں:

"ہماری مراد قومیت متحدہ سے اس جگہ وہی قومیت متحدہ ہے جس کی بنا جناب رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ میں ڈالی تھی۔ یعنی ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، بحیثیت ہندوستانی اور متحد الوطن ہونے کے ایک قوم ہو جائیں

اور اس پردیسی قوم سے جو کہ وطنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتی ہوئی سب نوفنا کر رہی ہے، جنگ کر کے اپنے حقوق کو حاصل کریں اور اس ظالم و بے رحم قوت کو نکال کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھوڑ ڈالیں۔ ہر ایک دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کرے، بلکہ تمام ہندوستان کی بسنے والی قومیں اپنے مذہبی اعتقادات، اخلاق، اعمال میں آزاد ہیں۔ اپنے مذہبی رسم و رواج اور مذہبی اعمال و اخلاق آزادی کے ساتھ عمل میں لائیں اور جہاں تک ان کا مذہب اجازت دیتا ہو، امن و امان قائم رکھتے ہوئے اپنی اپنی نشر و اشاعت بھی کرتے رہیں۔ اپنے اپنے پرسنل لا اور کلچر (تہذیب) کو محفوظ رکھیں۔ نہ کوئی اقلیت، دوسری اقلیتوں اور اکثریت سے ان امور میں دست و گریباں ہو اور نہ اکثریت اس کی جد و جہد کرے کہ وہ اقلیتوں کو اپنے اندر ہضم کرلے"۔

مسٹر عبدالعزیز اور مولانا حسین احمد صاحب کے ارشادات کے مطالعے کے بعد آپ یہ بھی تسلیم کرلیجیے کہ قول کے لیے عمل، گفتار کے لیے کردار لازم اور ضروری ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"یایها الذین امنوا لم تقولون مالا تفعلون ۔ کبر مقتاً عند الله ان تقولوا مالا تفعلون"۔

"اے ایمان والو! تم کیوں وہ باتیں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بہت زیادہ مستحق عتاب ہے کہ تم وہ باتیں کہو جو کرو نہیں"۔

مسٹر عبدالعزیز نے جو لیگ کے پلیٹ فارم پر کہا اس کا کوئی عملی ثبوت نہیں دیا اور حضرت شیخ الاسلام اور آپ کی جماعت کا جرم ہی یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتی ہے اس سے زیادہ کرتی ہے (والحمد لله علی ذلك)۔

کیا مسٹر عبدالعزیز اور ان کی پوری جماعت نے جد و جہد آزادی کے لیے کبھی کوئی قدم اٹھایا؟ کوئی جنبش کی؟ روٹی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کوئی اقدام کیا؟ جمعیت علمائے ہند اور اس کے صدر محترم کا جرم ہی یہ ہے کہ انھوں نے تحفظِ شریعت کے ساتھ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں کیا کہ مسلمان روٹی کا مسئلہ حل کرنے میں کسی کے پیچھے رہیں۔

اس کی تاریخ ماضی شاہد ہے کہ ہر ایک موقع پر اور ہر ایک صورت حال پر قرآن اور

احادیث و فقہ کی روشنی میں اس نے مکمل طور پر غور و خوض کرنے کے بعد ایک لائحۂ عمل مرتب کیا اور پھر ایثار و قربانی اور اعتماد علی اللہ کا توشۂ گراں قدر لے کر راہ نوردی شروع کر دی۔

البتہ یہ خصوصیت صرف مسلم لیگ کے لیے مخصوص ہے کہ ہندوؤں کے مظالم کا شور مچا کر عوام کے جذبات میں حرکت پیدا کی اور جب اسی اجلاس پٹنہ کے موقعہ پر عوام کے متحرک جذبات نے عملی اقدام کا مطالبہ کیا تو ایک تجویز کے ذریعے ڈائریکٹ ایکشن اور عملی تدابیر کا مجلس عاملہ کو اختیار دے دیا۔ اس کے بعد آج تک کانگریسی مظالم کا شور تو باقی ہے، مگر تجویز کا مفہوم بھی لیگی بہادروں کے دماغ میں نہ رہا ہوگا۔

اس کے ماسوا، وہ جماعت جس کے روز و شب احیاے سنت اور اتباع شریعت میں صرف ہوتے ہوں، جس کا دوامی موضوع بحث یہ ہو کہ کون سا فعل سنت کے مطابق اور شریعت کے موافق ہے، کون سا مخالف، جو ہر ایک رسم کو اور معاشرت کے ہر ایک رواج کو شریعت غرا کے اصول پر پرکھنے کی عادی ہو، جو کلچر اور تہذیب کے باب میں ہر ایک جدت سے عملاً اور قولاً متنفر ہو اور قدامت پسندی کی یہاں تک عادی ہو کہ دقیانوسیت اور تنگ نظری کا خطاب انھیں دعویداران تحفظ کلچر کی جانب سے دیا جا رہا ہو۔

اس نے تحفظ ملت، احیاء سنت، اتباع شریعت کے مقاصد کے لیے تمام ہندوستان میں انجمنوں اور مجالس کا جال پھیلا رکھا ہو، ہر ایک ضلع میں وہ درس گاہیں قائم کر رکھی ہوں، جو نونہالانِ اسلام کو نہ صرف یہ کہ پابندِ شریعت بنائیں بلکہ ان کی وضع قطع، ان کے مذاق اور ان کے تمام جذبات کو شریعت غرا کے سانچے میں ڈھال دیں۔

ایسی جماعت کے متعلق کوئی انصاف پسند کبھی بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ وہ ایسی متحدہ قومیت کی خواہاں ہو سکتی ہے جس سے مسٹر عبد العزیز نے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔

چناں چہ کانگریسی وزارت کے دور میں ہی جب تبرا کی رسوا عالم تحریک شروع کی گئی تو کیا یہی مولانا حسین احمد اور ان کے رفقا نہ تھے، جنھوں نے ناموس صحابہؓ کی عزت و حرمت

کے لیے سخت ترین قربانیاں پیش کیں۔ ودیا مندر اسکیم، واردھا کی تعلیمی اسکیم، صوبہ بہار میں اوقاف پر محاصل لگائے جانے کی اسکیم وغیرہ وغیرہ کے متعلق جو خدمات انجام دیں، ان کا ذکر طویل ہے۔ "رسالہ جمعیۃ علماء کیا ہے؟" میں ان کی مختصر کیفیت بیان کی گئی ہے اور اگر شریعت بل، قاضی بل اور مسلم قاضی بل کو خود لیگی ممبرانِ اسمبلی مسترد نہ کراتے تو آج تمام ہندوستان میں ایک اساسی نظام مرتب ہو جاتا جو محاکم شرعیہ اور دارالقضاوغیرہ کے قیام میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا اور گرام سدھار کے سلسلے میں جن موہوم خطرات کا اظہار کیا جا رہا ہے، ان سب کا سدباب ہو جاتا۔

مگر افسوس جمعیت علما کی ان تمام خدمات کے باوجود وہ ہر طرح قابل لعن ہے اور مسلم لیگ ان تمام بداعمالیوں کے باوجود مستحق صد تحسین۔ بہر حال حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی جس متحدہ قومیت کو پسند فرماتے ہیں وہ ایسی متحدہ قومیت ہے جو قائدین اور زعما لیگ کے نزدیک بھی جائز اور درست ہے اور اتحاد قومیت کا جو پہلو خطرناک ہے اس سے نہ صرف اجتناب واحتیاط کا دعوئی ہے بلکہ اس کے متعلق قابل اطمینان ٹھوس اور نتیجہ بخش جدوجہد جاری ہے۔

ہم دامان بحث کو رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر (شیخ الاسلام کے رفیق زندان کراچی اور چہیتے دوست) کی تقریر سے مرصع کرتے ہیں، جو آپ نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ارشاد فرمائی تھی۔

آپ نے فرمایا:

> ایک لفظ میں مسلمانوں کی پوزیشن کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ مذہب میرے خیال کے مطابق حیاتِ انسانی کی تشریح کا نام ہے۔ میرے پاس ایک تمدن ہے، ایک ضابطۂ اخلاق ہے، زندگی کا ایک نظریہ ہے اور حیاتِ اجتماعی کے لیے مکمل نظام ہے جس کو اسلام کہتے ہیں۔ خدائے برتر کے حکم کے سامنے میں اول مسلمان ہوں، دوئم مسلمان ہوں اور آخر مسلمان ہوں اور سوائے مسلمان کچھ نہیں ہوں۔ اگر تم مجھ سے اپنی قوم اور اپنی سلطنت میں اس نظام، اس ضابطۂ اخلاق اور اس شریعت کو چھوڑ کر شریک ہونے کو کہو کے تو میں

اس کے لیے تیار نہ ہوں گا۔ یہ میرا پہلا فرض ہے، اپنے خالق کی جانب سے جو مجھ پر عاید ہوتا ہے اور یہ ہی ڈاکٹر مونجے کا خیال ہے اور جہاں تک اس فرض کا تعلق ہے، ان کو پہلے ہندو ہونا چاہیے اور مجھ کو پہلے مسلمان۔ لیکن جن امور کا ہندوستان سے تعلق ہے میں اول ہندوستانی ہوں، دوئم ہندوستانی ہوں اور آخر بھی ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے سوا کچھ نہیں۔ میں ان مساوی المساحت دائروں سے تعلق رکھتا ہوں جس کے دو مرکز ہوں۔ ایک ہندوستانی، دوسرے دنیاے اسلام"۔ (مدینہ بجنور، ۲ر فروری ۱۹۳۸ء)

مسٹر محمد علی جناح صاحب کو یہ برتری دماغ اور یہ لطافت طبع تو کہاں نصیب، تاہم قیادتِ عظمٰی کے نمایشی ٹائٹل سے پیشتر ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنو کے بعد اپنے مذاق کی تعریف کرتے ہوئے اپنے خطبۂ صدارت میں آپ نے فرمایا تھا:

"کوئی دلیل، نسل ورنگ کے متعلق، کوئی جعلی نظریہ اس حقیقت کو ہندی مسائل کے طالب علم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں کر سکتا کہ ہندوستان ہم سب کی پہلی اور آخری منزل ہے"۔ (تاریخ مسلم لیگ، صفحہ ۱۳۵، خطبۂ صدارت اجلاس لکھنو)

باب سوم:

دو قومی نظریہ

موضوعِ بحث :

مذکورۂ بالا قیل و قال کے بعد ہم جمعیت علماے ہند کے ایک ذمہ دار رکن کا بیان مدینہ کے حوالے سے درج کرتے ہیں جس سے مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کا نظریہ بھی واضح ہو جائے گا۔ نیز موضوعِ بحث کے معین کرنے میں سہولت ہوگی۔

"بار بار قوم پرور مسلمانوں کو طعن دیا جارہا ہے کہ وہ دو قوم کی تھیوری کے مخالف ہیں۔ حال آں کہ اگر عدل وانصاف کے پیمانے کو ہاتھ سے نہ رکھ دیا جائے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ مسلم لیگ اور اس کے قائد اعظم اور ان کی باتوں پر حسن اعتقاد رکھنے والے حضرات نے یہ غلط پروپیگنڈا صرف اس لیے کیا تاکہ مسلم عوام کو مذہب کے نام پر ان کے خلاف بھڑکا کر اپنے سیاسی اقتدار کو بلند کیا جائے۔

ورنہ تو بزمی صاحب (ابو سعید صاحب بزمی، سابق ایڈیٹر اخبار مدینہ بجنور) خود اس کے لیے شاہد ہیں کہ کانگریسی حکومت کے دور میں بزمی صاحب نے جب مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے بعض شکوک کو پیش کیا تھا تو اس سلسلے میں قومیت متحدہ کا مسئلہ بھی آیا تھا اور مولانا مدظلہ العالی نے فرمایا تھا کہ اس مسئلے میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں کہ مسلمان اور ہندو بلحاظ کلچر اور ثقافت دو جدا جدا قومیں ہیں اور رہیں گی، لیکن اپنے ملک کو آزاد کرنے اور اجنبی حکومت کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے جو ڈیفنس یا دفاع انڈین نیشنل کانگریس کی جانب سے بہ صورت "پرامن جنگ" جاری ہے، اس نقطہ

نظر سے بلاشبہ ملک کی مختلف المذاہب اقوام سب ایک قوم ہیں اور اس دنائی قومیت متحدہ کو کانگریس قوم کہتی ہے اور اگر وہ نہ بھی کہے تو آزادی خواہ مسلمان اس مسئلے کی صرف اتنی ہی حقیقت سمجھتے ہیں"۔ (مدینہ، بجنور۔ یکم فروری ۱۹۴۳ء، نمبر ۸، ج ۳۲)

اس تحریری بیان سے جو نہایت مستند ہے واضح ہو جاتا ہے کہ موضوع بحث یہ نہیں کہ مسلمان اور ہندو دو قوم ہیں یا ایک قوم بلکہ موضوع بحث یہ ہے کہ

(۱) آیا برطانوی سامراج کے پنجۂ استبداد کو توڑنے اور مروڑنے کے لیے ہندو اور مسلمان ایک قوم کی طرح مشترکہ جدوجہد کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) آیا ہندو اور مسلمانوں کو دو قوم قرار دے کر تقسیم ہندوستان کا مطالبہ مسلمانوں کے لیے مفید ہے یا تباہ کن۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے خود لیگی حضرات کے مذکورۂ بالا اقوال اس کے جواز اور اس کی درستی کی شہادت دینے کے لیے کافی ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑنے کے بعد سے آج تک سیکڑوں علما کے فتاویٰ اس کے جواز کے متعلق بار بار شائع ہو چکے ہیں۔ ایک انصاف پسند کے لیے وہ بہت کافی ہیں، مزید طوالت کی ضرورت نہیں۔

رہا دوسرا مسئلہ یعنی دو قوم قرار دے کر تقسیم ہند کا مطالبہ تو اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اگرچہ بدقسمتی سے لیگ نے اس نظریے کو اپنا لیا ہے مگر درحقیقت وہ مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہے۔ اس نظریے کے بموجب اسلام اور قوم تقریباً مرادف ہو جاتا ہے اسلام اور قوم کو ہم معنے اور مساوی ماننے میں سب سے پہلی مذہبی قباحت یہ لازم آتی ہے کہ اعمال اور عقائد کا سوال قطعاً ختم ہو جاتا ہے اور لفظ اسلام، لفظ ہندو کی طرح ایسا ہمہ گیر اور عام ہو جاتا ہے کہ اس کی کوئی جامع مانع تعریف نہیں رہ سکتی۔

سرسید نے سفر پنجاب میں ہندوؤں کو خطاب کرتے وقت فرمایا تھا:

"آپ نے جو لفظ اپنے لیے ہندو کا استعمال کیا ہے وہ میری رائے میں درست نہیں، کیوں کہ ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ ہر ایک شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہے اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو

باوجودے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں ہندو نہیں سمجھتے"۔

(سفر نامۂ پنجاب از سر سید صفحہ ۱۳۹ بہ حوالہ روشن مستقبل، صفحہ ۲۷۲، طبع سوم)

اسی طرح اسلام بھی ان مخصوص عقائد کا نام نہ رہے گا جو علمائے حق کے نزدیک صحیح ہیں اور قرآن و سنت سے ثابت ہیں، بلکہ ہر وہ شخص جو مسلم گھرانے میں پیدا ہوا ہو خواہ عقیدہ کچھ بھی رکھتا ہو اور خواہ وہ کمیونسٹوں کی طرح منکرِ خدا ہو، مسلم حقوق کا مالک ہوگا اور مسلم معاشرت کا مساوی طور پر حصے دار اور پھر اگر خدانخواستہ پاکستان بن گیا تو ہر پاکستانی مسلم کہلائے گا۔ جس طرح سر سید کا مطالبہ تھا کہ ہر ہندوستانی کو ہندو کہا جائے، ایسے ہی ہر پاکستانی مسلمان کہلائے گا، خواہ عقیدہ کچھ ہو۔ بالفاظ دیگر جس طرح ایک برہمن برہمن ہے، ایک کھتری کھتری ہے، ایک ویش ویش ہے، خواہ عقیدہ اور عمل کچھ بھی ہو۔ ایک جرمن جرمن ہے، ایک فرانسیسی فرانسیسی ہے کیوں کہ جرمن یا فرانسیسی نیشن سے تعلق رکھتا ہے، عمل اور عقیدہ خواہ کچھ ہو۔ اسی طرح جو مسلم نیشن سے تعلق رکھے گا مسلم کہلائے گا، خواہ عمل اور عقیدہ کچھ ہو۔

پھر یہ ایک عجیب لطیفہ ہے کہ ایک طرف یہ دعویٰ کہ اسلام جغرافیہ اور نسل کی تمام بندشوں کو توڑ کر ہمہ گیر اور عالم گیر مذہب ہے اور دوسری جانب اس کو پاکستان کی جغرافیائی حدود میں محدود کر دیا جائے گا۔

یہ حد بندی تبلیغی نقطۂ نظر سے بھی انتہا درجہ مضر ہوگی، کیوں کہ اس صورت میں ہندو ہندوستان کے کسی ہندو یا عیسائی کو اسلام کی دعوت دینے کے یہ معنے ہوں گے کہ آپ پاکستانی بننے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس کی شکل ایسی ہوگی کہ ایک برطانوی کو جرمنی بننے اور جرمن نیشن میں داخل ہونے کی دعوت دی جائے۔

بہر حال اگر جغرافیائی حیثیت نمایاں ہوگئی تو یہ تباہ کن نقصان لازمی ہے اور اگر مذہبی حیثیت ابھری رہی تو جب مذہب پر نیشن کا مدار ہوا اور بحیثیت نیشن ملک کی تقسیم ہوئی تو ہندوستان صرف دو حصوں ہی میں تقسیم نہ ہوگا۔ بلکہ ہر ایک حصے میں درجنوں حصے نکلیں

گے اور اس کا بیشتر نقصان خاص پاکستانی علاقوں کو اٹھانا پڑے گا۔ آخر سکھ، عیسائی، پارسی وغیرہ ہندوستان کے بے شمار مذاہب والوں کو مطالبۂ تقسیم سے کیا چیز منع کردے گی۔

اور جب مذہبی بنیاد پر ملکی تقسیم ہوئی تو یہ صرف صوبجات تک ہی کیوں محدود رہے گی۔ ہر ایک میونسپلٹی اور ہر ایک ڈسٹرکٹ بورڈ میں یہ تقسیم ہونی چاہیے۔

اس تقسیم در تقسیم میں کس کا فائدہ ہوگا اور کس کا نقصان؟ یہ چیز آج غور کرنے کی ہے۔ نقصان سراسر مسلمانوں کا ہوگا جن کے صوبوں میں ۴۵ اور ۴۷ فی صدی غیر مسلم ہوں گے اور فائدہ ان کا ہوگا جن کے ایک مفکر سر جان میلکم کا ارشاد ہے:

"اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری جو بڑی جماعتیں ہیں ان کی عام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں جب تک یہ لوگ اس طریقے سے جدا رہیں گے، اُس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوت کے استحکام کو متزلزل نہ کرسکے گی"۔ (کمپنی کے عہد کی تاریخ تعلیم از میجر باسو، صفحہ ۱۸۷، بہ حوالہ "علمائے ہند کا شاندار ماضی" و نیز "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، صفحہ ۲۶۰)

بہر حال یہ برطانوی ڈپلومیسی کس قدر حیرت انگیز ہے کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں اور اس قدر وارفتہ ہیں کہ اس بربادی کو آبادی سمجھ رہے ہیں (والی اللہ المشتکیٰ)

ایک اہم سوال:

ٹو نیشن (دو قوم) کے اصول پر اگر تقسیم ہند کا مطالبہ ہو سکتا ہے تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسی اصول کے بموجب مرکز میں مساوی نمایندگی کا مطالبہ کیا جائے، جیسا کہ نواب زادہ (لیاقت علی خان) اور ڈیسائی (بھولا بھائی) فارمولا میں ہندو اور مسلمانوں دونوں کے لیے چالیس چالیس فی صدی نمایندگی طے کی گئی تھی۔ اس صورت کو قطعاً نظر انداز کرکے تقسیم ہند کے مطالبے پر کیوں زور دیا جارہا ہے۔ کیا یہ واقعہ اس حقیقت کو روشن کرنے کے لیے کافی نہیں کہ

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

باب چہارم:

جمعیت علماے ہند کا
شاہ راہِ مستقیم

پاکستان کے مبہم مطالبے نے (جو مسائل پیدا کر دیے ہیں اور جمعیت علماے ہند نے ان کا جو حل پیش کیا ہے، اب آخر میں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے :)

(۱) ہندو ہندوستان کے تقریباً تین کروڑ مسلمانوں کو صرف ایک معاہدے کا اطمینان دلایا، جو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہوگا در آں حالے کہ ہندو ہندوستان اس کا اتنا محتاج نہ ہوگا جتنا کہ پاکستان، کیوں کہ ہندو ہندوستان میں مسلم آبادی اوسطاً دس فی صد ہوگی اور پاکستان میں غیر مسلم آبادی تقریباً چالیس فی صد۔

(۲) پاکستان میں جمہوری نظامِ حکومت کا اعلان کر کے اسلامی حقوق کو پنجاب میں ۴۴ فی صد اور بنگال میں ۴۷ فی صد اور آسام میں ۶۶ فی صد غیر مسلم کی مرضی پر معلق کر دیا۔

(۳) پاکستانی اور غیر پاکستانی کی تقسیم کر کے ہندوستان کی دس کروڑ مسلم آبادی کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔

(۴) تقسیم بر بنائے مذہب کا اصول قائم کر کے ہندوستان اور بالخصوص پاکستان کو بہت سے حصوں پر منقسم کر دیا۔

(۵) اقوام ہند میں افتراق و انفصال کی تخم ریزی کر کے متحدہ ہندوستان کی عظیم الشان

طاقت کو کمزور کر دیا۔

(۶) اس تقسیم و تفریق نے اس قوت کو بے پناہ فایدہ پہنچایا جس کا اصول ہی یہ ہے کہ "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو"۔

(۷) بہانہ صرف یہ ہے کہ مرکز میں ہندو اکثریت کے خطرے سے مسلمان محفوظ ہو جائیں گے (حال آں کہ یہ محض ایک خیال ہے جس کی حقیقت و بنیاد کچھ نہیں!)۔ ہمارے نزدیک حقوق دو قسم کے ہیں:

(الف) اسلامی حقوق: مثلاً: محاکم شرعیہ کا قیام، مسلم حلقوں میں قانونِ شریعت کا نفاذ وغیرہ۔

(ب) مسلمانوں کے حقوق: مثلاً: وزارتیں، ملازمتیں، اسمبلیوں وغیرہ میں نشستیں وغیرہ۔

پاکستانی علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت کے باعث مسلمانوں کے حقوق کے متعلق تو اطمینان کیا جا سکتا ہے، مگر جب کہ حکومت جمہوری ہو اور مسٹر جناح کے حالیہ اعلان کے بموجب سوشلزم کی بنیادوں پر نظام حکومت کا قیام مقصود ہو تو صرف پاکستانی حیثیت کو اسلامی حقوق کے تحفظ کے متعلق کافی قرار دے لینا محض نادانی اور سراسر سادہ لوحی ہے۔ بالخصوص اس صورت میں کہ بادشاہ خیز کمیونسٹ بھی لیگ میں داخل ہو کر اس کی اصلاح کے در پے ہوں یا مقصد براری کر رہے ہوں، اور اسلام کے فرق اور دیگر مذاہب باطلہ کو بھی مسلم لیگ مساوی حیثیت دے رہی ہو۔

تحفظ حقوق اسلامی کے سلسلے میں جمعیت علماے ہند اپنے قیام کے وقت سے امارتِ شرعیہ کے قیام کی ساعی رہی ہے، جس کا ایک نمونہ صوبۂ بہار میں تحریکِ خلافت کے زمانے سے قائم ہے۔ نیز وہ اجلاس سہارن پور، منعقدہ اگست ۱۹۳۱ء میں طے کر چکی ہے کہ جو دستورِ اساسی ہندوستان کے لیے مرتب ہو اس میں:

"(۱) ہندوستان کی مختلف ملتوں کے کلچر، رسم الخط، پیشہ، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی ادارے، مذہبی عقائد، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف آزاد ہوں گے۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

(۲) دستور اساسی میں اسلامی (پرسنل لا) کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی جس میں تصریح ہوگی کہ مجلس مقننہ اور حکومت کی جانب سے اس میں مداخلت نہ کی جائے۔ اور "پرسنل لا" کی مثال کے طور پر یہ چیزیں فٹ نوٹ میں درج کی جائیں گئیں۔ مثلاً: احکام نکاح، طلاق، رجعت، عدت، خیار بلوغ، تفریق زوجین، خلع عنین، مفقود، نفقہ زوجیت، حضانت، ولایت، نکاح، مال، وصیت، وقف، وراثت، تکفین و تدفین، قربانی وغیرہ۔

(۳) مسلمانوں کے لیے ایسے مقدمات فیصل کرنے کے واسطے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے، مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا اور ان کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے"۔

پھر اجلاس سہارنپور ۱۹۴۵ء کی دفعہ (ب) کے الفاظ یہ ہیں:

"وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا، مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو"۔

حقوق مسلم: پاکستانی اسکیم کے ذریعے جس قدر حقوق پاکستانی مسلمانوں کو پاکستان میں حاصل ہوتے ہیں، جمعیت علمائے ہند کی تجویز کی رو سے وہ تمام حقوق ہندوستانی مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ ہندو ہندوستان کے تین کروڑ مسلمان بلا کسی جدید معاہدے وغیرہ کے صوبائی حکومت میں حصے دار ہوتے ہیں اور مرکز میں بھی ان کا حصہ مساویانہ رہتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے، تجویز کے الفاظ یہ ہیں:

(ج) ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خود مختاری اور آزادی کے حامی ہیں۔ غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں اور جن کا تعلق تمام صوبوں

سے یکساں ہو۔

(د) ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے۔ مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک نو کروڑ (دس کروڑ) نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی۔ یعنی مرکزی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں"۔

تشکیل مرکز کے متعلق جمعیت علما نے ایک تشریح کے ضمن چند صورتیں پیش کی ہیں۔ تشریح کے الفاظ درج ذیل ہیں:

"تشریح: اگرچہ اس تجویز میں بیان کردہ اصول اور ان کا مقصد واضح ہے کہ جمعیت علما مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی اور تہذیبی آزادی کو کسی حال میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں، وہ بے شک ہندوستان کی وفاقی حکومت اور ایک مرکز پسند کرتی ہے، کیوں کہ اس کے خیال میں مجوزہ ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کے لیے یہ مفید ہے، مگر وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کے لیے حق خود ارادیت تسلیم کر لیا جائے اور وفاق کی تشکیل اس طرح ہو کہ مرکز کی غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی حقوق پر اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر تعدی نہ کر سکے۔ مرکز کی ایسی تشکیل جس میں اکثریت کی تعدی کا خوف نہ رہے، باہمی افہام و تفہیم سے مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کسی صورت پر یا ان کے علاوہ کسی اور ایسی تجویز پر جو مسلم و غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے ہو جائے، ممکن ہے۔

(۱) مثلاً مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو:

ہندو ۴۵، مسلم ۴۵، دیگر اقلیتیں ۱۰

(۲) مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ۳/۲، اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخالفانہ اثر انداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکے گی۔

(۳) ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم و غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم و غیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی

کمیٹی کرے۔ یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے اختلافات کے آخری فیصلے کرے گا۔ نیز تجویز نمبر ۲ کے ماتحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کے خلاف ہونے نہ ہونے میں مرکز کی اکثریت مسلم ارکان کی ۳/۲، اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا۔

(۴) یا اور کوئی تجویز جسے فریقین باہمی اتفاق سے طے کریں"۔

مسٹر جناح نے اعلان فرمایا ہے کہ پاکستانی حکومت سوشلزم کی بنیادوں پر قائم کی جائے گی۔

پاکستان میں سوشلزم یا کمیونزم یا کسی ازم کی بنیاد پر حکومت کے قیام کے یہ معنے ہوں گے کہ نہ صرف اسلامی حکومت کے امکانات ختم ہو جائیں گے، بلکہ یہ بھی مشکل ہو جائے گا کہ وزارت میں مسلمانوں کی اکثریت ہو، بلکہ اقتصادی اصول پر پارٹیوں کا الیکشن ہو گا اور جو پارٹی غالب ہو گی اسی کی وزارت بنے گی، خواہ مذہب کچھ بھی ہو۔

لیکن اگر مسٹر جناح کچھ وسعت نظر اور فراخ حوصلگی سے کام لیں اور صرف پاکستان کے بجائے متحدہ ہندوستان میں حکومت کی بنیاد سوشلزم کے اصول پر قائم کرنے کی کوشش کریں تو تشکیل مرکز کی ایسی صورت ممکن ہے کہ پورے ہندوستان کے لیے بھی مفید ہو اور مسلمانوں کو بھی اقلیت کی بنا پر جو خطرات درپیش ہیں وہ ختم ہو جائیں گے کیوں کہ اس وقت مذہب کی بنیاد پر اسمبلی میں پارٹیاں نہیں بنیں گی، بلکہ دیگر آزاد ممالک کی طرح اقتصادی اصول پر پارٹیاں بنیں گی اور دستورِ اساسی میں ایسے بنیادی اصول تسلیم کرانے ہوں گے کہ مذہبی اور کلچرل فنڈامنٹل رائٹس (بنیادی حقوق) سمجھے جائیں اور اس کا فیصلہ اسی کمیونٹی (اقلیت) کے ہاتھ میں ہو جس کے وہ حقوق ہیں اور وہ کسی حال میں بھی لیجس لیچر کے اندر زیر بحث نہ آئیں۔ اس صورت سے مذہبی معاملات اسمبلی کی کشاکش سے محفوظ رہیں گے اور اس کی دلچسپیوں سے مستثنیٰ ہو جائیں گے۔ بہر حال تشکیل مرکز کی ایسی بہت سی صورتیں نکل سکتی ہیں، جن سے وہ خطرہ قطعاً زائل ہو جائے جس کی بنا پر تقسیم ہند کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

آج جب کہ باہمی اشتراک و تعاون سے یک جائی و وفاق اور متحدہ محاذ بنانے کی لہر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور بڑی سے بڑی مرکزی حکومتیں بھی اس اشتراک و تعاون کی محتاج ہیں۔ مسلمانان ہند بجائے اس کے وہ افغانستان، ایران، مصر، عراق، شام، فلسطین، حجاز، سماٹرا، جاوا اور چین جہاں ہندوستان سے بھی زیادہ مسلمان آباد ہیں، ان سب کو ملا کر ایک ایشیائی وفاق بنانے کی کوشش کریں، جس میں مسلمانوں کی حیثیت بہت بلند اور بہت نمایاں ہو، بلکہ قیادت مسلمانوں ہی کے حصے میں آئے۔ وہ خود ہندوستان کو حصے بخرے کر کے مفلوج اور اپاہج بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اسی سعی میں ہیں کہ خود اپنے ہاتھوں ہندوستان میں ایک السٹر قائم کر دیں کہ اگر ہندو ہندوستان کوئٹ انڈیا (ہندوستان خالی کرو) کی تحریک میں کامیاب ہو کر اپنے حصے کو انگریز کی دست برد سے محفوظ بھی کر لے تو آئرلینڈ کی طرح ہندوستان کے پاکستان میں انگریز کا تسلط بدستور باقی رہے، جس کے جانے سے وہ تمام اسلامی ممالک بلکہ تمام ایشیا کو اپنی اغراض کا آماجگاہ بنائے رکھے۔ یالیت قومی یعلمون!

ایک سوال اور اس کا جواب: جمعیت علمائے ہند کی اس واضح اور صاف تجویز کے بعد حامیان پاکستان اپنی خفت مٹانے کے لیے سوال کرتے ہیں کہ کیا جمعیت علما اس تجویز کو کانگریس سے منظور کرا چکی ہے؟ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ پاکستانی اسکیم تو اب تک اسکیم ہی ہے، اس کو نہ کانگریس نے اب تک منظور کیا نہ اس مہربان برطانیہ نے جس کا ہر ایک مہرہ آج امتحانی مہم میں لیگ کی حمایت میں سرگرم نظر آرہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کانگریس نے نمایندہ اسمبلی کا مطالبہ اسی لیے کیا ہے کہ اہل ملک اپنی مصلحتوں اور مضرتوں کو سوچ سمجھ کر ہندوستان کے لیے آئین بنائیں۔ اس وقت مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ غور کریں کہ تقسیم ہند ان کے لیے مفید ہے یا جمعیت علمائے ہند کی متبادل تجویز۔ آخری فیصلہ نمایندہ اسمبلی کے ہاتھ میں ہوگا۔

علاوہ ازیں واقعہ یہ ہے کہ صوبجات کی مکمل آزادی، غیر مصرحہ اختیارات کا صوبجات

کے حوالہ ہونا، صوبجات کے لیے حق خود ارادیت، کانگریس تسلیم کر چکی ہے، ہر ایک مذہب اور ہر ایک تمدن کی آزادی کا اصول بھی کانگریس کے (فنڈامینٹل رائٹس) بنیادی اصول میں تسلیم کیا جا چکا ہے۔ تشکیل مرکز کا مسئلہ ابھی افہام و تفہیم کا محتاج ہے۔ اگر مسلمان پاکستانی مطالبے کی لغویت کو محسوس کر کے جمعیت علمائے ہند کی حمایت کریں اور انتخاب میں اس کا ساتھ دیں تو کوئی طاقت نہیں جو تشکیل مرکز کے سلسلے میں مسلمانوں کے مطالبے کو نظر انداز کر سکے۔

محمد میاں

ضمیمه نمبر ۳:

مسٹر جناح کی تشریحِ پاکستان پر مختصر تبصرہ

از مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیت علماے ہند

"منشور" مورخہ ۱۱ر نومبر میں مسٹر جناح کے وہ ارشادات شائع ہوئے ہیں، جو آپ نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمایندے کے سوالات کے جواب میں صادر فرمائے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"پاکستان ایک جمہوری حکومت ہوگی"۔ (کالم ۲، صفحہ ۳، منشور)

پھر ارشاد فرماتے ہیں:

"پاکستان کے متعلق میرا گمان نہیں کہ وہ ایک پارٹی کی حکومت ہوگی، بلکہ میں ایک پارٹی کی حکومت کے قانون کی مخالفت کروں گا"۔

پھر آپ غیر مسلم اقلیت کے متعلق فرماتے ہیں:

"انھیں یہ محسوس کرا دینا چاہیے کہ حکومت میں ان کا بھی ہاتھ ہے اور اس کے لیے انھیں حکومت میں مناسب نمایندگی دی جانی چاہیے"۔

اس تمام تشریح کے باوجود مسٹر جناح صاحب کا ارشاد ہے:

"یہ حکومت مسلمانوں کی ہوگی"۔

کیا اسلامی حکومت زمانۂ حاضر کی جمہوری حکومتوں کی تعریف میں آسکتی ہے؟ جب مذہبی نقطۂ نگاہ سے حکومت قائم ہو اور ہندو مسلم ملک کی پارٹیاں تسلیم ہوں تو کیا اسلامی حکومت پارٹی کی حکومت نہ ہوگی؟

حضرات علما توجہ فرمائیں اور جمہوری حکومت کے متعلق تھانہ بھون کے علماے کرام کے جو بیانات شائع ہوئے ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

ضمیمہ نمبر ۱:

نواب زادہ لیاقت علی صاحب

اور

تفسیر پاکستان

جناب مولانا سید محمد میاں سے ناظم جمعیت علمائے ہند نے اخبارات کے لیے حسب ذیل بیان جاری کیا ہے:

"۲۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے نواب زادہ لیاقت علی خاں جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے فرمایا:

"پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ ان علاقوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں آباد ہیں۔ آزاد، خود مختار اور جمہوری ریاستیں قائم کی جائیں"۔

پاکستان کے دستور اساسی کے متعلق آپ نے فرمایا:

"پاکستان ایک جمہوری ریاست ہوگی۔ اس کا دستور اساسی، اس کے باشندے خود اپنے اپنے دستور ساز اداروں کے ذریعے بنائیں گے۔ ان اداروں کی تشکیل وہ خود کریں گے"۔ (منشور۔ ۲۶ر ستمبر ۱۹۴۵ء)

اسی تقریر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ

"مسلم طلبہ دس کروڑ مسلمانوں کی آزادی اور حق خود ارادیت کے حامی ہیں"۔

یہ تمام امور وہ ہیں جن کو جمعیت علماے ہند ساڑھے تین سال پیشتر اپنے اجلاس لاہور، منعقدہ مارچ ۱۹۴۲ء کی مشہور تجویز میں نہایت خوبی اور عمدگی کے ساتھ شامل کر چکی ہے اور کانگریس بھی بار بار ان کی منظوری کا اعلان کر چکی ہے۔ ان کی بنا پر طلبہ سے اپیل کرنا الیکشن کا غلط پروپیگنڈہ ہے۔ بقول نواب زادہ صاحب فرق یہ ہے کہ لیگ متحدہ ہندوستان معرض وجود میں نہیں آنے دے گی، کیوں کہ وہاں ہندو اکثریت کا غلبہ ہوگا۔ نیز وہ یونٹس (واحدوں) کے لیے حقِ خود ارادیت نہیں مانگتی بلکہ مسلم قوم کے لیے (مانگتی ہے۔) مختصر یہ کہ :

(۱) یوروپین شہنشاہیتوں نے ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد عثمانی سلطنت کے حصے بخرے کر کے اس کو بہت سے پاکستانوں پر تقسیم کر دیا تھا۔ یمن علاحدہ، عراق علاحدہ، حجاز علاحدہ، شام علاحدہ، لبنان علاحدہ، فلسطین علاحدہ، وغیرہ وغیرہ۔

یہ یونٹس (واحدے) آج تک نیم غلام ہیں اور فرانس و برطانیہ کے آہنی پنجۂ استبداد کی گرفت میں کسے ہوئے کراہ رہے ہیں۔ مسلم لیگ یہ چاہتی ہے کہ اسی طرح ہندوستان کی متحدہ طاقت کو خود اپنے ہاتھوں پارہ پارہ کر کے اس خوبصورتی سے برطانوی سامراج کے پنجۂ استبداد کو مستحکم کر دے کہ مسلمان قوم اس غلامی کو اپنے لیے نعمتِ عظمیٰ سمجھتی رہے۔

پاکستان علاحدہ ہو، ہندو ہندوستان علاحدہ اور ہندوستانی ریاستیں علاحدہ اور پھر جب مذہبیت کی بنا پر واحدے (UNITS) بنائے جائیں گے تو ہندوستان کے درجنوں مذاہب کی طرح اس کے اجزا بھی کئی درجن ہو جائیں گے۔

(۲) اور جب کہ پاکستان کا دستور جمہوری ہوگا، جس کو اس کے باشندے دستور ساز اداروں کے ذریعے مرتب کریں گے۔

یہ تو واضح ہو گیا کہ اسلامی یا قرآنی حکومت جس کے خوش آیند الفاظ سے عام مسلمانوں کو دھوکا دیا جارہا ہے، وہ قطعاً نہ ہوگی بلکہ ایک ایسا فیڈریشن ہوگا، جس میں تقریباً چالیس فی صدی غیر مسلم کا حصہ پھر بھی رہے گا۔

''کوہ کندن و کاہ بر آوردن'' کی مثال اس سے زیادہ کہاں چسپاں ہو سکتی ہے کہ پاکستان کے اس تمام قیامت خیز شور و غوغا کے بعد صرف دس فی صد کی اکثریت مسلمانوں کے پلے پڑے گی، جو آئین ساز اسمبلیوں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ چناں چہ صوبہ آسام کی مثال موجود ہے، جہاں مسلمان ۳۴ فی صد ہیں اور ہندو کو ۶۶ فی صد اکثریت حاصل ہے۔ مگر عموماً سر سعد اللہ وزارت کرتے رہے ہے۔

ہندو اکثریت سے حفاظت کا طریقہ:

اس کے برعکس ہندو ہندوستان میں تقریباً تین کروڑ مسلمانوں کو تقریباً نوے فی صد کی اکثریت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اقتصادی لحاظ سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

نواب زادہ صاحب سے توقع نہیں کہ وہ اس واضح حقیقت کی طرف توجہ فرمائیں۔ مگر ہمارا مطالبہ عام مسلمانوں سے ہے کہ وہ غور کریں کہ آیا ہندوستان کو حصے بخرے کر کے ہمیشہ کے لیے غلام اور مفلوج اور بے دست و پا کر دینا بہتر ہے یا یہ صورت بہتر ہے جو جمعیت علماے ہند نے ''وحدتِ مرکز'' تسلیم کرتے ہوئے اکثریت کے خطرات سے بچنے کی تجویز کی ہے کہ:

> ''مرکز کی تشکیل اس طرح کی جائے کہ غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی حقوق پر تعدی نہ کر سکے، مثلاً مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو کہ ہندو ۴۵، مسلمان ۴۵، دیگر اقلیتیں ۱۰، یا یہ کہ مرکز میں ایسی کوئی تجویز پیش نہ ہو سکے جس کو مسلم ارکان ۲/۳ (دو تہائی) اکثریت اپنی مذہبی یا سیاسی آزادی کے مخالف سمجھے یا ایسا سپریم کورٹ قائم کر دیا جائے جس میں مسلم اور غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو''۔

(تفصیل کے لیے دیکھو: تجویز جمعیت علماے ہند، اجلاس سہارن پور ۱۹۴۵ء)

آخر میں مسلمانوں سے اور بالخصوص مسلم طلبہ سے اپیل ہے کہ وہ غلط جذبات سے متاثر نہ ہوں! جب ہندو ہندوستان میں ان کے حقوق بھی محفوظ نہ ہوں گے تو ان تمام صوبوں اور ریاستوں کے مسلم طلبہ کی ڈگریاں کس کام آئیں گی۔ (زمزم ماہانہ لاہور، ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۵ء، ص ۳)

ضمیمہ نمبر ۵:

جمعیت علمائے ہند کا فیصلہ

جمعیت علمائے ہند کے فیصلے پر سہ روزہ زمزم، لاہور کا ایک شذرہ بھی ہمیں دستیاب ہو گیا ہے۔ ادارۂ زمزم کے نزدیک یہی فیصلہ قابلِ قبول، اطمینان بخش اور نتیجہ خیز ہو سکتا تھا اور اسی فیصلہ کو قبول کرنے سے ہندوستان کی وحدت، اسلام کی وحدتِ فکری کا نمونہ بن سکتی تھی، لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔ لیگ کے بزرگوں نے ہندوستان میں اسلام کی وحدت فکری اور مسلمانوں کے اسلامی مفاد کے نقطۂ نظر سے کہاں سوچا تھا! زمزم کا شذرہ ملاحظہ فرمایئے۔

"جمعیت علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی نے ہندو مسلم مسائل پر پھر از سر نو غور کیا ہے اور اس کی رائے اور فیصلہ یہ ہے کہ ہندوستان کی جغرافیائی وحدت ہی سے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ یہ وہ فیصلہ ہے جو لیگی حلقوں میں ضرور تشویش کا باعث ہو گا۔ لیکن غور کرنے کے بعد محسوس ہو گا کہ یہی فیصلہ قابلِ قبول، اطمینان بخش اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے، ہندوستان کی وحدت، اسلام کی وحدتِ فکری کا نمونہ بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہم اسلام کی عالمگیر سیاست اور اس کی بین الاقوامی اہمیت کو سمجھیں اور کسی ایک خاص رقبہ کو نہیں بلکہ پورے معمورۂ ارضی کو خصوصاً ہندوستان کے گوشے گوشے کو اپنی وراثت تصور کر لیں۔

جمعیت علما کے ہبر و نجیب ارکان نے وفاقی طرز حکومت کی تائید کرتے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ ہندوستان کے صوبے خود مختار ہوں اور انہیں یہ حق حاصل ہو کہ وہ

جب چاہیں مرکز سے علاحدگی اختیار کریں۔ یہ صورت ایسی ہے جس سے پاکستان کا مقصد بھی حاصل ہو سکتا ہے اور ہندوستان کی جغرافیائی وحدت کو بھی کسی قسم کا گزند نہیں پہنچ سکتا۔

ایک تجویز یہ ہے کہ اقلیتوں کے تحفظ کے لیے اقلیتوں کے ایسے مخصوص صوبوں کی تشکیل و تعمیر عمل میں آئے جہاں اکثریت کی دراز دستیوں کے لیے کوئی امکان باقی نہ رہے۔ یہ تجویز بھی اس قابل ہے کہ اہل الرائے اس پر غور فرمائیں اور اقلیتوں کے دائمی تحفظ کی اس شکل کو مقبول بنانے کی کوشش کریں"۔

(زمزم، لاہور۔ ۱۱ر فروری ۱۹۴۳ء صفحہ ۲)

ضمیمہ نمبر ٤:

کانگریس اور حقِ خود ارادیت

گزشتہ صفحات میں کسی جگہ یہ ذکر آیا ہے کہ جمیعت علما کا فیصلہ کانگریس نے تسلیم کر لیا تھا۔ اس بارے میں کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے۔ "علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" (حصہ دوم) میں خود مولانا سید محمد میاں نے یہ وضاحت فرمائی ہے۔ مولانا مرحوم کا بیان یہ ہے (ا۔ س۔ ش)۔

حقِ خود ارادیت (یا سیلف ڈیٹر مینیشن) یعنی اپنے متعلق آزادانہ فیصلہ کا حق، اگرچہ آزادی کے لیے لازم ہے اور جب کسی قوم یا کسی صوبہ کو خود مختار تسلیم کیا جائے تو قدرتاً اس کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے تعلقات کے متعلق بھی فیصلہ کرلے کہ اس کو کس کے ساتھ رشتہ قائم رکھنا ہے اور کس سے تعلق منقطع کرنا ہے۔ کانگریس جب جمہور کے لیے آزادی کی خواہاں ہے تو لامحالہ جمہور کے لیے یہ حق بھی تسلیم کرتی ہے۔ چناں چہ سر اسٹیفورڈ کرپس نے ایک سوال کے جواب میں کانگریس کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ:

> اس کے حلقوں میں بھی یہ مانا جا چکا ہے کہ اگر مسلمانوں کی رائے عامہ علاحدگی کے حق میں ہو گی تو اسے نہیں روکا جا سکتا۔ (ضمیمہ تیج، مورخہ ۳۰ مارچ ۱۹۴۲ء)

چناں چہ جمیعت علمائے ہند نے جب اجلاس لاہور میں مذکورہ بالا فارمولا منظور کیا تو ہندوؤں کے متعصب اور تنگ نظر اخبارات نے اس کو دوسرے عنوان سے "پاکستان" کا مطالبہ قرار دیا تھا کیوں کہ اس فارمولے میں مکمل اختیارات کا مالک صوبوں کو قرار دیا گیا تھا۔

مگر یہ درست ہے کہ کانگریس نے اس مفہوم کی کوئی تجویز اب تک پاس نہیں کی تھی۔ صرف گاندھی جی اور کانگریس کے لیڈروں کے بیانات میں یہ تسلیم کیا گیا تھا، جس کا کرپس نے حوالہ دیا۔

کرپس کی واپسی پر ۱۰؍ اپریل ۱۹۴۲ء کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس میں مندرجہ ذیل تجویز پاس کی گئی:

کانگریس ہندوستان کی آزادی اور اتحاد کی حامی رہی ہے اور اس اتحاد میں کوئی رخنہ بالخصوص جدید دنیا میں جب کہ لوگوں کے دماغوں میں وسعت پذیر فیڈریشنوں کا تصور بڑھتا ہوا ہے، سب متعلقہ فریقوں کے لیے نقصان دہ ہوگا اور اس کا خیال کرنا بھی تکلیف دہ ہے۔ پھر بھی کانگریس کسی علاقہ وارانہ واحدے کے لوگوں کو ان کی اعلان شدہ اور مسلمہ مرضی کے خلاف انڈین یونین میں رہنے پر مجبور کرنے کا خیال دل میں نہیں لا سکتی۔ ہر علاقہ وارانہ واحدے کو انڈین یونین میں پوری پوری خود اختیاری حاصل ہونی چاہیے۔ (تیج مؤرخہ ۱۳؍ اپریل ۱۹۴۲ء، نمبر ۹۹، ج ۲۰ و تیج مؤرخہ ۲؍ اکتوبر ۱۹۴۲ء، نمبر ۲۶۵، جلد ۲۳)

کانگریس نے اس تجویز کے ذریعہ حقِ خود ارادیت کو باضابطہ تسلیم کر لیا۔ اگرچہ تجویز کے الفاظ میں وحدت ہندوستان کے جذبات نمایاں ہیں اور ان کو غلبہ حاصل ہے اور اس کو ہندوستان کی حفاظت اور ترقی کے لیے ضروری اور مفید سمجھا جا رہا ہے۔ مگر تاہم کسی علاقہ کی رائے کو ان سب پر ترجیح دی گئی ہے۔

کانگریس، جمعیت علماے ہند کے فارمولے کی تائید میں:

مذکورہ بالا طویل تجویز سے کانگریس نے جمعیت علماے ہند کے فارمولے کے ان فقروں کو اپنا اصول بنا لیا۔

۱۔ جمعیت علماے ہند ہندوستان میں صوبوں کی کامل خود مختاری اور آزادی کی زبردست حامی ہے۔

۲۔ جمعیت علماے ہند کے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا سیاسی وفاق ضروری اور مفید ہے۔

اس کے بعد کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۶ ر اگست ۱۹۴۲ء (بمقام بمبئی) میں ایک طویل ریزولیوشن منظور کیا، جس میں تسلیم کیا گیا کہ

"کانگریس کے نظریے کے مطابق یہ آئین (جو نمائندہ اسمبلی مرتب کرے گی) فیڈرل (وفاقی) ہونا چاہیے اور اس فیڈرل میں شریک ہونے والی یونٹوں کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہیے اور اختیارات باقی انھیں یونٹوں کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں"۔

اگرچہ جمعیت علماے ہند نے کانگریس سے مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ جمعیت علما کے فارمولے کو تسلیم کرے مگر حالات اور رفتار زمانہ ہر ترقی پذیر اور ملک کی ہر بہبودی خواہ جماعت کو ان اصولوں کی طرف لا رہے تھے جو جمعیت علماے ہند اپنی بصیرت کی روشنی میں چند ماہ پہلے طے کر چکی تھی۔

(علماء ان کے مجاہدانہ کارنامے، حصہ دوم، صفحہ ۴۵۔۱۴۳)

ضمیمہ چہارم:

غیر مسلموں سے موالات اور اسلام

ایک سائل کے جواب میں

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا مکتوب گرامی

نسیم باغ، سری نگر (کشمیر) ۲۸/اگست ۱۹۴۵ء

حبّی فی اللہ

خط مورخہ ۱۵/ پہنچا۔ یہ بات کہ مسلمان کانگریس یا کسی دوسری انجمن میں شریک ہوں یا نہ ہوں، وقت کے مصالح اور احوال و ظروف کے مطالعے پر موقوف ہے، اور ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اپنے طریق نظر و فکر کے مطابق کسی خاص فیصلہ تک پہنچے۔ لیکن اس سلسلہ میں خواہ مخواہ اسلامی تعلیم کو درمیان لانا اور تحریف آیات قرآنی کی کوشش کرنا، صحیح طرز عمل نہیں ہوگا۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی حالت پھر ایک وقتی اور عارضی حالت ہے، لیکن اسلام کی تعلیم وقتی نہیں ہے۔ وہ دائمی تعلیم ہے۔ اسے وقتی حالات کی بنا پر کھینچ تان کر محرف کرنا نہایت افسوسناک ہے۔

آپ نے قرآن کریم کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے، وہ اور اس کی تمام ہم معنی آیات، احکامِ جنگ سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھیں مسلمانوں کی زندگی کے دائمی احکام سے کوئی تعلق نہیں۔ عرب کے اہل کتاب اور مشرک جب اسلام کے خلاف بر سر پیکار ہو گئے تو دو متقابل صفیں پیدا ہو گئیں۔ ایک طرف مسلمان تھے، دوسری طرف محارب مشرک اور یہود و

نصاریٰ۔ پس حکم ہوا کہ جو شخص ہماری صف سے تعلق رکھتا ہے، اس کا دشمنوں کے کیمپ سے تعلق نہیں ہونا چاہیے، اگر رکھے گا تو دشمنوں ہی میں سے سمجھا جائے گا۔ چناں چہ سورۂ توبہ اور سورۂ انفال کے تمام احکام اسی صورت حال سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا زمانۂ امن کے احکام سے تعلق نہیں ہے۔ اصلِ قرآنی اس بارے میں وہ ہے جسے سورۂ ممتحنہ میں صاف صاف واضح کردیا ہے:

انّما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم، ان تولوھم، ومن یتولھم فاولئک ھم الظالمون ○

"جو لوگ دین کے بارے میں تم سے جنگ کریں اور تم کو تمھارے وطن سے نکال دیں اور جو لوگ تم کو ملک بدر کرنا چاہیں ان کی حمایت پر اتر آئیں، خدائے تعالیٰ ایسے ہی لوگوں سے دوستی اور موالات کرنے سے روکتا ہے اور جو شخص ایسے لوگوں سے موالات کرے گا اس کا شمار ظالموں سے ہوگا"۔

"انما" پر غور کیجیے۔ یعنی جز ایں نیست کہ کذا و کذا۔ اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہو گیا کہ موالات کی "نہی" صرف ان غیر مسلموں سے تعلق رکھتی ہے، جنھوں نے مسلمانوں سے دین کے بارے میں قتال کیا ہو، اور انھیں ہجرت پر مجبور کردیا ہو، ورنہ بہ صورتِ دیگر دنیوی معاملات میں ان سے تعاون اور اشتراکِ عمل ممنوع نہیں۔ مسلمان اپنے مصالح کے پیش نظر ہمیشہ ایسا کرسکتے ہیں۔

خود آنحضرت ﷺ کا طرزِ عمل اس بارے میں ہمارے سامنے ہے۔ آپ نے قریش مکہ کے خلاف اطرافِ مدینہ اور مدینہ کے غیر مسلم قبائل کے ساتھ اتحادِ عمل کا معاہدہ کیا، جو معاہدۂ صحیفہ کے نام سے پکارا گیا تھا اور اس میں یہ الفاظ لکھے کہ ہم اس مقصد میں متحد ہو کر اس طرح کام کریں گے کہ "امۃ واحدہ" نظر آئیں گے۔

جس قرآن کی آیت آپ نے نقل کی ہے۔ اسی قرآن کی آیت سورۂ توبہ میں یہ بھی ہے کہ یاایھا الذّین آمنوا لاتتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء۔ الخ ہندوستان میں ڈیڑھ سو

برس سے برٹش حکومت قائم ہے، لوگ ان کی ملازمت کرتے ہیں، ان کے مقاصد واعمال کی راہ میں اپنی ساری زندگیاں ختم کر دیتے ہیں، ان سے موالات و تعاون میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ برطانوی نصاریٰ سے موالات کرتے ہوئے کبھی قرآن حکیم کے احکام لوگوں کو یاد آئے تھے؟ یاد رہے کہ ان ڈیڑھ سو برسوں کے اندر برٹش حکومت تمام عالم اسلامی کو تہ وبالا کرتی رہی، اور بارہا اسلامی حکومتوں کے خلاف علانیہ صفوف جنگ آراستہ کیں۔

اسلام عمومِ رحمت و شفقت اور اخوتِ انسانیت کا پیغام عام ہے۔ حاشا کہ اس کا دائرہ نظر اس درجہ تنگ ہو جتنا آپ نے ہار کھا ہے۔

میں ایک موٹی سی بات آپ کو بتاتا ہوں۔ قرآن نے مسلمانوں کے لیے جائز رکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے ازدواج کریں۔ ازدواج کا رشتہ، محبت و مؤدت کا رشتہ ہے۔ اگر رشتہ سازگار ہو تو شوہر اپنی بیوی کا پرستار بن کر رہے گا۔ اور اس سے بڑھ کر دنیا کا کوئی علاقہ اسے محبوب نہ ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے نزدیک کسی حال میں بھی یہ جائز نہ تھا کہ مسلمان غیر مسلموں سے دنیوی علایق میں تعاون واشتراک عمل کریں، تو کیوں کر ممکن تھا کہ وہ مسلمانوں کو اس کی اجازت دیتا کہ اپنے دل اور گھر کی مالکہ ایک غیر مسلمہ کو بنا کر رکھیں اور اپنی دنیوی زندگی اس کے سپرد کر دیں؟

اگر آپ کی یہ رائے ہے کہ مسلمان ملک کی سیاسی جد و جہد میں غیر مسلموں کے ساتھ شریک نہ ہوں تو آپ ایسی رائے رکھ سکتے ہیں، اور اپنے خیال کے مطابق اس کے وجوہ و مصالح بتا سکتے ہیں۔ لیکن خدا کے لیے قرآن حکیم کی آیتوں کو اس میں نہ لائیے۔ اور اس کے احکام کو تفسیر بالرائے کا بازیچہ نہ بنائیے۔ یحرفون الکلم عن مواضعہ کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ یہود و نصاریٰ تورات وانجیل کے الفاظ میں تحریف کرتے تھے، بلکہ یہ بھی تھا کہ ان کے معانی کو الٹ پھیر کر کچھ سے کچھ بنا دیتے تھے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ابوالکلام

حوالہ: زمزم، لاہور۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۴۵ء صفحہ ۱

ضمیمہ نمبر ٦:

پاکستان، پس منظر اور رہنما

مولانا عبدالماجد دریابادی کو سیاست سے گہری دلچسپی کبھی نہیں رہی، لیکن وہ ایک صحافی تھے جو گرد و پیش کے حالات اور وقت کی شخصیات و تحریکات سے کبھی بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ مولانا دریابادی کی ایک مجبوری بھی تھی اس لیے بھی انھوں نے وقت کی سیاسیات میں کھل کر حصہ نہیں لیا۔ وہ ذہناً نیشنلسٹ یا قوم پرور تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ہندو مسلم بھائی چارے کی فضا میں اور محبت و تہذیب کے شہر لکھنؤ میں گزرا تھا۔ اس لیے ہندو مسلم منافرت کی کوئی بات ان کا دل قبول ہی نہ کر سکتا۔ شکایات ہو سکتی تھیں، وہ تھیں، جن کا اظہار وہ ہمیشہ کرتے رہے، لیکن ان کے روحانیات اور طریقت کے بزرگوں...... خانقاہ تھانہ بھون کے شیخ اور ان کے متوسلین کا مسلک بالکل دوسرا تھا۔ انھوں نے مذہب کے جوش میں ہندوستان میں مسلمانوں کی صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ، ہندوستان کے دور دراز گوشوں اور چھوٹے چھوٹے قریوں تک پھیلے ہوئے مسلمانوں کے مفادات، ان کے اسلامی آثار، مدارس، مساجد، کروڑہا روپے کے آثار جو ان کے لیے سرچشمۂ حیات کی حیثیت رکھتے تھے، اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے تمام منافع و مصالح کو نظر انداز کر دیا تھا اور چند خوشنما نعروں کے فریب سراب میں مبتلا ہو گئے تھے، جن کی بنیاد سراسر دنیا پرستی، ہوسِ اقتدار اور بے دینی پر تھی، مولانا دریابادی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ان حضرات کی مخالفت کرتے، اس لیے اپنے حقیقی قوم پرور خیالات کا اظہار کرتے بھی تھے تو دبے دبے الفاظ میں۔ لیکن جب وہ خانقاہ اجڑ گئی اور انقلاب کے ایک ہی چابک نے اس کے پجاریوں پر اس دیر کی زمین تنگ کر دی اور ہبل ہبل پکارتے ہوئے اس سرزمین سے بھاگ کھڑے ہوئے تو

مولانا دریابادی، جنھوں نے ان کی سیاسی فکر کو اپنا عقیدہ کبھی نہ بنایا تھا، آہستہ آہستہ وہ سب باتیں کھل کر کہنے لگے، جن کے واضح اظہار و بیان سے ان کا قلم ہمیشہ قاصر رہا تھا۔

مولانا دریابادی نے پاکستان کے تصور، اس کے پس منظر، اسی کے رہنماؤں کی زندگی، ان کی سیرت، ان کے پُر فریب نعروں اور پس پردہ عزائم، علما کی سادہ لوحی، ان کے بے اُبھر تی، سیاست سے ان کے ذوق کی عدم مناسبت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، وہی ہے جسے ہمارے بزرگ انتہائی مشکل حالات میں بھی بہانگ دہل مسلسل کہتے رہے تھے،

مولانا دریابادی کے اس مضمون میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں:

۱۔ قومیت کے بارے میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی حمایت۔

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے 'انڈیا ونس فریڈم' کے ایک بیان کی پُر زور تائید، جس پر وہ خود اس سے پہلے حیرت و استعجاب کا اظہار فرما چکے تھے، بلکہ ایک مراسلہ نگار کی آڑ میں تنقید فرما چکے تھے۔ مولانا آزاد نے انڈیا ونس فریڈم کے "حرفِ آخر" میں لکھا تھا:

"مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے شمال مشرق اور شمال مغرب میں تھے۔ یہ دونوں علاقے کسی مقام پر بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں۔ یہاں کے باشندے مذہب کے سوا ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ کہنا عوام کو ایک بڑا فریب دینا ہے کہ صرف مذہبی یگانگت دو ایسے علاقوں کو متحد کر سکتی ہے جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور معاشرتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی کوشش کی جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حدبندیوں سے بالاتر ہو، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ شروع کے چالیس برسوں کو یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کو چھوڑ کر اسلام کبھی سارے مسلمان ممالک کو صرف مذہب کی بنیاد پر متحد نہ کر سکا"۔

انڈیا ونس فریڈم میں مولانا آزاد کے بیان (۱) کا یہ ترجمہ پروفیسر محمد مجیب کے قلم سے ہے۔ اگر یہی ترجمہ مولانا غلام رسول مہر کے قلم سے ہوتا تو اس بیان کی تاریخی اور واقعاتی صداقت کے بارے میں دل میں کوئی خیال بھی نہ آتا۔ بالفرض مجیب صاحب کے ترجمے ہی کو بنیاد بنایا جائے، تب بھی مولانا دریابادی نے زیادہ مفصل اور واشگاف الفاظ میں تاریخ کی اس صداقت کا اعتراف کیا ہے۔

قومیت کے بارے میں حضرت شیخ الاسلام کی حقیقت بیانی کی جس طرح تائید و حمایت فرمائی ہے، وہ تاریخ کی صداقت کے علاوہ مولانا دریابادی کے اسلوبِ بیان اور طرزِ نگارش کی دل آویزی بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ مولانا کا مضمون "بجا دِ پاکستان ---- ایک محاسبہ" اور اس پر "چند مزید وضاحتیں" ملاحظہ فرمائیے۔ (ابو سلمان شاہ جہاں پوری)

حاشیہ:

(۱) انڈیا ونس فریڈم میں بھی مولانا کا بیان (انگریزی) مولانا کا اصل بیان نہ تھا۔ مولانا نے اپنے خیالات کا اظہار اردو میں فرمایا تھا۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے اسے انگریزی میں منتقل کیا، یا یہ کہا جائے کہ انھوں نے انگریزی میں مولانا کے خیالات کی ترجمانی کی۔ پروفیسر محمد مجیب نے اسے اردو میں منتقل کیا۔ کتاب کی اصل (انگریزی) اور ترجمہ (اردو)، دونوں سے مولانا کا تعلق نہ تھا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مولانا اس حقیقت کو کن الفاظ میں بیان فرماتے، لیکن اُن کی زبان اور اسلوب بعینہٖ یہ نہ ہوتا۔ مولانا کے محققین اور مخلصین میں غلام رسول مہر، ان کے ذوق و مزاج، زبان اور اسلوب سے زیادہ آشنا تھے۔ اسی لیے ان کے ترجمے میں ایک خاص احتیاط موجود ہے۔ (ا۔ س۔ ش)

بنیادِ پاکستان

ایک محاسبہ

(از عبد الماجد)

تخیلِ پاکستان کے اصل بانی چودھری رحمت علی مرحوم سمجھے جاتے ہیں۔ بہر حال وہ ہوں یا اقبال مرحوم، کوئی صاحب بھی اصل داعیوں میں نہ عالم دین تھے اور نہ بالکل ابتدا میں دعوت کی بنیاد بھی دینی تھے۔ مسلمانوں کو نہ یہ شکایت پیدا ہوئی تھی کہ ہماری مذہبی آزادی خطرے پر پڑ گئی ہے اور نہ یہ کہ ہمارے اداے نماز یا اداے حج میں رکاوٹیں ڈالی جارہی ہیں یا یہ کہ شعائرِ اسلام مٹائے جارہے ہیں، تبلیغ اسلام جرم قرار پا گئی ہے اور ہماری غذا، لباس وغیرہ کو مسلم تمدن سے بعید و نامانوس کیا جارہا ہے۔ شکایتیں جو کچھ ہندوؤں سے پیدا ہوئیں، اعتقادی مسائل میں نہیں، قومی معاملات میں تعصب و تنگ نظری کی پیدا ہوئیں۔ سرکاری ملازمتوں میں کلیدی عہدے اپنے ہاتھ میں رکھ لیے ہیں، اقتدار اعلیٰ میں ہمیں گھسنے نہیں دیتے، تجارت، تعلیم و سیاست، وکالت، ڈاکٹری، انجینئری ہر شعبے، ہر محکمے کے دروازے ہم پر بند ہو رہے ہیں۔ ماتحتی، محکومی بھی ہر صیغۂ زندگی میں ہمارے نصیب میں آرہی ہے۔ یہ ہٹیں اور ان سے پیچھا چھوٹے تو ہمیں بھی ارمان اپنے حوصلے کے مطابق نکالنے کے موقعے ملیں اور ہم زندگی کی ہر بلندی، ہر کامرانی سے لطف اندوز ہوں۔ الفاظ جو کچھ بھی ہوں، شکایتیں یہی دل میں تھیں اور اسی ملی مظلومیت کے احساس نے زبانوں میں تلخی پیدا کر لی تھی۔ علاج

یہ سمجھ میں آیا کہ کچھ حصہ ملک کا مخصوص اپنا کرا لیا جائے۔ وہاں آزادی اور انصاف، امن چین سے رہنے سہنے کا موقع ملے اور ہر وقت کے آزار و ستم سے نجات نصیب ہو۔

جناح صاحب انھیں جذبات کے ترجمانِ اعظم تھے اور مسلمانوں کی قوم میں قائدِ اعظم کہلائے۔ ملت نے انھیں جس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا، نہ وقت کے کسی عالم و فاضل، مفسر و محدث کو لیا، نہ کسی صاحبِ طریق و سلوک صوفی و درویش کو۔ مطالبہ پاکستان کی بنیاد اگر دینی ہوتی تو ظاہر ہے کہ بیعت کسی مشہور مولوی، مولانا کے ہاتھ پر کی جاتی اور خود جناح صاحب کے عقائد پر ہر طرف سے نکتہ چینی اور خردہ گیری شروع ہو جاتی اور مولوی صاحبان اور ان کی وضع ظاہری وغیرہ پر فتوی دینے سے کسی طرح باز نہ آتے۔ مولانا مودودی جو اس وقت جمہوریت اور حق رائے دہی بالغان وغیرہ سے منزلوں دور تھے، ہرگز مطالبہ پاکستان کی مخالفت نہ کرتے، بلکہ ایک دینی جہاد سمجھ کر جناح صاحب کے ہم زبان اور رفیق طریق ہو جاتے۔ جب تحریک پھیلی اور اس کے قدم جم لیے تو عام مسلمانوں میں اپنی سادہ دلی سے قدرۃً یہ خیال پیدا ہوا کہ جب حکومت اپنی ہوگی تو لازمی طور پر قانون اسلام رائج ہوگا اور اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو جانے والے بے شمار عامی مسلمانوں میں ان سطور کا راقم اور صدق کا مدیر بھی تھا۔ علما میں مخلصین اور تہجد گذاروں کی ایک بڑی تعداد بے شبہ تھی۔ لیکن وہ بے چارے موجودہ سیاسیات کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کو کیا سمجھتے۔ ان کے ذہن میں حکومت کا تمام تر وہی سادہ نقشہ تھا جو کروسیڈز (حروب صلیبیہ) کے زمانے میں آج سے سیکڑوں سال قبل تھا، جب مسلموں غیر مسلموں میں جنگ جہاں کہیں بھی ہو بڑی آسانی سے جہادِ دینی کی شکل اختیار کر لیتی۔ موجودہ نسلی و لسانی، جغرافیائی و سیاسی، معاشی و عمرانی قسم کی بے شمار پیچیدگیوں کا کسی دماغ کو اندازہ ہی نہ تھا! ''اخوتِ اسلامی'' سب سے زیادہ جاذب نظر اور سب سے بڑھ کر مؤثر و کارگر کلمہ نظر آ رہا تھا اور کسی کا ادھر ذہن بھی نہیں جا سکتا تھا کہ مشرقی بنگال اور سندھ و بلوچستان کے درمیان آب و ہوا کا شدید اختلاف، زبانوں کا کامل اختلاف، لباس وضع اور عام ثقافتی اختلاف، کبھی بھی اشتراکِ کلمہ کے ہوتے ہوئے حائلِ راہ بن سکتا ہے۔

لیکن جب تخیلات و تصورات سے نہیں ٹھوس حقائق سے ٹکراؤ ہوا تو تجربے سے معلوم ہوا کہ اشتراکِ کلمہ کا سارا آج کی فضا میں کتنا بودا ہے۔ "ہونا" اسے جو کچھ چاہیے تھا اس کا سوال نہیں۔ سوال صرف اس کا ہے کہ "ہے کیا"۔ دنیوی مفادات کا ٹکراؤ، جب مشرقی حصے کا مغربی حصے سے ہوا تو مقابلہ و مسابقہ کے وہ سارے پست و سفلی بشری جذبات قوت سے جاگ اٹھے، جس سے وہ پہلے ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں جاگا کرتے تھے۔ اور جو بھی قوتیں ترکوں کو عربوں کے، مغلوں کو پٹھانوں کے، عباسیہ کو بنو اُمیہ کے مقاتلے اور باہمی خوں ریزی تک سے نہ روک سکیں وہ مشرقی و مغربی کے مقابلے میں آج بیسویں صدی میں کیسے دھیمی اور سرد رہ سکتی ہیں۔ جب وہ آج سے سیکڑوں برس قبل نہ قابو میں رہ سکیں، اس وقت اسلام جو بہر حال ضعیف تھا، دلوں پر حکمراں تھا، مگر اب آخری بڑی لڑائی تو بس چودھویں صدی میں ختم ہو گئی اور اس کے بعد سے چند چھوٹے چھوٹے مستثنیات (سکھوں کے خلاف سید احمد شہید کا جہاد، اطالویوں کے خلاف روسیوں کا جہاد وغیرہ) کو حذف کر کے صدیوں سے اب جہاد کا کہیں نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ حد یہ ہے کہ اسرائیل کی پچھلی جنگ کے مقابلے میں باوجود ہر طرح کے نقصانِ عظیم کہ یہ کسی بھی مسلم ملک کی ہمت نہ ہوئی کہ اپنی جنگ کو جہاد کا نام دے!

اب مولانا حسین احمدؒ کے وہ سیاسی خیالات و نظریات سے کسی کو اختلاف رہا ہو یا اتفاق، لیکن ان کا یہ دعویٰ تو بہر حال غلط نہ تھا کہ اب قوم تو وطن سے بنتی ہے۔ "ہونا چاہیے" کا سوال ہرگز نہیں۔ سوال صرف "ہے" کا ہے۔ واقعہ افسوس ناک جتنا بھی ہو، بہر حال اس کی واقعیت سے کیسے چشم پوشی کر لی جائے۔ اشتراکِ کلمہ کا جادو آج کہاں چل رہا ہے۔ اس کا آج مسلم ملکوں میں سے کسی پر باقی ہے۔ جمال الدین افغانی کی پان اسلامزم کے بعد، تحریکِ خلافت آخری تحریک اخوت اسلامی کی پرزور اور جاندار طریقے پر ہندوستانی مسلمانوں نے اٹھائی، لیکن باہر والوں میں سے کس نے ان کا ساتھ دیا اور پھر یہاں کے مسلمان بھی آخر ہار کر تھک کر بیٹھ گئے اور اس کے بعد اس مطالبے کا زبان سے بھی نکالنے کا یارا نہ رہا۔ حالاں کہ

مولانا شوکت علی مرحوم اس کے بعد کئی سال زندہ رہے اور حسرت موہانی تو کہنا چاہیے کہ ۲۰، ۲۲ سال تک۔ عالم اسلام کی فضا میں اتنے دنوں میں اتنی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی اور جبن و کم ہمتی، بزدلی کی حکومت دلوں پر مسلط ہو چکی تھی۔

مطالبۂ پاکستان کی قریب ترین مثال علی گڑھ کالج کی ہے۔ سرسیدؒ نے جب اس کی تحریک اٹھائی تو ان کا تصور اصلاً اور براہِ راست قومِ مسلم کی دنیوی صلاح تھی، جو یہاں سے پڑھ کر نکلیں، وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوں، وکیل اور بیرسٹر ہوں، جج اور مجسٹریٹ ہوں، ڈاکٹر اور انجینئر ہوں، سیٹھ اور ساہوکار ہوں، اور ساتھ ہی دینِ اسلام پر قائم اور شعائرِ اسلام کے پاسبان بھی۔ دین سے باہر ہرگز نہ ہوں۔ دینی حمیت و غیرت سے بہرہ ور ہوں، لیکن اصلاً کامیاب دنیادار ہوں۔ فلاحِ دین بھی مقصود تھی، لیکن ضمناً و تبعاً۔ فلاحِ دین کو بہ طورِ اصل مقصد کے رکھنے والا کوئی ولولہ نہ تھا۔

پاکستان کا اصل مقصود دنیوی حکومت حاصل کرنا تھا۔ مسلمان قوم و ملت کو آزادی دلانا تھی۔ داعیانِ پاکستان اسی مطالبہ کو لے کر اٹھے تھے۔ تحت الشعور میں البتہ یہ بات تھی کہ جب قوم کو آزادی حاصل ہو گی تو قدرتاً وہ اپنے ہی قانون اور اپنے ہی نظامِ حکومت کا انتخاب کرے گی۔ اس راہ کی پیچیدگیاں، گتھیاں اور لاینحل دشواریاں ہرگز نہ شعور میں تھیں، نہ لاشعور میں، بس ایک مجمل مبہم اور نہایت پرجوش نعرہ تھا کہ زبان اور حلقوں سے نکل رہا تھا (سوراج ہی کے نعرے کی طرح جو سارے ہندوستانیوں کی ملک تھا)۔ اس کے مضمرات و مقتضیات کا واضح کیا معنی دھندلا خیال نہ مسلمانوں کے چھوٹوں کے دل میں آیا نہ بڑوں کے۔ بھولی قوم کی طرح لیڈر بھی کچھ ایسے ہی بھولے بھالے تھے۔ بدنصیبی دونوں میں مشترک۔ یہ سطریں ختم ہو چکی تھیں کہ حضرت اکبر کا ایک شعر دماغ میں گونج گیا:

کہہ دیا میں نے کہ "ہوں" اور یہ نہ سمجھا کہ کیا
اس خودی کا حشر کیا ہوتا ہے دیکھا چاہیے!

جدید آفاقی تمدن کی فضا محض اسلامی نہیں مطلق مذہبی تصور سے اس درجہ نامانوس ہو

چکی ہے کہ اب کوئی سوال مومن وکافر کی تفریق کا باقی ہی نہیں رہ گیا ہے، بلکہ تفرقہ کی بنیادیں بالکل ہی دوسری (رنگ و نسل، زبان، اقتصادیات، جغرافیہ وغیرہ کی) بنیادوں پر قائم ہو چکی ہیں کہ اب دنیا کو دین ومذہب والی تفریق پر لانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور اس کے لیے ضرورت کسی پیمبرانہ عزم و عزیمت کی ہے ہمارے بہتر سے بہتر بھی لیڈروں کے بس کی بات نہیں۔ (صدق جدید، لکھنو۔ ۲۱/ مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۴۔ ۵)

چند مزید صراحتیں

(از عبدالماجد)

مضمون "جیادِ پاکستان --- ایک محاسبہ" (صدق) نے بہتوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ بعض حلقوں کی طرف سے سوالات و شبہات بھی پیش ہوئے ہیں۔ ان کے پیش نظر بعض اور صراحتیں ضروری معلوم ہوئیں۔

۱۔ یہ ٹھیک ہے کہ جناح صاحب کی ذات سے واقفیت کے بعد ایک اسلامی نظامِ حکومت کی توقع ہی ان سے بہت مستبعد تھی، لیکن اول تو لوگ تھے ہی ایسے بہت کم، جو ان سے براہِ راست واقفیت رکھتے ہوں۔ عموماً لوگوں نے تو بس "قائد اعظم" ہی کی حیثیت سے ان کا تخیل اپنے دماغ میں قائم کیا اور ایک مجاہد ہی طرح کا تصور ان کے متعلق اپنے دل میں بساتے رہے اور کچھ لوگ تو انھیں محمد علیؒ ہی قسم کا ایک "مذہب زدہ" لیڈر سمجھتے رہے۔ پھر دوسری بات ہے کہ مسلم لیگ کی ہائی کمان میں چند لوگ تو ضرور ہی ایسے موجود تھے، جن کی طرف سے مذہبی مطالبہ ذرا بعید از قیاس نہ تھا۔ خواجہ ناظم الدین، چودھری خلیق الزماں، عبدالرحمن صدیقی، مولانا اکرم خاں وغیرہ۔

۲۔ خوش عقیدگی اور اعجوبہ پرستی کی جو روح آج سے نہیں صدیوں سے مسلمانوں پر مسلط ہے۔ وہ ہر دور میں انھیں عجیب عجیب خوش فہمیوں میں مبتلا کرتی رہی ہے اور اسی نے "قائد اعظم" کی مذہبیت سے متعلق طرح طرح کی اختراعی روایتیں پھیلا رکھی ہیں۔ لوگ بے تکلف انھیں ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کرتے رہتے تھے اور کسی کو ان پر جرح و تنقید کا

خیال تک نہ آتا تھا۔ مثلاً ایک چلی ہوئی روایت حسرت موہانی مرحوم کے مستند حوالے سے یہ تھی کہ ایک بار کوئی بہت ہی اہم خبر لے کر رات کے پچھلے پہر جناح صاحب کی کوٹھی واقع دہلی میں جانا پڑا۔ یہ پہنچے تو ایک اندرونی کمرے میں انہیں کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی، شیشے سے جھانک کر دیکھا، تو کیا دیکھتے ہیں کہ جناح صاحب بہ خشوع و خضوع نمازِ تہجد میں مصروف ہیں! جی ہاں نماز پنجگانہ ہی نہیں نماز تہجد۔ سادہ لوح و معصوم صفت قوم اس خوش خیالی میں مبتلا اور اس کی منتظر کہ امام مہدی کا ظہور بس اب ہوا چاہتا اور جہاد عمومی کا حکم بس ملا چاہتا ہے۔ اب ایک واقعی بزرگ نے اس سے کئی سال قبل تحریکِ خلافت کے دور میں مجھ سے بیان کیا تھا کہ امام مہدی پیدا تو ہو چکے ہیں بلکہ طوافِ کعبہ میں فلاں ہندی بزرگ کو مل بھی چکے ہیں۔ بس ابھی تک مامور اپنے منصب مہدویت پر نہیں ہوئے ہیں۔

۳۔ لیگ کے ہمدرد ہم مسلک علما کی تشخیص یہ تھی کہ لیگ کے اکابر کو جو چیز مسجد کے اندر جانے سے روکے ہوئے ہے، وہ ان کا تساہل اور بے توجہی ہے۔ جب مولانا شبیر احمد عثمانی یا مولوی شبیر علی تھانوی کے پایے کے لوگ انہیں اس طرف توجہ دلا دیں گے تو ان کی جھجک ٹوٹ جائے گی اور یہ لوگ پابندِ مسجد و جماعت ہو جائیں گے۔

۴۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں بجز خلافت کمیٹی کے اور کسی سیاسی مجلس کا ممبر نہیں رہا۔ چناں چہ لیگ کے بھی چھوٹے بڑے سیکڑوں جلسوں میں سے (سوا ایک اور صرف ایک جلسہ) کسی میں بھی نہیں شریک ہوا اور نہ لیگ کا ابتدائی ممبر (ایک آنہ والا) ہی کبھی رہا۔ صدق میں مطالبۂ پاکستان کی تائید زور و قوت کے ساتھ بے شک بار بار کی، لیکن صرف شرعی و اصولی حیثیت سے۔ یعنی بس اسی حیثیت سے کہ مسلمانوں کو بھی اپنے ہوم لینڈ کا حق ضرور حاصل ہے، جیسا کہ دوسروں کو حاصل ہے، لیکن اس کے آگے اس کے علمی، سیاسی پہلوؤں پر رائے زنی کا اہل اپنے کو کبھی نہ سمجھا، نہ اب سمجھتا ہوں۔ علم و فن اپنے کو آتا ہی کون سا ہے۔ لیکن سیاسیات میں تو مبتدی کا درجہ بھی نہیں تھا۔

(۵) مسلمان جس ملک کا بھی باشندہ ہو کر رہے گا، لازمی ہے کہ اس کا وفادار ہو کر رہے گا،

لیکن وہ اس ملک کا محض شہری یا محض رعایا بن کر نہیں رہے گا، بلکہ مسلمان شہری یا مسلمان رعایا بن کر رہے گا۔ یعنی اپنے خصوصیات و تشخصات کو قائم رکھ کر۔ (صدق جدید، لکھنؤ۔ ۱۸/اپریل ۱۹۶۹ء)

ضمیمہ نمبر ۲:

جمعیت علمائے ہند کا واضح فیصلہ

پورا ہندوستان ہمارا پاکستان ہے!

بیان کے آخر میں حضرت مولانا سید محمد میاںؒ نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس سہارن پور کی تجویز کے مطالعے کا مشورہ دیا ہے۔ جلسہ سہارن پور میں یہ گیارھویں قرار داد کے طور پر پیش ہو کر پاس ہوئی تھی۔ یہ تجویز ہمیں ایک کتاب میں مولانا محمد میاںؒ کے نوٹ کے ساتھ مل گئی ہے۔ جسے ہم قارئین محترم کے مطالعے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ تجویز کے آخر میں بھی دو نوٹ حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کے قلم سے یادگار ہیں۔

(ابو سلمان شاہ جہان پوری)

(نوٹ) اصلی چارۂ کار کے بعد ذیل کی واضح تجویز ملاحظہ فرمایئے۔ آپ کے سامنے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ جمعیت علما کے ارباب حل و عقد جو فیصلہ کرتے ہیں، وہ سالہا سال کے غور و خوض اور تجربات کا نتیجہ ہوتا ہے، جس پر ان کے ضمیر پختہ ہو جاتے ہیں اور پھر اس پر عمل کو دیانۃً اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس کے لیے ہر قربانی کو جہاد فی سبیل اللہ قرار دیتے ہیں۔ محمد میاں عفی عنہ

جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس عام جمود و تعطل کی حالت کو ملک و قوم کے لیے نہایت مضر اور ملی حیات و ترقی کے لیے مہلک سمجھتا ہے۔ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ ملک کی تمام معتد بہ جماعتیں اور عام پبلک حصول آزادی کے لیے بے چین و مضطرب ہے اور ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اور تمام افراد مختلف خیالات اور فارمولے تجویز کر رہے اور شائع کر رہے ہیں۔ مجلس

عاملہ اپنی رائے اجلاس لاہور، منعقدہ ۱۹۴۲ء میں ظاہر کر چکی ہے۔ آج پھر اس کی تجدید کرتی ہے اور اس کے آخری حصے کی رفع اجمال کی غرض سے قدرے توضیح کر دینی مناسب سمجھتی ہے۔ یہ بات بدیہی اور مسلمات میں سے ہے کہ ہندوستان آزادی کی نعمت سے اس وقت تک متمتع نہیں ہو سکتا، جب تک ہندوستان کی طرف سے متفقہ مطالبہ اور متحدہ محاذ قائم نہ کیا جائے۔ ہندوستانی کسی متفقہ مطالبے کی تشکیل اور متحدہ محاذ قائم کرنے میں جتنی دیر لگائیں گے، اسی قدر غلامی کی مدت طویل ہوتی جائے گی۔ جمعیت علمائے ہند کے نزدیک تمام ہندوستانیوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً یہ صورت مفید ہے کہ وہ حسب ذیل نکات پر اتفاق کر لیں اور اسی بنیاد پر حکومتِ برطانیہ کے سامنے متفقہ مطالبہ پیش کر دیں:

"(الف) ہمارا نصب العین آزادی کامل ہے۔

(ب) وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا، مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

(ج) ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خود مختاری اور آزادی کے حامی ہیں۔ غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

(د) ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے، مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی۔ یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

تشریح: اگرچہ اس تجویز میں بیان کردہ اصول اور ان کا مقصد واضح ہے کہ جمعیت علما مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی اور تہذیبی آزادی کو کسی حال میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ وہ بے شک ہندوستان کی وفاقی حکومت اور ایک مرکز پسند کرتی ہے، کیوں کہ اس کے خیال میں

مجموعہ ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کے لیے مفید ہے مگر وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کے لیے حق خود ارادیت تسلیم کر لیا جائے اور وفاق کی تشکیل اس طرح ہو کہ مرکزی غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی حقوق پر اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر تعدی نہ کر سکے۔ مرکز کی ایسی تشکیل جس میں اکثریت کی تعدی کا خوف نہ رہے، باہمی افہام و تفہیم سے مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کسی صورت پر یا ان کی علاوہ کسی اور ایسی تجویز پر جو مسلم و غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے ہو جائے، ممکن ہے۔

(۱) مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔ ہندو ۴۵، مسلم ۴۵، دیگر اقلیتیں ۱۰۔

(۲) مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ۳/۲ (دو تہائی) اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخالفانہ اثرانداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکے گی۔

(۳) ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم و غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم و غیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے۔ یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے تنازعات کے آخری فیصلے کرے گا۔ نیز تجویز نمبر ۲ کے ماتحت اگر کسی بل کو مسلمانوں کے خلاف ہونے نہ ہونے میں مرکز کی اکثریت مسلم ارکان کی ۳/۲ (دو تہائی) اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا۔

(۴) یا اور کوئی تجویز جسے فریقین باہمی اتفاق سے طے کریں۔

نوٹ:

(۱) مندرجہ بالا تجویز 'الف' سے بشمول 'د' تک اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۴۲ء میں پاس ہو چکی تھی۔ اس پر مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند نے اپنے اجلاس منعقدہ ۳۱ر جنوری و یکم و دوم فروری ۱۹۴۵ء میں تشریح کا اضافہ کیا اس کے بعد یہ پوری تجویز مع تشریح جمعیت علمائے ہند کے چودھویں اجلاس عام میں بمقام سہارن پور منعقدہ ۴ تا ۷ رمئی (۱۹۴۵ء

میں منظور کی گئی۔

(۲) اس تجویز کے ساتھ اگر مجلس عاملہ جمعیت علماے ہند کے اجلاس سہارن پور، منعقدہ ۳ ر اگست ۱۹۳۱ء کے فارمولے کی مندرجہ ذیل دفعات بھی پیش نظر رہیں تو آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کا نقشہ ہر مسلمان کے سامنے آسکتا ہے اور وہ بآسانی یقین کر سکتا ہے کہ جمعیت علماے ہند کی تائید و حمایت سے نہ صرف یہ کہ پاکستان ہندوستان کے چند گوشوں میں سمٹ کر رہ جائے بلکہ پورا ہندوستان ایسا پاکستان بن سکتا ہے، جس میں شرعی محکمے اور دارالقضاء قائم ہوں اور پرسنل لا (شرعی احکام) کا نفاذ مسلمانوں کے کامل اور آزاد اختیارات کے ذریعے سے پورے ہندوستان میں نافذ ہو۔

(مولانا سید) محمد میاں غفی عنہ